جلد (۱) شمارہ (۶) | سب رس | جون ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

ادا ریہ

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبالؔ

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت (گرامیؔ)

اہلِ ہند نے اقبالؔ کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی قدر و منزلت کرکے یہہ ثابت کردیا تھا کہ ان کی آنکھوں سے "آشنا نا آشنائی" کے پردے اٹھتے جارہے ہیں اور ان میں جوہر شناسی کے ساتھ ساتھ خود شناسی کا مادہ بھی پیدا ہوتا جارہا ہے۔ یہہ ابتداء تھی ایک عظیم المرتبت شاعر کو خراجِ تحسین ادا کرنے کی اور ممکن ہے اگر وہ زندہ رہتا تو دیکھ لیتا کہ اس کے وطن والے اس کو اچھی طرح پہچان گئے ہیں ــــــ ایک طرف تو سارے ہندوستان میں "یوم اقبال" منایا جارہا تھا اور دوسری طرف اقبالؔ اپنی مادی زندگی کے آخری دن ختم کررہے تھے۔ اس کے بعد پانچ مہینے بھی گزرنے نہیں پاتے کہ وہ مسکراتے ہوئے ایک مردِ مومن کی طرح اس مقامِ بلند پر پہنچ جاتے ہیں جہاں اُن کی "فریادوں" نے ہنگامہ مچا رکھا تھا۔

مسلسل ہنگامہ یا صرف موقتی جلسے؟

ان کی وفات کے بعد بھی سارے ہندوستان میں ان کے لئے خراجِ تحسین ادا کیا گیا یہہ کوئی نئی بات نہیں مرنے کے بعد قدر و منزلت ہوا ہی کرتی ہے۔ لیکن بات جب ہے کہ اِس نمائشی ماتم سے ہٹ کر جس کا حاصل چند جلسے ہیں، جن کی رونق ایک ہنگامے کے بعد ختم ہوجاتی ہے، چند آنسو ہیں جو آنکھوں سے ڈھلک کر رائیگاں ہوجاتے ہیں۔ چند "تحریکات" ہیں جو زبان سے نکل کر ہوا میں پھیل جاتی ہیں، ہم اپنی زندگی میں وہ مسلسل ہنگامہ پیدا کریں جو "یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم" کا مظہر ہو۔ اپنے افسردہ اور بے رنگ چہروں پر زندگی کی وہ جھلک لہرائیں جو حیات آفریں تبسم کے سیلاب میں ہمارے گریۂ بے اثر کو غرق کردے۔ اور خاموشی میں وہ "لذتِ فریاد" پیدا کریں جو زمین سے پرواز کرکے آسمانوں پر پہنچ جائے۔

اگر ہم نے اپنے آپ میں اقبالؔ کے پیام سے حیات آفرینی کی یہ قوت حاصل کرلی تو ہم اُن کی موت پر ظاہری ماتم میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اُن کے پیام پر عمل کرکے یہہ ثابت کرسکتے ہیں کہ اہلِ ہند نے اپنے شاعر کی کاوشِ پیہم اور سوز دروں کو رائیگاں نہیں کیا۔ اقبالؔ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ان کا کلام ان کی موت کے بعد بھی "زندہ مردوں" کے لئے اسی طرح "پیام زندگی" دے رہا ہے گا ہندوستانِ جدید کے نوجوان جن کی ناؤ "مشرق و مغرب" کے سنگم پر "ساحلِ کشمکش" سے ٹکرا رہی ہے اگر اقبالؔ کے اضطراب آگیں پیام کو اپنے لئے خضرِ راہ بنالیں تو ان کا ہر سانس بانگِ درا بن سکتا ہے۔

حیدرآباد اور اقبال

اقبالؔ کو حیدرآباد سے خاص محبت تھی، اس کا ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جو انھوں نے اپنے حیدرآبادی احباب کو لکھے تھے وہ چاہتے تھے کہ حیدرآباد میں "مستقل بود و باش" اختیار کرلیں۔ چنانچہ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ قانون کی پروفیسری اور اس کے بعد عدالت العالیہ کی رکنیت پر اقبالؔ کے تقرر کی خبریں یقین کی حد تک پہنچ گئی تھیں۔ لیکن بعض اتفاقی حالات نے دونوں مرتبہ حیدرآباد کو ان کی خدمات سے محروم رکھا۔

۱۹۲۸ء میں اقبالؔ نے مدراس جاتے ہوئے حیدرآباد میں قیام کیا تھا اور ٹاؤن ہال میں دو معلومات آفریں تقریریں کی تھیں۔ اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے انھیں باریاب کیا تھا۔ مہاراجہ بہادر نے ان کے اعزاز میں ایک بزم سخن بھی منعقد کی تھی۔ بندگان عالی کی شان اور مہاراجہ بہادر کی مدح میں اُن کی نظمیں اس کا ثبوت ہیں کہ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست کے ہر دلعزیز بادشاہ اور وزیر کی کس قدر عزت کرتے تھے "گورستانِ قطب شاہی" پر ان کی مشہور نظم اسی قیامِ حیدرآباد کا نتیجہ ہے۔

جنوری میں حیدرآباد نے یوم اقبال منایا اور اس خصوصیت کے ساتھ منایا کہ اس کی صدارت ہز ہائینس شہزادۂ برار نے فرمائی اور

ان کی وفات کے بعد نہ صرف بلدہ میں ایک عظیم الشان ماتمی جلسہ کیا گیا بلکہ اضلاع اور تعلقوں کے باشندوں نے بھی سوگ منایا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حیدرآباد میں اقبال کی ذات کس قدر عزیز تھی اور ان کا کلام کس قدر مقبول تھا؟ —— اقبال سے یہ والہانہ عقیدت، اہلِ حیدرآباد کے ان دلی جذبات کا نمایاں ثبوت ہے جن کو ہز ہائنس شہزادۂ برار نے اپنے "ارشادِ صدارت" میں یوں ظاہر فرمایا تھا۔

"اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام کے ذریعے مشرق میں موجودہ نسل کی ذہنیت کو متاثر کیا ہے۔ بجا طور پر وہ دنیا کا ایک بہت بڑا مفکر اور مصنف مانا جاتا ہے اور بہ حیثیت شاعر وہ بنی نوعِ انسان کے لئے ایک پیغام کا حامل ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کا حیدرآباد اعتراف کر رہا ہے۔"

"سب رس" کا خراجِ عقیدت شاعرِ مشرق کی خدمت میں

"اقبال" کی وفات پر ناممکن تھا کہ حیدرآباد کے مشہور "ادارۂ ادبیات اردو" کا ماہ نامہ "سب رس" اردو کے سب سے بڑے "شاعرِ حیات" کی خدمت میں اپنا خراجِ عقیدت ادا نہ کرتا۔ اس نے بھی کوشش کی ہے کہ اس خصوص میں بساط بھر حصہ لے۔ چنانچہ یہ شمارہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس شمارہ کو نکالنے کا خیال اس وقت آیا جب کہ مئی کا سب رس تقسیم ہو چکا تھا اور "ادارۂ سب رس" جون نمبر کی تیاری میں مصروف تھا۔ پندرہ روز کے عرصے میں کارکنانِ سب رس نے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ یہی نہیں ہے، جو آپ پیشِ نظر شمارہ میں دیکھیں گے بلکہ عدمِ گنجائش کے باعث کئی مضامین اور نظمیں نہیں چھپ سکیں، جن کا ادارۂ سب رس کو افسوس ہے۔ اس کے علاوہ "سب رس" کے اکثر بیرونی معاونین کے مضامین بھی مہلت نہ ملنے کی وجہ سے وقت پر وصول نہ ہو سکے اور خود اہلِ ملک کے بعض مضامین بدیر وصول ہوئے جن کو ہم شریکِ رسالہ نہ کر سکے۔

حیدرآباد میں ادبی علمیت کا قحط نہیں ہے۔

اس قدر کم مدت میں "اقبال نمبر" کی ترتیب اور اشاعت نے ہمارے اس خیال کو یقین سے بدل دیا ہے کہ حیدرآباد میں ادبی علمیت کا قحط نہیں ہے۔ "اقبال نمبر" کی اشاعت کا اعلان ہی ہوا تھا کہ ملک کے انشاپردازوں نے ہماری قلمی اعانت کی طرف توجہ کی۔ اور چند ہی دنوں میں ہمیں اتنے مضامین وصول ہو گئے جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں خاموش خدمت گزارانِ اردو کی کمی نہیں ہے۔ کیا اچھا ہو کہ انفرادی مساعی کے علاوہ ہمارے ہاں منظم طریقے سے اجتماعی، ادبی کوششیں شروع ہو جائیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ حیدرآباد کو اجتماعی کوششیں راس نہیں آتیں لیکن یہ خیال صرف وہی لوگ کرتے ہیں جنھوں نے کبھی اس قسم کی کوشش نہیں کی۔ "ادارۂ ادبیات اردو" کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے جو محترمی ڈاکٹر زور کی مخلصانہ کوششوں سے اب ملک کا واحد ادبی ادارہ بن گیا ہے جس نے بیسیوں انشاپردازوں کے مضامین اور کتابیں کامیاب طریقے سے شائع کی ہیں۔ اور جس کو اردو کے اکثر اہلِ ذوق اصحاب کا تعاون حاصل ہے۔

"اقبال نمبر" کے لئے مضامین اور نظمیں فراہم کرنے کے علاوہ کارکنانِ سب رس کے پیشِ نظر زیادہ دقت طلب کام اس کی طباعت و اشاعت کا تھا۔ اس دشوار گزار گھاٹی سے وہی لوگ واقف ہیں جنھوں نے اس میں قدم رکھا ہے اور حیدرآباد کی طباعتی دشواریوں سے واقف ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ منزل بھی صبر آزما ثابت نہیں ہوئی۔ اور وہ اس قابل ہو سکے کہ وقت پر یہ رسالہ شائع کر سکیں۔

سرورق، تصاویر اور مضامین۔

اس شمارہ کا سرورق مسٹر خلیل نے تیار کیا ہے جو سب رس کے اولین معاونوں میں سے ہیں۔ پہلے بھی ان کے سرورق "زینت" "سب رس" بن چکے ہیں۔ مسٹر خلیل کو سرورق بنانے کا خاص سلیقہ ہے۔ وہ اپنے موقلم سے لکیروں میں وہ حسن کارانہ روح بھر دیتے ہیں جن میں "تخیل و صداقت" ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

مسٹر افضل حسین آرٹسٹ نے "اقبال نمبر" کے لئے اقبال کی ایک نظم اور ایک شعر کو مصور کیا ہے ان کے "آرٹ" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختلف خیالات کو ایک جگہ دیدہ زیب انداز میں جمع کر دیتے ہیں۔ "پیام صبح" میں آپ وہ ساری باتیں سمجھیں گے جو ہر صبح ہوتی ہیں اور جن کو اقبال نے اپنے فلسفیانہ تخیل سے نظم کیا ہے۔ دوسری تصویر کی اہمیت موجودہ زمانے میں زیادہ بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ موجودہ "فرقہ وارانہ فضا" کا یہہ ایک لطیف حل ہے جو مصور کے قلم سے نکلا ہے۔ مسٹر افضل حسین نے بندگان عالی کے ایک مشہور شعر کو بھی مصور کیا ہے۔ سرکار فرماتے ہیں ؎

سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثمانؔ　　　مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

اس "علوئے تخیل" اور "حقیقت ثابتہ" کو تصویر کے پردے پر ظاہر کرنے کی عزت مسٹر افضل حسین کے حصے میں تھی۔ یہ تصویر "قصرِ فلک نما" میں حسب الحکم بندگان عالی رکھوائی گئی ہے۔

مشرق کے سب سے بڑے حسن کار خان بہادر عبدالرحمان چغتائی نے بھی "سب رس" کو اپنا مرہونِ احسان کیا ہے۔ اور اقبال کی ایک رباعی کو اپنے مخصوص اندازِ حسن کاری میں مصور کر کے عنایت کیا ہے۔

محترمی ڈاکٹر زور کی مہربانیاں شامل حال نہ ہوتیں تو ہم کبھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف قدم قدم پر ہماری رہنمائی فرمائی بلکہ شروع سے آخر تک عملی حصہ لیا۔ آپ نے ہمیں اقبال کی ایک اور غیر مطبوعہ تصویر بھی عنایت فرمائی ہے۔

ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ یہ تصویر اپنی نوعیت کی ایک ہی تصویر ہے۔

"سب رس" کے اقبال نمبر کے لئے بعض مشاہیر نے خاص طور پر پیامات روانہ فرمائے ہیں۔ اس کے ذریعے سے نہ صرف اقبال کے متعلق ان کے تاثرات کا اظہار ہو سکے گا بلکہ یہہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ وہ "سب رس" کی مساعی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا مضمون جو اقبال کی حیات اور شاعری سے متعلق ہے دراصل اُن کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے "انجمنِ ترقی طلبہ" کے زیر اہتمام کی تھی اس کو مسٹر خواجہ حمید الدین مہتمم سب رس اور مسٹر محمود علی نے لکھ لیا تھا۔ ادارہ ان دونوں حضرات کا شکر گذار ہے۔

حیدرآباد کے علم دوست حضرات نے اس نمبر کے مضامین اور نظموں پر انعامات دینے کے وعدہ کئے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اُن مضامین کا اعلان آئندہ نمبر میں کیا جائے گا جو انعام کے مستحق ہیں۔ انعام عطا کرنے والوں میں نواب ولی داد خاں صاحب جمعدار مندوزی محترمہ بیگم صاحبزادہ میر جہاندار علی خاں صاحبزادہ میر اشرف علی خاں صاحب بی، اے۔ سراج الدین احمد صاحب، معین الدین احمد صاحب انصاری اور خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کے نام قابل ذکر ہیں۔

کارکنانِ سب رس کی ان تھک کوششوں کا ماحصل جو "اقبال نمبر" کی صورت میں ہے اس لئے نہیں ہے کہ اس کو دکھا کر ہم تعریفی جملے حاصل کریں بلکہ یہہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اقبال کے نام اور پیام کو ہر اردو داں تک پہنچا دیں۔

مری مشاطگی کو کیا ضرورت حسنِ معنی کی　　　کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی　　(اقبال)

اعتذار۔ سب رس کا اقبال نمبر بالکلیہ تیار ہو چکا تھا لیکن بعض تصاویر لاہور سے دیر میں وصول ہوئیں ان کے بغیر رسالہ کو شائع کر دینا ہم نے مناسب نہیں سمجھا اگرچہ اس سے "سب رس" کی اس روایت پر حرف آنے کا اندیشہ تھا جو "پابندیٔ وقت" کی خصوصیت بن کر اس سے وابستہ ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ مسٹر خلیل کا بنایا ہوا سہ رنگی ٹائیٹل بھی بروقت چھپ نہ سکا۔

امید کہ "سب رس" کے قدرداں ہماری مجبوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں معاف فرمائیں گے۔

مینیجر

اقبال اور حیدر آباد

قلعہ گولکنڈہ

آہ جولاں گاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار

زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

گرچہ باغِ زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

قطب شاہی مقبرے

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا
دیدۂ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر
جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر

کہہ رہی ہے کوئی ایامِ کہن کی داستاں
چاندنی گرتی ہے میناروں سے کیا سرگوشیاں

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

دکن

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوا ہے ہم نوا میرا گذر

جس کے ذرے مہرِ عالمتاب کو سامانِ نور
جس کی طور افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار

جس کے بلبل عندلیبِ عقلِ کل کے ہم صفیر
جس کے غنچوں کے لئے رخسارِ حور آئینہ دار

خطۂ جنت فضا جس کی ہے دامنگیرِ دل
عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار

جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے
وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئینہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

سر یمین السلطنت مہاراجہ بہادر

اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت
آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اس کی رائے روشن سے ہے نگاہِ روزگار

اس کی تقریروں سے ہے رنگیں گلستانِ شاعری
اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار

شکریہ احساں کا اے اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

قطب شاہی سلاطین

سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں
دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں

آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے
عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

هز اکسلنسی راجۂ راجایاں مہاراجہ

ڈاکٹر سر کشن پرشاد بہادر

یمین السلطنت جی سی آئی ای۔ ال ال ڈی

پیشکار و سابق صدر اعظم باب حکومت

ڈاکٹر سر اقبالؔ فقیر کے مخلص دوست تھے ان کی بے وقت مفارقت سے شعر و سخن کا ایک درخشاں ستارہ غروب ہوگیا۔ مرحوم نے فلسفہ کی گتھیوں کو نظم کے ذریعے آسان اور عام فہم بنا دیا ہے۔ دنیا کی فضائیں اُن کے منظوم نغموں سے گونجتی اور آنے والی نسلوں کے دلوں میں مرحوم کی یاد ہمیشہ تازہ کرتی رہیں گی

هز اکسلنسی رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری

نواب حیدر نواز جنگ بہادر

پی سی۔ کے ٹی۔ ال ال ڈی۔ ڈی سی ال

صدر اعظم باب حکومت دولتِ آصفیہ

اقبالؔ جیسے فوق الانسان ہستیوں کو موت نیست و نابود نہیں کر سکتی اگرچہ کہ موجودہ پریشان زمانے میں اقبالؔ خود ہماری رہبری کے لئے موجود نہیں رہے ان کے کلام میں وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ اور ہمیں اس سے سبق ملتا رہے گا وہ دن بھی ضرور آئے گا جب ہمارا ملک بلکہ ہماری دنیا اس شاعر کے بلند پایہ خیالات پر عمل پیرا ہوگی

TURAB.

پنڈت جواہر لال نہرو

خاص "سب رس" کے لئے

ہم ایک سیاسی دور سے گذر رہے ہیں جس میں افراد کی عظمت اور اہمیت اُن کے اس حصہ سے جانچی جاتی ہے جو وہ سیاسی میدان میں لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ عظمت یا اہمیت کی کسوٹی نہیں ہے۔ قوم اپنے شاعروں اور فلسفیوں سے پہچانی جاتی ہے نہ کہ اربابِ سیاست سے اور اس طرح سر محمد اقبالؔ کا درجہ بحیثیتِ شاعر و فلسفی دور حاضر کے موقتی اربابِ سیاست سے کہیں اعلیٰ ہے۔ یہ حق بجانب ہوگا اگر ہم اُن کی یاد میں ہدیۂ عقیدت پیش کریں اور ان کے کلام سے ہدایت حاصل کریں۔

Message

We are living in a political age and the greatness and importance of individuals are usually judged by the part they play in the political field. and yet this is no test of greatness or importance. A nation is ultimately known by its poets and philosophers not by its politicians and so Sir Mohammed Iqbal's position as a poet and a philosopher is far greater than that of the passing politicians of the day It is right that we should pay homage to his memory and seek inspiration from his writings.

مولانا عبدالماجد فلسفی دریابادی مدیر اخبار "صدق"

اقبالؔ کی ستائش میں زبان کھولنا، درپردہ اپنی مدح و ستائش کرنا، اور گویا اس کا اعلان کرنا ہے کہ ہم بھی صاحبِ بصیرت ہیں، اہلِ بینش ہیں، جوہر شناس ہیں!

مادحِ خورشید مداحِ خود ست　　　کیں دو چشمم روشن و نامر مد ست

عرض کرنے کی کچھ گنجائش ہوتی، تو میں وہی کہتا، جو جامیؒ حضرت مولانا رومؒ سے متعلق کہہ گئے ہیں ؎

من چہ گویم وصفِ آں عالی جناب　　　نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

اب تو صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ اقبالؒ پر اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں، کہ اُسے شاعر قرار دیا جائے ——— "شاعر" جس معنی میں ہمارے ہاں عام طور پر مستعمل ہے، یعنی نظم گو، یا قافیہ پیما، یا غزل سرا، لفظی یا تفریحی صناعیوں سے اس حکیم وقت و نباضِ ملت کو واسطہ کیا تھا؟ وہ صحیح معنی میں پیغمبروں کا جانشین، ایک "پیغام" لے کر آیا تھا، اسے سنا کر اپنے اصلی عالم کو واپس چلا گیا، اور دنیا ورطۂ حیرت میں پڑی ہوئی یہ کہتی ہی رہ گئی ؎

کہ کشید دامن فطرت کہ بہ قید یا دامن آمدی

مولوی محمد عبد الرحمٰن خاں صاحب

اے آر سی اس۔ بی اس سی۔ ایف ام یو۔ ایف ادیو۔ فیلو رائل اسٹرانا مکل سوسائٹی سابق صدر کلیہ جامعۂ عثمانیہ

سب رس کی یہہ اشاعت اقبال مرحوم کے اعزاز میں شائع ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور اُن کے شرکا، کار قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اِس شہرۂ آفاق ہستی کی آخری خدمت اپنے ذمہ لی اور مرحوم کے عقیدتمندوں اور مرتبہ شناسوں کو اپنے دلی جذبات کے اظہار کا موقع دیا۔

میں نہ شاعر ہوں اور نہ فلسفی۔ لیکن اچھا کلام اور سچی بات ہر کسی کو بھاتے ہیں۔ مرحوم کے تصانیف کے مطالعہ کے بعد کون ایسا شخص ہوگا جو اقبال کے دل و دماغ کی داد نہ دے گا۔ شعراء میں عالم اور علماء میں شاعر بڑے پایہ کے بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں خواہ بلادِ مشرق میں یا بلادِ مغرب میں۔ لیکن عالم و شاعر کا اجتماع فطرت نے اقبال کی خمیر میں جلوہ گر کر کے بتایا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت اقبال اور اس کے تصانیف و حالاتِ زندگی پر تحقیق کرنے والوں کی ایک کثیر جماعت تیار ہو گئی ہے۔ شاید یہہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کا سچا احترام اور اس کے ساتھ دلی محبت کا اظہار جس طرح نوجوانانِ حیدرآباد کیا ہے ہند کے کسی اور خطہ میں نہیں کیا گیا۔ اس کا ہرگز یہہ مفہوم نہیں کہ ملکِ دکن کو اپنی اس حق شناسی پر فخر ہے۔ سچی بات یہہ ہے کہ ہندوستان کے ہر باشندے پر اقبال کی خدمت فرض ہے۔ جن لوگوں نے یہہ خدمت انجام دی انھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔

اقبال کی زندگی سے متعلق اگر کوئی بات مجھ کو ناقابل تلافی رنج دیتی ہے تو اہلِ ملک کی وہ سرد مہری ہے جو اقبال کے ساتھ برتی گئی۔ اردو دانوں اور ہندی نژاد علماء نے جب اس کی خاطر خواہ قدر نہیں کی تو اغیار کی بے اعتنائی کا کیا گلہ۔ جاہلانہ تعصب بعض تنگ خیال اشخاص کو اقبال کی زبان آفرینی، بلند خیالی اور نزاکت طبع کی جیسی قدر کرنی چاہئے تھی ویسی قدر کرنے سے پہلے روکا۔ اگر اردو داں حضرات اس فاحش غلطی کے مرتکب نہ ہوتے اور ملک اقبال کے کلام اور اس کے فلسفہ کی ہر وقت قدر کرتا تو اہلِ وطن اس سے بہت بیش بہا فائدہ اٹھاتے۔ خیر۔ اقبال کے کلام اور اس کے ہدایات سے ملک اب بھی مستفیض ہو سکتا ہے۔

اقبال کا شمار نہ صرف اسلام کے اکابر شعراء میں ہے بلکہ ہند کے سچے اور بے تعصب وطن پرستوں کے بڑے سے بڑے لیڈروں پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ صداقت اس کا نصب العین تھی اور جو کچھ اس کے قلم یا زبان سے نکلتا تھا اس کے دل سے نکلتا تھا۔ گویا قلب کا ایک ٹکڑا تھا جو کلام کی شکل میں رونما ہوتا تھا۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت دے۔ آمین۔

خان بہادر عبدالرحمان چغتائی (لاہور)

"سب رس" کے ساتھ ہر طرح کی ہمدردی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ خدا اس کی عمر دراز کرے اور بلند اقبال بھی۔ گرمیوں میں اکثر میں کام کرنے کے قابل نہیں رہتا، ورنہ ضرور "اقبالؔ نمبر" کی خدمت کرتا۔ اقبالؔ کے ساتھ میری آخری ملاقات تو ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے، جس کے متعلق میں کسی دوسرے موقع پر تحریر کروں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے لئے مسلمان قوم کو ایک نیا گھر، نیا ملک، نئی دنیا آباد کرنی چاہئے تھی مگر جس غریب قوم کا وہ شاعر اور پیغام بر تھا اس نے اس کو امید سے زیادہ اچھی جگہ دی۔ اُس کی آرام گاہ شاہی مسجد کا دامن ہے جس کا بانی اورنگ زیب تھا، جہاں ہزاروں مسلمان روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں شام کے وقت تو اتنا دردناک اور پُرسوز منظر رہتا ہے کہ سنگ دل سے سنگ دل انسان کی آنکھوں سے بھی بے ساختہ آنسو ٹپک پڑتے ہیں کوئی اقبالؔ کے شعر پڑھتا ہے، کوئی اس کی روح کو درود کا تحفہ بھیجتا ہے اور کوئی کلام الٰہی کا ورد کر تا رہتا ہے ــــــ اور وہ شاعر اعظم خاموشی سے، اس مجاہد اور غازی کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے ہے جس نے ہندوستان میں پہلی مرتبہ قوت کے ساتھ اسلام کا پیام دیا تھا۔

اقبالؔ کے چلے جانے سے لاہور کی فضا سونی ہے اور دلوں پر ایک قسم کی مردنی چھائی رہتی ہے۔ خدا آپ کو "اقبالؔ نمبر" کے شائع کرنے میں کامیابی دے۔ ہر طرح سے میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ

بیتابیٔ دل سے ہائے سوئیں کیونکر
غم اشکِ رواں سے اپنے دھوئیں کیونکر
عالیؔ شعرا ہستی میں اچھے کم ہیں
اقبالؔ کو ہم کھو کے نہ روئیں کیونکر

کیا موت نے ڈھونڈا ہے بہانہ اقبالؔ
کیونکر نہ تجھے بھولے گا زمانہ اقبالؔ
عالیؔ کو تو رہ رہ کے خیال آتا ہے
اب کون سنائے گا ترانہ اقبالؔ

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے

مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبالؔ

اقبال کا سب سے آخری کلام

بہشتے بہرِ ارباب ہمم ہست | بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست
بگو با مسلمِ ہندی کہ خوش باش! | بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

انتقال سے قبل شاعرِ مشرق نے یہ شعر پڑھا تھا

نشانِ مردِ مومن با تو گویم | چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

یہ قطعہ آخری ایام میں ترجمانِ حقیقت کے وردِ زبان تھا

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید | نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبالؔ

وداعِ اقبال

الوداع اے نُطق کی سحر آفرینی کے امام
الوداع اے محفلِ معنیٰ کے میرِ اہتمام
الوداع اے بزمِ مشرق کے خداوندِ سخن
الوداع اے نکتہ سنجِ نازشِ اربابِ فن
الوداع اے مطربِ پاکیزہ الحاں الوداع
الوداع اے سرخوشِ صہبائے عرفاں الوداع
الوداع اے خسروِ شیریں کلامی الوداع
الوداع اے حسنِ فطرت کے پیامی الوداع

جا! کہ تیری منتظر تھی دیر سے خلدِ بریں
اُٹھ! کہ یہ دنیا ابھی اسرار کی محرم نہیں

(۲)

اے کہ تیرے نور سے رخشاں ہوئی صبحِ وطن
تو نے کی ویرانۂ ہستی میں تعمیرِ چمن
سازِ مشرق میں سمو دی نغمۂ مغرب کی لے
تو نے یا بھر دی نئے پیالوں میں صہبائے کہن
ہستیٔ موہوم سے پھوٹا حقیقت کا جمال
نکھری یہ جیسے رقصاں صبح کی پہلی کرن
تو نے اُن پھولوں کو سینچا باغبانِ پختہ کار
انجمِ گردوں سے ٹکراتا ہے جن کا بانکپن
اب بجھا سکتی نہیں جس کو ہوائے روزگار
تو نے سینوں میں لگا دی زندگی کی وہ لگن
تو نے چھیڑا سازیوں اے مطربِ شیریں نوا
لے کے خود انگڑائیاں اٹھی عروسِ علم و فن
اللہ اللہ تیری فطرت کی جمال آرائیاں
خار و خس کو تو نے دی تقدیرِ رو و یاسمن

تیری تدبیروں کا منت کش ہے آئینِ بہار
بھول سکتا ہی نہیں تیرا یہ احساں روزگار

(۳)

شاعرِ ہندی کہ تھا سرگشتۂ وہم و خیال
تو نے سمجھائے اسے فطرت کے اسرارِ جمال

"آرٹ" کی تعریف تھی یا گریۂ مرگ و مزار
شعر میں کہتے تھے یا افسانۂ ہجر و وصال

استعارے کی لطافت، خوبیاں تشبیہ کی
سطح بیں شاعر کی زد میں ہو رہی تھیں پائمال

شعر نے تیرے سکھایا حسنِ اندازِ کلام
فکر نے تیری جلائی شمعِ آئینِ کمال

جوش ہے، یوں ہوں بہت ہیں اور بھی اہلِ نگاہ
تھی مگر کچھ اور تیری جنبشِ موجِ خیال

شعر کا فطری سلیقہ، آگہی، فکرِ عمیق
ہیچ تو یہ ہے ایک بھی ہم میں نہیں تیری مثال

شاہدِ ہستی کو تو نے دیدیا حسنِ دوام
نطقِ انسانی کو تو نے کر دیا سحرِ حلال

تیری چوکھٹ پر ادب سے بڑھ کے رکھتے تھے جبیں
قیصر و کسریٰ کی عظمت، پیرِ دانش کا جلال

مدتوں کرتی ہے گردش جستجو میں، کائنات
تب کہیں ملتا ہے ایسا محرمِ رازِ حیات

(۴)

موت اور اقبال تو نے کیا کہا او سطح بیں!
موت اس کے گوشۂ داماں کو چھو سکتی نہیں

تو ابھی تک نارسی کی حد میں ہے گم کردہ راہ
ہستیٔ اقبال تھی سرنامۂ علم و یقیں

جس کی ہر موجِ نفس تھی نغمہ پردازِ حیات
شاہدِ مشرق کو جس نے کر دیا ناز آفریں

جادوانی حسن سے معمور تھا جس کا خیال
سرمدی انوار سے تابندہ تھی جس کی جبیں

جس نے مرجھائی ہوئی نبضوں میں دوڑا یا لہو
خاک کے ذروں کو جس نے کر دیا گردوں نشیں

خاک کو جس نے گلستاں کی لطافت بخش دی
جس نے گردوں سے بڑھا دی سرحدِ اہلِ زمیں

جس نے کھولے بے خبر دنیا پہ اسرارِ حیات
جس کی باتیں دل پذیر اور جس کے نغمے دل نشیں

ہستیٔ فانی کو جس نے جاودانی کر دیا
موت اس کو چھین لے ہم سے، نہیں ہرگز نہیں

وہ بھی زندہ، اس کا پیغامِ عمل بھی زندہ ہے
زندگی کے نور سے اس کی جبیں تابندہ ہے

علی اختر

سب رس جون ۱۹۳۸ء

حضرت اقبال رحمتہ اللہ علیہ

ہر طرف سے آرہی ہے آہ وزاری کی صدا — آسمانِ علم وفن پر غم کا بادل چھا گیا
چار سو اندھیر ہے مہرِ مبیں گہنا گیا ! — غمگسارِ قوم کو خود قوم کا غم کھا گیا

آگئی فصلِ خزاں، سارا چمن پامال ہے
سرزمینِ ہند، بزمِ ماتمِ اقبالؔ ہے

اے دیارِ علم وحکمت خطۂ ہندوستاں ! — خاک سے اٹھے ہیں تیری کتنے ایسے نکتہ داں؟
بخش دی اقبالؔ نے تجھ کو حیاتِ جاوداں — جانتا ہے اس کی نسبت سے تجھے سارا جہاں

آج شمعِ بزم گو آسودہ زیرِ خاک ہے
اس کے اشکوں سے مگر خاکِ وطن نمناک ہے

قوم کو جس نے دیئے لبریز جامِ زندگی — ہو گئے سیراب لاکھوں تشنہ کامِ زندگی
جوش نے جن کے بدل ڈالا نظامِ زندگی — غرق کردی صبح کے جلووں میں شامِ زندگی

کشتئ دل کو سدا سیلاب پر کھیتا رہا
سست رفتاروں کو پیغامِ عمل دیتا رہا

قوم کی کایا پلٹ دی شعر کے اعجاز سے — ہو گئے کمزور واقف لذتِ پرواز سے
صدق کے دریا بہا ڈالے جنوں کے ساز سے — خرمنِ باطل جلایا شعلۂ آواز سے

داغِ محکومی کو آبِ اشک سے دھوتا رہا
ملک وملت کی تباہی پر سدا روتا رہا

بے سہارا ہو گئے ہیں آج دست و پائے قوم　　ہو گیا بے نور آخر دیدۂ بینائے قوم
بیوگی کا ہے مرقع چہرۂ زیبائے قوم　　ہر نوِ امروز سے تاریک ہے فردائے قوم

شمع کے بجھتے ہی ساری رونقِ محفل گئی
حشر برپا ہے بنائے ملک و ملت ہل گئی

خوں بہا آنکھوں سے تو بھی آج اے اردو زباں　　اب حقیقت ہے ترے اقبال کی اک داستاں
موت کے قزاق نے لوٹی تری جنسِ گراں　　اور منزل سے ابھی ہی دور تیرا کارواں

تیرے جوہر دہر میں چمکانے والا مر گیا
حیف بد قسمت! ترا غم کھانے والا مر گیا

دور کی جس نے دلوں سے گردِ وہم کمتری　　رد کیا جس کی کرامت نے طلسمِ سامری
بے حقیقت ہو گئی الفاظ کی جادو گری　　بن گیا آئینۂ جذبات فنِ شاعری

موت کی وادی میں بادِ زندگی چلنے لگی
یاس کی محفل میں پھر شمعِ یقیں جلنے لگی

اب تری مظلوم حالت پر ترس کھائے گا کون؟　　تیرے دامانِ تہی میں پھول برسائے گا کون؟
حسن کو تیرے اجاگر کر کے دکھلائے گا کون؟　　برتری تیری زمانے بھر سے منوائے گا کون؟

کوچ دنیا سے ہوا اُس مردِ جوہر دار کا
جس نے بخشا تجھ کو دلکش بانکپن تلوار کا

ہمنشیں! قلبِ حزیں پر داغ کھاؤں کس لئے　　دید کی حسرت کا افسانہ سناؤں کس لئے
سامنے اغیار کے آنسو بہاؤں کس لئے　　کیا دھرا ہے اب وہاں لاہور جاؤں کس لئے

قافلہ ہے بھی تو کیا، وہ زینتِ محمل نہیں
اب کسی کو دیکھنے کی آرزو دل میں نہیں

تونے اے اقبالؔ! پائی عاشقِ شیدا کی موت
جاں نثار و غمگسارِ ملتِ بیضا کی موت

موت ہے تیری زبان و قوم کے آقا کی موت
سوز و ساز و درد و داغ و عشقِ بے پروا کی موت

کون اب عقل و جنوں کی گتھیاں سلجھائے گا؟

کون سوزِ دل سے قلب و روح کو گرمائے گا؟

فرقِ باطل کے لئے تو تیغِ بے زنہار تھا
مردِ کامل، صاحبِ دل واقفِ اسرار تھا

تا دمِ آخر مئے توحید سے سرشار تھا
بہرِ حق سارے جہاں سے بر سرِ پیکار تھا

تھے ترے سب کام مولیٰ کی رضا کے واسطے

دوستی اور دشمنی، دونوں خدا کے واسطے

تیری آنکھوں میں لبا تھا روئے احمدؐ کا جمال
ہیچ تھا تیری نظر میں بادشاہوں کا جلال

تیری شمشیرِ زباں تھی قاطعِ دستِ سوال
تیرا مسلک فقرِ حیدرؓ، عشقِ سلمانؓ و بلالؓ

شمعِ ایماں سے زمانے میں اُجالا کر دیا

عشق کا تونے جہاں میں بول بالا کر دیا

نعمتِ دیدار سے عاشق کا جی بھرتا نہیں
جان دینے میں وہ ہرگز پیش و پس کرتا نہیں

ڈرتے ہیں بے دین، مومن موت سے ڈرتا نہیں
زندۂ جاوید رہتا ہے، کبھی مرتا نہیں

مرتے مرتے فاش کر جاتا ہے رازِ زندگی

موت کے دامن پہ پڑھتا ہے نمازِ زندگی

"موسمِ گل تیری تربت پر گل افشانی کرے
روح پر تیری زمانہ فاتحہ خوانی کرے!

بارشِ الطاف کی خالق فراوانی کرے
قبر پر تیری اُجالا، شمعِ ایمانی کرے!

تا قیامت تجھ پہ ابرِ فصلِ گل روتا رہے!

تو یونہی آغوشِ رحمت میں سدا سوتا رہے!"

سکندر علی وجدؔ

اقبال کا پیامِ حیات

(ایک پُرمغز تقریر)

اقبال کی بے وقت موت ہمارے لئے وہ سانحۂ عظیم ہے جس کا احساس ہم کو روز بروز زیادہ ہوتا جائے گا۔ ابھی یہہ اچانک صدمہ اس قدر تازہ ہے کہ ہمارے اعصاب شل اور دماغ معطل ہے۔

موت کا ڈر نہ خود اقبال کو تھا نہ ہمیں ہوسکتا ہے اور یوں بھی انھوں نے کوئی ساٹھ برس اس چمن میں نے نوازی کی لیکن یہہ کوئی ایسی عمر نہیں جس کو اس زمانے میں طویل کہا جاسکے جب کہ اسّی اور نوّے برس تک جینا معمولی بات ہے پھر ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہہ ہے کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی عدیم المثال قوت بلند سے بلند تر ہوتی جارہی تھی۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ وفات سے چند لمحہ قبل جب ان کو اپنے آخری وقت کا یقین ہوگیا تو انھوں نے برجستہ یہہ رباعی کہی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ این فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

ہمیں کیسے یقین آئے کہ وہ دماغ جس نے ابھی ابھی یہہ اشعار کہے ہوں دوبارہ ہمیں کوئی لاہوتی پیغام نہیں سنائے گا ؟

ان کی خواہش تھی کہ زندگی کے آخری لمحے ملک حجاز میں بسر ہوں اور وہ درگاہِ نبوی کے زیرِ سایہ دفن کئے جائیں۔ زمانے نے ان کی یہہ آرزو بھی پوری نہ کی شاید حکمتِ الٰہی اسی میں ہے کہ ان کی ہڈیاں بھی زیرِ زمیں ہمیں پیغامِ بیداری دیتی رہیں۔

ہمارے سینے اس ناقابلِ تلافی نقصان کے احساس سے معمور ہیں لیکن ہمیں ایک "بیوہ کی طرح شور و شیون" نہیں کرنا چاہئے جس سے اُن کی روح کو تکلیف ہو۔ یہہ تو ہم اپنے عزیز احباب کے لئے کیا کرتے ہیں کہ دو گھڑی رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں۔ ضرورت ہے کہ جس چراغ کو اقبال نے جلایا اور اپنی گرم نوائیوں سے روشن کیا وہ کبھی بجھنے نہ پائے۔ جس پودے کی انھوں نے اپنے آنسوؤں سے آبیاری کی اور اپنے خونِ جگر سے سینچا وہ کبھی سوکھنے نہ پائے اگر جیتے جی ہم نے ان کی کماحقہ قدر نہ کی تو اب ان کے انتقال کے بعد ہم متفقہ اور انفرادی طرزِ عمل سے ثابت کردیں کہ جس پیام کو انھوں نے ودیعت کیا تھا ہم اس کے ناقابل نہیں ہیں۔ ان کے کلام کی وسعت اس کی متقاضی ہے کہ محققین کی ایک جماعت اس کی تفسیر و اشاعت میں منہمک رہے۔ پھر بھی یہہ کام ہماری زندگی میں ختم ہونے والا نہیں۔ اس کا بارِ گراں زیادہ تر آئندہ نسلوں پر پڑے گا۔

ضرورت ہے کہ ان کی یادگاریں قائم کی جائیں۔ جابجا ایسی مجلسیں اٹھ کھڑی ہوں جن کا مقصد ان کے سوانح حیات کو قلمبند کرنا ہو اور ان کے کلام کی ملک اور بیرون ملک میں اشاعت کرنا۔ یہہ چیزیں ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔ اقبال کو اس کی ہرگز ضرورت نہیں کہ ہماری کمزور کوششیں ان کی بقاء دوام میں مدد کریں۔ انھوں نے اپنی ابدی زندگی کا سامان آپ ہی پیدا کرلیا ہے ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم ان کے بتلائے ہوئے رستے پر چلیں اور یہہ رستہ کوئی نیا نہیں بلکہ وہی ہے جو ابتدا سے خدائے برتر اپنے بندوں کو بتاتا چلا آتا ہے۔ ان کے ہر مصرع اور شعر سے اس خدائی رستہ کا پتہ چلتا ہے سالہا سال تک ہمارا لائحۂ عمل یہی ہونا چاہئے کہ ان کے ارشادات کو پڑھیں سمجھیں سمجھائیں اور اپنی زندگی کا سامان مہیا کریں

اپنے آخری شعر میں تو اقبال نے یہہ شبہہ ظاہر کیا ہے کہ معلوم نہیں کوئی دوسرا حکیم دانا ان کی جگہ لے گا یا نہیں لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پھر ایسا انسان صدیوں تک نہیں پیدا ہو سکتا!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عمر ہا در کعبۂ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید برول

میں صرف اسی پر اکتفا کروں گا کہ ان کی زندگی کے چند رجحانات اور ان کے مقصدِ عظیم کو خود ان کے کلام کی روشنی میں واضح کروں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی زندگی ہمارے لئے ایک مکمل خضرِ راہ ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی ہر منزل اور اپنے دل و دماغ کے ہر تأثر کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

در غزل اقبال احوال خودی را باز گفت
زانکہ ایں نو کافر از آئین دیر آگاہ نیست

زندگی کا مقصد

کسی انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم سوال اس کے مقصدِ حیات کے متعلق ہے، ابتدا ہی سے اقبال نے اپنی زندگی کا یہہ مقصد قرار دے رکھا تھا کہ سوئے ہوؤں کو جگائیں بھولے بھٹکوں کو رستہ بتائیں اور بنی نوع انسان کو اس زمانے کی تباہی سے نجات دلائیں۔ وہ خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ اس کام کو انجام دے سکیں:۔

تیرہ خاکم را سراپا نور کن
در تجلی ہائے خود مستور کن
تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق
بر فروزم سینۂ احرارِ شرق
از نوائے پختہ سازم خام را
گردشِ دیگر دہم ایام را

اے کہ بہن فزدہ گرمیٔ آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاک ہزار سالہ را
عجم رمیدہ بود انغم بہار یا دا
عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
چو بجانِ من در آئی دگر آرزو نہ بینی
مگر ایں کہ شبنم تو یم بے کنار بادا
بضمیرم آں چناں کن کہ ز شعلۂ نوائے
دل خاکیاں فروزم دل نوریاں گدازم

ان کا واحد مقصد اور ان کی تنہا آرزو یہی ہے کہ گرے ہوؤں کو اٹھائیں اور کبوتروں کو شانِ عقابی سے مانوس کریں۔

بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو نہ دارم
بجز ایں دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عقابی

وہ چاہتے تھے کہ دامنِ ہستی سے پرانے داغ دھوڈالیں اور اس خاک سے ایک نیا آسمان تعمیر کریں:۔

شوید از دامانِ ہستی داغہائے کہنہ را
سخت کوشی ہائے ایں آلودہ دامانگر
خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

مقصد کی تکمیل کا طریقہ

اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر دیا اور اپنی ہر تقریر و تحریر میں اسی کا راگ الاپا۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کا اندازہ لگانے کے لئے ہم ان سے پہلے کی حالت پر نظر کرتے ہیں۔ اس حالت کو وہ زبورِ عجم میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

ز جانِ خاور آں سوزِ کہن رفت
دمش واماند و جانِ او ز تن رفت
چو تصویرے کہ بے تارِ نفس زیست
نمی داند کہ ذوقِ زندگی چیست
دلش از مدعا بیگانہ گردید
نئے او از نوا بیگانہ گردید
ز عہدِ شیخ تا ایں روزگارے
نزد مردے بجانِ ماشرارے
کفن در بر بخاکے آرمیدیم
ولے یک فتنۂ محشر ندیدیم

انھیں اس کا افسوس ہے کہ ہمارے دل میں نہ وہ پرانا اضطراب ہے نہ خلشِ آرزو۔ ہم نہ تو ذوقِ زندگی رکھتے ہیں نہ سینہ میں آواز پھر ان کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ شیخ سعدیؒ کے بعد سے کسی بندۂ خدا نے ہمارے خس و خاشاک میں چنگاری نہیں لگائی۔ وہ ٹھان لیتے ہیں کہ صدیوں کی اس کمی کو پورا کریں۔ پھر ہم آپ اور ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ اپنے ارادہ میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔

عجمیت سے بے زاری اور شاعری کا نصب العین

اس بے پایاں جمود کو توڑنے کے لئے اقبال نے اپنی شاعری کو آلۂ کار بنایا۔ اس سلسلہ میں ہم کو اقبال کے نظریہ آرٹ پر بحث کرنی پڑتی ہے۔ شاعری ہو یا موسیقی، نقاشی ہو یا صورت گری ان سب فنونِ لطیفہ میں اقبال اس نظریہ کے جو "فن برائے فن" "Art for Arts sake" کی تلقین کرتا ہے سخت مخالف تھے۔ اس تصور سے جس کو وہ عجمیت کہتے ہیں انھیں سخت بیزاری تھی قدم قدم پر وہ اس سے ہر چیز کی تلقین کرتے ہیں۔ شاعری کو وہ جزوِ پیغمبری سمجھتے ہیں جس سے مردہ قوموں میں جان ڈالنے کا کام لیا جاتا ہے اس ضمن میں مختلف مقامات سے ہم ان کے اشعار نقل کرتے ہیں جس سے ان کا تصور بخوبی واضح ہو جائے گا:۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن　　یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے　　یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلاویز　　اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں　　بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے　　جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

ان کے نزدیک وہ شاعری جس میں کوئی پیغام نہ ہو ایک درخت ہے جو پھل اور پتوں سے محروم ہے:۔

شنیدہ ام سخن شاعر و فقیر و حکیم　　اگرچہ نخلِ بلند است برگ و بر ندہد
تجلئے کہ برد پیر دیر می نازد　　ہزار شب دہد و تاب یک سحر ندہد

وہ ایسی غزل چاہتے ہیں جو فطرت کو بدل ڈالے نہ کہ اس کی ہم آہنگی کرے:۔

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند　　چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

ان عجمی شاعروں سے جو ایک مصنوعی معشوق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں وہ اپنا فرق یوں بیان کرتے ہیں:۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم　　مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست　　کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

بکوئے دلبراں کارے نہ دارم　　دلِ زارے غمِ یارے نہ دارم
بجبریلِ امیں ہم داستانم　　رقیب و قاصد و درباں ندانم

دمے در خویشتن خلوت گزیدم　　جہانے لازوالے آفریدم
مرا زیں شاعری خود عار ناید　　کہ در صد قرن یک عطار ناید

ان کی ہر آواز ایک نفسِ آتشیں ہے جو ان کے سینے سے نکلتی ہے:۔

تا مرا رمزِ حیات آموختند　　آتشے در پیکرم افروختند
یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام　　عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

حق رموزِ ملک و دیں بر من کشود　　نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود
برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است　　مصرعِ من قطرۂ خونِ من است

تا نہ پنداری سخن دیوانگی ست　　در کمالِ ایں جنوں فرزانگی ست

وہ صرف ایک طلسم رنگ و بو پیدا نہیں کرتے بلکہ رگِ گل کی حقیقت سے مطلع کرنا چاہتے ہیں:۔

زیاں بینی ز سیر بوستانم | اگر جانت شہید جستجو نیست
تماشا آنچہ ہست اندر رگ گل | بہار من طلسم رنگ و بو نیست

ان رنگین بیان فن کار شاعروں سے وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں :-

زمن با شاعر رنگیں بیاں گوئے | چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی
نہ خود را می گدازی زاں آتش خویش | نہ شام درد مندے بر فروزی

وہ تال اور سُر نہیں جانتے لیکن زندگی کی آواز پہچانتے ہیں :-

مرا از پردۂ ساز آگہی نیست | ولے دانم نوائے زندگی چیست
سُرودم آنچناں در شاخساراں | گل از مرغ چمن پرسد کہ ایں کیست؟

انھیں یقین ہے کہ عجمی شاعری و فن کاری موت سکھاتی ہے اس سے جہاں تک ہو سکے گریز کرنا چاہئیے خصوصاً اس زمانے میں جب کہ ہم میں پہلے ہی مردنی چھائی ہوئی ہے :-

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن | جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے | یہہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا | اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو | جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں | جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

غلاموں اور آزاد مردوں کے فنون لطیفہ کا فرق بھی سن لیجئے :-

مرگ ہا اندر فنون بندگی | من چہ گویم از فنون بندگی
نغمۂ او خالی از نار حیات | ہم چو سیل افتد بدیوار حیات
از نئے او آشکارا راز او | مرگ یک شہر ست اندر ساز او
ناتوان و زار می سازد ترا | از جہاں بیزار می سازد ترا
نغمہ باید تند رو مانند سیل | تا برد از دل غماں را خیل خیل
نغمہ می باید جنوں پروردۂ | آتشے در خون دل حل کردۂ

آج کل کی مصوری کو دیکھتے ہیں جس میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہ :-

راہبے در حلقۂ دام ہوس | دلبرے با طائرے اندر قفس
مطربے از نغمۂ بیگانہ مست | بلبلے نالید و تار او گسست
نو جوانے از نگاہے خوردہ تیر | کودکے بر گردن بابائے پیر

تو بے زار ہو کر وہ کہہ اٹھتے ہیں :-

می چکد از خامہ ہا مضمون موت | ہر کجا افسانۂ و افسون موت
بے نفس را لذت تحقیق نیست | بے نفس را قوت تخلیق نیست
شیخ ما از برہمن کافر تر است | زانکہ او را سومنات اندر سر است
رخت ہستی از عرب برچیدۂ | در خمستان عجم خوابیدۂ
شل ز برفاب عجم اعضائے او | سرد تر از اشک او صہبائے او

شاعر کی حقیقت ان کے نزدیک یہہ ہے :-

سینۂ شاعر تجلی زار حسن | خیزد از سینائے او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر | فطرت از افسون او محبوب تر
از دمش بلبل نوا آموختہ ست | غازہ اش رخسار گل افروختہ ست
سوز او اندر دل پروانہ ہا | عشق را رنگین از و افسانہ ہا

بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش　　صد جہانِ تازہ مضمر در دلش　　اہلِ عالم را صلا بر خواں کند　　آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی شاعری بحیثیت فن مکمل نہیں ہے، ان کو وہ یہہ جواب دیتے ہیں:-

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم　　من نوائے شاعرِ فرداستم　　عصرِ من دانندۂ اسرار نیست　　یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست
نغمۂ من از جہانِ دیگر است　　ایں جرس را کاروانِ دیگر است　　اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد　　چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد
رفت باز از نیستی بیروں کشید　　چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید

جب ہندوستان کے تنگ حلقہ سے نکل کر دنیائے مشرق کو وہ اپنا پیام پہنچانا چاہتے ہیں تو اردو کی بجائے فارسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے ہیں:-

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست　　بت پرستی بت گری مقصود نیست　　حسنِ اندازِ بیاں از من مجو　　خوانسار و اصفہاں از من مجو
گرچہ ہندی در عذوبت شکر است　　طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است　　فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت　　خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام　　درخورد با فطرت اندیشہ ام

ان کا یہہ پیغامِ عمل و بیداری کیا ہے؟

اٹھ کہ پیدا ہوئی ظلمت افقِ خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں　　پھونک ڈالا تھا کبھی دفترِ باطل جس نے　　حدتِ دم سے اسی شعلہ کو پیدا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں　　خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں　　اس چمن کو سبقِ آئینِ نمو کا دے کر　　قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
شکلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا　　رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا　　شوق وسعت ہے تو ذرے سے بیاباں ہو جا　　نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

اسی پیغام کو انھوں نے اپنی اس مشہور نظم میں دہرایا ہے جو اب مقبولِ عام ہو چکی ہے:-

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز　　کاشانۂ مارفت بتاراجِ غماں خیز　　از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز　　از گرمیِ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز　　از خوابِ گراں خیز

ان کے نزدیک ہستی اور عمل دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں چنانچہ جرمن شاعر Henrich Heine کے سوال کا جواب وہ یوں دیتے ہیں:-

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم　　ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم　　موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت　　ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

جہانِ عمل کی تصویر وہ اس طرح کھینچتے ہیں:-

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا　　قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا　　نشہ از حال بگیرند و گذشتند ز قال　　نکتۂ فلسفہ دُرد تہ جام است ایں جا
ما دریں رہ نفس و مہر بر انداختہ ایم　　آفتابِ سحر او لبِ بام است ایں جا　　اے کہ تو پاس غلط کردۂ خود می داری　　آنچہ پیش تو سکون است خرام است ایں جا
ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم　　علم را جاں بدمیدیم و عمل ساختہ ایم

پھر کہتے ہیں:-

در دل پوشیدہ مضمونِ حیات　　لذتِ تخلیق قانونِ حیات　　خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو　　شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو

وحدتِ کامل اس پیغام کے ساتھ اقبال نے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ ایک مکمل وحدت ہے جس کو وہ اپنی خالص حالت میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس وحدت کا رنگ ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے :-

نغمۂ "اللہ ہو" میری رگ و پے میں ہے ۔۔۔ شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے

جب تک مسلم قوم اس نعرۂ توحید کو بلند کرتی ہے وہ کبھی دنیا سے نہیں مٹ سکتی :-

سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ ۔۔۔ مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ

اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل ۔۔۔ مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے

توحید کے اس سبق کو تازہ کر کے وہ ہمارے دل و دماغ کے بت خانوں کو توڑنا چاہتے ہیں :-

بندِ غیر اللہ را نتواں شکست ۔۔۔ تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے ۔۔۔ بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے

ان لوگوں کو جو موجودہ زمانے کی دہریت میں پھنس گئے ہوں وہ یہ پیغام دیتے ہیں :-

نفی بے اثبات مرگِ امتاں ۔۔۔ لا و الا ساز و برگِ امتاں

سوئے الا می خرامد کائنات ۔۔۔ در مقامِ لا نیاساید حیات

در محبت پختہ کے گردد خلیل ۔۔۔ تا نگردد لا سوئے الا دلیل

ہمارے ان موروثی مرشدوں کو جو اپنے خوش اعتقاد مریدوں کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے اپنے آباو اجداد کی کرامات سنایا کرتے ہیں اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے :-

نعرۂ لا پیش نمرودے بزن ۔۔۔ اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن

وحدتِ الٰہی کے ساتھ وہ وحدتِ ملت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں :-

رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما ۔۔۔ لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما

ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ ۔۔۔ ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ

در ضمیرش مدعا باید یکے ۔۔۔ قوم را اندیشہ ہا باید یکے

روشن از یک جلوہ ایں سیناستے ۔۔۔ ملت از یک رنگیٔ دلہاستے

نسلِ انسانی کو وہ اسی ایک اصول کے تحت ملا جلا دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وطن یا رنگ اور نسل پر فوقیت کی بنیاد کبھی پائدار نہیں ہو سکتی

با دو آب و گل پرستیدن کہ چہ ۔۔۔ اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ

بر نسب بنیادِ تعمیرِ امم ۔۔۔ با وطن وابستہ تقدیرِ امم

ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است ۔۔۔ ملت ما را اساسِ دیگر است

حکم او اندر تن و تن فانی است ۔۔۔ بر نسب نازاں شدن نادانی است

طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست ۔۔۔ مدعائے ما مآلِ ما یکیست

یک نما یک بیں یک اندیشیم ما ۔۔۔ تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما

یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم ۔۔۔ ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم

تعلیمِ خودی دوسری چیز جس پر اقبال نے اپنی تعلیم میں متواتر زور دیا ہے وہ خودی ہے اس کا سبق خود انھوں نے حدیث شریف "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" سے لیا۔

کہ با نورِ خودی بیند خدا را ۔۔۔ غلامِ ہمت آں خود پرستم

ان کے پاس ہماری پستی اور ذلت کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھول بیٹھے ہیں اور اپنی پوشیدہ قوتوں سے ناواقف ہیں اس پر وہ اس شد و مد کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ منکرِ خودی کو وہ منکرِ خدا سے بڑھ کر کافر سمجھتے ہیں :-

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است ۔۔۔ منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

اس احساسِ خودی کو وہ اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ اپنے کلام میں اس کو متعدد مرتبہ نظم کرنے کے علاوہ انھوں نے ایک پوری مثنوی اسرارِ خودی کی بنیاد ہی اس پر رکھی اور بتلایا کہ نظامِ عالم کی بنیاد ہی خودی پر ہے اور تسلسلِ حیات اسی پر منحصر ہے :-

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست — می کشاید قلزمے از جوئے زیست

ان کے نزدیک دنیا کی ساری مصیبتیں خودی کی موت کے باعث ہیں :-

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور — خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و نظام — خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر — قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

ان مایوس بندوں کو جو اپنی اندرونی طاقت کو کھو کر مستقبل سے مایوس ہو چکے ہیں اس سے بہتر کیا سبق سکھلایا جا سکتا ہے۔ ذیل کی نظم کا ہر لفظ لوحِ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے۔ اس کا پیغام دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہے۔

اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا — ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا — تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی — نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

عشق و عقل اقبال کا ایمانِ کامل ہے کہ انسان کی دو حیثیتیں ہیں جن کو وہ عشق اور عقل سے تعبیر کرتے ہیں لیکن جن کو ہم دل اور دماغ کے افعال سے واضح کر سکتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کی مساوی اہمیت نہیں۔ عشق کو وہ سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقل دل کے تابع رہ کر اپنا فعل انجام دے۔ ان کے نزدیک انسانوں کی اور خصوصاً اہلِ مغرب کی سب سے زیادہ گمراہی یہی ہے کہ وہ دل کو بالکل بھول بیٹھے ہیں اور صرف عقل و خرد میں ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ "پیامِ مشرق" کا مرکزی موضوع یہی ہے :-

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
آہ زاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختۂ — دانش اندوختۂ دل ز کف انداختۂ
حکمت و فلسفہ کارے است کہ پایانش نیست — سیلیٔ عشق و محبت بدبستاں نش نیست
طوف گلشن زدہ یک گل بہ گریبانش نیست — دشت و کہسار نوردید و غزالے نگرفت

ہماری بیماریوں کا علاج اسی میں ہے کہ عقل کی اس فسوں گری سے واقف ہوں اور اس کو عشق کا پرستار بنا دیں :-

چارہ ایں است کہ از عشق کشادے طلبیم — پیش او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم
اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست — نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

مقصد سفر ہے نہ کہ منزل اقبال کا سفر منت کشِ منزل نہیں ہے وہ صرف اس لئے اڑنا چاہتے ہیں کہ لذتِ پرواز حاصل کریں :-

لذتِ سیر است مقصودِ سفر — گر نگہ بر آشیاں داری مپر
زندگی جز لذتِ پرواز نیست — آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

وہ بحرِ بے پایاں میں تیرتے ہیں تو موتی کی خواہش ہے نہ کنارے پر پہنچنے کی :-

من اے دریائے بے پایاں بموجِ تو در افتادم — نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

منزل ان کے پاس صرف ایک سنگِ راہ ہے :-

من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم — کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

راستہ جس قدر زیادہ کٹھن ہو اسی قدر ان کو مرغوب ہے :-

مرا صاحب دلے ایں نکتہ آموخت — ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

وہ کھوئی ہوئی منزل کا دکھڑا نہیں روتے بلکہ اپنی زندگی اسی میں سمجھتے ہیں کہ چلتے رہیں

چو موج سازِ وجودم ز سیل بے پرواست — گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

بہتر سے بہتر کی تلاش ۔ اس دنیا میں وہ کسی مقصود کو حاصل کر کے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ بہتر سے بہتر کی تلاش انھیں سرگرداں لئے پھرتی ہے :-

تپش است زندگانی تپش است جاودانی — ہمہ ذرہ ہائے خاکم دلِ بے قرار بادا
نہ بجادۂ قرارش نہ بمنزلے مقامش — دلِ من مسافرِ من کہ خداش یار بادا

بہشت میں ایک حور جب ان سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے اور آشنائی کے طریقوں سے ناواقف ہیں۔ ان کی ہر سانس ایک سازِ جستجو ہے اور ہر غزل ایک سوزِ آرزو تو وہ کیا جواب دیتے ہیں ؟

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد — دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے — تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد — بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے — نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

وہ زندگی جس میں کشمکش نہ ہو بے لطف ہے ۔ اس زندگی کو جس میں کشمکش نہ ہو وہ بے لطف سمجھتے ہیں اور خود اپنی زندگی میں اس کا ثبوت دیتے ہیں ان کی شخصیت کا اعتبار کرتے اور جو شہرت انھوں نے حاصل کی تھی اس کے زیرِ اثر ان کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ عیش و آرام کی زندگی بسر کریں۔ وہ چاہتے تو قلمدانِ وزارت اور اس کے علاوہ سب کچھ ان کے قدموں پر ہوتا لیکن ان کے لئے ساحل پر سے تماشا دیکھنے میں کوئی لذت نہیں تھی وہ تو سمندر کی موجوں سے لڑنا چاہتے تھے :-

میا با بزم بر ساحل کہ آں جا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

بے درد زندگی کو وہ موت سمجھتے ہیں :-

کسے کو دردِ پنہانے ندارد — تنے دارد و لے جانے ندارد
اگر جانے ہوس داری طلب کن — تب و تابے کہ پایانے ندارد
دوامِ ما ز سوزِ ناتمام است — چو ماہی جز تپش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل — تپید یک دم و مرگِ دوام است

ان کا قول ہے کہ اگر حیات چاہتے ہو تو خطرہ میں جیو، یہ شراب جس قدر زیادہ کڑوی ہے اتنی ہی اچھی ہوتی ہے :-

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست — گفتا مئے کہ تلخ تر او نکوتر است
گفتم کہ شوق سیر نہ پرورش بہ منزلے — گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است

وہ تیر و سنان اور خنجر و شمشیر کا مقابلہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں :-

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست — با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

یہاں تک کہ اگر کعبہ کا راستہ بے خطر ہو تو وہ کعبہ کا سفر بھی نہیں کرنا چاہتے ۔

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است — سفر بہ کعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

آزادی، غلامی اور سرمایہ داری سے جنگ ۔ سوشیلزم

غلامی کو چاہے وہ کسی شکل میں ہو نوع انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں اور ہر انسان کو آزاد دیکھنے کے متمنی ہیں

نوع انساں کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے یہ — شاہ راہ فطرت اللہ میں ہی غارت گری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن — تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

آزاد اور محکوم کی حالتوں کا فرق ضرب کلیم میں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں :-

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور — محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

غلام انسانوں کو وہ کتوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں :-

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد — گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است — من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

جب وہ دیکھتے ہیں کہ :-

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

تو ان حاکموں کو وہ تنبیہ کرتے ہیں کہ :-

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

سرمایہ داری کے خلاف بھی انھوں نے مسلسل جنگ کی ہے اور مزدوروں کو ان کے حقوق سے خبردار کیا ہے :-

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول — غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

لینن Lenin کی زبان سے وہ حضورِ باری میں کہتے ہیں کہ :-

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

آرزوئے انقلاب ۔ اسی لئے انقلاب کی آرزو ہمیشہ ان کے سینے میں موجزن ہے، وہ اس دنیا کو بدل دینا چاہتے ہیں تاکہ اس خاکستر سے ایک نیا آدم پیدا کر سکیں :-

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

وہ دنیا کی حالت دیکھتے ہیں اور انقلاب انقلاب پکار اٹھتے ہیں :-

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب   از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن   اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب

انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام   آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

وہ اپنی آواز کو خدا تک پہنچاتے ہیں کہ اس نے یہہ کیا "حیرت خانۂ امروز و فردا" بنا رکھا ہے جس میں وہی "لعبت خاک" ہے جس کو اب بدل ڈالنا ہی بہتر ہے

یا مسلماں را بدہ فرماں کہ جاں برکف بنہ   یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں

یا چناں کن یا چنیں

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک   یا دگر ابلیس بہرِ امتحانِ عقل و دیں

یا چناں کن یا چنیں

یا جہانے تازۂ یا امتحانے تازۂ   می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں

یا چناں کن یا چنیں

یا کشش در سینۂ من آرزوئے انقلاب   یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں

فرنگی تمدن و تصورِ حیات کے خلاف جہاد

ایک تہائی صدی سے وہ فرنگی مادیت اور میکانی تصورِ حیات کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ بار بار وہ اس موضوع پر لوٹ آتے ہیں اور مختلف پہلوؤں سے اس کی برائیوں کو واضح کرتے ہیں :-

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے   حق یہہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہہ ظلمات

یہہ علم یہہ حکمت یہہ تدبر یہہ حکومت   پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس   کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم   حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت   احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

عصرِ حاضر کی حالت دیکھ کر حکیمِ یورپ سے وہ یہہ پوچھتے ہیں :-

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال   مرد بیکار و زن تہی آغوش ؟

کبھی وہ ہم کو آگاہ کرتے ہیں کہ :-

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اخوت   ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

کبھی فرنگیت کے خلاف فریاد کر اٹھتے ہیں:۔

فریاد ز افرنگ و دلاویزیٔ افرنگ　　فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ　　عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ　　معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

کبھی ہم سے کہتے ہیں کہ:۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی　　یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تو کبھی خود اہلِ یورپ کو ہوشیار کرتے ہیں کہ:۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا　　تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

مے خانۂ فرنگ کی حالت وہ اپنے مشاہدات کی بنا پر یوں بیان کرتے ہیں:۔

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ　　جامِ او روشن تر از آئینۂ اسکندر است　　جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل　　عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است

در ہوایش گرمیٔ یک آہِ بے تابانہ نیست　　رند ایں مے خانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

اپنی آخری مثنوی اقوامِ شرق میں وہ اس حقیقت کو اور زیادہ واضح کرتے ہیں:۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق　　باز روشن می شود ایامِ شرق　　یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد　　زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد

مشکلاتِ حضرتِ انساں از وست　　آدمیت را غمِ پنہاں از وست　　در نگاہش آدمی آب و گل است　　کاروانِ زندگی بے منزل است

مشرق میں سب کچھ ہے مغرب کی تقلید کی ضرورت نہیں

ان کے خیال میں ہمارے پاس شرق میں سب کچھ ہے۔ ہم کو مغرب کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ وہ ہم کو ہماری حقیقت سے آشنا اس طرح کراتے ہیں:۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا　　دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے　　راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو　　کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا　　ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا　　مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

ترکوں کو جب یورپ کی تقلید میں منہمک دیکھتے ہیں تو ان کو یاد دلاتے ہیں:۔

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترکِ عثمانی　　سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعرِ غریب　　سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا　　ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

ہمارے مقلدِ یورپ صورت گروں سے وہ اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:۔

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل　　ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی　　مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد　　کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی

معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات　　صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی　　فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے　　آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

جب ہم کو مغرب کے پیچھے آنکھ بند کر کے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو پوچھتے ہیں.

اے ترا حق خاتمِ اقوام کرد　　بر تو ہر آغاز را انجام کرد　　اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ　　اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ

اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو　　اے تماشا گاہِ عالم روئے تو　　ہمچو موج آتش تہ پا می روی　　تو کجا بہرِ تماشا میروی ؟

ان کا پیغام مغرب کا رہینِ منت نہیں ہے اگرچہ انھوں نے مغرب اور اس کے فلسفہ اور معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا لیکن نہ تو اپنی طرزِ زندگی میں اور نہ اپنے پیام میں وہ مغرب کے رہینِ منت ہیں۔ ان کا تخیل ٹھیٹ مشرقی بلکہ اسلامی ہے ان کی بلند فطرت اور شاعری اپنی آپ نظیر ہے:—

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں　　غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن　　کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

میانِ آب و گل خلوت گزیدم　　زِ افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم　　جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

تواں بے منت بیگانگاں سوخت　　نہ پنداری کہ من پروانہ کیشم
خود افروزم چراغِ راہِ خویشم

ان کا نغمہ ان ہی کے آب و گِل کا سرمایہ ہے:—

برکش آن نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست　　اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

انھیں معلوم تھا کہ یورپ کی حکمت اس راہِ عشق میں جس پر وہ گام زن تھے ان کی رہنما نہیں ہو سکتی اور چراغ کی مدد سے آفتاب کو نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ اس لئے وہ نورِ نظر حاصل کرنے کے لئے یورپ کی بجائے اہلِ دل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان پر مولانائے روم کا رنگ سب سے زیادہ غالب ہے:—

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن　　اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

پیغام قبول کرنے کی التجا اپنا پیام جب انھوں نے ہمارے سامنے پیش کر دیا تو وہ ہم سے التجا کرتے ہیں کہ اس کو قبول کریں:—

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم　　فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

خدا سے دعا کرتے ہیں:—

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

جوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:—

نوجوانِ خام سوزے سخنم تمام سوزے　　غزلے کہ می سرایم بتو ساز گار بادا

جہاں ہا دید از مشتِ گلِ من　　بیا سرمایہ گیر از حاصلِ من
غلط کردی رہِ سرِ منزل دوست　　دمے گم شو بصحرائے دلِ من

بعشوہ ہائے جوانانِ ماہ سیما چیست　　درآ بحلقۂ پیرے کہ دلبری داند
بیا بمجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش　　اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما　　اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام　　تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گذشت　　ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما
[illegible]　　[illegible] دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

اُن کی راہ نمائی ہماری کوششوں کو مرکز پر لانے کے لئے انھوں نے ہماری پوری رہنمائی کی ہے صرف ضرورت ہے کہ ہم ان کے پیام کو سمجھیں :-

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم　کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم　مخور ناداں غم از تاریکیٔ شبہا کہ می آید　کہ چوں نجم درخشاں داغ سیمائے کہ من دارم

اگر زمے کدۂ من پیالۂ گیری　زمشتِ خاک جہانے بیا توانی کرد　چساں بسینہ چراغے فروختنی اقبال　بخویش آنچہ توانی بما توانی کرد

مقصد کی تکمیل مشرق کی بیداری

شکر کا مقام ہے کہ اقبال نے اپنی زندگی ہی میں مشرق کو بیدار ہوتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے مقصد کی تکمیل کو زیادہ قریب محسوس کرنے لگے :-

اگرچہ تو ہے مثال زمانہ کم پیوند　ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی

وہ پرشکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند　تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے　تری نوا نے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند　جو کو کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو

ان کی آوازِ جرس نے ہم کو راستہ بتلا دیا جس پر چل کر ہم منزلِ مقصود کے قریب ہو رہے ہیں :-

عجم از نغمہ ام آتش بجان است　صدائے من درائے کاروان است　گل او شعلہ زار از نالۂ من　چو برق اندر نہادِ او فشادم

آئندہ کی امید

اس سے ان کو مستقبل درخشاں نظر آتا ہے اور وہ ہم کو مژدہ سناتے ہیں :-

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار　نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی　آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک　لینے گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز　اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی　آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں　محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

وہ نظر کھول کر دیکھتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ زندگی ایک نئی دنیا کی تعمیر کر رہی ہے :-

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم　چشمِ ہر ذرہ بہ انجم نگراں می بینم　دانہ را کہ بآغوشِ زمین است ہنوز　شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیرِ افلاک　بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم　خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند　جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود　ایں مے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود　آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت　آنچہ بالیست و نبود است ہماں خواہد بود

آں زمینے کہ بر و گریۂ خونیں زدہ ام　اشکِ من در جگرش لعلِ گراں خواہد بود　مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

ان کو احساس تھا کہ ابھی اُن کا کام ختم نہیں ہوا بہت کچھ کرنا باقی ہے :-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں　تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں　یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں　تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا　کہ تیرے زماں اور مکاں اور بھی ہیں

عجم کو انھوں نے پیام پہنچا دیا تھا لیکن اس کی حسرت تھی کہ عرب کو بھی پہنچا سکیں :-

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت　عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

ان کا پیغام ساری دنیا کے لئے ہے

بعض لوگوں کو یہہ شکایت ہے کہ اقبال نے اپنا پیام مسلمانوں تک محدود رکھا اور وہ مسلمانوں کو فرقہ بندی کی تعلیم دیتے تھے ۔ یہہ غلطی صرف ان کو ہو سکتی ہے جنھوں نے سطحی نظر سے اقبال کے کلام کو دیکھا ہے ۔ خود اقبال نے اس کا جواب پروفیسر نکلسن کے نام مکتوبہ خط میں دیا ہے جس کو پروفیسر موصوف نے اپنے ترجمۂ اسرار خودی کے ساتھ طبع کیا ہے ۔ اس کی حقیقت ان بے شمار بیانوں سے واضح ہو سکتی ہے جو اقبال کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی ڈاکٹر ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ نے دئے ہیں ۔ لیکن ہم کو ان خارجی شہادتوں کی ضرورت نہیں ۔ ہم خود ان کے کلام سے اس کا ثبوت دے سکتے ہیں :-

سر سیّد کی لوحِ تربت سے ان کو آواز آتی ہے :-

دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تحریر سے
وصل کے ساماں پیدا ہوں تری تقریر سے
دانہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی
دیکھ اپنوں میں کہیں پیدا نہ ہو بیگانگی

فرقہ واری خیالات پیدا کرنے والوں کے خلاف وہ بارگاہِ رسالت میں نالاں ہوتے ہیں :-

مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں
خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں
یہہ تعصب کو مگر گھر کا دیا کہتے ہیں
لاکھ اقوام کو دنیا میں اجاڑا اس نے
دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں
بغض للّٰہ کے پردے میں عداوت ذاتی

وہ اسلام کی حقیقت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا میں بھائی چارہ ہو جائے

نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی

وہ کسی خاص حصۂ زمین سے تعلق نہیں رکھنا چاہتے :-

نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

اپنے فرزند جاوید کو وہ نصیحت کرتے ہیں کہ :-

باخبر شو از مقامِ آدمی
آدمیت احترامِ آدمی
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است
حرف بد را بر لب آوردن خطا است
می شود بر کافر و مومن شفیق
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
بر طریقِ دوستی گامے بزن
آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن
ایں ہمہ آفاق آفاق دل است
گرچہ دل زندانیٔ آب و گل است

کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم
چمن زاریم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم

ان کو گھر اور منزل کی ضرورت نہیں تھی ہر ملک کو وہ اپنا ملک سمجھتے ہیں کیونکہ وہ خدا کا ملک ہے :-

سرِ راہم غریب ہر دیارم
ہوائے خانہ و منزل نہ دارم

دنیا کا ہر واقعہ ان کے دل پر اثر کرتا ہے ۔ حکیم آئن سٹائن نظریہ اضافیت کا انکشاف کرتا ہے تو وہ اس کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں ۔ بلشویکِ روس کے انقلاب کرنے والوں کو وہ نصیحت کرتے ہیں کہ لامذہب کی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اٹلی جب ابی سینیا پر زبردستی قبضہ کر لیتا ہے تو پیرِ کلیسا کو اس کی حقیقت کی خبر دیتے ہیں جب اقوام ... ایک انجمن بن کر رہ جاتی ہے

تو وہ ایک نئی جمعیت آدم کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں :۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام　　پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہہ پیغام　　جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم ؟

ہندوستان کی آزادی اور اتحاد۔ ہندوستان کی آزادی کی اس جدوجہد میں ان کی ابتدائی نظموں ہمالہ ہندوستان ہمارا نیا شوالہ ہمارا دیس میرا وطن اور صدائے درد کا جو حصہ ہے وہ سب جانتے ہیں لیکن کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اپنی آخری مثنوی اقوام شرق میں بھی وہ ہمارے باہمی اختلاف پر آنسو بہاتے ہیں اور غلامی کی لعنت کو آزادی سے بدلنے کی تلقین کرتے ہیں :۔

اے ہمالہ اے　　اے رود گنگ　　زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب　　نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر　　خشت ما سرمایۂ تعمیرِ غیر
زندگانی بر مرادِ دیگراں　　جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں
ہندیاں با یک دگر آویختند　　فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں　　ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب　　انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

یہہ کام انھوں نے نام و نمود کے لئے نہیں کیا۔ بے نیازی اور استغنا اس کام سے ان کا مقصد نہ کسبِ زر تھا نہ نام و نمود انھیں نہ تو لیڈری کی خواہش تھی نہ بلند مراتب کی آرزو۔ ان کا سر کسی آستانِ شاہی پر کبھی خم نہیں ہوا ان کو مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن خوشامد کی بجائے انھوں نے ان حاکموں کو یہی نصیحت کی کہ :۔

سروری در دینِ ما خدمت گری است　　عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است

ان کی بے نیازی اور استغنا کا یہہ حال تھا کہ انھیں ٹوٹ جانا پسند تھا لیکن کسی سے مومیائی نہیں مانگ سکتے تھے۔ ان کی خودداری وہ تھی کہ عین دریا میں وہ پیمانہ الٹ دیتے ہیں۔ اس طویل بیماری میں بھی نہ تو افراد سے اور نہ انجمنوں سے روپے پیسے کا کوئی تحفہ قبول کیا۔ گذشتہ یومِ اقبال کے سلسلے میں جب ان کو ایک چک بھیجا گیا تو انھوں نے یہہ کہہ کر واپس کر دیا کہ شاید آپ لوگوں نے مجھے نہیں سمجھا۔

عالی ہمتی اسی کے ساتھ اُن کی بلند ہمتی یہہ تھی کہ وہ زمین سے نہیں آسمان سے اپنی خوراک تلاش کرنا چاہتے ہیں :۔

قبائے زندگانی چاک تا کے　　چو موراں آشیاں در خاک تا کے
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز　　تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے

وہ ان لوگوں کی ہمت کے غلام ہیں جو ستاروں کو اپنی گرہ میں باندھتے ہیں وہ جبریل کا نہیں یزداں کا شکار کرنا چاہتے ہیں :۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

ان کے سینے میں اس قدر طاقت ہے کہ وہ خدا کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر خدائی کی محنت سے تھک گیا ہے تو ان کے سینے میں آرام لے :۔

در سینۂ من دمے بیاسائے　　از محنت و کلفتِ خدائی

تن من دھن جان و مال سے محبت رکھنے والوں کو تن من دھن کی حقیقت اس سے بہتر کون سمجھا سکتا ہے وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ اقبال صرف مشکل گو تھے اس کو غور سے سنیں۔ یہہ ان کے آخری وقت کا کلام ہے :۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق — تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج — من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے تو من تیرا نہ تن

دعائے مغفرت ہم نے اقبال کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈال کر دیکھا ہے کہ وہ کس شخصیت کے حامل تھے اور ان کا پیام کس فرشتہ کی صدا ہے جوں جوں دن گذرتے جائیں گے ہمیں معلوم ہوتا جائے گا کہ انھوں نے اس دنیا میں کیا انقلاب کیا۔

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند — جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ حق آگاہے

فی الحال ہمارے لئے یہی فرض رہ جاتا ہے کہ خود ان کی زبان سے ان کے لئے دعا کریں :۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر — خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

رضی الدین صدیقی

امت کا شب چراغ

جس رہ نوردِ شوق کو منزل سے عار تھا
جس موجِ بے قرار کو ساحل سے عار تھا

کس کی نظر نے اس کو نظر بند کر دیا
اس برقِ جاں نواز کو پابند کر دیا

شعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا
امت کا شب چراغ اُجالے میں کھو گیا

مخدوم محی الدین

اقبالؒ

دلوں کی وادیوں میں پھول برساتا ہوا آیا
حجازی "لے" میں نغمہ ہند کا گاتا ہوا آیا

کہا لبیک اس کے شعر پر کلیوں نے ہنس ہنس کے
نسیمِ صبح کی مانند اٹھلاتا ہوا آیا

بہارِ لالہ و گل اس کی فطرت کا تھا آئینہ
وہ بوئے گل سے ہر وادی کو مہکاتا ہوا آیا

وہ شاعر جس کے نطقِ شعر کا احساں ہے اُردو پر
ادب کی زلفِ ژولیدہ کو سلجھاتا ہوا آیا

جو باتیں رہ گئی تھیں فکرِ عطارؔ و سنائیؔ سے
اُن ہی باتوں کی وہ تکمیل فرماتا ہوا آیا

شرابِ ساقیٔ رومیؔ سے بدمستِ خودی ہو کر
فضائے ہند پر اک کیف برساتا ہوا آیا

نظر آزاد، دل بے باک، فکر و ذہن بے پایاں
خودی کا پرچمِ رنگین لہراتا ہوا آیا

ہوا نازل زمینِ ہند پر "بانگِ درا" بن کر
وہ آیا اور ہر سوتے کو چونکاتا ہوا آیا

قلندر کی زباں میں اس نے دی تعلیمِ آزادی
مجاہد کی طرح تلوار چمکاتا ہوا آیا

کہا اس نے کہ ہے عجزِ غلامی موت انساں کی
وہ سینوں میں خودی کی آگ بھڑکاتا ہوا آیا

کہا اس نے امیری بے فقیری ہو نہیں سکتی
وہ جبر و ظلم کی طاقت کو ٹھکراتا ہوا آیا

کلیمی ضرب کی تاثیر تھی اس کے تکلم میں
وہ ہر فرعون کی قوت سے ٹکراتا ہوا آیا

کہا اس نے مسلماں موت سے ڈرتا نہیں ہرگز
فسانہ حضرتِ ٹیپوؒ کا دہراتا ہوا آیا

"خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"
وہ ان اسرار کو شعروں میں سمجھاتا ہوا آیا

وہ شاعر، مردِ خود آگاہ، تہذیبِ فرنگی کو
حجازی تیغ کا آئینہ دکھلاتا ہوا آیا

وہ دل جو برف کے ٹکڑوں سے بھی بڑھ کر فسردہ تھے
وہ ان کو بادۂ الفت سے گرماتا ہوا آیا

جبیں میں اس کی رخشاں تھا جلالِ شانِ فاروقیؓ
غلامی کی فضا میں گرچہ شرماتا ہوا آیا

دیا پیغام اسلامی اخوت کا زمانے میں
جہاں میں زندگی کی روح دوڑاتا ہوا آیا

وہ آتش جس کے سینے میں ہو گرمی سوزِ طارق کی
اسی سے دل کے خاکستر کو گرماتا ہوا آیا

دیا تھا جو پیامِ زندگی نطقِ محمدؐ نے
اسی پیغام کو اقبالؔ دہراتا ہوا آیا

ماہر القادری

کچھ نذر کو لائے ہیں مرے دیدۂ تر بھی

قابل انشا پردازوں نے اقبال کی بے وقت موت پر اخباری دنیا کے لئے کافی مسالہ فراہم کر دیا ہے۔ کالم کے کالم اس کے ماتم میں سیاہ ہو چکے ہیں۔ آج گھر گھر اس کا تذکرہ ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اس سانحہ کے افسوس کا اظہار۔ کتنے دل ایسے ہیں جن میں اس کا دکھ پنہاں ہے۔ وہ کتنا خوش نصیب ہے جس کے اتنے رونے والے ہیں۔ یہہ غریبوں کا مجازی بھگوان کس قدر جلد اپنے خدائے حقیقی سے جا ملا۔

۲۱ اپریل تاریخ عالم کا وہ حسرتناک دن ہے جس نے مشرق کے ادبی افق سے رنگینی چھین لی۔ فضائے شاعری سے کشش مفقود ہو گئی جس نے ان گنت اور بے حساب دلوں کو اپنا بنا لیا تھا۔ تسخیر قلوب جس کی شاعری کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس کی موت نے سب کی آنکھیں کھول دیں۔ خبر مرگ نے ایک بیکس کی آہ کی طرح جگر کو چھلنی کر دیا۔ شاعری کی دیوی اندھی ہو گئی، حقیقت افسانہ بن گئی۔ واقعی اس مقولہ میں کتنی قوت ہے، کتنا جادو ہے :—

”ایک ہونہار ادیب یا شاعر کی موت دنیائے ادب کی موت ہے!!“

وہ شوریدہ سری، وہ طوفان و ہیجان، وہ تلاطم خیزیاں، وہ جوش و خروش جو اقبال کے قلم اور دماغ کا نتیجہ تھیں — قائم تو رہیں گی جب تک دنیا قائم ہے۔ لیکن ان کا تسلسل ختم ہو گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم۔ عرفان و فلسفہ پر اداسی چھا گئی، اب مردہ قوموں میں زندگی کی لہر دوڑانے والا شاید کوئی نہیں رہا۔ اقبال کی شاعری قومی شاعری تھی۔ اس کا دائرۂ عمل اپنے ہی تک محدود نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے لئے زندہ تھا شاید یہہ ٹھیک ہی ہے ؎

مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جئے
جیتا ہے وہ جو مر چکا انسان کے لئے

اقبال کی موت ایک فلسفہ ہے جس کو سوچنے اور اس پر سر دھننے سے دماغ نکمّا ہو جاتا ہے۔ اقبال کو موت سے وابستہ کرنے میں دل پس و پیش کرتا ہے۔ یقین کی حس ساکت و صامت ہو جاتی ہے۔ شاید زندگی کا لطف اسی میں ہے کہ انسان آئے اور چلے جائے۔ ابدی زندگی کس کام کی — سوا سو برس جینے کی لوگ دعا دیتے ہیں — اُف کتنی بد دعا دیتے ہیں — خیال کرنے سے وحشت ہوتی ہے اور فوراً زبان سے ”خدا نہ کرے“ نکل جاتا ہے — ۶۰ - ۷۰ برس ہی کتنے بہت ہیں۔ خضرؑ کیا کر رہے ہیں نہیں معلوم زندہ رہ کر اتنے زمانے سے —

”ابدی زندگی“ انھیں نصیب ہے!!

تخیل — زندگی کے متعلق ایک خیالی دنیا — جس میں علو ہمتی ہو اولوالعزمی ہو، ہمت و حوصلہ، وجدان و کیف ہو۔ اسی کا نام شاید تخیل ہے۔ اور اقبال ان محسوسات شاعری کا ناخدا تھا۔ بجھی ہوئی خاموش طبیعت کو اکسانے والی قوتیں اس کے قلم میں چھپی ہوئی تھیں جس کو ایسے ایسے جادو جگانے یاد تھے کہ بس دنیا جانتی ہے۔

اس کا ”شکوہ“ ایک بچے کا اظہار ہے — وہ زبان جو شکوہ پر تلی تو اللہ کو بھی اس نے نہ چھوڑا اور پھر خدا کی شان اللہ ہی کی

زبان لے لی اور اسی شکوہ کا وہ دنداں شکن جواب دیا کہ جیسے خدا خود بول رہا ہے شکوہ میں اس نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی خوب ہی بھڑاس نک
اللہ کو پناہ بخدا " ہرجائی" ٹھہرایا ــــــ اس پردۂ ناز کو بھی تاز ہو گیا۔ اس کے نالۂ بیباک نے آسمانوں کو چیر دیا افلاک کے جگر چاک ہو گئے
پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی بولے سیارے سر عرش بریں ہے کوئی چاند کہتا تھا نہیں اہل زمیں ہے کوئی کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوہ کو تو رضواں سمجھا مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

اللہ کی زبان میں کتنی مٹھاس بھر دی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

"جواب شکوہ" میں انسانی زندگی کے لئے عمل کا سبق ملتا ہے۔ وہ جو کہہ دیا ہے ناکسی نے "کوشش کرنے سے خدا ملتا ہے" اقبال اس مقولے
رگ رگ پر حاوی ہے۔ وہ قوتوں کو حرکت میں لانے کے لئے بے چین ہے۔ اور قوتیں رکھنے والوں کو بے چین و مضطرب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس
جمود و سکوت ناپسند ہیں۔ اس کے الفاظ میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے اشعار کے بے پایاں دریا سے ان موتیوں کا اقتباس ستار
گننے کے مشغلے سے کم نہیں۔

اقبال کی شاعری نے ایک عالم گیر ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔ بلاشبہ اقبال پر بعض اوقات غالب کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ اس نوع سے زند
غالب تھے۔ آج یہہ محسوس ہوتا ہے کہ صرف اقبال ہی نہیں بلکہ غالب بھی دنیا سے چل بسے۔

اقبال کی شاعری جھوٹے ڈھکوسلوں اور نسائی ناچاریوں سے قطعاً بے نیاز ہے۔ اقبال، میر کی طرح سرہانے آہستہ بولنے کی است
نہیں کرتا۔ روتے روتے ابھی آنکھ لگنے کا اس کو گلہ نہیں بلکہ اس کے یہاں کی دہوم دھام یوں ہے ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

فرانس کا سب سے بڑا مفکر و ادیب روسو کہتا ہے:۔

"ہر ادبی کارنامہ انسان کا ذہنی شاہکار ہے"!

خیال تو کیجئے اقبال نے ایسے کتنے شہ کار چھوڑے ہیں جن کا ٹھکانا نہیں ــــ جو بجائے خود ایک گلدستۂ ادب ہے۔ "بانگ درا" میں اقبال ایک
ڈھونڈنے والے کی طرح بے چین ہے۔ اور بال جبریل میں ایک پانے والے کی طرح مطمئن۔ بانگ درا زیادہ تر رنگ ہے اور بال جبریل تمام
یہہ وہ الفاظ ہیں جو خود نے اقبال کے لئے لکھے ہیں۔ اور شاید اس سے بہتر تشریح نہیں ہو سکتی ــــ احساس خودی اور سخت کوشی یہہ اقبال
پیام کے دو اہم اجزا ہیں۔ وہ اپنے نظریوں کی بالکل آزادانہ تبلیغ کر رہا تھا ــــ کہ زندگی ختم ہو گئی فلسفہ منہ ہی تکتا رہ گیا۔ اقبال ایک
سچے آدمی کی طرح اپنے طرز کلام میں صاف اور بے باک ہے۔ جوش و خروش ہی تو اس کے یہاں اہمیت رکھتے ہیں۔ اور انھیں کا یہاں پلہ بھا
اقبال کا نظریہ تھا کہ حرکت زندگی ہے اور سکون موت ؎

ناصبوری ہے زندگی دل کی آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

کسی کا خیال ہے کہ زندگی ایک معمہ ہے "سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" لیکن جن کے بازوؤں میں قوت ہے اور جوش ہمت ان کے
نزدیک ایک معمولی کھیل

اقبال عشق کو دنیا کی سب سے بڑی قوت اور حیاتِ انسانی کی سب سے اہم ضرورت خیال کرتا ہے ؎

جہانِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

ی کی بدولت منصور " انا الحق " کے نعرے لگاتا ہوا اللہ کا قربِ حاصل کرتا ہے۔ اسی کے طفیل موسیٰ کلیم اللہ بن جاتے ہیں۔ پریم کا رس ہر
ول میں میٹھاس پیدا کرتا ہے ؎ تھا ارنی گو کلیم میں ارنی گو نہیں اس کو تقاضا روا مجھ پہ تقاضا حرام

رے شیشے میں مے باقی نہیں ہے بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں ہے

رونے دھونے بسورنے گڑگڑانے کی جگہ اقبال کے یہاں ہمت افزا خیالات ہیں، حوصلہ افزا تخیلات ہیں۔ ایک نیا شعور، ایک نئی ذہنیت سے اس
کی شاعری معمور ہے۔ سچے کاوش اور تلاش جمالیات کا مذاقِ سلیم اس کے قلم کی روح رواں ہے۔ اقبال کی غزلیں اردو شاعری میں انقلاب کا اثر
کھتی ہیں۔ اس کے یہاں وہی حسن و عشق، ساقی و صہبا، رندے ہوئے خیالات مہمل الفاظ کا گورکھ دھندا مفقود ہے۔ اس کا ذہن ہمیشہ اپنے مستقبل کو سمجھنے
کی کوشش میں محو رہتا تھا۔ بالِ جبریل ایک کہن سال بزرگ کی فریاد ہے اس میں شاعری کا زورِ بیان ہے۔ خیالات کے دھندلے نقوش شوخ ہو گئے ہیں۔ پہلے
باتیں رمز و کنایہ میں کہی تھیں وہ اس میں صاف صاف اور برملا بے دھڑک کہہ دی ہیں۔ بانگِ درا میں مناظرِ قدرت کا ڈھیر ہے طفلانہ چشمک ہے " ماہِ نو "
رِ قیامت کے الفاظ ہیں :- ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

ہ تشبیہہ و استعارے کی سرگرمیاں ہیں۔ " تصویرِ درد " کے لفظ لفظ سے درد و الم آشکارا ہے یہ خود ایک درد و غم کی تصویر ہے۔

رے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

لا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

ا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے لے کہ اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

ھ بالِ جبریل سے تغزل کی تمثیلیں :-

تاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں اگر کھو گیا اک نشیمن تو غم کیا مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

ہ اشعار حقائق پر کس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ دماغ کو سوچنے اور غور کرنے کا ایک پرکیف مشغلہ مل جاتا ہے ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

رض بعض کوتاہ بینوں کا یہ نظریہ ہے کہ اقبال کے یہاں تغزل نہیں۔ ایسی ذہنیتیں شاید موسیقی کے فن اور سُر سے ناواقف ہیں۔ بہرکیف ؎

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا

جہاں بانو بیگم

اقبال سے

(ایسے سوالات جو منت کشِ جواب نہ ہوے)

مدت سے تمنا تھی کہ لاہور کو جاؤں
قدموں پہ سر اقبال کے میں سر کو جھکاؤں

رُو رُو کے کروں عرض کہ اے رہبرِ ملت!
کہنے کی اجازت ہو تو کچھ اپنی سناؤں

تعلیم تری اور ہے، یاں رنگِ جہاں اور
فطرت کو ہلاکت سے میں کس طرح بچاؤں

یہہ جرات دل، جرم نہیں، خاورِ مشرق'!
ذرّہ کو بھی حسرت ہے کہ خورشید کو پاؤں

زنجیرِ توہّم میں مقید ہے تمدّن
اور روح کی خواہش ہے کہ شورش سی بچاؤں

فطرت کے خزانوں سے عطا کی گئی مجھ کو
یہہ قوتِ پرواز کے اڑنے بھی نہ پاؤں

رونے کا یہاں نام ہے کمزوریٔ فطرت
فرما کہ تڑپ دل کی میں کس طرح چھپاؤں

سب کہتے ہیں اندازِ جنوں ہیں یہہ نرالے
تو کہہ کہ کھلیں پھول میں آنسو نہ بہاؤں

یاں سجدۂ بیتاب سے ہوتا ہے گماں اور
کیا حسنِ شفق دیکھ کے میں سر نہ جھکاؤں

تڑپاتے ہیں کہسار و بیاباں کے نظارے
ساکت ہو قمر اور میں دریا پہ نہ جاؤں

بن دیکھے کسی چیز کا قائل نہیں کوئی
دودِ تپشِ داغِ جگر کس کو دکھاؤں

فریاد ہے اے داغِ جگر پالنے والے
کیونکر غمِ ہستی سے میں ہستی کو بچاؤں

یہہ آب وہوا وجہہ پریشانیٔ دل ہے
فرما کہ تباہی سے یہہ دل کیسے بچاؤں

ہیں منتظرِ ساعتِ اظہارِ تمنّا
اور پیرِ فلک تاک میں یہہ راز نہ پاؤں

آئی یہ خبر! اُٹھ گیا مسلم کا سہارا
اور امتِ مرحومؒ کا اقبال سدہارا

اک برقِ اجل سوز گری خرمنِ دل پر
اے کوہِ الم ٹوٹ کہ رونے بھی نہ پاؤں

تاریکیٔ شب چھا گئی رخصت ہوا خورشید
سایہ بھی گیا قوم کے سر سے گئی چھاؤں

یہہ درد نہ ہوگا کبھی منت کشِ درماں
وہ دولتِ نایاب کہاں ڈھونڈنے جاؤں

فطرت یہہ سدا جس کی پرستار رہی ہے
قسمت میں یہہ تھا شرفِ تکلم بھی نہ پاؤں

جذباتِ تجسس رہے ناکام سراسر
قدرت کا یہہ مقصد تھا کہ تسکین نہ پاؤں

اُس تک نہ گئی جب یہہ صدائے دلِ محزوں
اللہ نہ کرے میں کبھی لاہور کو جاؤں

بشیر النساء بیگم بشیر

اقبال اور اس کی شاعری

دنیائے ادب میں اقبال کی شخصیت ممتاز ہی نہیں عدیم النظیر بھی ہے اور اس کی شاعری بہ لحاظ ادبیت وخیالات اردو وفارسی کا وہ نایاب خزانہ ہے جس پر مشرق صدیوں تک ناز کرتا رہے گا۔

اقبال نے غالب کو جائز طور پر یوں سراہا ہے۔

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر — محو حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر — خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں — ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں — آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزئ پروانہ ہے

اور غالباً غالب کے بعد ہی اقبال کو گیسوئے اردو کو سنوارنے کا خیال خاص طور پر پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے خیال کو اس کمال سے عمل کا جامہ پہنایا کہ نقل کو اصل سے بھی بڑھا دیا۔ خدا جانے ہندوستانیوں کی کونسی نیکی خدا کو بھائی اور اس طرح آڑے وقتوں میں کام آئی کہ جب غالب نے بزم شاعری کو الوداع کہا اور دنیائے ادب اس مہر درخشاں کی ضوفشانیوں سے محروم ہو کر شب تار بن گئی تو عین اس وقت افقِ شاعری پر ایک اور درخشاں ستارہ نمودار ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے ماہتاب اور پھر آفتابِ عالم تاب کی صورت اختیار کی اور اپنی ضیاباریوں سے دوبارہ دنیائے شاعری کے ذرے ذرے کو جگمگا دیا۔

مہر عبد القادر اقبال کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے۔ اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

روح غالب نے جسد اقبال میں جنم لیا ہو یا نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب و اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ غالب اور اقبال دونوں نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ غالب نے اپنی غزلیات کا بہت سا حصہ حذف کر دیا اور ظن غالب ہے کہ اقبال کی غزلوں کی بھی ایک خاص تعداد منظرِ عام پر نہ آسکی۔ شکوہِ الفاظ، فارسی بندشیں، دلکش ترکیبیں، عمقِ خیال اور پروازِ تخیل ان دونوں کا سرمایۂ امتیاز ہے۔ اقبال کے کلام میں بھی اس جستجو کی ایک جھلک موجود ہے جس کی تپش سے کلام غالب سراپا سوز ہے اور جس کی توضیح اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے

" دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے بن کے سوز زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے"

پہلے پہل اقبال کی شاعری کی ابتدا غزلوں سے ہوئی جس میں کیف عشق بھی تھا اور ثنائے حسن بھی۔ جن میں اول اول داغ کا رنگ نمایاں تھا جیسے۔

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

لیکن یہ رنگ داغ کی استادی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور اب اقبال کے کلام پر غالب کا رنگ غالب تھا جیسے (بطرز سہل الممتنع)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

(یا)

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

وہ میکش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراق ساقئ نامہرباں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بے تابی سو میرے آشیاں تک ہے

جرس ہوں نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقت رحیل کارواں تک ہے

سکون دل سے سامان کشود کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطر گرداب کا آب رواں تک ہے

چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندئ رسم فغاں تک ہے

اقبال کی اس تقلیدی شاعری میں بھی ان کا کمال فن نظر آتا ہے۔ طرز نگارش اور اسلوب بیان سے قطع نظر اقبال کی شاعری نے خیالات اور رجحانات کے لحاظ سے بھی کئی پلٹے کھائے ہیں۔ دنیائے رنگ و بو اور عالم حسن و عشق سے باہر بھی کچھ ایسے اسباب دلکشی موجود تھے جنھوں نے بہت جلد نوجوان شاعر کے فلک پیما تخیل کو مسحور کر لیا اور اب اقبال نے اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھنی شروع کیں جن میں کبھی حالی کا رنگ جھلکتا ہے تو کبھی اکبر الہ آبادی کا۔

حالی کا رنگ

زہد و رندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی — تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی — منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے — تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا — گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا — ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا — تفضیل علیؑ ہم نے سنی اس کی زبانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی — ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے — یہ آپ کا حق تھا زرہ قرب مکانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو (یا) — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اکبر کا رنگ

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اس قبیل کی اصلاحی نظموں کے علاوہ اقبال کی شاعری کے اس دور میں فطری اور وطنی نظمیں بھی بکثرت ہیں جن میں ہمالہ۔ گل رنگیں۔ جگنو۔ کنار راوی۔ صبح کا ستارہ۔ چاند۔ ابر کہسار۔ پرندہ اور جگنو۔ بچہ اور شمع۔ نیا شوالہ۔ آفتاب صبح خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک حصہ موضوعی نظموں کا بھی ہے جو مغربی شعرا سے ماخوذ ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ بھی اتنا مکمل اور

پاکیزہ ہے اور مغربی خیالات مشرقی انداز میں اس حسن سے سموئے گئے ہیں کہ درحقیقت آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان نظموں میں بھی اکثر نظمیں جیسے ایک پہاڑ اور گلہری۔ ہمدردی۔ بچے کی دعا۔ پرندے کی فریاد وغیرہ صرف مشہور ہی نہیں بلکہ زبان زدِ خاص و عام ہو چکی ہیں۔

اقبال کی شاعری قصیدہ اور ہجو دونوں سے پاک ہے۔ اقبال نے کبھی صاحبانِ زر و اربابِ اثر کی مدح سرائی نہیں کی نہ کبھی ہجو گوئی سے اپنے کلکِ اعجاز رقم کے وقار کو گھٹایا۔ ہاں اس کی شاعری کا پہلا دور بارگاہ خداوندی کی ایک برگزیدہ ہستی حضرت نظام الدینؒ کی عقیدت مندانہ منقبت پر ختم ہوتا ہے جو نہ صرف جذباتِ عقیدت اور تاثراتِ مودت کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں اقبال کا کردار ان اشعار میں بے نقاب ہوتا ہے ؎

نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں — کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور پیامِ محبت سناتا ہے۔ قیامِ یورپ میں اقبال نے فارسی پر بہت توجہ صرف کی تھی اور شاعری کے لئے فارسی کے میدان کو بہ نسبت اردو کے کہیں زیادہ وسیع پایا۔ اس کے علاوہ ہزار ہا نئی بنائی دلکش ترکیبیں اور صدہا خوبصورت جملے ایسے ملے جو اردو میں عنقا تھے۔ اور چونکہ اسے اپنی قوت فارسی گوئی کے امتحان کا موقع بھی یہیں ملا لہٰذا وہ اب ہمہ تن فارسی گوئی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اسی زمانے میں علمی سند کے حصول کے لئے اس نے فلسفۂ ایران کا گہرا مطالعہ کیا اور یقیناً اسی ضمن میں وہ فلسفۂ تصوف سے بھی روشناس ہو چکا تھا یہی سبب ہے کہ اس دور کے کلام میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور شاعر متصوفین کی طرح ذرہ ذرہ میں حسنِ حقیقی کا جلوہ ڈھونڈتا نظر آتا ہے اور دنیا کو رازِ محبت اور حقیقتِ جستجو سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ ؎

(۱)

انسان کو راز جو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا — بے تاب ہے ذوقِ آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے — آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

(۲)

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب — پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
آہ! موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں — خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

کبھی شاعر جستجوئے حقیقت میں مطمئن بھی نظر آتا ہے ؎

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا — بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے
تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ — چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

فلسفۂ مغرب و علومِ جدیدہ میں متلاشئ حقیقت شاعر کو تسکینِ قلب حاصل نہیں ہوتی اور وہ اپنی بے اعتقادی کو اسی دور سے ظاہر کرنا شروع کرتا ہے جو آج تک اس کے کلام میں جاری و ساری ہے۔ ؎

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر — اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزمِ کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

مارچ ۱۹۰۷ء کی اس غزل میں اقبال کے خیالات قابلِ غور ہیں۔ یہ چند اشعار اس کے مطمحِ نظر کے انقلاب کو ظاہر کرتے ہیں۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

(۳) اقبال کی قومی شاعری کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے۔ چنانچہ قومی نظموں میں اقبال کی اکثر نظمیں بلحاظ سوز و گداز۔ درد و اثر اور جذبۂ قومی اتنی بلند و بالا اور عظیم المرتبت ہیں کہ الہامی معلوم ہوتی ہیں۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، خضرِ راہ، علوم اسلام۔ اقبال کی معرکۃ الآراء نظمیں ہیں جو درحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ان کے علاوہ مسلم، وطنیت، ترانۂ ملی وغیرہ بھی ایسی نظمیں ہیں جو بجا طور پر اقبال کے قلم کا اعجاز ہیں۔

اقبال کی ہر قومی نظم جذبۂ قومی میں ڈوبی ہوئی اور تاثراتِ قلبی سے مملو نظر آتی ہے۔

(۴) اسی دورِ شاعری یا قیامِ مغرب کے زمانے میں اقبال نے یورپ کے اکثر علما، حکما، اور شعرا کے خیال، پیام، اور فلسفہ کا بغور مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کے بعد اس کی طبیعت پر بہت اچھے اثرات مترتب ہوئے اور خود اس کی شاعری میں ایک خاص پیام اور فلسفہ نظر آنے لگا۔

اقبال کی شاعری اب ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے جو تقریباً ۱۹۰۷ء سے لے کر آج تک کم و بیش اس کے کلام میں پایا جاتا ہے۔

اقبال کا یہ جدید رنگ اس کو ایک خاص امتیاز بخشتا ہے جس کے بغیر اس کے حقیقی جوہر نہ کھل سکتے اور اس کے شدید جذبات کی حقیقی نمایندگی اور اس کے تاثرات کی سچی ترجمانی نہ ہو سکتی تھی۔ قومی شاعری میں وہ سب سے پہلے اس تڑپ کو ظاہر کرتا ہے جو ملتِ بیضا کے لئے اس کے دل میں ہے۔ اور اس کا مقصد ملت کے مضمحل قویٰ اور نیم مردہ عروق میں ایک تازہ زندگی کی رو اور قومی اخلاق اور ادبیات میں نشاۃ جدید کا پیدا کرنا ہے۔ مگر وہ اس حیاتِ جدید کو مغربی رنگ کی کورانہ تقلید سے بھی بچانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشاہیرِ اسلام اور اسلاف کا بار بار ذکر کرتا ہے اور ان کے محاسن و کردار کی مثالیں دے دے کر مسلمانوں کی سوئی ہوئی طاقتوں کو جگاتا ہے۔ اقبال کی اس دور کی شاعری کا ایک سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کا شاعرانہ وجدان حسن و عشق کے آئین مضمون آفرینی اور اظہارِ بیان کے رسمی قیود سے آزاد ہے۔ بلحاظ شاعر کے وہ دل دادگانِ خال و خط کے اس زمرہ میں محدود نہیں ہے جو سویدائے سیرِ عدم دیکھتے ہیں۔ وہ ایک فلسفی شاعر ہونے کی حیثیت سے عالم و مافی العالم کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا شاعرانہ وجدان اور طرزِ بیان اسی لئے ایک خاص قدرت رکھتا ہے۔

اقبال کے شاعرانہ وجدان کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی پرجوش اور طوفان خیز موجوں میں تلخیِ خیال اور پیام عمل بھی ہے اور جس کی گہرائیوں میں زندگی کے ارتقا اور تعلیم روحانی کے بیش بہا گوہر ہیں۔ اس کا حساس دل زمانے کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس جمود و سکون کا متحمل نہیں ہوتا جو اس کے قریبی ماحول اور اس کے ملک و قوم میں موجود ہے اس لئے وہ اس کو دور کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے۔ کبھی تو وہ اسلاف کے کارنامے یاد دلاتا ہے جس کے بارے میں خود کہتا ہے۔ ؎

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اور کبھی طرح طرح سے غیرت دلا کر حمیت قومی کو اکسا کر ان کی قوت جد و جہد کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے ؎

تیرے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی | لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل | نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر | تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

فطرت کو خرد کے روبرو کر | تسخیر مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے | کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بے کرانہ | تو بھی یہ مقام آرزو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت | جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

غرض اس جمود قومی کو مٹانے اور اس سکون کے خلاف ردعمل کرنے کے لئے اس کے جذبات کا دریا امنڈتا ہے باوجود قوم کی بے حسی کے اقبال کو ان کے مستقبل سے یاس نہیں نہ وہ ہمت پست کرنے والی قنوطیت ہے جو اکبر الہ آبادی کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎ خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر | مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

برخلاف اس کے اقبال کا انداز تخاطب امید افزا اور ہمت آفریں ہے ؎

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں | وہ جلوہ گاہ ترے خاک داں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں | غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے | قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

کتنا بلند پیام ہے اور کیسا دلکش اور جوشیلا انداز بیان کیا سوتوں کو جگانے کا اس سے بڑھ کر کوئی اور دل نشیں پیرایہ بھی ہو سکتا ہے۔ اقبال کے جذبات مثل ایک ابلتے ہوے چشمے کے ہیں جس کے سوتے خاکِ دانِ حیات سے ابلنا چاہتے ہیں ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدی | یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ہمت کی یہی بلند حوصلگی اور طبیعت کا یہی غیر معمولی جوش ہے جو اقبال کے طرز بیان میں ایک ایسا انوکھا پن اور کلام میں وہ خدمات کی فراوانی اور زور اور آمد کا ایسا سیلاب موجزن کر دیتا ہے جو اردو اور فارسی کے کسی اور شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنے انوکھے ڈگر کا آپ مالک ہے اور اپنی نرالی شان کا آپ خالق۔ یہ حسن بیان یہ پیام جد و جہد یہ جوش عمل اور یہ فلسفۂ زندگی، یہ زور کلام، یہ گرجتی للکار اور یہ شکوہِ زبان اعجاز یا الہام نہیں تو کیا ہے؟

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی | کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی | اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولے | ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

اقبال نے اپنی قومی شاعری سے زبان و ادب کی بھی قابل قدر خدمت کی ہے۔ بعض سخن داں اس کی زبان کی بعض معمولی لغزشوں تک اعتراض کرتے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات کے تلاطم اور اپنے تاثرات کے طوفان میں کچھ اس طرح کھو جاتا ہے کہ کبھی کبھی ان سطحی جکڑ بندیوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ابتدائی رنگ میں جب استاداں فن کے آگے زانوئے ادب طے کیا تھا اس کے کلام میں زبان کی ناہمواری اور ... بھی پائی جاتی ہے مثلاً اقبال کے ایسے اشعار ؎

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا | خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

گر دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنی نرالی اور جدت آفریں طرز، دلکش تشبیہوں اور دل پذیر ترکیبوں اور گرجتی زبان سے جو خدمت اردو زبان کی کی ہے وہ فراموش نہیں کی جا سکتی۔ اس نے گیسوئے اردو کے سنوارنے میں درحقیقت ایک خاص حصہ لیا ہے اس کی پرواز خیال کی طرح اس کی خصوصیاتِ زبان بھی قابلِ تعریف ہیں ؎

مشتی از خرواری

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام | لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا | شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا (کنارِ راوی)

نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقابِ آگہی | ہے غبارِ دیدۂ بینا حجابِ آگہی
محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن | آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ | شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں | طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں (شمعِ ویرانہ)

مہرِ روشن چھپ گیا، اٹھی نقابِ روئے شام | شانۂ ہستی پہ ہے بکھری ہوئی گیسوئے شام
یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے | محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
کر رہا ہے آسماں جادو لبِ گفتار پر | ساحرِ شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر
منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں | ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں (خفتگانِ خواب سے استفسار)

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا | ناقۂ شاہدِ رحمت کا حدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا | رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا
بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں | شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں (ابرِ کہسار)

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار | صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر | کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح | جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار
ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح | شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہم کنار (نمودِ صبح)

لوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل | ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب | نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی | نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی (ماہِ نو)

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں | بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی
کیا ذرہ کو جگنو دے کے تابِ مستعار اس نے | کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی

تغیر آگیا ایسا تدبر میں، تخیل میں — ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا — رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی
فروغِ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی — مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمعِ محفلی داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلی داری

(تہذیبِ حاضر)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا — میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آذری!
میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ، رمیدہ بو — میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری
تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا — کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری
نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے — وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

(میں اور تو)

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے — من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں — جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیاری بن نہ سکا
اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے — گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

حسنِ بیان اور زورِ کلام کے ایسے ایسے ہزارہا نمونے اقبال کے کلام میں پائے جاتے ہیں جن کے مختصر انتخاب سے بھی ایک ضخیم جلد تیار ہو سکتی ہے۔ جب ہم ہندوستان کے اس سب سے بڑے موجودہ شاعر کی شخصیت پر غور کرتے ہیں تو علاوہ ایک مایۂ ناز ماہرِ فن اور ایک استادِ سخن ہونے کے اس کی شخصیت کے دو اور نمایاں پہلو نظر آتے ہیں۔ (۱) پیامِ عمل (۲) فلسفۂ حیات اس لحاظ سے اقبال نہ صرف دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر ہی ہے بلکہ ایک پیامبر اور مفکر (فلسفی) بھی ہے۔ ہم اقبال کی شاعری کے متذکرہ بالا پہلوؤں پر آئندہ روشنی ڈالیں گے۔

لطیف النساء بیگم بی اے

ملک و ملت کی جان تھا اقبال — فخرِ ہندوستان تھا اقبال
قوم کا ترجمان تھا اقبال — درد کی داستان تھا اقبال
روشنئ زمینِ شعر و سخن! — نیرِ آسمان تھا اقبال
دوست دشمن کو کر لیا مسحور — ایک جادو بیان تھا اقبال
موت نے ہم سے اس کو چھین لیا — جانِ ہندوستان تھا اقبال
دے رہا تھا وہ ہم کو درسِ بقا — حریت کا نشان تھا اقبال
بلبلیں نوحہ کر رہی ہیں شور — رونقِ گلستان تھا اقبال

منور عابدی (نگینہ)

حیدرآباد میں یوم اقبال

مسلم کلچر سوسائٹی کی جانب سے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو تاؤن ہال حیدرآباد میں نہایت تزک و احتشام سے یوم اقبال منایا گیا۔ صبح کے اجلاس کی صدارت ہز ہائی نس والا شان اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار نے فرمائی۔ حیدرآباد کے اکثر علم دوست اصحاب، معززین اور طلبہ سے پورا ہال بھر گیا تھا۔ نواب فخر یار جنگ بہادر (سوسائٹی کے صدر نے) تحریک صدارت کی اور شہزادۂ برار نے کرسی صدارت قبول فرما کر اقبال کی نسبت جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ دوسرے صفحہ پر درج ہیں۔ اس کے بعد رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے امیر جامعۂ عثمانیہ کی حیثیت سے ایک پیام سنایا دیگر اصحاب کے پیامات بھی پڑھے گئے۔ اس اجلاس میں وجدؔ، میکشؔ، مخدومؔ نے اپنی نظمیں پڑھیں ڈاکٹر زورؔ، ڈاکٹر لطیف مولوی سید ہاشمی اور مولوی سید محمد اکبر وفاقانی نے اپنے مقالے پڑھ کر سنائے۔

دوپہر کے اجلاس کی صدارت کے لئے نواب بہادر یار جنگ بہادر نے ہز اکسلنسی مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر سے استدعا کی۔ مہاراجہ کا خطبۂ صدارت بھی آیندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، اور مولوی مخدوم محی الدین صاحب نے مقالے پڑھے۔ نواب بہادر یار جنگ نے "اقبال کے تصور مومن" پر تقریر کی۔

یوم اقبال کے سلسلے میں "بزم تمثیل حیدرآباد دکن" کی جانب سے اقبال کے کلام کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔ یہ ڈرامہ مولوی سید محمد اکبر وفاقانی کے حسن انتظام سے بہت ہی کامیاب رہا خصوصاً جبریل اور ابلیس کا مکالمہ اس بہتر انداز میں اسٹیج کیا گیا کہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ واقعی آسمان پر جبریل اور ابلیس ایک دوسرے سے بحث کر رہے ہیں۔

یوم اقبال، یوم دہلی کے بعد حیدرآباد کا ایک نہایت ہی شاندار و کامیاب علمی و ادبی اجتماع تھا اس میں جو پیامات نظمیں اور مقالے پڑھے گئے وہ کئی روز تک مقامی جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ ماہنامہ خلیق نے بھی ان میں سے بعض کو ایک جگہ کر کے اپنا "اقبال نمبر" شائع کیا۔ سب رس کے اس "اقبال نمبر" کے آیندہ صفحات میں حیدرآباد کے اس یوم اقبال کی مستقل یادگار قائم رکھنے کے لئے پیامات نظموں اور مقالوں کے اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔

اس یوم اقبال کے بعد نظام کالج کی بزم ادب کی طرف سے بھی مولوی عبدالحق کی صدارت میں ایک جلسہ یوم اقبال منایا گیا اُس کی تقریروں کے اقتباسات بھی اسی سلسلے میں شریک کر دئے گئے ہیں۔

خواجہ حمید الدین

ارشادِ صدارت

ہز ہائینس پرنس آف برار والاشان حضرت اعظم جاہ ولیعہد بہادر دولت آصفیہ دام اقبالہٗ

"یہ امر میری انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ آج میں اس تقریب میں بذاتِ خود شریک ہوں، جو آپ مشرق کے مایۂ ناز شاعر سر محمد اقبال کی ادبی اور فلسفیانہ خدمات پر حیدرآباد کی طرف سے اظہار استحسان کے لئے منعقد کر رہے ہیں۔

اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام کے ذریعہ مشرق میں موجودہ نسل کی ذہنیت کو متاثر کیا ہے کہ بجا طور پر وہ دنیا کا ایک بہت بڑا مفکر اور مصنف مانا جاتا ہے اور بہ حیثیت شاعر وہ بنی نوع انسان کے لئے ایک پیغام کا حامل ہے، یہی وہ خصوصیات ہیں جن کا حیدرآباد اعتراف کر رہا ہے۔

خواتین و حضرات! میں اس تقریب کی کامیابی کا دل سے متمنی ہوں۔"

پیامات:-

ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ و امیر جامعہ عثمانیہ

مجھ سے منتظمین جلسہ نے خواہش کی ہے کہ میں بہ حیثیت امیر جامعہ ایک پیام آج کی تقریب کے لئے دوں، آج ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ ایک ایسی شخصیت کے جنم دن کی یادگار منائیں جو مسلمہ طور پر خالص ہندوستانی شاعر اور حقیقی ہندو مسلم تہذیب کا شعر گو ہے اس کی شاعری تصوف، فلسفہ اور قومیت کا عجیب مجموعہ ہے، اور ایسے شاعر کے لئے سوائے حیدرآباد کے ہندوستان میں کوئی اور مقام جنم دن منانے کا موزوں نہیں ہوسکتا، جہاں اردو اور فارسی بڑے طبقے کی بولی جاتی ہے اور جہاں پر ایک ایسا تاجدار شاعر موجود ہے جس کے تخیل اور اندرونی جذبات کو ہم ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے رہنے والے اپنے لئے آئینۂ ہدایت سمجھتے ہیں اور آج کے جلسہ کی زینت صدارت کے لئے ہز ہائنس پرنس سے بڑھ کر کون موزوں ہوسکتا ہے جو خاندان آصفی کے تاجدار شاعر کا نور عین ہے۔

ہز ہائی نس سر آغا خاں:-

اقبال جو اردو اور فارسی زبانوں کا مایۂ ناز شاعر اعظم ہے اس کا یوم مناکر آپ نے اسلامی تہذیب کو درخشاں کردیا۔ اقبال کی شاعری میں ہندوستانی قومیت کی تحریک کے راز پوشیدہ ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو:-

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس شاعر اعظم کے نغموں کی وجہ سے موجودہ نسل زبردست متاثر ہوئی۔ اقبال کی خداداد قابلیت کا ہر شخص معترف ہے۔ "یوم اقبال" کی کامیابی کی توقع پر مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔

بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو:-

میں اپنے بہترین دوست اقبال کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا عظیم ترین شاعر سمجھتی ہوں۔ اس شاعر کے اردو اور فارسی شعری کارنامے ہندوستانی قوم کے زبردست رہبر و رہنما ثابت ہوں گے۔

ہز اکسلنسی سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب:-

میں انتہائی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ مشرق کے شاعر اعظم کا "یوم" ہز ہائنس پرنس آف برار کی صدارت میں شان دار طریقہ سے منایا جا رہا ہے اس فلسفی شاعر کے پرستاروں کی بہترین توقعات مسلم کلچر سوسائٹی سے وابستہ ہیں۔

ہزہائی نس عالیجناب نواب صاحب رام پور:۔

"اقبال ڈے" کے شاندار موقع پر مجھے مبارک باد کہنے کی مسرت حاصل ہو رہی ہے اس شاعر اعظم نے اردو فارسی شاعری کے علاوہ فلسفہ کی جتنی خدمت انجام دی ہے اس کا اعتراف ہر شخص کو ہے۔

ہز ہائنس عالیجناب نواب صاحب بھوپال:۔

مجھے مسرت ہوی کہ "یوم اقبال" ہز ہائی نس پرنس آف برار ولیعہد خانوادۂ آصفی کی صدارت میں منایا جا رہا ہے۔ اقبال کے نغموں میں ہندوستانی قوم کی ترقیوں کے راز مضمر ہیں۔ اس فلسفی شاعر نے اہل ہند کو خواب غفلت سے چونکا کر ان میں احساس بیداری پیدا کر دیا۔

آنریبل سر غلام حسین:۔

"یوم اقبال" کے سلسلہ میں میں اپنی بہترین توقعات اور مسرتوں کا اظہار کرتا ہوں۔

آنریبل مسٹر یعقوب حسن:۔

میں بھی مسلم کلچر سوسائٹی کے ساتھ یوم اقبال کی مسرت حاصل کر رہا ہوں۔

مسٹر عبداللہ بریلوی:۔

اقبال دنیا کے چند غیر فانی شعرا میں سے ہے مجھے توقع ہے کہ اہل حیدرآباد اقبال کی لافانی شاعری کو انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کر کے بستی دنیا تک اس کا پیام پہنچا کر زندۂ جاوید کارنامہ پیش کریں گے۔

جسٹس منوہر لال:۔

اقبال موجودہ نسل کا سب سے زبردست مجاہد شاعر ہے۔ اس لافانی شاعر کو ابھی کئی "بانگ درا" پیش کرنی ہیں۔

شعبہ اسلامیات جامعۂ پیرس:۔

نے اپنے مستقل نمایندۂ ہندوستان کو اس بات کا مجاز کیا ہے کہ "یوم اقبال" سے جو ہز ہائنس شہزادہ برار کی معزز صدارت میں منعقد ہو رہا ہے اپنے آپ کو وابستہ کرے اور کامیابی کی بہترین تمنائیں پہنچاوے۔

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور:۔

ہندوستان کے شاعر اعظم کا "یوم" منانے میں میری مسرتیں بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ مجھے عمر بھر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں اقبال جیسے شاعر اعظم کا کلام اردو فارسی زبانوں سے ناواقفیت کی وجہ سے اصلی علمی و ادبی حسن کارانہ روپ میں نہ دیکھ سکا۔ خدا اقبال کو قوم اور ملک کی خدمت کے لئے زندہ و سلامت رکھے۔

ہز اکسلنسی سر مرزا اسمٰعیل دیوان میسور۔

ہز ہائنس پرنس آف برار کی صدارت میں مسلم کلچر سوسائٹی نے "یوم اقبال" منا کر فی الحقیقت ادبی و شعری مسرتوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ اس شاعر اعظم کی اردو اور فارسی شاعری تعریف سے بالاتر ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اقبال زندہ رہیں تا کہ ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔

فردوس میں رومیؒ سے یہ کہتا تھا سنائیؒ ۔۔۔ مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش!

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر ۔۔۔ اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش!

(اقبال)

خطبۂ صدارت

ہز اکسلنسی یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد

اردو شاعری کے اس "جشن بھوم" میں آج کا دن حقیقت میں ایک یادگار دن ہے کیونکہ آج ہم سر اقبال جیسے مشہور اور مقبول شاعر کی خصوصیات کی داد و تحسین کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

مجھے اس کی مسرت ہے کہ آپ نے اس جلسہ کے دوسرے اجلاس کی صدارت کا اعزاز مجھے عطا کیا۔ میرے سر اقبال سے ذاتی تعلقات بھی ہیں۔ یہی تعلقات مجھے اپنی کم نظری کے باوجود اس کا مستحق ٹھیراتے ہیں۔

حضرات! دنیا کا رخ بدل چکا ہے، جو طرز شعر اب سے چند سال قبل مطبوع و مقبول تھا۔ اب اس کی مانگ بہت کم ہوتی جارہی ہے، اب شعر مجلس کی گرمی اور دلوں کی تازگی کے لئے نہیں کہے جاتے۔ بلکہ قومی مذہبی اور ملکی تعمیر کا بار گراں بھی ان کے دوش پر رکھدیا گیا ہے۔ اسے اقبال ہی کی زبان سے سنیئے:۔

محفل را آتش گری برہم زدم
زخمہ بر تار رگ عالم زدم
بسکہ عود فطرتم نادر نواست
ہم نشیں از نغمہ ام ناآشناست

باوجود اس کے ہندوستان کی فضا میں ابھی ایسے شعرا موجود ہیں جو اپنے قدیم اساس شعر کو ترک کرنا مشرب سخن سنجی کا گناہ عظیم سمجھتے ہیں مگر ۔۔۔۔۔۔۔

یہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

ہندوستان کی جدید نسلیں، مختلف اقوام و ملل کے زاویۂ نگاہ سے باخبر ہوچکی ہیں اور ایک [illegible] کی طرح حقیقت عام ہوتی جارہی ہے کہ ہماری عہد گذشتہ کی شاعری آرٹ کی حیثیت میں خواہ کتنی ہی کامیاب سہی لیکن اس نے ہماری ہیئت اجتماعی پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ غرض زمانہ ہر پرانی چیز کو ترک کرنے اور نئی کو سراہنے کی سنت ادا کر رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس نقطۂ نظر کے متعلق آئندہ نسلیں کیا رائے قائم کریں گی۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ فن شعر کی اس کایا پلٹ نے ہندی شاعر کے سینے میں بھی تحقیق و تلاش کی روح دوڑادی اور اب قدیم "چابکدست" معماروں کے بنائے ہوئے اجزا سے اپنے کلام کو درست کرنے کی بجائے اس نے خود اپنی ایک عمارت تعمیر کرنے پر توجہ کی، اس سے ایک طرف جدید نسلوں کی توجہ تحصیل علم کی جانب بڑھنے لگی اور دوسری طرف ان کے افکار شعری صرف "جمالیاتی اور حُزنی" کیفیات تک محدود نہیں رہیں بلکہ ان میں بصیرت و بصارت کے اسرار جھلکنے لگے۔ ہندوستان میں اردو اور فارسی میں اس طرز شعر کا علمبردار یقیناً اقبال ہے جس نے مشرقی انداز بیان کو قائم رکھکر شاعری ہی میں حکمت و بیداری کے دریا بہادئے اور جدید نسلوں کو اپنے بلند آہنگ نغموں کے ذریعے جینے اور اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کا راز سمجھایا۔

"خودی" اقبال کے کلام کا سرنامۂ امتیاز ہے اور یہی ایک لفظ اُس تمام دعوتِ سعی و عمل کا آئینہ دار ہے۔ خودی احساس نفس بلکہ عظمتِ نفس کا ایک راز ہے جسے اقبال کی باریک بیں نظروں نے پہچانا اور مشرق کی موجودہ پستی نے اس کے حساس دل کو سمجھایا کہ جب تک اس کو نصب العین نہ بنایا جائے گا [illegible] تنزل میں آئی ہوئی اقوام مشرق کائنات

پیام صبح
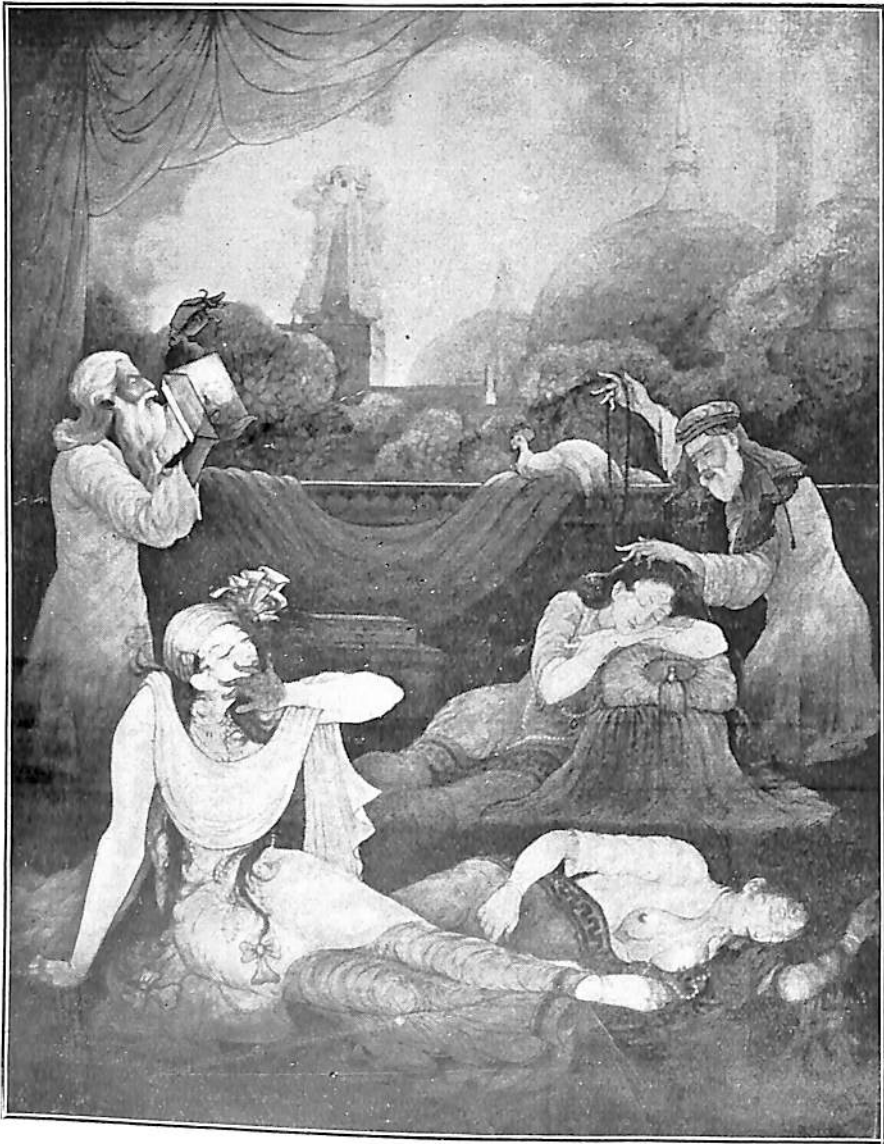
اجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی افشاں کا — نسیم زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا

طلسم ظلمت شب سورۂ والنور سے توڑا — اندھیرے میں اڑایا تاج زر شمع شبستاں کا

پڑھا خوابیدگان دیر پر افسون بیداری — برہمن کو دیا پیغام خورشید درخشاں کا

ہوی بام حرم پر آکے یوں گویا مؤذن سے — نہیں کھٹکا ترے دل میں نمود مہر تاباں کا

پکاری اس طرح دیوار گلشن پر کھڑے ہوکر — چٹک او غنچۂ گل! تو مؤذن ہے گلستاں کا

"اقبال"

میں اپنی بقائے حیات کے لئے جگہ نہ حاصل کر سکیں گی ۔

حقیقت میں اقبال جس بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے وہ اس کا جائز حق ہے اور اس کا پیام فرزندان مشرق کبھی فراموش نہ کر سکیں گے آیندہ نسلیں اس کا فیصلہ کریں گی ہندوستان کی ادبی ناہمواری کی اصلاح اور قومی ترقی میں اس زندہ جاوید شاعر کا کس قدر حصہ تھا اعلیٰ تخیلات کے کسی شاعر کی نسبت جیسے اقبال ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی مذہب اور ذات کے قیود کا وہ پابند ہو سکتا ہے اقبال کی ذات بہ حیثیت شاعر لطیفیات عالم کے ہر حسن پر حاوی ہے ۔

اقبال بہ حیثیت فرزند ہند اپنی وطنیت پر نازاں ہیں اقبال کو مسلم ہونے پر بجا فخر ہے تو ان کے ہندوستان سے وابستہ جذبات وطنی اور قومی بھی ایسے ہی اعلیٰ تخیلات سے مملو ہیں جو اقبال جیسے بلند پایہ شاعر کے شایان شان ہیں کوئی اقبال کا مسلم ترانہ دیکھ کر ان کو مسلمانوں کا شاعر خیال کرے تو اس سے بڑھ کر گناہ نہیں ہو سکتا ۔ اقبال نے مسلمانوں کی خوبیوں کو کماحقہ واضح کر دکھایا کہ مسلمانوں کو بیدار کیا جائے ۔ ہندوؤں کی حقیقتوں کو موثر پیرایہ میں پیش کیا کہ ہندو حقیقت آگاہ ہو جائیں جہاں اقبال نے اس ملک کو بیدار کرنے میں اس طرح بلند حصہ لیا ہے، ہندو مسلمانوں میں اتحاد قومی کی روح بھی پھونکی ہے ۔ جس کی ترجمانی اقبال کی بے شمار نظمیں کرتی ہیں ۔ جن کا یہاں حوالہ خالی از طوالت نہیں ۔

ظلم ہوتا اگر مشرق ایسے باکمال شاعر کو اس کی زندگی میں کم سے کم خراج تحسین بھی ادا نہ کرتا اور مجھ کو دلی مسرت ہے کہ ہمارے اہل ملک دوسرے اقطاع ہندوستان سے پیچھے نہیں رہے اور کیونکر پیچھے رہتے جب کہ اہل علم و فن کی قدر افزائی ان کا روایتی شیوہ رہا ہے اور انھوں نے اقبال کا وہ "قرض" جو علمی اور ادبی حیثیت میں ان پر تھا کسی حد تک ادا کر ہی دیا ۔ میری دعا ہے کہ خدا اقبال کو بہت دن تک زندہ رکھے تاکہ ہندوستان ان کے نغمۂ بیداری سے زندگی اور کامیابی کا درس حاصل کرتا رہے ۔

میں اب ان سطور کو ختم کرتا ہوا آپ حضرات کا شکر گذار ہوں اور مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے اقبال کے کلام کا کچھ انتخاب نہ پیش کر سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس جلسہ میں اس فرض کو دوسرے اصحاب ادا کر کے رہیں گے اور ہم سب کو تھوڑی دیر کے لئے اقبال کے اسرار خودی و بیخودی کی لذتوں سے آشنا کر کے رہیں گے آخر میں اعلیٰحضرت آقائے ولی نعمت سلطان العلوم کی عمر و اقبال کی دعا کرتا ہوں جن کی علمی و فنی سرپرستی اظہر من الشمس ہے اور جن کی فارسی و اردو شاعری کا وہ مرتبہ ہے جس کا اعتراف حافظ و سعدی اور میر و امیر کی روحیں کرتی ہیں اور جن کا واحد ذوق فارسی زبان کی نشاۃ ثانی کا ضامن ہے اور یہ اسی متوارث ذوق علمی کا اثر تھا کہ حضرت والا شان ہز ہائنس پرنس آف برار نے اس خالص علمی جلسہ کے اجلاس اول کی صدارت سے ہم سب کو سرفراز فرمایا اور نہ صرف ہمیں بلکہ خود اقبال کو بھی اپنی رونق افروزی سے مفتخر و معزز فرمایا ۔ خداوند حقیقی ان سب کی عمر و اقبال میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے ۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد ۔

اقبال نے کل اہل خیاباں کو سنایا یہ شعر نشاط آور و پرسوز و طرب ناک

میں صورت گل دست صبا کا نہیں محتاج کرتا ہے مرا جوش جنوں میری قبا چاک

عالمی نظم و ضبط کے متعلق اقبال کا تصور۔

(اقتباس)

آج ہم اس شخص کی ذہنی عظمت و بلندی کی تحسین و ستائش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جس نے اپنی ساری زندگی مشرقی تہذیب کے بعض ان روایتی خصوصیات سے اپنی شاعری کو آراستہ کرنے کے لئے وقف کردی ہے، جن کی وجہ سے مشرقی تہذیب ممتاز ہے۔ یہ مشرقی تہذیب ہر روحانی تہذیب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس نے ہر دور میں انسانی زندگی کو عزت و توقیر بخشنے کا فرض ادا کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ آج ہم شاعر اقبال کی عزت کیا کر رہے گویا اپنی نظروں میں آپ وقیع و ممتاز ہو رہے ہیں۔

اقبال بہت بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست فلسفی بھی ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کی کون سی حیثیت پر زیادہ زور دے سکتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اقبال کی شاعری کی علت غائی کو سمجھنے، ان کے جذبات و احساسات کی گہرائیوں اور ان کے تصور کی بلند پروازی تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کی شاعری اولین دور میں تھی زمانہ گذرتا گیا اور اس دلچسپی کو جو زندگی کے شاعرانہ اعتبار سے متعلق ہے صرف حسن و رعنائی کے اطمینان بخش انداز بیان سے کچھ اور زیادہ طلب کرنے کی ضرورت ہوئی، بعض اوقات میں نے ان کے فلسفہ کے نہائے مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس دنیا پر اس کی تاریخ پر اس کے مسائل پر اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے مستقبل قریب پر ایک وجدانی تصور کے ذریعہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ تصور اقبال کے فلسفہ کا مہیا کردہ ہے۔

اس شاعری کو میں اب تک محسوس کرتا اور فلسفہ کی اس آواز کو اب تک سنتا ہوں لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کو منتخب کرکے اقبال تک پہنچنے کی کوشش کروں؛ ان دونوں نے اس طرح ترکیب پائی ہے کہ میرے نزدیک ان کا کلام نہ تو خالص شاعری کا روپ رکھتا ہے اور نہ نرے فلسفہ کا رنگ۔ یوں کہئے کہ گویا ان دونوں نے عرفان عمرانی کے مرکب کی شکل پائی ہے اور اپنا اپنا حق ادا کرتے ہیں۔

اقبال نے جو اثر مجھ پر چھوڑا ہے اس کو واضح کرنے کے لئے میں نے عرفانِ عمرانی کا لفظ استعمال کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے عالمی تصور کے سلسلہ میں اپنے پاس سے جو چیز پیش کی ہے وہ اس سے نمایاں ہو جاتی ہے، وہ زندگی کے اس پیام جاوید کی طرف اشارا کرتا ہے جو ہمیشہ سے روحِ فطرت میں کارفرما نظر آیا ہے اور بنی نوع انسان کی حیاتِ مدنی کے لئے ایک ایسے مطمح نظر کو متعین کرتا ہے جس کو اس وقت ہر جگہ فراموش کیا جا رہا ہے۔

اقبال کی قوم پرستی کی یہ داستان اس زمانہ کی ہے جب کہ اُن کا عالم شباب تھا، اور فطرت کا اقتضا یہی تھا کہ اس وقت جب کہ ہندوستان کے ایک بیدار اور ترقی یافتہ طبقہ کے دلوں کو نام نہاد قوم پرستی کا مضراب آہستہ آہستہ چھیڑ رہا تھا۔ اقبال بھی مست ہو کر ایسے ہی نغمے الاپنے لگے لیکن جب وہ یورپ گئے اور ان کی نظر نے دنیا کے حوادث، اقوام عالم کے رجحانات اور انسانیت کی بے بسی اور مجبوری کا بہت قریب سے مطالعہ کیا اور زندگی کے تجربات نے جب ان کی پرواز نظر کو مزید تقویت بخشی تو وہ قومیت کا یہ محدود تصور بہت پیچھے رہ گیا، اور وہ ایک پاکیزہ اور بلند و بالا مطمح نظر کے حامی ہو گئے یہی وہ مطمح نظر ہے جو انسانیت کی نجات کا باعث ہے

سید عبد اللطیف سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ

اقبال کا اثر اردو شاعری پر

(اقتباس)

اقبال نے تخیل کی جولانیوں کے لئے ایسے ایسے میدان کھول دئے ہیں جن کی طرف اس سے قبل اردو شاعروں کی توجہ کبھی منعطف ہی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے خیالی اور مصنوعی شاعری کو نظروں سے گرادیا۔ اردو شاعروں کا فرضی معشوق اپنی کمر کی طرح اب خود بھی عنقا ہوتا جارہا ہے۔ مصنوعی عشق بازی اور جھوٹی معاملہ بندی اب ہماری شاعری کی جان نہیں رہی۔ قصیدوں کی مبالغہ آمیزیاں اور مثنویوں کے فوق الفطری قصے جنوں اور پریوں کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتے جارہے ہیں۔ اقبال نے لفظی چٹکلوں اور دور از کار محاورہ بندیوں کی جگہ حقایق کی تلخیوں اور سیاسیات حاضرہ کے ناگفتہ بہ مسائل کو اس خوبی سے شاعری میں داخل کردیا ہے کہ اب اردو شاعری کے موضوع ہی بدل گئے اور شاعری واقعی ساحری بن گئی اقبال نے صاف صاف اعلان کردیا ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بیگانے تو ناخوش رہتے ہی ہیں لیکن اقبال سے اپنوں کا خفا ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ انھوں نے غالب کی طرح قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی روش اختیار کی اور خیالی معاشقے یا فرضی بادہ و ساغر کے بیانات سے اپنے کلام کو آلودہ نہیں کیا۔

وہ کہتے ہیں ؎

حدیثِ بادۂ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو — نہ کر خاراشگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطان سے — وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی — شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے لوازم غزل کی پابندی نہیں کی اور ایسے نامانوس اور خشک مضامین باندھے جن کی ہماری شاعری متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ زبان و محاورہ کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس کا جواب خود اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں اس طرح دیا ہے :۔

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں — کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی — کہ بانگِ صورِ سرافیل دلنواز نہیں
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا — کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری — وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

غرض اقبال نے شاعری کا اسلوب ہی بدل دیا۔ آزادہ روی حقیقت نگاری شاعری کے لوازم ہوتے جارہے ہیں معاملہ بندی آسمان یا معشوق کے ظلم و ستم کا ماتم، رقیب روسیاہ کے رشک و حسد کا گلہ، غزل کی زبان کا لحاظ، دلی یا لکھنو کے محاوروں یا روزمروں کی پابندی غرض طرح طرح کی قید و بند سے ہماری شاعری آزاد ہوتی جارہی ہے۔ مولوی حالی نے پھر بھی قدیم مشرقی مروت سے کام لیا تھا اور شعرائے نازک خیال کے تکلفاتِ لایعنی اور خیالی لوازمِ شعری کی مدافعت اس مہذب پیرایہ میں کی تھی کہ ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن اقبال ضروریات زمانہ کے پیش نظر سخن آرائی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی سخن آرائی کے لحاظ نے حد سے زیادہ ہمارے شاعروں کو گمراہ کرکے معانی و مطالب کی گہرائیوں سے بے پروا کردیا اور اردو شاعری یا تو قافیہ پیمائی یا محاورہ بندی کے لئے وقف ہوگئی یا چند موضوعوں کے لئے محدود

کر دی گئی۔ اقبال اسلوب سے زیادہ مطالب و معانی کے قائل
ہیں۔ وہ اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس
کو پیرایۂ بیان بھی خود بخود اچھا ہی مل جائے گا۔ اور بغیر مشاطگی یا
پروپگنڈے کے اس کے سننے اور سمجھنے والے بھی پیدا ہو جائیں گے۔
ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو　　کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر　　مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

دوسرے شعرا کی طرح اقبال اپنے کلام کو جام مے بنا کر
گردش میں لانا نہیں چاہتے بلکہ وہ اہل محفل کو دعوتِ عمل دیتے
ہیں کہ اس ثمر سے وہ خود مئے لالہ فام نکالیں۔ اور جو اس دعوت
پر لبیک کہنا نہیں چاہتے اور ذوقِ خودی نہیں رکھتے اُن سے
تو وہ مخاطب بھی نہیں ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ　　کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کی محفل ان کے
کلام کو سمجھنے اور اس سے کما حقہٗ محفوظ ہونے کے قابل نہیں
ہوئی۔ ان کا تخیل دور نکل گیا ہے اور ان کے ساتھی بہت
پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا خود ان کو بھی احساس ہے وہ
کہتے ہیں۔

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　　مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شعرا تو کجا اہل مدرسہ و اہل خانقاہ بھی اس ذوق سے
بے بہرہ نظر آتے ہیں اور اسی محرومی کی وجہ سے اب تک ملک و قوم
کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اقبال کا شعر ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے　　فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اس خیال کو ایک اور جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق　　خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ　　میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کے خیال میں اضطراب و التہاب اور خونِ جگر کی آمیزش

ہے اور شاعر ساحر نہیں بن سکتا ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات　　ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال نے ہمارے شاعروں کے سب سے بڑے نقص
یعنی اظہار بو الہوسی اور زلف و کاکل، خد و خال اور جوبن و کمر
کے مضامین باندھنے کی اچھی توضیح کی ہے کہ ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا　　ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند　　کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس　　آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ مصرعہ "آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار"
جتنا اردو کے شاعروں اور خاص کر غزل گو شعرا پر صادق آتا ہے
دنیا کے کسی اور فن کار پر منطبق نہیں ہوتا۔
'عشق عاشقی اور معاملہ بندی کی جگہ اقبال چاہتے ہیں کہ
ہمارے شاعر حقیقت نگاری سے آشنا ہوں اور اپنی خودی کی
حفاظت کریں۔ جب تک آدمیوں اور شاعروں میں یہ احساس
پیدا نہ ہوگا کوئی شاعری ملک و قوم کے لئے وجہ حیات اور
باعث وقار ثابت نہیں ہو سکتی۔

مرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر　　گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات　　نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی　　خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جو کلام حقیقت پر مبنی نہ ہو اور زندگی کے سبق نہ سکھلائے
وہ بیکار ہے۔ وہ بادِ سحر ہی کیا جس کے جھونکے چمن کی افسردگی
کو شگفتگی میں نہ بدل سکیں۔ اقبال کہتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن　　جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا　　اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اسی خیال کو ایک اور نظم میں اس طرح واضح کیا ہے ؎

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز　　اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہے گلستاں　　بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز
اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ　　از ہر چہ بآئینہ نماید بہ پرہیز

آخر میں ہم اقبال کی اس نظم کے چند شعر بھی سنائے دیتے ہیں جو ہمارے نوجوان شاعروں کے لئے لائحہ عمل کا کام دے رہے ہیں اور جن میں اقبال شاعر ہی سے مخاطب ہیں ے

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے　　شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم　　اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو　　شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ ہے وہ وسعت نظر اور مرحلۂ شوق کی گوناگونی جو اردو شاعری کو متاثر کر رہی ہے۔ اقبال کی تلخ نوائیوں نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ سلیم و سیماب اور جوش و ساغر جیسے پختہ مشق شاعروں کو بھی متاثر کر دیا۔ اقبال کے اثر سے رفتہ رفتہ قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ میں ناسخ و آتش کے اثر سے الفاظ و محاورات اور اسالیب بیان متروک ہو گئے تھے اور آج اقبال کے اثر سے بہت سے فرسودہ خیالات، لایعنی تکلفات اور غیر ضروری لوازم شعر متروک ہوتے جا رہے ہیں اور جہاں تک مطالب و معانی کا تعلق ہے اردو شاعری اقبال کے کلام سے متاثر رہے گی اور اہل اردو میں زندگی اور زندہ دلی قائم رکھنے کا باعث ہوگی۔

سید محی الدین قادری زورؔ

سونے والوں کو، پیام صبح نو، دیتی ہوئی　　خواب کی دنیا اٹھی، انگڑائیاں لیتی ہوئی
مطلع مشرق پہ چمکا، آفتاب شاعری　　ہر کرن، جس کی بنی، تار رباب شاعری
دل پہ تھا جو داغ غفلت، اس کو آہیں دھو گئیں　　خون مشرق میں ہزاروں بجلیاں حل ہو گئیں
ضبط کے زخم نہاں، فریاد سے بھرنے لگے　　یعنی بندے بھی خدا سے گفتگو کرنے لگے
عارض پرنور جھلکا، گیسوئے شب رنگ سے　　جوئبار ساز دل نکلی، سکوت سنگ سے
اشک خونیں میں نظر آئی تبسم کی جھلک　　نغمۂ بلبل بنی، خاموش پھولوں کی مہک
کارواں بڑھنے لگا، تیزی سے منزل کی طرف　　کائنات درد خود کھنچنے لگی، دل کی طرف
دہر کے دھارے پہ طوفانی ہوا بہنے لگی　　ناؤ، مشرق کی کنارے کی طرف بہنے لگی
جاگ اٹھا مشرق، دل اقبال کی دھڑکن گواہ　　واہ کا محشر لئے آتی ہے جس کے لب پہ آہ

قلب شاعر سے صداقت لے کے نکلی شاعری
سچ کہا ہے "شاعری جزویست از پیغمبری"

میکش

اقبال کی حسن کاری

ایک دلچسپ مقالہ کی چند سطریں

شاعری حسن کاری کا سب سے بلند مظہر ہے اور شاعر حسن کاری کا مبالغہ۔ شاعر ایک ایسا حسن کار ہے جو بجائے رنگ و موقلم، سنگ و تیشہ، رباب و مضراب کے الفاظ اور قلم کو تخلیق کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس لئے جس قدر بڑا شاعر ہوگا اسی قدر وہ حقیقی معنوں میں بڑا حسن کار ہوگا۔ اقبال بڑا شاعر ہے اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ہم خود "یوم اقبال" منا رہے ہیں، چونکہ وہ بڑا شاعر ہے اس لئے وہ بڑا حسن کار بھی ہے اور اس موقع کو غنیمت جان کر میں اقبال کو بحیثیت "حسن کار" آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

شاعر جب حسن کارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو اس کا کلام تصور کی نگاہ میں ایک رنگین تصویر، خوبصورت مجسمہ اور دلکش نغمہ بن جاتا ہے۔ وہی ذرائع جو حرف عام میں حسن کار کی حسن آفرینی کو پیش کرتے ہیں، شاعر الفاظ اور صرف الفاظ کو استعمال کرکے آپ کے تخیل کے پردے پر حسین ارتسامات پیدا کر دیتا ہے۔

جب ہم اقبال کو اس نقطۂ نگاہ سے جانچتے ہیں تو ہم اس کو اردو اور فارسی کے بلند شاعر کی بجائے ہندوستان کا سب سے انوکھا حسن کار پاتے ہیں اس کی حسن کاری میں مشرق کی خوبیاں، مغرب کا پرتو اور مسلم کی ذہنیت جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

اقبال شاعر قدرت ہے اور قدرت ہی اس کو تخیل کی بلند پروازی میں مدد دیتی ہے۔ قدرتی مناظر ہر بڑے شاعر کے لئے جاذب نظر ہوتے ہیں اور کوئی زبان مناظری شاعری سے خالی نہیں۔ اقبال کا کلام بھی ان چیزوں سے پُر ہے، خواہ وہ اردو میں ہو یا فارسی میں۔ شاعر کی رنگ کاری کو دیکھنے کے لئے اسی قسم کا کلام پیش نظر ہو جاتا ہے۔ جس میں فطرت کے ہر لمحہ، ہر موسم، ہر کیفیت کو اقبال نے چھوٹے اور بڑے canvas پر لفظوں کے ذریعہ رنگ دیا ہے ایک نظم میں وہ ایک خاموش کیفیت، سوز و گداز سے بھرا ہوا منظر پیش کرتا ہے، کہتا ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی ؛ شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش ؛ کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے ؛ آغوش میں شب کے سو گئی ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

تاروں کا خموش کارواں ہے ؛ یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا ؛ فطرت ہے مراقبہ میں گویا

اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لیکے سو جا

صبح کا پرخروش منظر، رنگوں کا تلاطم، نور و ظلمت کی کشمکش اور بتدریج ظلمت پر نور کا غلبہ اس طرح کہ کوئی بہ

کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغ آبدار

نظم کیا ہے رنگوں کا ایک مرقع ہے جو معمولی رنگوں اور موقلم

کی سعی سے بلند اور بالا ہے، اب رات کا منظر دیکھئے۔ قلعہ گولکنڈہ کے پیچھے گورستان شاہی کے قریب شاعر بیٹھا ہوا ہے آسمان پر ابر بھی ہے، چاند بھی ہے، حسن کار کے لئے بہترین موضوع ہے۔ گورستان کا مایوس منظر نورانی حسن میں گم ہے جس کو حسن کار شاعر یوں ادا کرتا ہے۔

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے — کچھ مکدر سا جبین ماہ کا آئینہ ہے

چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں — صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں

کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی — بربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

کیا ان اشعار کو پڑھنے کے بعد ہر وہ شخص جس نے قطب شاہیوں کی آخری آرام گاہ کو دیکھا ہے اپنے سامنے ایک حسین تصور گورستان شاہی اور موسم باران کی چاندنی رات کا محسوس نہیں کرتا۔ یہ لفظوں کی رنگ کاری ہے۔

اب فارسی کلام کی موسیقی دیکھئے اس کلام میں نغمہ اور ہم آہنگی کی بیحد بہتات ہے۔

بلبلگاں در صفیر — صلصلگان در خروش

خون چمن گرم جوش — اے کہ نشینی خموش

در شکن آئین ہوش — بادۂ معنی بنوش

نغمہ سرا، گل بپوش

بلبلگاں در صفیر — صلصلگاں در خروش

سید محمد اکبر وفا قانی

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا — جانب مشرق اُجالا سا نظر آنے لگا

موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں چھٹنے لگیں — ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں ہٹنے لگیں

اک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا — آسماں سے نور پیکر نوجوانوں تک گیا

عالم بالا پہ باہم شورے ہونے لگے — آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے

پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا — زندگی کی موٹر پر گاتا ہوا پایا گیا

وہ نقیبِ زندگی شام و سحر گاتا گیا — کوبہ کو، کوچہ بہ کوچہ در بہ در گاتا گیا

گیت سننے کے لئے خلقِ خدا آنے لگی — گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی

نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں — صورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

عرش کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے

راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

مخدوم محی الدین

مجاہد اقبال

بال جبریل اور ضرب کلیم کی روشنی میں

(اقتباس)

اقبال کے کلام کے کئی پہلو ہیں، اسی مناسبت سے اُن پر بحث کی جاتی ہے۔ ان ہی پہلوؤں میں سے ایک پہلو جہاد کا ہے اور غالباً غالب پہلو بھی یہی ہے۔ اقبال کے پیش نظر انفرادی اور اجتماعی سیرت کا ایک خاکہ ہے جس کسی کو وہ اپنے نصب العین سے ہٹا ہوا پاتا ہے اُس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ جس کسی کردار یا ارادہ میں اپنے خیال کی جھلک بھی دیکھتا ہے تو اُس سے متاثر ہوتا ہے مجاہد کی خود اقبال نے یہ تعریف کی ہے:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش　　میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق آگاہ　　خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش　　میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و نظرباز و نکو بین و کم آزار　　آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خرسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم　　کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند
چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال　　کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

یہی ہے مجاہد کی تعریف، یہی بندۂ گستاخ کہیں اقبال، کہیں مومن، کہیں قلندر، کہیں درویش اور کہیں مرد کامل کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے دنیا کی تاریخ میں یہ مرد مجاہد ہر عہد کے سماجی حالات کے مطابق کبھی مصلح کبھی مدبر، کبھی شاعر اور کبھی پیغمبر کے پیکروں میں نمودار ہوا ہے۔ اس کا کام کلیسا اور حرم کے چراغ گل کرنا ہے تاکہ خدا اور انسان میں کوئی پردہ حائل نہ رہے۔ اس کا کام پیری و قیصری کے ایوانوں کو ڈھانا ہے تاکہ ابن آدم اس ارض اللہ پر نیابت الٰہی کا حق [illegible] ادا کرے

خونخواری نہیں بلکہ محبت کرنا سیکھے وہ حق پرست اور باطل شکن ہے۔ اس کی بجلیاں اپنوں اور بیگانوں کا امتیاز نہیں کرتیں۔ وہ فرعون کے لئے موسیٰ اور لات و ہبل کے لئے محمد ہے لات و ہبل چاہے حرم کے ہوں یا سومنات کے، عرب کے ہوں یا عجم کے۔ فرعون چاہے مشرق کے ہوں یا مغرب کے، مدرسہ کے ہوں یا خانقاہ کے۔

اقبال کے کلام کا مرکزی جذبہ عشق ہے۔ اس کی ساری تعلیمات اس کے سارے شاعرانہ تخیلات اسی جذبے کا طواف کرتے ہیں وہ عشق ہی کے بازوؤں پر بیٹھ کر آسمانوں کی سیر کرتا ہے فضا میں اڑنا اس کا محبوب شغل ہے گنبد نیلوفری میں اپنا نشیمن بنانا چاہتا ہے، اس کے کلام کے ہر ورق سے عالم بالا کی بو آتی ہے، مگر چونکہ فلسفیانہ تجسس کا نقطۂ پرواز دنیاوی حقایق ہی میں ہے اس لئے آسمانوں کی سیر میں بھی اقبال کا دامن زمین ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ وہ نیند میں بھی زندگی کو نہیں بھولتا۔ ہر چند وہ عملی دنیا کی کشمکش سے منہ چھپا کر داخلیت میں بند ہو جانا چاہتا ہے۔ باوجود خاکی ہونے کے خاک سے پیوند نہیں رکھنا چاہتا، مگر اس کی ذات میں صرف عشق ہی نہیں اس میں عقل کا عنصر بھی شامل ہے اور بام حرم کا یہ کبوتر زندگی اور اس کی تلخیوں کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انسان کے پیش نظر جب کوئی مقصد ہوتا ہے تو وہ اپنی آواز سے بولتا ہے۔ مگر جب کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے تو وہ گایا کرتا ہے۔ جب کچھ نہیں ہوتا تو وہ مصوری کرتا ہے۔ انسان کی جب کوئی منزل ہوتی ہے تو وہ اپنے پاؤں سے چلتا ہے جب کچھ نہیں ہوتا تو وہ رقص کرتا ہے۔ اقبال کی زندگی کا سارا جہاد اسی دنیا کے لئے ہے۔

اسی سرمدی دنیا میں وہ گانا مصوری کرنا اور رقص کرنا چاہتا ہے۔

خویشتن را وانمودن زندگی است　　　ضرب خود را وانمودن زندگی است

مخدوم محی الدین

مبارک ہو جہانِ شعر کی پیغمبری تجھ کو　　　ملی ہے شاعرانِ خوشنوا کی سروری تجھ کو

دلوں میں احترامِ عشق پیدا کر دیا تو نے　　　سخن کو دم میں ہمدوشِ ثریا کر دیا تو نے

گراں خوابی ہوئی کافور تیری ضربِ پیہم سے　　　ہوئی سرسبز کشتِ ملتِ بیضا ترے دم سے

ترا ہر شعر دل کی سمت پورا وار ہے گویا　　　زبانِ پاک تیری تیغِ جوہر دار ہے گویا

ترے فیضِ نظر سے حریت کی بزم روشن ہے　　　تری ضربِ کلیمی سے غلامی لرزہ برتن ہے

اشاروں میں دیا درسِ رموزِ بیخودی تو نے　　　فنا کو بڑھ کے دکھلایا چراغِ زندگی تو نے

ترا سازِ خودی جس دم حقیقت پاش ہوتا ہے　　　مثالِ صبح رازِ زندگانی فاش ہوتا ہے

خرد بیزار تھی آشفتگی کے آستانے سے　　　اسے تو راہ پر لایا جنوں کے تازیانے سے

کہاں ہوتے ہیں تجھ سے اہلِ دل اہلِ نظر پیدا　　　کئے تیری نگاہوں نے ہزاروں دیدہ ور پیدا

جہاں میں نام پیدا کر لیا ہے خوشہ چینوں نے　　　کئی خرمن بنا ڈالے ہیں تیرے خوشہ چینوں نے

اسے کیا قحط ہو جس کی جانب چشمِ ساقی ہے　　　تجھے کیا غم ہے اے اردو ابھی اقبال باقی ہے

سکندر علی وجد

اشارات

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں ۔ غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

کتنا جاذبِ دل کلام ہے ۔ اللہ اکبر

سنتا ہوں کہ ہندوستان میں اکثر لوگ اقبال کی تعریف کرتے ہیں اور بعض لوگ تنقیص سے بھی نہیں رُکتے جی میں آتا ہے کہ فریقین میں سے چند اہل الرائے حضرات کا انتخاب کر کے مناظرہ کرا دوں

مناظرہ کا نتیجہ شائع ہونے کے بعد سب کے سب اقبال کی فضیلت کلی کے قائل ہو کر اُن کا موازنہ دوسرے شاعروں سے کرنا چھوڑ دیں گے یا اقبال کو بھی "منجملہ اسباب حیرانی" سمجھنے لگیں گے ۔

وہ مرد خدا جس کے ہاتھوں کی برکت ایک نقش فانی میں "رنگ ثبات و دوام" بھر دے خود کیونکر مٹ سکتا ہے ۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے ۔ اس کی اذانوں سے فاش سرّ کلیم و خلیل

اقبال نے اس مرد خدا کی حیثیات مختلفہ پر کس خوبی سے روشنی ڈالی ہے ۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ۔ ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اردو شاعری اور اقبال

ذیل کا مقالہ نظام کالج میں "یوم اقبال" پڑھا گیا تھا ۔

اقبال کی شاعری کا آغاز دوسرے نظم گو شعراء کی طرح غزل سے ہوتا ہے لیکن غزل گوئی اس کی پرواز فکر بلند خیالی اور شعلہ نوائی کی متحمل نہ ہو سکی اور اس کی متنوع طبیعت بہت جلد پکار اٹھی کہ "بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے" چنانچہ وہ نظم کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جس مخصوص شاعری کے پودے کی تخم ریزی حالی نے کی تھی اس کی آبیاری اپنے خون دل سے کر کے ایک ہرا بھرا سرسبز و شاداب درخت بنا دیتا ہے اور اپنی رنگین بیانی سے اس میں ایسے خوش رنگ اور خوشنما پھول لگاتا ہے جس کی عطر بیزی نوع انسانی کے دل و دماغ کو ہمیشہ معطر کرتی رہے گی ۔

اقتباس

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل ۔ اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو ۔ رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اقبال ان ہی سے مخاطب ہیں جو ان کے تئیں سحر زدہ نقشوں کو دیکھ کر اپنے لئے ایک ... محاذ بنا سکتے ہیں ۔

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترک عثمانی ۔ سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعر غریب

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا ۔ ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

اقبال اپنی شخصیت اور اپنے مقلدوں کی حیثیت کما حقہ سمجھتے ہیں، یہ اقبال ہی کا دعویٰ ہے، صرف الفاظ میرے اپنے ہیں مگر دعوی کی طرح دلیل بھی میں اپنے لفظوں میں پیش کرنا نہیں چاہتا ۔ ۔ ۔ فرماتے ہیں ۔

اگرچہ میرے نشیمن کا کر رہا ہے طواف ۔ مری نوا میں نہیں طائر چمن کا نصیب

اور ایک مقام پر اپنی خصوصی اولیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ۔

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی ۔ دیا ہے میں نے انہیں ذوق آتش آشامی

علی منظور منظور

وطنی شاعری

اقبال نے ابتدا میں قوم و وطن کی جانب توجہ کی ۔ ایک طرف ہندوستان کی کھوئی ہوئی عظمت و بلندی عروج و اقبال کی تصویر کھینچ کر اور دوسری طرف اس کی موجودہ پستی و غلامی ادبار و نکبت کا نقشہ دکھا کر اس نے اہل ہند کو خواب غفلت سے بیدار ہونے اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کا پیغام دیا ۔ اپنی پہلی وطنی نظم میں "وہ فصیل کشور ہندوستان" سے ایک جگہ یوں خطاب کرتا ہے ۔

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا ۔ مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا ۔

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا ۔ داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا ۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
واعظ کو بھی کو سکھایا جنگ و جدل خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

آ غیریت کے پردے ایک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

ہندوستان کی عظمتِ پارینہ کو یاد دلا کر اہلِ ہند کے دلوں میں احساسِ برتری اور حب الوطنی کے جذبات کو اس طرح بیدار کرتا ہے:-

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو حق نے جس کی زر کا اثر دیا تھا — ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ملی شاعری:- لیکن ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں بلقان اور طرابلس کی جنگوں نے اقبال کے خیالات کی کایا پلٹ دی۔ اس نے دیکھا کہ ملتِ بیضا کا چراغ کوئی دم کا مہمان ہے اور مسلمانانِ عالم کا سیاسی اقتدار اور تیرہ سو سال کا تمدن صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو رہا ہے اس کے حساس دل کو جسے اسلام اور اہلِ اسلام سے سچی ہمدردی ہے چوٹ لگتی ہے اس کی حمیتِ ملی جوش میں آتی ہے اب وہ اپنا موضوعِ سخن بجائے وطنیت عالمگیر اسلامی اخوت بنا لیتا ہے اور اپنی تمام توجہ مسلمانانِ عالم کی فلاح و صلاح کی طرف منعطف کر دیتا ہے اس کا ترانہ اب بجائے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کے "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" ہو جاتا ہے۔ دنیائے اسلام کی ذلت و رسوائی اسے اس قدر متاثر کرتی ہے کہ وہ عجز کے اسرار کو پس پشت ڈال کر اپنی مشہور و معروف نظم "شکوہ" میں اللہ سے بھی "برہم" ہو جاتا ہے اور اس برہمی کے آثار اس کی تازہ ترین تصنیف میں بھی باقی ہیں:-

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

ایک دوسرے مقام پر یوں شکوہ سنج ہوتا ہے:-

تہی شیشہ میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

دنیائے اسلام کے زوال و پستی کا سبب اس کے نزدیک صحیح اسلامی اسپرٹ کا فقدان ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق — کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اس کا ایقان ہے کہ اسلام ہی انسانیت کا علمبردار ہے وہ سمجھتا ہے کہ اگر اقوامِ عالم اسلام کے بتائے ہوئے اصول پر کاربند ہو جائیں تو عصرِ حاضر کی ساری معاشی کشمکش اور سیاسی اضطراب کا خاتمہ ہو جائے لیکن یہ وہ اسلام نہیں جو نام نہاد مولویوں اور صوفیوں کا بتلایا ہوا ہے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

غرض اقبال نے اپنی شعلہ نوائی سے مسلمانانِ عالم میں قوت و حیات کی ایک ایسی چنگاری پیدا کر دی کہ دنیائے اسلام اس کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتی۔

سیاسی شاعری:- سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اقبال ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ ایک مفکر کی حیثیت سے اس نے سیاسیاتِ حاضرہ کے تقریباً تمام پہلوؤں پر رائے زنی کی ہے۔ وہ نارواقومیت کی ہمیشہ مذمت کرتا ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جنگ و جدل کا اہم ترین سبب اقوامِ عالم کی رقابت اور ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کی خواہش ہے جس سے انسانیت کی دیواریں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

(اقتباس)

عباس جعفری

مشرق کے مایۂ ناز شاعر کی زندگی پر ایک نظر

مشرق کے مایۂ ناز شاعر اعظم اور دنیا کے مفکر اعظم ڈاکٹر سر محمد اقبال بار۔ اٹ لا ۱۸۷۵ء میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے آپ کشمیر کے ایک شریف ہندو گھرانے کے چشم و چراغ ہیں ابتدائی تعلیم آپ نے "مکتب" میں پائی۔ اور پھر انگریزی تعلیم کے لئے ہائی اسکول میں شریک ہے جہاں آپ اپنی خداداد قابلیت اور ذہانت طبع کی وجہ سے بہت جلد ممتاز ہو گئے تقریباً ہر جماعت میں آپ کو قابلیت کی وجہ سے وظیفہ ملتا رہا۔ آپ کی اوائل عمر کی خداداد قابلیت کا پتہ حسب ذیل واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے ایک مرتبہ اقبال جماعت میں دیر سے داخل ہوئے اس پر فاضل استاد نے کہا کیا بات ہے اقبال تم اکثر جماعت میں دیر سے آتے ہو" اقبال نے فوراً جواب دیا "قبلہ" "اقبال" ہمیشہ دیر سے آیا کرتا ہے"

میٹرک کامیاب کرنے کے بعد اقبال سیالکوٹ کے کالج میں شریک ہوئے جہاں خوش قسمتی سے اقبال کو علوم مشرقی کے علامہ شمس العلماء سید میر حسن جیسا استاد ملا۔ ان کی تعلیم کا یہ خاصہ تھا کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھتا اس کی طبیعت میں زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے چونکہ اقبال کی طبیعت میں علم و ادب سے قدرتی طور پر مناسبت موجود تھی اس لئے مولوی صاحب کی تلمیذ ہونے پر سہاگہ کا کام کر گئی اور ابھی اسکول ہی میں تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔ اس زمانہ میں فصیح الملک مرزا داغ مرحوم استاد حضرت غفران مکاں کا بہت شہرہ تھا۔ چنانچہ اقبال نے اپنا ابتدائی کلام خطوط کے ذریعہ انہیں کو بغرض اصلاح روانہ کیا۔ داغ مرحوم فخر کیا کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔

سیالکوٹ کالج میں ایف۔ اے کامیاب کرنے کے بعد بی، اے کے لئے اقبال کو لاہور آنا پڑا۔ جہاں اقبال جیسے فلسفہ پسند طالب علم کو پروفیسر آرنلڈ (جو بعد کو سر ٹامس آرنلڈ ہوئے) سا غیر معمولی قابلیت کا استاد ملا۔ یہ سلسلہ تلمذ اقبال کو کھینچ لے گیا، اور وہاں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا، اور اقبال آرنلڈ کی قابلیت کے معترف ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال کو ڈاکٹر میک ٹیگرٹ براؤن نکلسن ...... جیسے قابل اصحاب ملے۔ پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مشہور فارسی نظم اسرار خودی کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔ خوش قسمتی سے اقبال کو مولٰنا شبلی مرحوم، مولٰنا حالی مرحوم اور مولٰنا اکبر آبادی کا ساتھ ملا۔

اقبال کچھ دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں اس زمانہ میں علمی مشاغل کی شرکت کی وجہ سے فی البدیہہ اشعار کا دریا بہاتے تھے جسے ان کے ساتھی اور طلبا نوٹ کر لیا کرتے تھے اقبال نے کبھی فرمایش پر نظم یا غزل نہیں کہی، بلکہ جب کبھی طبیعت موزوں رہتی تو زبان سے اشعار کا دریا امنڈ آتا تھا، آواز میں سوز و گداز اور ترنم کی وجہ سے اقبال جب کبھی نظم سر محفل پڑھتے تو خود بھی وجد کرتے اور محفل کو بھی وجد میں لاتے۔

اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے شائد کسی بڑے لیڈر نے بھی نہ کی ہوگی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور میں جب آپ نے اپنی معرکتہ آلارا نظم "شکوہ" سنائی تو اس نظم نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے میں ایک معجزہ کا کام کیا۔ بعض "مولوی" قسم کے حضرات نے اقبال پر اس نظم کی وجہ سے کفر کا فتویٰ لگا ہی دیا ہوتا اگر اقبال "جواب شکوہ" سے انہیں ٹھنڈا نہ کر دیتے۔

محمد حبیب اللہ اوج

(اقتباس)

وفات کے بعد

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے انتقال کی خبر

لاہور ۲۱ اپریل۔ آج صبح کے ساڑھے پانچ بجے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا انتقال ہوگیا جو چند سال سے علیل اور حال ہی میں صاحب فراش ہوگئے تھے ان کی وفات غیر متوقع اور اچانک تھی۔ چنانچہ اس مشہور شاعر کے چند ایک قریبی رشتہ دار وفات کے وقت ان کے پاس تھے۔ سر اقبال گزشتہ تین سال سے دمہ میں مبتلا تھے اور گزشتہ تین مہینے وہ بستر علالت پر ہی رہے۔

آج صبح کے ۴ بجے ان کی حالت یکایک دگرگوں ہوگئی اور ساڑھے ۵ بجے طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا اس طرح کہ اقبال کا سر ان کے پرانے اور وفادار خادم علی بخش کی گود میں تھا۔ چند روز قبل سر اقبال کو علم ہوچکا تھا کہ ان کی حالت بگڑتی جا رہی ہے بنا بر آں انھوں نے ایک وصیت نامہ تیار کر لیا۔ بہرحال صحت یابی سے بالکل مایوسی نہیں ہوگئی تھی کیونکہ چند روز قبل انھوں نے اپنی پیش نظر کتاب لکھوانے کے لیئے ایک آدمی کو ملازم رکھا تھا۔

آخری الفاظ جو شاعر مشرق کی زبان سے نکلے نہایت اہم ہیں۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے "میں موت سے نہیں گھبراتا میں مسلمان ہوں اور خندہ پیشانی سے موت کا خیر مقدم کرتا ہوں"

سر محمد اقبال مرحوم کے پسماندوں میں دو لڑکے ایک لڑکی اور ایک بڑے بھائی اور تین بہنیں اور متعدد احباب اور سارے اردو و فارسی داں قدردان اس شاعر کی وفات پر وقف ماتم ہوں گے۔

اقبال مرحوم کے متعلق مزید تفصیلات

یوں تو ڈاکٹروں نے کہہ ہی دیا تھا کہ مرض لاعلاج ہے اور زندگی برسوں کی نہیں بلکہ مہینوں کی ہے مگر گذشتہ چار پانچ مہینوں میں اگرچہ علاج کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا لیکن حالت گرتی ہی گئی۔

مغربی طب کے ماہروں میں سے ڈاکٹر محمد یوسف خاں ڈاکٹر یار محمد خاں ڈاکٹر کیپٹن الٰہی بخش۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ۔ کرنل امیر چند۔ اور یونانی اطبا میں سے حکیم عبدالوہاب صاحب عرف نابینا صاحب برسوں سے مرحوم کے معالج تھے۔ حیدر آباد سے بھی آخر وقت تک دوا بھیجتے رہے اس طرف حکیم محمد حسن صاحب قریشی کے علاج سے بہت سکون ہوگیا تھا مگر چھ سات روز قبل سے طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ عام طور پر کہا جاتا تھا کہ دل پھیل گیا ہے اور اس کی ایک نالی خراب ہوگئی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات ضعف قلب کے دورے ہوتے تھے جن سے ضیق النفس کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی۔ تین روز سے بلغم کے ساتھ خون آنا شروع ہوگیا تھا اور جسم کے بائیں حصے پر ورم تھا۔

۲۰ اپریل کی شام کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ حالت گرتی جا رہی ہے لیکن ساڑھے بارہ بجے تک چند عقیدت مند پاس ہی موجود رہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طبیعت سنبھلی ہوئی ہے۔ رات کو کسی قدر نیند بھی آگئی تھی۔ تین بجے کے قریب درد شروع ہوا۔ پانچ بجے کے قریب راجہ حسن اختر صاحب کو حکیم قریشی صاحب کو لے آنے کے لیئے بھیجا گیا۔ ان کے جانے سے پیشتر علامہ مرحوم نے یہ دو شعر سنائے جو کچھ عرصہ قبل کہے گئے تھے۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید	نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے	دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب پانچ بج کر کچھ منٹ بعد حکیم صاحب کو لانے کے لیئے روانہ ہوئے تھے۔ کوئی سوا پانچ بجے ایک دھکا سا محسوس ہوا۔ حضرت مرحوم کا محبوب اور دیرینہ ملازم علی بخش اس وقت سرہانے تھا۔ چند سکنڈ ہی میں وہ زبان ہمیشہ کے لیئے خاموش ہوگئی جس نے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو زندگی کا پیغام دیا تھا۔

یہ دل سگاف خبر سرعت کے ساتھ سارے شہر میں پھیل گئی۔

تمام اسلامی حلقوں میں ماتم کے طور پر دوکانیں بند ہوگئیں۔ لوگ جوق درجوق مرحوم کی کوٹھی کی جانب روانہ ہوئے۔ زمین کے لئے جگہ کے تعین کا مسئلہ بہت اہم ہوگیا تھا۔ بالآخر قرار پایا کہ شاہی مسجد کے بڑے دروازے کے باہر سیڑھیوں کی بائیں جانب کا قطعہ موزوں ہے۔ چند حضرات کا وفد ہز اکسلنسی گورنر کی خدمت میں پہنچا۔ ہز اکسلنسی سر ہنری کریگ نے فوراً اجازت دی اور محکمۂ آثار قدیمہ کی منظوری کا بھی اہتمام کر دیا۔ پانچ بجے گورنر پنجاب کے نمایندے کی حیثیت سے ان کے اے ڈی کانگ اور چیف سکریٹری و کمشنر صاحب کوٹھی پر آئے اس کے بعد ہی جنازہ اٹھایا گیا۔ چارپائی میں لمبے لمبے بالس باندھ دیے گئے تھے تاکہ بہت سے لوگ وقت واحد میں کندھا دے سکیں۔ جنازہ پہلے اسلامیہ کالج لایا گیا۔ پھر قرار پایا کہ نماز جنازہ شاہی مسجد میں ہو جہاں مسلمان زیادہ شریک ہو سکیں۔ سات بجے کے قریب جنازہ شاہی مسجد پہنچا اور ساٹھ ستر ہزار آدمیوں نے شرکت کی اور آٹھ بجے کے قریب حضوری باغ کے کونے پر مسجد عالمگیر کے مینار کے سایے میں میت سپرد خاک کی گئی۔

علامہ مرحوم کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال ہیں اور چھوٹے بیٹے جاوید اقبال جن کی عمر تیرہ برس کی ہے چھوٹی صاحبزادی منیرہ بانو ہے جس کی عمر صرف چھ برس ہے۔ بہت زمانہ پیشتر ہی مرحوم نے ایک وصیت نامہ مکمل کرا کے رجسٹرار کے پاس محفوظ کرا دیا تھا جس میں جاوید اور منیرہ بانو کے ولی چار اشخاص، چودھری محمد حسین یم۔ اے منشی طاہر الدین، شیخ اعجاز احمد اور بچوں کے ماموں خواجہ عبد الغنی صاحب کو ٹھہرایا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ بقیہ تین حضرات وصیت نامہ کی تعمیل کریں گے۔

بیانات

ڈاکٹر ٹیگور سر محمد اقبال کی وفات نے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر دی ہے کہ ایک کاری زخم کی طرح [illegible] کے لئے ایک نہایت طویل عرصہ درکار ہے۔ ہندوستان جس کی جگہ دنیا میں بہت تنگ ہے ایسے شاعر کو نہیں کھو سکتا تھا جس کی شاعری ایسی عالمگیر قدر و قیمت رکھتی تھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو "مجھے اس واقعہ کی خبر سن کر عمیق رنج ہوا۔ کچھ ہی عرصہ قبل مجھے ان سے ایک طویل ملاقات کی عزت حاصل ہوئی تھی جب وہ بستر علالت پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور ان کی تیز فہم و فراست اور محبت آزادئ وطن کا مجھ پر بڑا اثر ہوا ان کی وفات سے ہندوستان ایک شان دار اور درخشاں ستارہ سے محروم ہوگیا لیکن ان کی عظیم الشان نظمیں آنے والی نسلوں کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھیں گی اور ان میں جوشِ عمل پیدا کریں گی۔

سر سلطان احمد سر محمد اقبال مرحوم کی رحلت کی خبر سنکر مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ ان کے اٹھ جانے سے ہندوستان عہد حاضر کے عظیم ترین شعرا میں سے ایک سے محروم ہوگیا ان کی شاعری میں اردو ادب کی نفاست اور حسن اور فلسفہ تصوف اور ایرانی تمدن کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی نمایندہ نظموں کا مقصد مسلمانانِ ہند کو ایک ایسے بلند رتبہ تک لے جانا تھا جو ان کے شاندار ماضی کے حتی الامکان قریب ہو۔ سر محمد اقبال ایک بڑے شاعر تھے لیکن میری رائے ہیں وہ شاعر سے بڑے فلسفی تھے وہ بجائے خود ایک جماعت تھے اور یہ سوچنا بھی ناممکن ہے کہ کوئی شخص جلد ان کی جگہ لے سکے گا۔

مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار: ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی رخصت سے ہندوستان ایک زبردست ترین مفکر سے محروم ہوگیا ہے شاعر کی حیثیت سے چند ہی ان کے ہم پلہ تھے ان کی کئی نظمیں یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور بجا طور پر ان کو بین الاقوامی شہرت کا حامل تصور کیا جاتا ہے مسولینی ان کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس نے اقبال مرحوم کی کئی

نظمیں اطالوی زبان میں ترجمہ کرائی ہیں ان کی بعض نظموں نے ہندوستان میں ایک نئی وطنی روح پھونک دی ہے۔ ہندوستان ان کی وجہ سے مفلس ہو گیا ہے۔

نواب بہادر یار جنگ اقبال کی موت نہ صرف مسلم قوم کا بلکہ مشرق اور دنیا کا ایک عظیم اور ناقابل تلافی نقصان ہے ان کی نوائے عمل نے ان کے لیئے عند الناس اور عند اللہ وہ مقام رفیع پیدا کر دیا ہے کہ ہمارے فاتحہ اور دعا سے مستغنی ہے ان کا بہترین صلہ اور ان کی سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان کے پیغام کو مشعل راہ بنائیں۔ "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" سے چونکیں اور "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کو سمجھیں۔ "جاوید نامہ" کو حرز جان بنائیں اور وہ مقام پیدا کریں جہاں اقبال ہم کو دیکھنا چاہتے تھے۔

مسٹر سوبھاش بوس صدر کانگرس سر محمد اقبال کی وفات کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے آسمانِ ادب کے نہایت درخشاں ستاروں میں سے ایک غائب ہو گیا۔ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک نادر شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی وفات سے ہمیں جو نقصان پہونچا ہے اس کو سارا ملک محسوس کرے گا۔ پچھلے دنوں ان کے سیاسی خیالات ایسے تھے کہ ہم میں بہت سے ان سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے لیکن کسی کو ان کے خلوص کی نسبت کبھی کوئی شبہ نہیں ہوا۔ غمگینی و الم کے اس موقع پر سارا جھگڑا مٹ چکا ہے اور ہم ہندوستان کے عظیم ترین فرزندوں میں سے ایک کے احترام میں اپنے سر جھکا دیتے ہیں۔ ان کی یاد ان کے ہم وطنوں کے قلوب میں ہمیشہ جاگزیں رہے گی۔

مسٹر محمد علی جناح صدر مسلم لیگ مجھے سر محمد اقبال کی وفات کی خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ وہ عالمی شہرت کے ایک نہایت ممتاز شاعر تھے اور ان کی شہرت اور ان کے کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ملک اور مسلمانوں کی انھوں نے اتنی بہت سی خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے ریکارڈ کا مقابلہ عظیم ترین ہندوستانی کے ریکارڈ سے کیا جا سکتا ہے جو کبھی پیدا ہوا ہو۔ حال تک وہ پنجاب کی صوبہ وار مسلم لیگ کے صدر تھے حتیٰ کہ ایک غیر متوقع علالت نے انھیں استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔ وہ کل ہند مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے زبردست حامی تھے میرے لئے وہ ایک رہنما تھے، دوست اور فلسفی اور تاریک ترین لمحوں میں جن میں سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا وہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی متزلزل نہیں ہوئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف تین دن قبل انھوں نے اس کامل اتحاد کا ذکر پڑھا یا سنا ہو گا جو کلکتہ میں پنجاب کے مسلم قائدوں کے مابین ہو گیا اور آج میں فخر و مباہات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانان پنجاب پورے طور پر اب لیگ کے ساتھ اور مسلم لیگ کے علم تلے آچکے ہیں جو یقیناً سر اقبال کے لئے عظیم ترین اطمینان کا واقعہ تھا۔ اس مفارقت میں میری نہایت مخلصانہ اور عمیق ترین ہمدردیاں ان کے خاندان کے ساتھ ہیں اس نازک وقت میں ہندوستان کو اور خصوصاً مسلمانوں کو ایک مہیب نقصان پہنچا ہے۔

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو "مجھے سر محمد اقبال کی وفات کی خبر سن کر سخت صدمہ ہوا۔ صرف دو مہینے پہلے میں لاہور میں ان سے ملا تھا۔ ان کا شمار دنیا کے موجودہ عظیم ترین شعراء میں سے تھا۔ فارسی اور اردو شاعری پر کامل عبور و قابلیت رکھتے تھے۔ اور گزشتہ تیس ۳۰ سال سے میں نہایت وقیع المرتبت شاعر و مفکر کی حیثیت سے ان کی قدر کر رہا ہوں۔ ان کی وفات سے ہندوستان ایک عظیم الشان ثقافت اور ایک عظیم الشان شاعر سے محروم ہو گیا۔ مجھے ان کے خاندان سے ہمدردی ہے۔

تعزیتی جلسے

انجمن خواتین دکن یکشنبہ ۲۵ اپریل پانچ بجے ہمایوں نگر کے مدرسہ صفدریہ میں تعزیتی جلسہ ہوا معزز خواتین اور مدرسہ کی طالبات شریک تھیں۔ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ کی تحریک اور بیگم بہادر یار جنگ کی تائید سے بیگم ممتاز یار الدولہ صدر نشین ہوئیں۔ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ نے رزولیوشن پیش کرتے ہوئے سر محمد اقبال کے حالات زندگی بیان کئے۔ ان کی تائید میں مسز صوفی صاحبہ نے تقریر کی بعد میں راحت النساء بیگم صاحبہ بنت محمد غوث صاحب نے سر محمد اقبال کے متعلق تقریر کی۔

جمعیت مسلم نونہالانِ سکندرآباد مولوی یوسف خاں صاحب کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا جس میں ارکان و دیگر حضرات کافی تعداد میں شریک تھے۔ مسٹر غوری نے اپنی تقریر کے آغاز میں کہا ہندوستان اور خصوصاً دنیائے اسلام کے لئے شاعر اعظم کی جدائی ایک سانحہ عظیم ہے۔ اقبال کا کلام مسلمانوں کو مرنے کی تعلیم نہیں دیتا ہے گو آج اقبال ہم سے جدا ہو گئے لیکن ان کا پیام ابھی موجود ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں وہ جوش اور تڑپ پیدا کریں جو اقبال کے کلام میں موجود ہے۔ مسٹر برہان اللہ نے کہا کہ علامہ اقبال کی موت مشرق اور اہل مشرق کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مسٹر فیاض علی بیگ نے ایک مقالہ پڑھا جس میں علامہ اقبال کے کلام اور حالات زندگی پر تبصرہ اور ان کے انتقال پر اظہار تاسف کیا گیا مولوی یوسف علی خاں صاحب نے کہا کہ اقبال کی روح کو اسی وقت مسرت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ مسلم نوجوان اقبال کے پیام کو پیش نظر رکھ کر میدان عمل میں مجاہدانہ استقلال کے ساتھ گامزن ہو جائیں گے۔ صدارتی تقریر کے اختتام پر صدر نے حسب ذیل قرار داد پڑھ کر سنائی جس کو حاضرین نے کھڑے ہو کر منظور کیا۔

"علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات حسرت آیات ہندوستان اور خصوصاً دنیائے اسلام کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے ہم جمیع اراکین مسلم نونہالان سکندرآباد مرحوم کی اس بے وقت وفات پر انتہائی تاسف کا اظہار کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ شاعر عظیم نے اپنے الہامی کلام سے مایوس دنیائے اسلام کے لئے جو خود فراموشی کی گھنگھور گھٹاؤں میں گم کردہ راہ تھی۔ پورے مجاہدانہ جوش کے ساتھ قوم کے ہاتھ میں خودی کی ایک مشعل دیدی جس سے دلوں کی تاریکی میں امید کی کرن پیدا ہوئی اور اسلامی بے خودی خودی سے بدل گئی۔ اس لئے اگر علامہ اقبال کو اسلام کی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"

مدرسہ فوقانیہ دار الشفاء کی جانب سے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات حسرت آیات کا تعزیتی جلسہ مولوی سید نور الحسن صاحب بی اے علیگ، ڈپ ایڈ کی صدارت میں منعقد ہوا جلسہ کا آغاز مرزا حیدر حسین صدر بزم ادب و متعلم جماعت ہشتم کی تقریر سے ہوا۔ صدر جلسہ نے فرمایا کہ "اقبال کے مطالعہ کی فرصت مجھے بہت کم نصیب ہوئی ہے جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو نصاب میں اقبال کی نظمیں بھی تھیں اور اسی سے اقبال کو جاننے لگا تھا۔ اقبال کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی وفات پر دنیا کے ہر گوشے سے تاسف کا اظہار کیا جا رہا ہے۔" آخر میں کرسئ صدارت سے تحریک تعزیت پیش ہوئی جس کو حاضرین نے استادہ ہو کر منظور کیا۔

کیمبرج یونیورسٹی مسلم سوسائٹی کیمبرج کے مسلم طلباء ۲۲ اپریل کو جمعہ کی نماز کے لئے اکٹھا ہوئے اور انھوں نے مشرق کے زبردست فلسفی اور شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات پر اظہار رنج کیا ایک قرار داد منظور کی۔ نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی۔

پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن زیر صدارت

علامہ اقبال مرحوم کی دو نادر تصویریں

شاعر مشرق کے ایک بے تکلف دوست سردار امراؤ سنگھ شیر گل مجیٹھیا نے ڈاکٹر زور کو اقبال کی چند تصویریں بطور تحفہ دی تہیں۔ یہ نادر تصویریں خود سردار مجیٹھیا نے اپنے کیمرے سے لی تہیں۔ اور ان میں سے دو کو سب رس نے ڈاکٹر صاحب سے حاصل کر کے شایع کیا ہے۔

میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم حکومت پنجاب برکت علی اسلامیہ ہال بیرون موچی دروازہ میں منعقد ہوا۔ ہال طلبا اور معززین سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں علاّمہ موصوف کے سوانح حیات، فلسفہ، روشن خیالی، اور تعلیم اسلامی پیش کرتے ہوئے ان احسانات پر اظہار خیال کیا جو علاّمہ مرحوم کے ذریعے سے قوم کو حاصل ہوئے انھوں نے کہا کہ لوگ مرحوم پر پھولوں کی بارش کرتے تھے اگر وہ چاہتے تو اپنی قابلیت کے عوض تمام دنیا کی دولت جمع کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس کی پروانہ کی وہ سادہ زندگی پسند کرتے تھے۔ اور اخیر وقت تک سادہ زندگی بسر کی جب آپ کی زندگی میں یوم اقبال منانے کی تجویز پاس ہوئی تو اس کے ساتھ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ایک ایک ہزار روپے دینے والے ایک سو معطیوں سے ایک لاکھ روپیہ جمع کر کے علاّمہ اقبال کی خدمت میں تھیلی پیش کی جائے۔ مگر آپ نے اس تجویز کو پسند نہ کیا اور کہا کہ اگر یہی ارادہ ہے تو یہ روپیہ اسلامی تعلیم اور اسلامی مشن پر خرچ کیا جائے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دولت کی کبھی پروا نہیں کی۔ وہ اپنی قابلیت اور لٹریچر کے لحاظ سے زندۂ جاوید ہیں۔ اس کے بعد ملک برکت علی صاحب ایم، اے، ال، ال، بی نے علاّمہ اقبال کے سوانح حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم نے ملت کی بڑی خدمات کی ہیں انھوں نے مشرقی اور مغربی تخیل کو اسلامی رنگ میں پیش کیا۔ علاّمہ اقبال کی تعلیم لازوال اور اقبال زندۂ جاوید ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین خاں صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ علاّمہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شخصیت اسلامیت جذبہ حب وطن اور جذبۂ حب اسلام ایسی چیزیں ہیں جن کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس کے اہل ہیں۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک نقطہ پر آجائیں۔

اسٹاف یونین آف دی جنرل اسٹیٹ بینک لمیٹڈ کے ارکان نے قیام یادگار کا سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور

اسٹاف اور طالب علموں کا ایک غیر معمولی جلسہ زیر صدارت عبدالحی صاحب طالب علم بی، اے کلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر شیخ محمد تیمور صاحب نے علاّمہ موصوف کی شاعری اور فلسفہ پر ایک مبسوط تقریر کی۔

بزم احباب

کی جانب سے شاعر مشرق علاّمہ اقبال کی وفات کا تعزیتی جلسہ ۲۳ خورداد کو منعقد ہوا۔

انجمن مسلم نوجوانان گلبرگہ

ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کا جلسۂ تعزیت زیر صدارت مولوی مرزا حسین احمد بیگ صاحب ایچ، سی، ایس زائد ناظم عدالت صوبہ گلبرگہ منعقد ہوا۔ جس میں مولوی محمد احمد خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ نے "اقبال بہ حیثیت ایک مصلح قوم" کے عنوان پر تقریر کی مولوی سید عزیز حسین صاحب شور عابدی نے ایک نظم سنائی۔

حیدرآباد کا سب سے بڑا تعزیتی جلسہ

مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں ۲۷ خورداد کی شام میں پونے پانچ بجے سے زمرد محل تھیٹر میں علاّمہ اقبال مرحوم کا تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھیٹر اصحاب و خواتین سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا یہ جلسہ موتمر مسلم نوجوانان دکن کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں حسب ذیل پیامات پڑھے گئے۔

ہز ہائی نس ولیعہد بہادر شہزادہ برار

"مہربانی فرما کر ہندوستان کے ایسے سپوت اور مشہور شاعر کی رحلت پر میری طرف سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کر دیجیے۔ ان کی تصانیف ہمیشہ ان کی یاد تازہ کرتی رہیں گی"۔

والا شان نواب معظم جاہ بہادر

"ڈاکٹر اقبال کی

افسوس ناک رحلت مسلمانوں کے لیئے ناقابل تلافی نقصان اور دنیائے ادب پر ایک ناقابل فراموش ضرب ہے۔"

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری اقبال کی رحلت سے ہندوستان اور بیرون ہندوستان نے اپنی ایک انتہائی حیات بخش آواز کھودی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کی ممتاز صدارت میں حیدرآباد اس کے نقصان پر اپنے شایان شان اظہار رنج کریگا۔ خدا کرے کہ اقبال کے پیغام کے ذریعہ ہمارا ملک اپنی روح حاصل کرے۔

سر مرزا اسمٰعیل دیوان میسور گو میں بہت دور ہوں مجھے اجازت دیجئے کہ اردو اور فارسی کے ایک عظیم المرتبت شاعر کی یادگار میں جو جلسہ منعقد ہورہا ہے اس میں روحانی طور پر آپ لوگوں کے ساتھ شریک ہوں اور یہ بہت موزوں و مناسب بات ہے کہ حیدرآباد جو اردو زبان اور ادب کا خاص مرکز ہوتا جارہا ہے اس عظیم المرتبت شاعر اور فلسفی کی وفات پر اس انداز میں اظہار افسوس کرے۔ سر محمد اقبال نے اردو شاعری پر ایک پاکیزہ اثر ڈالا ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ان کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب ڈاکٹر سر محمد اقبال کی رحلت سے مشرق کا سب سے بڑا فلسفی اور شاعر جاتا رہا جو ناقابل تلافی نقصان ہے۔ پنجاب اس عالمگیر اظہار تاسف و ہمدردی کی قدر کرتا ہے جو اس کے نقصان عظیم میں کیا گیا۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ ڈاکٹر اقبال کی رحلت سے ہندوستان کو بہت بڑا نقصان پہونچا۔ میں دلی رنج و ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔

راجہ صاحب محمود آباد اسلام کے عظیم المرتبت فلسفی اور شاعر سر محمد اقبال کی رحلت

اس درجہ مایوس کن ہے کہ اس کی اصلیت کو ہم پوری طرح محسوس نہیں کرسکتے ان کی آواز آئندہ نہیں سنائی دے گی مگر ان کا حیات بخش پیغام روزافزوں طاقت کے ساتھ گونجا کرے گا۔ میں حیدرآباد کے نوجوان مسلمانوں کے ساتھ ان کے ماتم میں شریک ہوں۔

ڈاکٹر سید محمود ڈاکٹر اقبال کی رحلت ایک عظیم قومی نقصان ہے آج ہمارا ہندوستان ان کی وفات کے لئے ماتم کررہا ہے۔ ان کی تصانیف ہمیشہ کے لئے یادگار رہیں گی۔

محمد علی جناح میں اس تعزیتی جلسہ میں آپ کا شریک ہوں۔ مسلمانوں اور ہندوستان کے اقبال کے کھونے کے غم میں برابر کا حصہ دار ہوں۔

مرزا یار جنگ بہادر اقبال ہمیشہ دل کے فلسفہ میں غرقاب رہتے تھے اور شاعری کو انھوں نے جذبات دل کی اظہار کا ایک آلہ بنا رکھا تھا ان کی اصل غرض و نیت اظہار شاعری نہیں تھی جب ان کے دل کی آگ اٹھتی تھی تو وہ اس کو شاعری سے بجھاتے تھے۔ ایسی ہستی کی وفات سے میرا دل بھی تڑپ رہا ہے۔

سر امین جنگ بہادر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ہستی ہندوستان میں تو کیا تمام علمی دنیا میں مسلمانوں کی ناک تھی۔ انھوں نے نہ صرف شاعری و فلسفہ میں مسلمانوں کا بول بالا کیا تھا بلکہ قوم کے لئے ایسے نمایاں کام کئے جو ان کے ترانے کے مانند کبھی نہیں بھولے جاسکتے۔ "اسرار خودی" جو انھوں نے اپنی ایک مثنوی اور چند انگریزی لکچروں میں ظاہر کئے وہ میری رائے میں ایسے ہیں جو اگر اس زمانے میں نوجوان سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہوں تو مسلمانوں کو ترقی کے بڑے سے بڑے زینہ پر پہونچا دیں گے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (نائب معتمد ادارہ ادبیات اردو) اقبال کی وفات [illegible] عظیم ہے جس پر بلاد مشرق اور خاصکر اردو دنیا

جتنا ماتم کرے کم ہے۔ اس شاعر اعظم نے اردو زبان کی حقیقی عظمت کو بے نقاب کر دیا اور اپنے بلند پایہ کلام کے ذریعہ سے ثابت کر دکھایا کہ یہ زبان دنیا کی بڑی سے بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں کی ہم پلہ ہے اور مشکل سے مشکل اور اہم سے اہم فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کی متحمل ہو سکتی ہے۔

اردو شاعری کو عصر حاضر کی ضروریات کے مطابق بنا کر اردو ادبیات کی تاریخ میں اقبال نے قلیل عرصہ میں جو زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے، اس کی نظیر ملنی دشوار ہے اردو کو اقبال جیسا محسن شاید پھر کبھی صدیوں ہی میں مل سکے گا۔ ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے ماہنامہ سب رس کا آئندہ شمارہ اسی شاعر اعظم کے سوانح حیات اور خصوصیات کلام کے لئے وقف کر دیا ہے اور موتمر مسلم نوجوانان حیدر آباد کی ان مساعی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے جن کی بناء پر آج یہ جلسہ تعزیت دکن کی ایک قابل فخر ہستی کی صدارت میں منایا جا رہا ہے۔ اپنے باکمالوں کی صحیح قدر و منزلت کرنا ہر قوم کا فرض اولین ہے، اور جو لوگ اس فرض سے واقف ہو جاتے ہیں وہ شاہراہ ترقی سے کبھی نہیں بھٹک سکتے۔

اقبال نے جس تہذیب کی نمایندگی کی اور جو پیغام تمام دنیا کو پہنچایا۔ اس سے اہل حیدر آباد کو خاص طور پر تعلق ہے کیونکہ عصر حاضر میں یہی ایک ایسا خطہ رہ گیا ہے جس کی نظیر مشرق و مغرب میں کہیں نہیں مل سکتی اور تین ماہ قبل کے یوم اقبال اور آج کے اس جلسہ تعزیت نے ثابت کر دیا کہ حیدر آباد کے نوجوان اپنے ملک کی اس اہمیت سے ناواقف نہیں ہیں اور اقبال کے پیغام کو سمجھنے اور اس کی ہدایتوں پر عمل پیرا ہونے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔

نواب مہدی یار جنگ بہادر نواب مہدی یار جنگ بہادر نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ سر محمد اقبال کا دنیا سے اٹھ جانا قابل تلافی نقصان ہے

یوں تو دنیا میں بہت سے انسان پیدا ہوتے ہیں لیکن اقبال جیسی عظیم ہستیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ اقبال صفات اور خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ اقبال شیدائے وطن تھے حب وطن کا جذبہ ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ گو اقبال مسلمان تھے۔ لیکن ان کا پیام سارے ہندوستان کے لئے تھا۔ وہ پورے ملک کے ترجمان تھے۔ مجھے ان سے تین چار مرتبہ ہی ملاقات کی سعادت ملی۔ ان کی صحبت فیض بخش تھی۔ اب ان کا جانشین ہونا محال ہے۔

راجہ پرتاب گیرجی نے ہندؤں کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا کہ ہندو مسلمان پارسی عیسائی کون ایسا ہے جو اقبال کو نہیں چاہتا۔ اقبال ہے تو سب کچھ اقبال نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو اس نہ مٹنے والے اقبال پر مٹا ہوا ہوں۔ جو نہ صرف اپنے میٹھے میٹھے راگوں سے دلوں کو موہ رہا تھا بلکہ اپنے پرجوش ترانوں سے خدا کی مخلوق کو غفلت کی نیند سے جگا رہا تھا۔ وہ روحانیت کی نشہ میں چور تھا کہ جو اس کے نشہ کو دیکھے خود بخود مخمور ہو جائے یعنی وہ زند بھی تھا اور واعظ بھی اور شاعر بھی تھا اور متقی بھی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کا بانی رہا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف لیڈر تھا بلکہ نغمہ طراز تھا اس نے اپنے گیت سے نوجوانوں کو بیدار کیا موت نے اسے ہم سے چھین لیا۔ لیکن اقبال کا پیام مسلمانان ہند اور اسلام کے ساتھ باقی رہے گا۔ اقبال کا فلسفہ خودداری کا فلسفہ تھا متعدد اشعار کے ذریعہ ثابت کیا کہ اقبال وطن پرست شاعر تھا اور اس کا دل حب وطن سے لبریز۔

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم نے کہا کہ ہر شخص کی دنیا میں دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک پبلک حیثیت یعنی شہرت اور دوسری ذاتی و شخصی حیثیت مجھ کو علامہ اقبال سے اسی دوسری حیثیت سے بہت قریبی اور گہرا تعلق رہا۔ ان کی صحبت سے گوناگوں فیض اٹھاتا رہا۔ فلسفہ کا ذوق، شاعری کا ذوق اور آزادیٔ فکر اور تقریر کا ذوق مرحوم کی فیض صحبت کا نتیجہ ہے۔ جب میں لاہور سے حیدر آباد آیا میری فیض یابی کم ہو گئی۔ ایک وقت میں

پانچ بجے شام سے گیارہ بجے رات تک اقبال کے ساتھ رہا اور اقبال برابر میرے سوالات کا پیشانی پر شکن ڈالے بغیر جواب دیتے رہے اور اسی دوران میں مجھ سے کہا کہ "دیکھو میں ایک گر بتاتا ہوں انسان میں جب تک نئے خیالات قبول کرنے کی صلاحیت ہے وہ زندہ ہے اور جب اس میں نئے افکار کو قبول کرنے کی استعداد ختم ہوگئی اور وہ اپنے پچھلے خیالات میں چکر کھانے لگا تو سمجھو کہ وہ مر گیا۔"

اقبال کی زندگی کے دو پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ ایک ان کی سادگی اور دوسرے مساوات! اقبال کی زندگی اس قدر سادہ تھی کہ انہیں اس کی تک خبر نہیں رہتی تھی کہ ان کے پاس کتنے کپڑے رہ گئے ہیں، کتنے پھٹ گئے اور پرانے ہوگئے ہیں۔ کینوس کی ایک کرسی تھی جس پر وہ بیٹھا کرتے اور ایک چارپائی تھی آخر عمر میں چارپائی پر ایک تکیہ رکھ لیا کرتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لئے کوئی وقت مقرر نہ تھا ان کا دروازہ چوبیس ۲۴ گھنٹے ہر بڑے چھوٹے، اعلیٰ و ادنیٰ کے لئے کھلا رہتا۔ معمولی انسان اور طلبا بھی آتے اور سیاست داں اور نائٹ بھی اور اقبال کی مساوات پسندی کا یہ عالم تھا کہ سب کے ساتھ مساوی گفتگو کرتے تھے، ہر ایک کی باتوں کا جواب دیتے اور اگر کسی کی زبان سے دلچسپ بات نکلتی خواہ کسی درجہ کا شخص ہو اس پر زیادہ توجہ کرتے۔ ہر ملاقاتی سے وہ اس کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے اور ہر شخص ان سے ایک نہ ایک فکر پارہ یا جوہر خیال حاصل کر لیتا تھا۔

اقبال کے وفادار ملازم علی بخش کا ذکر کیا جو تیس ۳۰ سال تک اقبال کی خدمت انجام دیتا رہا۔

"علی بخش نے شادی تک نہیں کی محض اس خیال سے کہ کہیں وقت نہ بٹ جائے اور جب اقبال مجھے آواز دیں تو میں موجود نہ رہوں"۔ اقبال نے اسی ملازم کی گود میں اپنی آخری سانس لی۔

نواب کیقباد جنگ بہادر نے پارسیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم اس ناقابل تلافی نقصان پر اظہار افسوس کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی المناک موت نے نہ صرف ملک ہند یا ملت اسلامیہ پر بلکہ پوری متمدن دنیا پر ڈھایا ہے اقبال ہند کو اپنا وطن اور اہل ہند کو اپنا ہم قوم سمجھتے تھے۔ کلام کا نمونہ پیش کرتے ہوئے اقبال کی وطن اور قوم پرستی کا مدلل ثبوت پیش کیا آخر میں کہا کہ اقبال کے دل میں ہند اور اہل ہند کی سچی محبت جاگزین تھی البتہ اظہار محبت کے طریقہ میں تجربہ کی پختگی اور دور ایام نے تبدیلی پیدا کر دی۔ اس جلسہ میں ماہر [illegible] اعجاز حسین خاں صاحب حبیب اللہ صاحب اوج اور مخدوم محی الدین صاحب نے اپنی نظمیں سنائیں اور خلیق احمد صاحب نعمانی نے ایک موثر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کی رحلت دنیائے انسانیت کے لئے ایک اندوہناک سانحہ ہے جس نے بنی نوع انسان کے دلوں میں گہرا ناسور ڈال دیا ہے۔ اقبال کا پیام اور ہمارا پیمان میری تخاطب کا موضوع ہے۔ اس تقریر کے بعد یہ شاندار جلسہ ختم ہوا۔

علامہ اقبال کی وفات سے متعلق جو تفصیلات اور بیانات شایع ہوئے۔ ان کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ خصوصاً حیدرآباد میں جو تعزیتی جلسے ہوئے ان کی روئداد و تقاریر کے اقتباسات اور نظموں کو بھی گزشتہ صفحات میں شایع کیا گیا ہے تاکہ آئندہ جو بھی علامہ مرحوم کے متعلق کام کرنا چاہیں تو ان کو زیادہ سے زیادہ مواد ایک جگہ مل سکے۔

خواجہ حمید الدین شاہد

اقبال کی نسبت میرے ذاتی تاثرات

مدت سے میری خواہش تھی کہ اقبال کی نسبت اپنے ذاتی تاثرات کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کروں مگر میری فطری کاہلی اس خواہش کی تکمیل میں مانع ہوتی رہی۔ مجھے اس کا افسوس ہے بہت سخت افسوس ہے۔ اب وہ شاعرِ اعظم وہ عظیم المرتبت انسان اس عالمِ فانی سے کوچ کر گیا ہے اور وقت گزر جانے کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کرنے بیٹھا ہوں۔ کاش! میں یہ کام اس کی زندگی ہی میں انجام دے لیتا۔ آہ! اگر میں ایسا کر سکتا تو اس مضمون کی ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ لکھتے وقت کتنی مسرت اور کتنا لطف محسوس کرتا۔ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب پچھتانے سے کیا فائدہ ہے۔ آج میں اپنی کاہلی اور اپنے اوپر نفریں کرتے ہوئے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی کوشش کرتا ہوں۔ اقبال کی شاعری سے میں پہلی مرتبہ کس طرح روشناس ہوا اور اس کا مجھ پر کیا اثر پڑا یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے اس لئے کسی قدر تفصیل سے اس کو سپردِ قلم کرتا ہوں۔

بچپن کا ذکر ہے جس کو شاید ایک قرن سے کچھ زیادہ ہی عرصہ گزرا ہے کہ میں دادا جان کی کتابوں کی الماری کھول کر پرانی کتابوں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا اتفاقاً رسالہ مخزن کا ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ نمبر میرے ہاتھ لگا اور میں بڑے اشتیاق سے اس کی اوراق گردانی کرنے لگا۔ اس نمبر میں اقبال کی ایک نظم کوہ ہمالہ موجود تھی۔ میں نے اس نظم کو شروع سے آخر تک دیکھا۔ اگر میں اپنے ان تاثرات کو جو اس نظم کو پڑھنے سے میرے دل و دماغ پر مرتب ہوئے ضبطِ تحریر میں لاؤں تو معلوم نہیں کتنے صفحے سیاہ ہو جائیں مختصر یہ کہ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے ایک نئی دنیا اپنی تمام رنگا رنگیوں اور اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھ موجود ہو گئی ہے جس کو میں نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اور جس کے دیکھنے کی مجھے کوئی توقع ہی نہیں تھی۔ مجھے شعراء اور ان کے کلام سے آغازِ طفولیت سے ہی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ اس زمانے میں بھی میں کسی نہ کسی حد تک میرؔ اور سوداؔ، انشاءؔ اور مصحفیؔ، غالبؔ اور ذوقؔ، انیسؔ اور دبیرؔ، داغؔ اور امیرؔ کے کلام سے واقف ہو چکا تھا لیکن اقبالؔ میرے لئے بالکل نیا شاعر تھا اور اس کی شاعری میرے لئے ایک ایسی چیز تھی جس کی مثال مجھے پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ کوہ ہمالہ والی نظم میں اقبال نے فطرت کے حسن کی نقاشی کی ہے۔ میں چونکہ اس حسن کا بچپن ہی سے نہ صرف قدردان بلکہ پرستار ہوں یہ نقاشی مجھے بڑی دلچسپ اور دلکش نظر آئی۔ میں جب اس شعر پر پہنچا۔

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر   خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تو میری عجیب حالت ہو گئی۔ میرا تخیل پرواز کرنے لگا اور آن کی آن میں میں نے اپنے کو کوہ ہمالہ کے دامن میں پایا۔ تخیل کی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ کوہ ہمالہ میرے سامنے برف کی "دستارِ فضیلت" باندھے کھڑا ہے جس پر "مہرِ عالم تاب" کی ہزارہا کرنیں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ آہ! بچپن کا تخیل بھی کتنا طاقتور اور کتنا پُرلطف ہوتا ہے۔

میں نے اس نظم کو کئی مرتبہ شروع سے آخر تک پڑھا اور نہیں کہہ سکتا کہ کتنا لطف اٹھایا۔ اس دن سے آج تک اگرچہ اس کو ایک زمانہ گذر چکا ہے میں اس نظم کو کم از کم مہینہ میں ایک مرتبہ بلکہ بعض اوقات ہفتہ میں دو چار مرتبہ پڑھ لیتا ہوں اور ہر دفعہ اپنے اندر ایک طوفانِ مسرت محسوس کرتا ہوں۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کے باعث میں اقبال کی شاعری سے پہلی مرتبہ روشناس ہوا۔ اس وقت سے اب تک مجھے اقبال اور اس کی شاعری سے بڑا شغف رہا ہے۔ اس کے بعد کا ذکر ہے کہ میں اپنے والد اور خاندان کے ساتھ ایک ضلع میں رہا کرتا تھا۔ ہمارا مکان بستی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے قریب چند مزدور اور باغبان تو رہا کرتے تھے مگر کسی ایسے شخص کا مکان نہیں تھا جس سے یا جس کے خاندان سے میں اپنی مجلسی حیثیت کے

لحاظ سے ربط پیدا کر سکتا۔ اس زمانہ میں میرے بڑے بھائی علیگڈھ میں زیر تعلیم تھے اور والد بالعموم دورے پر رہا کرتے تھے۔ میں مجبور تھا کہ بڑی حد تک اپنی زندگی کو تنہائی میں گذاروں اور اپنی مرضی کے مطابق کتابوں کا مطالعہ کرتا رہوں۔ والد نے میری صحت کی خرابی کے باعث مجھے کسی مدرسہ میں شریک نہیں کرایا تھا اس لئے میں آزادی سے اپنی پسند کے موافق کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا اور جب اس کام سے طبیعت اکتا جاتی تھی تو اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہو جایا کرتا تھا۔ یہ زمانہ میرے لئے بڑا نازک اور طوفانی تھا کیونکہ میں آغاز شباب کی خطرناک منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ آغاز شباب کا زمانہ انسان کی زندگی میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان طفلانہ کھیلوں اور اپنے کم عمر دوستوں سے کچھ بیزار ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ بڑے لوگوں کی مجلسوں اور کھیلوں میں آزادی کے ساتھ شریک بھی نہیں ہو سکتا۔ فطرتاً اس زمانہ میں انسان کو تنہائی کا تلخ احساس ہوتا ہے اور دنیا کی بندشوں کے خلاف اس کے دل میں بغاوت کے جذبات بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ یوں بھی ایک انسان کے دل میں تنہائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے میرے دلی جذبات کی کیا کیفیت ہو گی۔ میں حقیقی معنوں میں بالکل تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ ایک طرف تو میرے چھوٹے بھائی بہن مجھ سے بہت زیادہ کم عمر تھے اس لئے میں ان کے ساتھ رات دن کھیل میں مصروف رہ کر اپنے وقار کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور دوسری طرف جن لوگوں سے مثلاً ملازمین وغیرہ سے مجھے سابقہ پڑتا تھا۔ میں ان کے ساتھ بھی بلا تکلف اور بغیر اذیت محسوس کئے ہوئے اپنا زیادہ وقت نہیں گذار سکتا تھا۔ یہ زمانہ میری زندگی کا بڑا نازک دور تھا جس میں قوس قزح کی رنگینیاں بھی تھیں اور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک بھی۔ اس زمانے میں میرے دل کی دنیا پر کبھی آفتاب عالم تاب کی ہزارہا کرنیں جگمگاتی تھیں اور کبھی سیاہ بادلوں کی وحشت ناک تاریکی بھی چھا جاتی تھی۔ میں اس زمانے میں ذہنی اعتبار سے بھی اور مادی اعتبار سے بھی سخت ہولناک تنہائی کی مصیبتیں برداشت کیا کرتا تھا اگرچہ اس زمانہ کو ایک طویل عرصہ گذر چکا ہے لیکن مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنا دل بہلانے کے لئے کیسی کیسی دلچسپ ترکیبیں نکالا کرتا تھا۔ کبھی تو بلند درختوں پر چڑھ کر بیٹھ جاتا تھا اور نیلگوں آسمان کی طرف گھنٹوں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی ندی کے کنارے جا کر چھوٹے چھوٹے ریت کے ذروں کو جمع کرتا تھا اور پانی کی لہروں کو گن گن کر وقت کاٹا کرتا تھا۔ کبھی اشعار گنگناتا تھا اور کبھی یہ تصور کر کے کہ میرے سامنے ہزارہا لوگ بیٹھے ہوئے ہیں حسن فطرت پر برجستہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ تمام ترکیبیں بھی میرا دل بہلانے کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوتی تھیں۔ میں بالآخر سخت مایوسی اور کوفت کی حالت میں اپنے پلنگ پر جا لیٹتا تھا اور دل ہی دل میں اپنے سے سوال کرتا تھا کہ آخر اللہ میاں نے مجھ کو کیوں پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب مجھے کیا ملتا۔ میں اس زمانہ کو آج تک یہی سوال کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن ابھی تک اس کا کوئی جواب نہیں ملا ہے اور نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے۔ خیر اس زمانے کا ذکر ہے کہ میں اردو نظم و نثر کی کتابیں بڑی کثرت سے اور بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اقبال کے کلام سے واقفیت کے متذکرۂ صدر واقعہ کے بعد سے مجھے اس کے کلام سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں کتب فروشوں کی فہرستوں کو بالاستیعاب دیکھا کرتا تھا اور جہاں کہیں اقبال کی کسی نظم کے شایع ہونے کی کیفیت معلوم ہوتی تو فوراً بذریعہ وی، پی اس نظم کو منگوا لیتا تھا۔ اس زمانہ میں بانگ درا شایع نہیں ہوئی تھی۔ اقبال کی چھوٹی چھوٹی نظمیں مرغوب ایجنسی لاہور سے شایع ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اس ایجنسی سے شکوہ، جواب شکوہ، تصویر درد اور شمع و شاعر منگوائیں اور روزانہ ان کا مطالعہ وظیفے کے طور پر کیا کرتا تھا۔ شروع ہی سے مجھے اس کا کامل احساس ہو گیا تھا کہ اقبال کی شاعری میری روح کی آواز ہے۔ جب کبھی اقبال کی کوئی تازہ نظم وصول ہوتی تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ میں کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اس کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس وقت مجھے نہ تو نیلگوں آسمان کو دیکھنے کا خیال آتا اور نہ ندی کے کنارے جا کر ریت کے ذروں کو جمع کرنے کا۔ جب تک اقبال کی نظم میرے ہاتھ میں رہتی، میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ایک بہت بڑی نعمت غیر متوقع طور پر میرے ہاتھ لگی ہے۔ اس زمانہ میں مجھے اقبال کی اکثر طولانی نظمیں زبانی یاد ہو گئی تھیں اور میں تنہائی کے

تلخ ترین احساس کو مٹانے کے لئے ان کو اکثر پڑھا کرتا تھا۔ خاص کر شمع و شاعر کے یہ دو اشعار ؎

درجہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم | نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ
مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم | در طوافِ شعلہ‌ام بالے نہ زد پروانۂ

میری زبان پر ہمیشہ جاری رہتے تھے۔ میں شام کے وقت وسیع میدانوں میں تنہا جادہ پیمائی کرتے ہوئے ان اشعار کو بڑے سوز و گداز سے پڑھا کرتا تھا اور مجھے ان سے ناقابلِ بیان تسکین حاصل ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ایسے لمحوں میں جب مجھے اپنی تنہائی کا احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوتا تو مذکورہ بالا دو اشعار خود بخود میری زبان پر جاری ہو جاتے تھے اور میں اپنے دل سے کہتا تھا کہ دنیا میں ایک تو ہی ایسا نہیں ہے جو تنہائی کی جانفرسا تکالیف برداشت کر رہا ہے۔ خود ڈاکٹر اقبال کو بھی اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس تصور کے ساتھ ہی مجھے بڑی تسکین حاصل ہوتی تھی اور میں اپنے اندر ایک حیاتِ تازہ محسوس کرتا تھا جو زندگی اور اس کے سارے مصائب کو بہ آسانی برداشت کر سکتی ہے۔ یہ زمانہ بدل گیا۔ میری زندگی کا یہ نازک دور گذر گیا۔ آغازِ شباب کا عجیب و غریب اور رنگین عہد اپنی تمام طفلانہ دلچسپیوں کے ساتھ اختتام کو پہنچ گیا اور میں اب شباب کی مست و مخمور اور دلکش سرحد میں داخل ہوا۔ حالات بھی بدل گئے۔ مجھے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ ایک لطیفۂ غیبی کی بدولت میں میٹر کامیاب ہو گیا۔ اور مجھے کلیہ جامعۂ عثمانیہ میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہاں میرے لئے دوستوں کی کچھ کمی نہیں تھی۔ پورے کالج میں مجھے ہر طرف اپنے دوست ہی دوست نظر آنے لگے۔ میں نے تہیہ کیا کہ تقدیر نے جس نعمت سے (یعنی دوستوں سے) مجھے آغازِ شباب میں محروم رکھا تھا۔ اب اسی کو حاصل کروں اور اس طرح حاصل کروں کہ آج تک کسی نے اس طرح حاصل نہ کیا ہوگا۔ میں نے اپنے دوستوں کے حلقے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی دل میں ٹھان لی۔ مجھے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ چند ماہ کے اندر میرے دوستوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انٹرمیڈیٹ سال اول سے لے کر ام، اے سال آخری تک ہر جماعت میں مجھے اپنے چند دوست مل گئے۔ اب میں تنہائی سے سخت بیزار ہو گیا تھا اور ممکنہ حد تک اپنے کو اس خطرہ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس زمانے میں میں تنہا بیٹھ کر کبھی کتابوں کا مطالعہ نہ کرتا تھا۔ بلکہ جہاں تک بھی ممکن ہوتا دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ امتحان کی تیاری بھی پانچ چھ دوستوں کے ساتھ کرتا تھا۔ یہ زمانہ میرے لئے اگرچہ بڑا دلچسپ اور پُرلطف رہا لیکن کبھی کبھی رات میں سوتے وقت یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنی پہلی سطح پر نہیں رہا ہوں بلکہ کچھ نیچے اتر آیا ہوں اور اگر یہی لیل و نہار ہیں تو غالباً بہت کچھ نیچے اتر آنا پڑے گا۔ لیکن مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ کیا مجھے اس کا حق حاصل نہیں تھا کہ میں جو اتنے عرصہ تک تنہائی کے جانفرسا مصائب برداشت کر چکا ہوں کچھ دنوں تک دوستوں کی دوستی کا لطف اٹھاؤں اور زندگی کو ہنس بول کر گذاروں۔ میں اس خیال کے تحت اپنی موجودہ زندگی میں تبدیلی کرنے پر کسی طرح تیار نہ تھا۔ وقت سے بہت پہلے کالج جاتا تھا۔ جہاں میرے دوست میرے منتظر رہتے تھے اور کالج ختم ہونے کے بہت دیر بعد تک دوستوں سے باتیں کرتے چمن میں گلگشت کرتا رہتا تھا۔ تعطیلات میں بھی میں اپنا وقت دوستوں کے ساتھ کسی نہ کسی رسٹوران میں گزارتا تھا یا کبھی گنڈی پیٹھ یا ہفت گنبدوں کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ اس طرح دو تین سال گذر گئے۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ تنہائی اگرچہ سخت تکلیف دہ اور اذیت رساں ہے مگر وہ حقیقت ہے اور دوستوں کا لطف ملاقات گو کتنا ہی فرحت بخش اور دلکش ہو مگر ایک سراب ہے۔ انسان تنہا پیدا ہوتا ہے اور تنہا ہی مرتا ہے۔ دوست عمر کی چند منزلوں تک ساتھ دے سکتے ہیں مگر ہمیشہ تو ساتھ نہیں دے سکتے۔ جس زمانہ میں میرے دل میں یہ احساس رفتہ رفتہ پیدا ہو رہا تھا اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ میرے ایک دوست نے برسبیل تذکرہ اقبال کی پیام مشرق شایع ہونے کا ذکر کیا۔ اس کتاب کو شایع ہو کر غالباً کچھ عرصہ گذر چکا تھا مگر میں نے ایسے دوستوں کے ہنگاموں میں محویت کے باعث اب تک نہیں دیکھا تھا۔ پیام مشرق کا ذکر آیا۔

عزیز دوست کی زبانی سن کر میں بیتاب ہو گیا اور فوراً ایک کتب فروش کی دکان پر دوڑا دوڑا گیا جن اتفاق سے مجھے یہ کتاب وہاں مل گئی میں نے اسے خرید لیا اور گھر جاکر رات کے وقت اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ دیر تک محویت کے عالم میں اس کو پڑھتے رہا۔ آدھی رات کے وقت اچانک میری نظر "تنہائی" والی مشہور و معروف نظم پر پڑی۔ میں اس عجیب وغریب نظم کو صبح کے چار بجے تک پڑھتا رہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی اور میرے جذبات کی طوفان خیزی کس درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ خاص کر اس بند کو پڑھتے وقت ؎

شدم بہ حضرتِ یزداں گذشتم از مہ و مہر
که در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل
چمن خوش است ولے درخورِ نوایم نیست
تبسّمے بہ لب او رسید و ہیچ نہ گفت

میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔

مسلسل تین روز تک میں کالج نہیں گیا اور مسلسل تین روز تک صبح کے سات بجے سے رات کے ایک ایک دو دو بجے تک میں پیام مشرق پڑھتا رہتا تھا۔ پیام مشرق میں مجھے وہ سب کچھ مل گیا جس کے لئے میری روح اتنے عرصہ سے بے قرار تھی۔ تخیل، ترنم، فلسفہ، تصوف، حسن، عشق، فطرت، میں نے اس چھوٹی سی کتاب میں کیا نہیں دیکھا۔ اگر میں ان تمام احساسات، جذبات اور تصویرات کو یہاں پیش کروں جو اس کتاب کو پڑھتے وقت میرے قلب و دماغ میں پیدا ہوئے تھے تو یہ داستان بہت طولانی ہو جائے گی۔ اس لیے چند دلچسپ اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں:۔ غزل کا شعر ہے

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم براں

غور کیجئے کہ اقبال نے تصور کے لئے اس شعر میں کیسی عجیب دنیا فراہم کی ہے جو بہ یک وقت دلکش بھی ہے۔ اور غم آگیں بھی۔ دلکش اور غم آگینی کا اس شعر میں جو سنگم نظر آتا ہے وہ میرے لئے معجزہ سے کم نہیں ہے۔ اس شعر کا مجھ پر کیا اثر ہوا اس کا ذکر کر کے میں شعر کے لطف کو ضائع کرنا نہیں چاہتا یہ باتیں محسوس کرنے کی ہیں بیان کرنے کی نہیں ہیں۔ البتہ اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس شعر کی بدولت میں ہفتوں تک تخیل کی ایک ایسی دنیا میں پرواز کرتا رہا، جہاں ہر طرف خونِ شفق کی رنگینیاں نظر آتی تھیں اور جہاں ہر وقت آبشاروں کی مدھم اور رادا اس موسیقی سامعہ نوازی کرتی تھی:۔ ایک اور غزل کا شعر ہے

از ما بگو سلامے آں یارِ تند خو را
کاتش زداز نگاہے یک شہر آرزو را

اس معشوق کی شان ملاحظہ کیجئے۔ وہ معشوق ہی کیا جو یک شہر آرزو کو ایک نگاہ گرم سے نذرِ آتش نہ کر سکے۔ اقبال کے پاس معشوق کا تخیل حد درجہ بلند اور پاکیزہ ہے۔ یہاں وہ حسن کا انتہائی کمال انتہائی دلاویزی، اور انتہائی پاکیزگی دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے انسان کو مہد سے لے کر لحد تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اس کا معشوق اور شاعروں کے معشوق کی طرح نہیں ہے کہ جس سے دس یا پانچ سال ہی میں طبیعت اکتا جاتی ہے اور بوالہوسی "کوئی اور" کے نعرہ لگانے لگتی ہے۔ اسی تخیل کو اقبال کی ایک اردو غزل کے حسب ذیل دو اشعار میں ملاحظہ فرمائیے۔

پردہ چہرہ سے اٹھا انجمن آرائی کر
چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کیسی
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر

ایک اور غزل کا شعر ہے جو کسی صوفی کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔

بزمِ ما تشنہ و صہبا نہ تو داری و نہ من
من جواں ساقیؐ و تو پیر کہن میکدہ

اس شعر کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو زندگی اور اس کے راز کو سمجھنے کے لئے بے قرار رہتے ہیں وہ کبھی فلسفیوں کے خشک مقالوں پر وقت ضایع کرتے ہیں اور کبھی صوفیوں کے آستانوں پر جبہہ سائی فرماتے ہیں۔ لیکن دل کا سکون اور اطمینان انھیں کہیں سے بھی نہیں ملتا مجھے تو اس شعر میں ہزار ہا بے قراردلوں کی دھڑکن صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ بزم تشنہ ہے اور تشنہ ہی رہے گی۔ آہ! اس کی پیاس کون بجھا سکتا ہے۔

اقبال کی مشہور نظم "نوائے وقت" کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

چنگیزی و تیموری مشتے زغبارِ من
ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من

انسان و جہانِ او از نقش دگارِ من
خونِ جگرِ مرداں سامان بہارِ من

من آتشِ سوزانم من روضۂ رضوانم

میں عرض نہیں کرسکتا کہ اس بند کو پہلی مرتبہ پڑھتے وقت میرے دل کی کیا کیفیت ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اچانک ایک ویرانے میں مجھے دنیا کے سب سے زیادہ قیمتی جواہرات مل گئے ہیں۔ میں حیرت سے چاروں طرف دیکھتا تھا اور اس بند کو پڑھتا تھا اور پھر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگتا تھا۔ اس وقت مجھے وقت کی یہ آواز فضاؤں میں ہر طرف گونجتی سنائی دیتی تھی۔ اُف! اس بند میں کتنا ترنم کتنا تخیل اور کتنی حقیقت ہے۔

"آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید" والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چہ خوش ست زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل کوہ و دشت و صحرا بہ مے گداز کردن

ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہ آسماں نوردں بہ ستارہ راز کردن

بگداز ہائے پنہاں بہ نیاز ہائے پیدا
نظرے ادا شناسی بہ حریم ناز کردن

اس نظم میں اقبال نے تخیل کے لئے ایک عجیب بستی بسائی ہے۔ آدم بہشت سے نکالا گیا ہے۔ انوار قدیم کی یاد اس کے دل کو تڑپا رہی ہے بہشت کی جدائی نے غم کے اتھاہ سمندر میں اس کے وجود عزیز کو غرق کردیا ہے۔ ندامت اور غم کے جانگسل جذبات اس کے دل کی کشتی کو جھکولے دے رہے ہیں۔ وہ ایک ویرانے میں تنہا بالکل تنہا بیٹھ جاتا ہے اور اپنے جذبات کو آنسوؤں کے ذریعہ بہادینا چاہتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کچھ کہتا ہے۔ اس کے الفاظ نغمہ بن کر زبان سے نکلتے ہیں جس کو سن کر کوہ و دشت و صحرا کے دل کانپنے لگ جاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ یہاں اس ابن آدم نے آدم کے جذبات کی کیسی صحیح ترجمانی کی ہے اور آدم کے دوسرے فرزندوں کے لئے تخیل کی کیسی دلکش دنیا آباد کی ہے۔

اس قسم کی صدہا مثالیں پیام مشرق سے نکال کر پیش کی جاسکتی ہیں مگر میں ان کو بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال کی پیام مشرق دیکھنے کے بعد مجھ پر اس کے شاعرانہ کمال اور بلند تخیل کا کتنا زبردست اثر پڑا ہے۔ یہ ایک واقعہ اور حقیقت ہے کہ اس کی شاعری میرے قلب و دماغ پر پوری طرح مسلط ہوچکی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے جو شعر اس عظیم المرتبت شاعر کے قلم سے نکلتا ہے مجھے اپنی روح کی صدائے بازگشت نظر آتا ہے۔ میں اس کے کلام کا مطالعہ محض شاعری کا لطف اٹھانے کی خاطر نہیں کرتا ہوں بلکہ جس طرح کوئی عقیدت مند مرید اپنے مرشد کے ملفوظات کو کمال عقیدت کے ساتھ پڑھتا ہے اسی طرح میں اقبال کے ایک ایک شعر کو پڑھتا ہوں اور کیف کے سمندر میں غرق ہوجاتا ہوں۔ پیام مشرق کے بعد میں نے اقبال کی بلا استثنا تمام تصانیف خریدلی ہیں اور ہمیشہ ان کو دیکھتے رہتا ہوں۔

قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اقبال نے اس حد تک اور اس شدت کے ساتھ مجھے کیوں متاثر کیا ہے۔ یہ ایک نازک سوال ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس میں الجھ کر میں بڑی مشکلوں سے اس سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں۔ تاہم کوشش کرتا ہوں کہ اس کی نسبت سرسری طور پر چند خاص خاص وجوہ کا یہاں اظہار کر دوں۔

میرا خیال ہے کہ اقبال کی جس خصوصیت نے مجھے حد سے زیادہ اس کا گرویدہ بنا دیا ہے وہ اس کا لہجہ (TONE) ہے۔ اس کی شاعری کا لہجہ اتنا بلند اور اثر انداز ہے کہ مجھے اردو اور فارسی شاعری میں اس کی مثال کہیں نظر نہیں آتی۔ لہجہ کی تعریف کرنی اتنی ہی مشکل ہے جتنی خود شاعری کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ لہجہ شخصیت کا ایک آئینہ ہوتا ہے۔ جس میں شاعری کے صحیح خدوخال پوری وضاحت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اقبال اپنے لہجے کے لحاظ سے تمام اردو فارسی شاعروں میں بہت ممتاز ہیں۔ وہ کسی موضوع پر بھی اظہار خیال کرے اپنے مخصوص لہجہ ہی میں کرتا ہے جس سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اقبال بول رہا ہے۔ کوہ ہمالہ جیسی ابتدائی نظموں سے لے کر ضرب کلیم اور بال جبریل کی آخری نظموں تک اقبال کا لہجہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ میں اس امر کو شاید تسلیم کر لوں کہ اقبال نے بعض بعض نظموں میں دوسروں کے خیالات سے اکتساب فیض کیا ہے اور کہیں کہیں توارد خیال بھی نظر آ جاتا ہے لیکن کسی طرح یہ نہیں مان سکتا کہ اقبال کا لہجہ کسی حد تک بھی کسی دوسرے شاعر کا رہین منت ہے۔ اقبال اپنے لہجے میں شروع سے آخر تک اقبال ہے اور یہاں کسی دوسرے شاعر کی پرچھائیں تک نہیں پہنچی ہیں! اقبال کا لہجہ کیا ہے؟ وہ شاعری کا ایک معجزہ ہے وہ ایک ایسے شخص کی آواز ہے جو دلوں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے عظیم المرتبت انسان کی صدا ہے جو قوموں کے باطن میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ آسمانی آواز ہے۔ ربانی نغمہ ہے۔

دوسری خصوصیت جس کی وجہ سے اس کی شاعری نے میری روح پر پوری طرح قبضہ جما یا ہے اس کے تخیل کی بلندی اور رفعت اور اس کا انقلاب آفریں ترنم ہے۔ اقبال کے پورے کلام میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آ سکتی جس میں کسی قسم کا ابتذال یا عامیانہ پن کا ذرا سا بھی رنگ جھلکتا ہو۔ اس کی بلند فطرت کسی مبتذل، ناپاک اور محدود چیز کو ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس نے حسن و عشق کے میدانوں میں بھی جولانی دکھائی ہے مگر کہیں بھی ہم اسے کسی "بیسوا" کی زلف گرہ گیر میں پھنسا ہوا نہیں دیکھتے۔ وہ حسن کو ایک انسان ایک شاعر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اسی طرح اس کی بلند فطرت وطنیت کے محدود تخیل سے بھی برگشتہ رہی ہے۔ جس طرح اس نے حسن کو ایک بوالہوس نواب کی آنکھ سے نہیں دیکھا بالکل اسی طرح وہ وطن کو بھی ایک سود خوار سرمایہ دار بن کر کبھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھ کروڑوں انسانوں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کو دیکھنے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ ایسے بوالہوس نوابوں یا سود خوار سرمایہ داروں سے مطلقاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہی راز اقبال کے انقلاب آفریں ترنم کا ہے۔ اس کا ترنم بربط، ارغنول یا ساز کا ترنم نہیں ہے بلکہ یہ وہ ترنم ہے جو فضائے بسیط میں ستاروں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے جس سے کائنات میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ہر ذرہ ایک کیف سرمدی میں ڈوب جاتا ہے۔

اقبال کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت جو کچھ کم اہم نہیں ہے یہ ہے کہ وہ مجھے ہمارے عہد کا شاعر نظر آتا ہے۔ وہی ناقابل برداشت مصائب، وہی شکوک و شبہات، وہی زندگی کے اہم اور پیچیدہ مسائل جن سے آج کل ہم دوچار ہیں اقبال بھی ان سے دوچار ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی اور حافظ، خیام اور امیر خسرو، نظیری اور عرفی، میر تقی اور میر درد، حکیم مومن خاں اور غالب، جامی اور اکبر کا کلام ہمیں بہت متاثر کرتا ہے اور ہم پر وجد آفریں اثرات پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوتا ہے لیکن ان سب شعراء کے کلام کو پڑھتے وقت ہمیں ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اور ہماری تشنگی پوری طرح رفع نہیں ہو سکتی ہے۔ یعنی ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کہ یہ تمام

شعرا ہمارے دور کے نہیں ہیں۔ ان کے زمانے میں زندگی کے مسائل اس سے بہت مختلف تھے جن سے آج کل ہم دوچار ہیں۔ ان کا زندگی کے متعلق نقطۂ نظر اگر بالکلیہ نہیں تو کسی نہ کسی حد تک ہمارے نقطۂ نظر سے ضرور مختلف تھا۔ تشکیک ارتیابیت جو موجودہ دور مادیت کا ایک تلخ ثمرہ ہے اس کا انھوں نے کبھی چکھا ہی نہیں تھا، ان کے دلوں میں شکوک اور شبہات کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مذہب اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کی نسبت انھوں نے جرح و قدح کرنی سیکھی ہی نہیں تھی۔ ان کے دلوں میں کبھی یہ خیال پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ تصوف وجدان اور عشق پر کوئی بحث مباحثہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کو بطور مسلم حقائق کے تسلیم کرتے تھے اور ان پر ایمان رکھتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ ان کے کلام میں ایمان اور ایقان کے بکثرت جلوے نظر آتے ہیں۔ البتہ صرف خیام کے کلام میں کہیں کہیں کچھ ارتیابیت اور تشکیک کی جاں سوز بجلیاں چمکتی ہیں مگر اس کی ارتیابیت ہمارے دور کی ارتیابیت سے بہت مختلف ہے بلکہ صحیح معنوں میں اسے ارتیابیت قرار دینا بھی مشکل ہے۔ علاوہ ازیں خیام کے کلام میں بھی بہت سارے خیالات ایسے موجود ہیں جو اس کے دور کے عام رنگ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں غرض کہ متذکرہ صدر شعرا ایک بالکل جداگانہ دور کے شعرا تھے اور ہمارا دور کچھ اور ہی دور ہے۔ یہی باعث ہے کہ ان کا کلام گو بڑی حد تک لائق احترام ہے۔ لیکن ہماری روحوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے قاصر رہتا ہے۔ ان کا کلام پڑھتے وقت اکثر اوقات ہمارا دل چیخ اٹھتا ہے کہ انھوں نے زندگی اور اس کے تلخ حقائق کو اس طرح محسوس نہیں کیا تھا جس طرح آج کل ہم محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن اقبال کے ہاں یہ کمی نہیں ہے۔ وہ کامل اور مکمل طور پر ہمارے دور کا اور ہمارا شاعر ہے۔ اس نے ہر چیز کو اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح ہم محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے ہماری روحوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہمارے بے پایاں درد و غم میں ہمارے ساتھ آنسو بہاتا ہے۔ وہ ہمارے شکوک و شبہات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کیونکہ اسے اس جہنمی آگ کے خوب تجربے ہیں۔ وہ ہمارے مصائب و آلام سے ہم سے زیادہ واقف ہے اور ہم کو ان سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں یقین کی حرارت اور ایمان کا نور ہے۔ وہ ناامید ہونا نہیں جانتا۔ ناامیدی اس کے نزدیک کفر سے کم نہیں۔ وہ حیات تازہ کا پیامبر اور نغمۂ عمل کا مطرب آتش نفس ہے۔ وہ ایک سپہ سالار کی طرح اپنی شاعری کا علم بلند کرتا ہے اور اپنے مخصوص لہجے میں جو دلوں کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے بآواز بلند ارشاد کرتا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

اس آواز کو سنتے ہی ہماری روحیں تڑپ اٹھتی ہیں اور ہمارے دلوں میں عمل کا قیامت خیز طوفان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں ہر طرف امید کی کرنیں جگمگاتی نظر آنے لگتی ہیں۔ اقبال کی بے مثال عظمت کا یہی سب سے بڑا راز ہے۔

اقبال کی ایک اور خصوصیت جو اس کے شاعرانہ کمال پر دلالت کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری بلکہ مشرقی شاعری کو بے حد وسیع اور بے پایاں بنا دیا۔ اس کے پہلے شاعری صرف گل و بلبل کی حکایات، حسن و عشق کی داستانیں، مدح اور ہجو کے طومار، لغت اور منقبت کے کارنامے ہوتے تھے یا اس سے کچھ ترقی ہوئی تو قوم پر نوحہ خوانی۔ لیکن اقبال نے اس میدان کو بہت وسیع کیا۔ اس نے اپنے زور قلم اور بلندیٔ تخیل سے یہ محسوس کرایا کہ ہر وہ بات جو انسان کے قلب کو متاثر کرے شاعری کی قلمرو میں داخل ہے۔ یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ اقبال نے ہماری شاعری کی آبجو کو دریائے ذخار اور اس کے محدود گلستاں کو لامحدود دشت پر بہار بنا دیا اور شاعری کی دنیا دل کی دنیا کے ہم آہنگ بنانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی چند ایک خصوصیات کو بے نقاب کر کے میں نے تھوڑی بہت کامیابی حاصل کرلی ہے۔

اب اس مضمون کو طول دینا مجھے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ میرا ایقان ہے کہ اقبال کی اور متعدد خصوصیات ایسی ہیں جن کا ذکر لازمی ہے لیکن میں یہاں صرف اپنے ذاتی تاثرات کو پیش کر رہا ہوں اقبال کی شاعری کی نسبت کوئی عالمانہ مقالہ سپرد قلم نہیں کر رہا ہوں۔ اس لئے ان کا ذکر کچھ ایسا ضروری نہیں ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اقبال کی شاعری نے مجھے جس حد تک اور جس قوت کے ساتھ متاثر کیا ہے اس کا اظہار زبان قلم سے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اقبال اس عالم فانی میں پیدا نہ ہوا ہوتا اور اس نے اپنے غیر فانی نغموں سے دنیا کو متلاطم نہ کیا ہوتا تو میرے تخیل کی دنیا اس سے بہت مختلف ہوتی جو آج ہے۔ غالباً میں اس صورت میں کوئی اور ہی قسم کا آدمی ہوتا۔ ایک فاضل مورخ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ اگر کلیو پیٹرا کی ناک ذرا چھوٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ یہی کیفیت میرے دل کی دنیا کی بھی ہے۔ اگر اقبال کی شاعری اس سے ذرا مختلف ہوتی جو آج ہے تو یقیناً میرے دل کی دنیا بھی کچھ اور ہی ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ٹھیک اس قسم کا احساس مجھ جیسے اور ہزار ہا لوگوں کا بھی ہوگا اور ہزار ہا لوگ ایسے بھی موجود ہوں گے جو صاف الفاظ میں اس احساس کا اظہار نہ کر سکتے ہوں گے مگر دراصل اقبال کی شاعری نے ان کے اندر بھی وہی انقلاب پیدا کیا ہوگا جو میرے دل میں کیا ہے۔

اب میں اس مضمون کو اقبال کے حسب ذیل شعر پر ختم کرتا ہوں جو اس شہنشاہِ اقلیم معانی کے رہ گرائے عالم جاودانی ہونے کے بعد سے میری زبان پر خود بخود جاری ہو گیا ہے اور جس سے آج کل مجھے بے انتہا تسکین حاصل ہو رہی ہے!

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس کا نہ فردا ہے نہ دوش

اشک

مُطربِ آتش نفس"

اقبال کی آواز میں جبریل نغمہ بار تھا
نغمہ نہ تھا اقبال کا احساس کی قندیل تھا
دیتا تھا درسِ بے خودی قرآن کے انداز میں
دیتا رہا، دیتا گیا سب کو اخوت کا سبق
سینے میں قلبِ مضطرب فطرت نے بخشا تھا اسے

ویرانۂ اسلام پھر صد روکش گلزار تھا
یا لحن تھا داؤد کا یا صور اسرافیل تھا
پنہاں تھے اسرار خودی علم و عمل کے ساز میں
اسلامیوں کو دے گیا صدق و محبت کا سبق
"تعمیر ملت" کے لئے قدرت نے بھیجا تھا اسے

وہ "مطرب آتش نفس" فرض اپنا پورا کر گیا
اور سرمدی نغمات سے مسلم کا دامن بھر گیا

سید عبد اللہ جعفری صیغر

اقبال تاریخ وطن کے آئینہ میں

تاریخِ وطن ہمیشہ اپنے فرزندوں سے یہی مطالبہ کرتی ہے کہ "خونِ جگرِ مرداں سامانِ بہارِ من"۔ نہ صرف مطالبہ بلکہ ایسے سپوتوں کو پیدا کرنا بھی اس کا کام ہے اقبال نے "مرداں" کہہ کر ان کی کاوشوں کو "خونِ جگرِ مرداں" سے تشبیہہ دی ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ اقوام کو باوقار زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے، ان میں جذبۂ حمیت کو زندہ رکھتی ہے، ان کی رگِ غیرت کو متحرک کرتی ہے۔ تاریخ ہند نے قرنہا قرن آریائی سیلابوں، ترکانی تیز و تند انقلابوں اور خاص کر "ہنگامۂ افرنگی" سے سینہ سپر ہو کر ایک ایسا سپوت پیدا کیا جس کو دنیا مجاہد اعظم کے نام سے یاد کرے گی۔ اقبال اپنی تمام زندگی میں وطن کے لئے آخر دم تک باطل سے جہاد کرتا ہوا جاں بحق ہوا۔ اس کی تلخ راست گوئی نے ایسی ہستیاں پیدا کیں جو اپنے خون سے سرزمین ہند کو سینچیں گی۔ اور اس وقت مادرِ ہند کا اپنے سپوتوں سے یہی مطالبہ ہے۔ کہ "خونِ جگرِ مرداں سامانِ بہارِ من" اقبال نے اپنی ایک فارسی نظم "نوائی وقت" میں زمانہ کی اس طرح توضیح کی ہے۔ ع "پنہاں بہ ضمیرِ من صد عالم رعنا بیں" لیکن یہ مصرع دراصل اقبال کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ اقبال نہ صرف شاعر و فلسفی بلکہ تاریخ کا زبردست ماہر بھی تھا۔ اس نے تاریخ ہند کا مطالعہ نظرِ بینۂ تاریخ سے وہ دفینے نکالے کہ ساری دنیا متحیر ہے۔ لکھنے والوں نے ان پر خوب لکھا، عالمانہ انداز میں لکھا مگر تاریکی نے ان کا دامن نہ چھوڑا۔ اقبال نے جب کبھی کسی تاریخی شخصیت پر توجہ کی تو اس انداز میں کہ چار دانگ عالم میں اس کی شہرت ہوئی۔ پڑھنے والوں نے کرید کرید کر اس شخصیت کو ظلمت سے نور کی طرف لانا چاہا اقبال نے ان کی اہمیت کو اس انداز میں جتایا کہ ان کی حقیقی عظمت آنکھوں میں پھر گئی۔ یہی وہ چیز ہے جو اس کی شاعری میں نمایاں ہے۔ یوں تو شاعر ہر دور میں پیدا ہوئے لیکن ان شاعروں اور اقبال میں زمین آسمان کا فرق ہے "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" کھلی دلیل ہے۔ خود بھی ہمیشہ کے لئے زندہ رہا اور سیکڑوں کو حیات جاوید دیتا گیا۔ اور ہندوستان کی شہرت پر مہر دوام ثبت کر گیا۔ بعید از امکان نہیں کہ ایک ہستی بجائے خود ایک عالم ہو لیکن اقبال کی ہستی کائنات کے گوناگوں عوالم کا ایک مرقع تھی۔ اور اس کا ضمیر کائنات کے سیکڑوں عوالم کے لئے اپنے اندر وسعت رکھتا تھا۔ اسی لئے کہیں تو وہ خدا سے مکالمہ کرتا ہے، کبھی تو آسمانوں پر اڑتا ہے، کبھی کائنات کی سیر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا بلند پرواز شاعر اگر عالم موجودات کے مختلف حصوں پر خیال آرائیاں کرے، کبھی سولینی کی تعریف کرے، کبھی مصطفیٰ کمال کی خوبیاں بیان کرے، کبھی اندلس کی طرف متوجہ ہو اور کبھی ہندوستان پر نوحہ کرے تو شور مچانا کہ اقبال محب وطن نہیں ہے تنگ نظری ہے۔ اقبال کے ترانے دراصل حب الوطنی پر مبنی نہیں ہیں خود اقبال کی زبانی سن لیجئے کہ وطن کی محبت میں کس طرح "تصویر درد" بنتی ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے — جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

پہلے دو شعروں میں شاعر نے اپنی حب الوطنی کا بلند پایہ ثبوت پیش کیا ہے اور خود کو "اہلی توحہ خواں" کہتا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات کا نقشہ کھینچا ہے اور نہایت ہی موثر طریقہ سے آخری دو شعروں میں اہل وطن کو متنبہ کرتا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں جب اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ جلسے میں ایک طویل نظم "نالۂ یتیم" سنائی اس کے بعد ہر سال ایک نئی نظم سنایا کرتے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں لارڈ کرزن وائسرائے ہندوستان آیا اور ان کے زمانے میں مختلف سیاسی مسائل، بالخصوص تقسیم بنگال کی وجہ سے سارے ہندوستان میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کانگریس کے احتجاج کی وجہ پورے ہندوستان میں ہیجان پھیلا ہوا تھا۔ ان ہی سیاسی حالات کو اقبال نے تصویر درد میں پیش کیا ہے اور ہندوستانیوں پر اشعار کی صورت میں بیداری کے تازیانے برسائے ہیں خاص کر یہ شعر قابل غور ہیں۔

وطن کی فکر ناداں! مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ ہے اقبال کی حب الوطنی اور یہ ہے اقبال کا نظریۂ وطنیت، اقبال آغاز ہی سے محب وطن تھا اور آخر دم تک رہا۔ یورپ کے سفر کے بعد حب وطن میں نہیں بلکہ نظریۂ وطنیت میں ایک خاص تبدیلی ہوئی۔ جو یورپی اقوام کی بے لگام وطنیت کے خطرناک نتائج کے مشاہدہ سے رونما ہوئی۔ اقبال کا نظریۂ وطنیت اسلامی جذبات سے متاثر تھا۔ اور اسلام نظریۂ وطنیت کا قائل نہیں اور جس کا دل "صد عالم رعنا" کا حامل ہو، وہ کیوں کر کسی جغرافی حدود میں محدود ہو سکتا ہے چنانچہ لکھتا ہے ؎

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے — ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

بلا شبہ شاعر اعظم اقبال کی شخصیت قیدِ مقامی سے آزاد تھی۔ اور تاریخ عالم کو اس مایۂ ناز شاعر پر فخر ہے۔ لیکن ساتھ ہی اقبال نے اپنے ملک کی تاریخ پر جب نظر ڈالی تو دل چیر کر رکھ دیا۔ ترانۂ ہندی کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ کس طرح وہ اپنے ملک کی عظمت کو یاد دلاتا ہے۔

چشتی نے جس زمیں پر پیغامِ حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بارھویں صدی عیسوی کو ہند قدیم میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس صدی میں شہاب الدین غوری ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ہندوستان کی سلطنتوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ اگرچہ محمود غزنوی کے حملوں کی ابتدا ہو گئی [illegible] لیکن یہ حملے اس لئے اہم

ہیں کہ اس زمانہ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے۔ حملہ سے تین دن قبل ہی وہ اجمیر میں تشریف فرما ہو چکے تھے اور انھوں نے اپنی روحانی قوت سے بغیر کسی امداد کے اجمیریوں کے دلوں میں جگہ لے لی۔ اس واقعہ کو اقبال یوں یاد دلاتے ہیں۔ ع "چشتی نے جس زمیں پر پیغام حق سنایا"۔

ہندوستان کے مخلوط تمدن کے سب سے پہلے علمبردار گرونانک ہیں۔ نانک نے وحدت کی بانسری میں ہندو مسلم محبت کے گن گائے۔ نانک کی شخصیت اپنے پیغام کی اہمیت کے لحاظ سے تاریخ ہند میں' ناقابل فراموش ہے' اگر ہندوستان کی خوش نصیبی سے نانک کو موقع ملتا اور ان کے بعد ان کا پیغام اصلی حالت میں جاری رہتا تو شاید ہندی سیاسیات کا رخ آج کچھ اور ہی ہوتا۔ نانک کا پیام دراصل پیام محبت ہے اسی لئے اقبال نے کہا ہے۔ ع "نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا" بابر کو ملک ہند سے بڑی شکایت تھی۔ وہ یہاں کے لوگوں کے ذوق سے گھبراتا تھا۔ تزک بابری میں اس نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ یہاں کے لوگ دریاؤں کی طرف پشت کر کے مکان بناتے ہیں۔ ہندوستان کی گرمی سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ نہ صرف بابر بلکہ اس کے تمام ساتھیوں کو ہندوستان سے وحشت تھی' لیکن بابر کو کیا خبر تھی کہ اس کا خاندان' ہندوستان کا اس قدر گرویدہ ہو جائے گا کہ "ہندوستان جنت نشان" کو اپنا وطن بنائے گا۔ اور تاتاریوں کو تاتار چھڑا دے گا۔ اور اقبال کو یہ کہنے کا موقع دے گا۔ کہ "تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا" عربوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں یہ صاف ظاہر ہے کہ عرب قدرتاً ہندوستان کی طرف مائل تھے حضرت عمرؓ کے زمانے سے عرب ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ ۷۱۲ء میں حجاج بن یوسف کا داماد اور تاریخ عالم کا شہرۂ آفاق سپہ سالار عرب کے آسمانوں سے برق بے تاب بن کر نکلا اور سندھ کی فتح کے بعد سندھ ہی ہو جانا چاہتا تھا۔ اس واقعہ کو اقبال نے یوں بیان کیا۔ ع "جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا"

سکندر اعظم کی وجہ یونان میں ایک زبردست انقلاب ہوا۔ تمام شہری مملکتیں غائب ہو گئیں' مقدونیہ کا بادشاہ ایک عالمگیر مملکت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس زمانہ کے یونانی مفکرین نے بھی سکندر کا ساتھ دیا۔ سکندر اعظم شاہ ایران کو شکست فاش دے کر سارے ایران پر قابض ہو گیا۔ ایران اور ہندوستان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی دولت کے متحیر کن قصے سکندر کے کانوں تک پہونچنے لگے اور ۳۲۶ ق م ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ راجہ پورس کو شکست دے کر دریائے بیاس تک بڑھ آیا ہندوستان کی فارغ البالی' اور قدرتی عطیات سے سکندر اس قدر متاثر ہوا کہ دریائے بیاس سے آگے بڑھ کر سارے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتا تھا لیکن اس کے سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سکندر بہت ناخوش ہوا۔ بالآخر فوج کے ایک سردار کئی نوس نے سکندر کو یاد دلایا کہ اس کا یہ غرور خدائے تعالیٰ کو برا معلوم ہو گا۔ مجبوراً سکندر نے افواج کو واپسی کا حکم دیا۔

"یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا"

اقبال کو تاریخی تلمیحات میں خاص کمال تھا۔ چنانچہ بدھ مت کی عظمت کو اس طرح واضح کیا ہے ؎

گوتم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے | عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے
مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے | ہر پھول جس چمن کا فردوس ہے ارم ہے

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

مصلحین معاشرت کا خیال ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا المیہ جس نے ذات پات کی تفریق پیدا کر کے

مخلوق خدا میں نفاق اور منافرت کی دیواریں حائل کردیں۔ اور انسان کی قسمت کو برہمنوں کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو درکنار بادشاہ بھی پروہتوں کے ہاتھ میں تھا۔ شادی اور غم دونوں پروہت کے ہاں اور نہیں پر موقوف تھے۔ دوسرے معنوں میں برہمنوں باشندوں کی خانگی زندگی میں اس قدر مداخلت کی کہ نسل انسانی کی کوئی عزت و توقیر باقی نہ رہی۔ مخلوق خدا کو اس مصیبت سے بچانے کا بیڑا کپل وستو کے شہزادے نے اٹھایا۔ اپنے عیش و آرام کو ٹھوکر ماردی اور ہمالیہ کے جنگلوں میں حق کی تلاش میں سر دھنتا رہا۔ یہاں تک بنارس کے قریب قصبہ گیا میں اس پر عرفان کے دروازے کھلے۔ اس کے بعد وہ مصلح اعظم جہاتما گوتم بدھ کہلایا اور بدھ مذہب کو ہندوستان چین، جاپان، لنکا میں سرعت کے ساتھ پھیلادیا۔ دور دور سے لوگ بدھ مذہب کے جنم بھوم کی زیارت کے لئے ہندوستان آنے لگے چنانچہ تاریخ ہند کے وہ شہرۂ آفاق سیاح فاہیان چینی اور ہیوں نسانگ اسی غرض سے ہندوستان آئے تھے چین ہی نہیں بلکہ جاپان بھی ہندوستان کو اپنا حرم سمجھنے لگا۔ اس واقعہ کا اقبال یوں اظہار فرماتے ہیں۔ کہ "گوتم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے"۔

مدراس میں عیسیٰ علیہ السّلام کے سب سے بڑے حواری سینٹ تھامس، کا مزار ہے۔ عیسیٰ علیہ السّلام کے عشاق حرم مسیح یروشلم سے سیدھے یہاں آتے ہیں۔ اس لیئے اقبال نے فرمایا۔ کہ "عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے"۔ اقبال نے صرف قومی گیت میں ہی ہندوستان کی عظمت گم گشتہ پر آنسو نہیں بہائے بلکہ ہر اس نظم میں جس کا ہندوستان سے تھوڑا بہت تعلق ہے۔ ہندوستانیوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ترانۂ ہندی، کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

اے آب رود گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

گنگا ہندوستان جنت نشان کا مقدس دریا ہے۔ اس ارضی نہر فردوس کے کنارے کنارے ہندوستان کے باعظمت شہر آباد ہیں۔ جو ہندو تہذیب و تمدن کے مرکز رہ چکے ہیں۔ شہاب الدین غوری کی فوج جے چند راجہ قنوج سے مقابلہ کے لئے اسی دریا کے کنارے خیمہ زن ہوئی تھی۔ ترکوں کا امنڈتا ہوا سیلاب اسی جگہ ۱۱۹۳ء میں گنگا کے تیز و تند دھاروں سے لڑگیا اور جے چند مارا گیا جے چند کے بعد قطب الدین ایبک کا کوئی دوسرا حریف باقی نہ رہا۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں سب سے پہلی دفعہ مجموعی سلطنت کی بنا ڈالی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ قطب الدین ایبک ترک تھا اور اس کے بعد جتنے سلاطین آئے کم و بیش سب ترکی النسل تھے۔ قطب الدین ایبک دور وسطی کی سب سے پہلی باعظمت سلطنت کا بانی ہے اور یہ شاندار حکومت تھوڑے تھوڑے سے وقفہ کے بعد مغلوں تک جاری رہی جس کو اقبال نے یوں یاد فرمایا ہے۔

ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا ہٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا

قطب الدین ایبک کے بعد یہ حکومت اسی شان و شوکت کے ساتھ جاری رہی۔ چونکہ یہ لوگ بہت ہی شائستہ تھے۔ اسی لئے وہ خلیجیوں کے مقابلہ میں خود کو زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔ شمس الدین التمش کو خلیفہ بغداد نے شاہی خلعت عنایت فرمائی تھی غیاث الدین بلبن کے شاہی دبدبہ سے وہ منگول جنھوں نے بغداد پر حملہ کرکے شہر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، سمرقند و بخارا کے رصدگاہوں اور کتب خانوں میں آگ لگادی تھی نہ صرف مرعوب تھے بلکہ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ اس کے بعد خلجیوں کا دور آیا تو اس میں علاء الدین خلجی جیسا زبردست حکمراں پیدا ہوا جس نے سلطنت کو راس کماری تک وسعت دی۔ محمد تغلق نے ہندوستان کے باہر حملے شروع کردیئے فیروز تغلق نے اپنے تعمیری [illegible] ہندوستان پر محیط تھا اور خاندان

مغلیہ کی عظمت اس ملک میں مدفون ہے۔ جیسے اقبال اسلام کا حشم کہتا ہے۔ ؎

مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے
ہر پھول جس چمن کا فردوس ہے ارم ہے

تیموری جاہ وجلال کا مرثیہ اقبال نے ان الفاظ میں لکھا جس میں تیموریوں کی حمیت پوشیدہ ہے۔ نہایت ہی دردانگیز الفاظ میں اقبال نے تیمور کے گھرانے کی حمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

۱۳۹۸ء میں تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اور ایک سال بعد واپس ہو گیا خضر خاں نے ۱۴۱۴ء تک تیمور کے بیٹے شاہ رخ مرزا کی طرف سے حکومت کی...... ترکستان کا مرکز سمرقند تیمور کا پایہ تخت تھا۔ یونس خاں اور چنگیز خاں کی طرف سے بابر کا سلسلہ نسب تیمور سے جا ملتا ہے، چنگیز خاں کے بعد یہ لوگ ترکستان میں آباد ہو گئے۔ اسی لئے بابر اپنے آپ کو ترک کہتا ہے۔ بابر ترک ہو یا مغل اس کی رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا تھا۔ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی پر فتح پانے کے بعد بابر دہلی پر قابض ہو گیا تھا۔ لیکن پانی پت کے میدان سے بھاگے ہوئے پٹھان رانا سانگا کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے اور راجپوت اور پٹھان دونوں قومیں مغلوں کے مقابلہ کے لئے متحد ہو گئیں ۱۵۲۷ء میں بیانہ کے قریب یہ معرکۃ الآرا جنگ ہوئی جس کو تاریخ ہند میں جنگ سیکری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی کامیابی تمام تر تیموری کے خاندانی حمیت پر منحصر تھی۔ بابر سمرقند سے مایوس ہو چکا تھا۔ اور اب ہندوستان میں پٹھانوں اور راجپوتوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کرنا بڑے دل وجگر کی بات تھی۔ مغلوں کی فوج پر مایوسی مسلط تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی مایوسی کی وجہ بابر کے تیموری خون میں جوش آیا، اس نے اس موقع پر جو تقریر کی اس کے پس پردہ تیموری حمیت جوش زن ہے۔ بابر نے یاد دلایا کہ میدان جنگ سے بھاگ جانا مغلوں کے دستور شجاعت کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے مرتے دم تک لڑنے کی قسم کھائی، اور بالآخر تیموری شجاعت، راجپوتوں کی سرفروشی سے بازی لے گئی۔

ہمایوں کے انتقال کے بعد ۱۵۵۶ء میں اکبر کو ایسے ہی نازک مواقع سے دوچار ہونا پڑا۔ کابل پر اکبر کا علاتی بھائی مرزا عبدالحکیم قابض تھا۔ اس لئے باہر سے کسی مدد کی توقع نہ تھی۔ ہندوستانی، پٹھانوں کے مقابلہ میں مغلوں کو غیر ملکی سمجھتے تھے۔ شیر شاہی معرکے ابھی ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اس صورت حال سے مغل بھی گھبرا گئے۔ ترائن کے میدان میں مغل خیمہ زن تھے مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ بعض مغل سرداروں نے کہا کہ اس وقت مقابلہ خلاف مصلحت ہے۔ کابل واپس جانا چاہئیے۔ اکبر کی عمر اس وقت چودہ سال تھی۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اور خاموش بیٹھا سن رہا تھا۔ جب دیکھا کہ مایوسی کا پلہ گراں ہو رہا ہے تو تلوار سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا "تخت یا تختہ" کمسن شہنشاہ کے ان الفاظ نے مغلوں کے دلوں میں نشتر کا کام کیا اور تیموریوں نے ان سے جان کی بازی جیت لی۔

شاہجہاں بھی اس خصوص میں اپنے پیش روؤں سے پیچھے نہ تھا۔ ملک عنبر کا دکن میں مقابلہ کرنا۔ بڑے دل وجگر کا کام تھا۔ جب دکن میں اس کا علم ہوا کہ شہزادہ خرم کی زیر کمان افواج آرہی ہیں۔ سارے دکن میں سنسنی پھیل گئی، شہزادہ خرم جب دریائے تاپتی کے کنارے آیا تو سارے دکن پر اوس پڑ گئی، شاہجہاں کی حمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حق تلفی کے خلاف اس نے شہنشاہی طاقت کے مقابلہ میں سرکشی کی۔ گو کامیاب نہ ہوا۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کامیاب نہ ہو گا۔ لیکن نورجہاں کی خود غرضی، اور حق تلفی، و ناانصافی کے خلاف تلوار اٹھانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اورنگ زیب نے تمام معرکہ آرائیوں میں خود حصہ لیا۔ عبدالعزیز شاہ بخارا کے مقابلہ میں عین لڑائی میں ظہر کی نماز کے لئے شہنشاہ
افواج صف بستہ ہوگئیں، ایک طرف سے گولوں کی بارش ہو رہی تھی، دوسری طرف نماز کس قدر رقت انگیز منظر تھا، اور یہی واقعہ اورنگ زیب کو
گولکنڈہ میں بھی پیش آیا۔ اورنگ زیب کی اس جرأت سے عبدالعزیز شاہ بخارا ابوالحسن قطب شاہ دونوں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ شہزادہ
داراشکوہ کو گرفتار کیا گیا تو بغیر نہ لڑے گرفتار ہو جانا اس کو گوارہ نہ ہوا، ہتھیار تو تھے نہیں، ایک چھری سے مقابلہ کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے
انتقال کے بعد اورنگ زیب کے بڑے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ نے کام بخش کو لکھا کہ اطاعت قبول کرے اور حسب سابق دکن کا صوبہ دار رہے
کام بخش نے جواب دیا کہ بغیر لڑے اطاعت قبول کرنا مغلوں کی روایت کے خلاف ہے۔ آخر جنگ ہوئی اور کام بخش زخمی ہوا شہنشاہ نے
ان الفاظ میں اظہار افسوس کیا تھا "من نمی خواستم کہ ترا دریں حالت بہ بینم اما مقدر چنیں بود"

شاہ عالم کے بعد معز الدین، جہاندار شاہ، بادشاہ ہوا اس کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے سیدوں کی
مدد سے تخت حاصل کیا، ایک بڑی فوج جہاندار شاہ کے بیٹے عزالدین سے مقابلہ کے لئے آئی اور عزیز الدین بغیر لڑے میدان جنگ سے
بھاگ گیا۔ یہ تیموری خاندان کا سب سے پہلا شہزادہ تھا جو بغیر لڑے میدان جنگ سے بھاگا۔ اور اسی دن سے مشہور ہو گیا کہ
تیموریوں کا آفتاب اقبال ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اس کا ماتم اقبال نے یوں کیا ہے۔ ع

"حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے"

مورخین کا خیال ہے کہ شمالی ہند کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے پہلے جنوبی ہند کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ بالخصوص دور مغلیہ کی
تاریخ کا دکن سے گہرا تعلق رہا ہے۔ دکن تیموری شاہزادوں کی تربیت گاہ کہلاتا ہے۔ اکبر اعظم کے زمانہ سے مغلیہ حکومت دکنی سلطنتوں کے
جاہ و جلال کو دیدۂ حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر اورنگ زیب کے عہد میں تیموری سیلاب دکنی حکومتوں کو کچھ اس طرح بہا لے گیا کہ
صرف آثار ہی باقی رہ گئے۔ ہندوستان کی عظمت کا ازلی نوحہ خواں جو وطن کے ایک ایک ذرہ کو دیوتا سمجھتا ہو تاریخ ہند کے ایک اہم بالشان
باب کو کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے۔ گولکنڈہ کی عظمت کا یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

آہ! جولانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار — دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے — یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثال پاسباں استادہ ہے

پھر قطب شاہوں کا ماتم ان الفاظ میں کرتا ہے ؎

خواب گاہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا — دیدۂ عبرت! خراجِ اشک گلگوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے — آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر — جنبشِ مژگاں سے ہے چشم تماشا کو حذر

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

قطب شاہی عظمت کا سب سے پہلا علمبردار سلطان قلی قطب شاہ ہے جو اپنے پورے خاندان کے ساتھ قلعہ گول کنڈہ کے قریب آرام کر رہا ہے۔ آخری تاجدار ابوالحسن قطب شاہ کے سوا تمام انہی قطب شاہی گنبدوں میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اور یہ گنبد زبان حال سے قطب شاہی عظمت کے مرثیہ خواں ہیں۔ ۱۶۸۷ء میں ابوالحسن قطب شاہ کے زمانے میں سلطنت گول کنڈہ کا خاتمہ ہوا۔ ۱۵۱۲ء سے یہ سلطنت تہذیب و تمدن میں مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ قطب شاہیوں کے برگشتہ مقدر نے اس سلطنت کا شیرازہ ۱۶۸۷ء میں بکھیر دیا۔

جرمنی گوئٹے، انگلستان شکسپیر و ملٹن، امریکہ لانگ فیلو پر فخر کرتا ہے تو ہندوستان اپنے اقبال پر جو سیالکوٹ کی سرزمین سے اٹھ کر گھنگور گھٹا کی طرح فضائے ہند سے تمام عالم پر چھا گیا۔ مدت سے ہندوستانیوں کے دل سرد ہو چکے، ان کی محفلیں مردہ ہو چکی تھیں، ان کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں ان کا یہ یاس قدرت کو گراں گذرا اور اقبال سرزمین ہند پر رحمت الٰہی بن کر نازل ہوا سوتوں کو جگایا اور رومندوں کو رلایا، خاموش آیا اور ہنگامہ محشر کے ساتھ چل بسا، اقبال حیات قومی کی تخلیق پر مسیحا کا حکم رکھتا تھا یہ اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے کہ جنگ طرابلس کے زمانے میں اقبال کا کلام مسلمانان عالم پر عربوں کی رجز خوانی کا اثر رکھتا تھا۔ ہندوستان افلاس کی وجہ سے توپ اور تفنگ اور سامان حرب نہیں رکھتا لیکن اقبال کا کلام رکھتا ہے۔

یادِ اقبال

محمود مجاہد

حریف نورِ سحر ہو سکی نہ ظلمتِ شب — جو غم کے ذکر سے مٹ جائے وہ خوشی کیا ہے
نگاہِ شوق میں جنبش، زبانِ شوق خموش — اک انتظارِ اجل ہے یہ زندگی کیا ہے
نہ اپنا دل ہے نہ اپنی زباں، نہ اپنی نظر — اسی کا نام خودی ہے تو بے خودی کیا ہے
اگرچہ عام نہیں ذوقِ خود فراموشی — مگر یہ کوئی نہ سمجھا، خود آگہی کیا ہے
فسونِ عقل کو لازم نہیں بنائے فساد — جنونِ عشق پہ یہ تیر افگنی کیا ہے
خبر نہیں یہ فلاکت زدہ دماغوں کو — کلاہِ قیصری و تاجِ خسروی کیا ہے
ادھر "گمان" مُصرِ دعوئ خدائی پر — ادھر "یقین" کو حیرت کہ بندگی کیا ہے
غرض کہ علم بھی عاجز ہے ان مسائل سے — دماغ چھین لیا کس نے اہلِ محفل سے

مگر یہ این ہمہ نیرنگئ جنون و خرد — بتا دیے ہمیں آدابِ بندگی تو نے
خودی کے نور سے ہر سمت اک چراغاں ہے — شبِ سیاہ کو بخشی ہے روشنی تو نے
وہاں سے اُڑ نہ سکے طائرانِ بامِ حرم — بچھا دیا تھا جہاں دامِ آگہی تو نے
جہاں کے تنگ نظر فلسفہ پرستوں کو — بتا دیا ادب آموزِ شاعری تو نے
جنھیں سے گوش بر آواز ہیں فلک والے — کبھی کہی تھی شعر میں رودادِ بندگی تو نے
وہ جسم قوم کہ آسودۂ فنا بھی نہ تھا — اسی میں از سرِ نو جان ڈال دی تو نے
حیاتِ شعر کی تجدید کا ارادہ تھا — خدا سے مانگ لیا دلِ فلسفی تو نے

اقبال کی شاعری کا آخری دور

دنیا کے اس شاعر اعظم کی زندگی ہی میں، اس کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور اس کی فکر اور صناعی کے کئی پہلو ایک سے زیادہ مرتبہ معرضِ بحث میں آچکے ہیں۔ ان سب کے باوجود، اس وقت اس کے انتقال کے بعد، جب ہم غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عظیم الشان شاعری کے متعلق اب بھی سب کچھ نہیں کہا جا سکا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کبھی نہیں کہا جا سکے گا۔ اس کی شاعری کی طرح اس کی شاعری کی تنقید کی تشنگی بھی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور یہ اقبال کی عظمت کی دلیل ہے۔ دنیا کے غیر فانی شاعروں اور خاص کر مفکر شاعروں کے متعلق جس قدر بھی لکھا اور کہا جا سکتا ہے، اس سب کے باوجود ان کے خیال، صناعی اور حسنِ کلام کے متعلق بہت کچھ ناگفتہ رہ جاتا ہے۔ اس طرح یہ کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ عین مطابق فطرت ہے کہ اقبال کے کلام کی دلچسپی کی مناسبت سے ان کے کلام کی تنقید کی دلچسپی بھی لازوال ہو۔ اس شاعر نے غور و فکر کے لئے اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ نئے نئے نقاطِ نظر سے اس کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا رہے گا بہت سے گوشے ابھی ٹٹولنے ہیں اور بہت کچھ سعی اس کے قلب کی گہرائیوں تک نہیں تو ان کے قریب پہنچنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو ان تمام مساعی کا حقیقی مقصد اس برگزیدہ ہستی کی یاد اپنے دلوں میں تازہ رکھنے کی آرزو ہے۔ فہم و بساط کے مختلف مدارج اسی طرح اس ہمدردِ بنی نوع انسان کی جناب میں اپنا اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔

یہ بات اب ہر وقت سے زیادہ واضح ہو گئی ہے کہ فارسی زبان کی حد تک جو انتہائی تعریف، مثنوی معنوی کی گئی ہے وہ اردو میں پیر رومی کے اس پرستار کے کلام پر پوری پوری صادق آتی ہے۔ "ہست قرآں در زبانِ ہندوی"۔ اس فکر شعری کے آخری مدارج ارتقا کو سامنے رکھتے ہوئے، جب ہم اس کے ابتدائی مراحل پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اس عروج کے دور زینے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس روشنی میں ہماری اگلی کوشش جوان ادوار کے کلام کی چھان بین سے متعلق کی گئی ہیں۔ ادھوری، نامکمل اور قطعی ناقص معلوم ہو رہی ہیں۔

اقبال کے آخری عمر کا کلام، ایک عظیم الشان چیز، ایک سرمایۂ حیات اور ایک سرچشمۂ زندگی ہے۔ اس میں ایک حقیقی مفکر کی پختگی فکر اور ایک حساس صناع کے موقلم کی سحر کاری موجود ہے۔ قوت گویائی کے رعب داب میں الہامانہ اور پیغمبرانہ شان پیدا ہو گئی ہے رفعتِ فکر اور بلندئ خیال میں صوفی صافی کی روحانی سیر کے انداز نظر آتے ہیں۔ یہی درحقیقت شاعر کی معراج ہے۔ یہاں پہنچ کر کائنات اپنے تمام رموز کے ساتھ شاعر کی ہتھیلی میں ایک رائی کا دانہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ بلندئ پرواز قوت فکر اسے نصیب ہو گئی ہے۔

اقبال نے اردو اساتذہ کی اصطلاحی شاعری میں پہلا قدم رکھا تھا۔ اسی میدان میں جب ان کی فکر، انفرادیت کی طرف رجوع ہوئی تو وہ اصطلاحی شاعری سے ہٹ کر اپنے اطراف کی اشیاء اور مسائل پر عمومی خیالات کا اظہار کرتے رہے کبھی کسی کی ترجمانی کی کبھی کسی کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اور کسی وقت وطن اور قوم کے مسائل میں ان کی توجہ الجھی گو اندازِ بیان ان کا اپنا تھا، لیکن خیالات عموماً وہی تھے جو ان کے اطراف عام طور پر رائج تھے۔

یورپ کی سرزمین کے قیام نے دراصل شاعر کی آنکھیں کھول دیں۔ بہت سے مسائل میں اس کی فریب خوردگیاں، بے نقاب ہو گئیں اسے نظر آگیا کہ جن چیزوں کو اس کی قوم، پائیدار سمجھ کر ان کے پیچھے عمر گنوا رہی تھی وہ دراصل دھوکا اور حاکم قوموں کی شعبدہ بازی تھی جن بے شمار مسائل نے شاعر کو متاثر کیا اس کا خاکہ اس زمانے کے کلام میں پورا موجود ہے [illegible] میں اقبال کی پہلی عظیم الشان

نظم "شکوہ" لکھی گئی۔ یہ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور تھا۔

جب شاعر کی نفرب خوردگی اس پر عیاں ہوگئی تو نظر تا اُسے ایک پائدار چیز کی تلاش ہوی جس کے لئے حیات انسانی وقف کی جاسکتی ہے۔ اس تلاش میں اس کی طبیعت اسلامی فلسفۂ حیات اور معاشرت کی طرف رجوع ہوی اور یہاں اس کو وہ چیز مل گئی جو اس کے لئے حیات کائنات کا حاصل تھا۔ خیالات کے اس طوفان کو لیکر وہ زور و شور سے اٹھا اور ایک پیغمبر کی طرح دنیا کو اپنا پیغام سنانے لگا اب اقبال ایک انقلاب پسند شاعر اور ایک حقیقی صوفی ہوگئے تھے۔ ان کا مذہب عشق اور ان کا فلسفہ "خودی" معین ہوگیا تھا۔ اور ہر عقدہ کا حل ان کو انہیں چیزوں میں مل گیا جیسا کہ وہ اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ — خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا — فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوی ہے زمان و مکاں کی زناری — نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ

عشق ان کے لئے مذہب اور عشق ہی ایمان تھا۔ "علم و عشق" کے عنوان کی نظم میں وہ کہتے ہیں۔

عشق نے مجھ سے کہا، علم ہے تخمین و ظن — علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن — عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات — علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات — علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں — عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں — عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب
شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام — شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام — علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

خودی اقبال کی نظر میں رازِ حیات ہے۔ اور اس کی تفہیم اور تشریحات میں اقبال نے جس نکتہ رسی سے کام لیا ہے شاید ہی کسی اور نے کبھی اس کا عشر عشیر بھی سمجھا، یا سمجھایا ہو۔ "خودی کی زندگی" میں وہ فرماتے ہیں۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد — نہنگ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

افراد کو منظم کرنے والا ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی جذبہ رہا ہے۔ کسی زمانے میں یہ جذبہ مذہب تھا، اور موجودہ زمانے میں وطنیت اور قومیت نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ لیکن امن عالم کے لئے یہ جذبہ مذہب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو چکا ہے۔ قومیت کے شدید جذبے کی برائیاں اب پوشیدہ نہیں رہی ہیں۔ ہر قومی جذبہ میں دوسری قوموں سے منافرت، بغض اور دشمنی کا موجود ہونا لازمی سا ہوگیا ہے۔ اس کو دنیا کے بعض

اور صاحبانِ فکر نے بھی محسوس کیا۔ اور اس کو کسی قدر قابو رکھنے کے لیے حربے کے طور پر ایک بین قومی احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مجلس بین الاقوام اسی کا نتیجہ تھا۔ لیکن یہ ترکیب بھی جس قدر کارگر ہوئی، پچھلے چند سال کے واقعات سے ظاہر ہے۔ اقبال نے مجلس بین الاقوام کی ناکامیوں کا جو خاکہ اڑایا ہے وہ زبان زد ہو گیا ہے۔ "ضرب کلیم" میں اس عنوان کی نظم میں بھی یوں اظہار خیال کیا ہے۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے　　ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن　　پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ　　ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

اقبال کے وسیع تر انسانی جذبات نے انھیں بین قومیت کے مقابلے میں ایک بین الانسانیت کا احساس پیدا کرنے پر ابھارا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ احساس انھوں نے کہاں سے اخذ کیا۔ "مکہ اور جنیوا" کے عنوان کی نظم میں اس احساس کو انھوں نے صاف صاف ظاہر کر دیا۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام　　پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام　　جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

اقبال کے خیال میں، دنیا کی موجودہ ابتری اور پریشانی کا علاج اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی کہ بجائے قومیت کی تفرقہ پردازی کے "انسانیت" کے اتحاد کا احساس دنیا کی ساری قوموں کے افراد میں پیدا کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ اقبال کی فکر کا ایک نہایت قابل قدر پہلو ہے۔ اور دنیا کی موجودہ حالت کو نظر میں رکھتے ہوئے اس اتحاد اور ملتِ انسانی کا دنیا میں قائم ہونا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال اس کو حاصل کرنے کے لئے اس کی تمام مزاحم قوتوں سے جنگ کی تلقین کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے "جنگ کو ختم کرنے کے لئے بھی جنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔" اقبال اس امن خیز فضا کے پیدا کرنے کے لئے افراد کو ایک آخری جنگ کرنے پر بھی ابھارتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال کا پیغام دنیا کے لئے ایک عالمگیر امن کا پیغام ہے، لیکن یہ احساسِ امن نہ بزدلی کا پیدا کردہ ہے اور نہ اس کا نتیجہ بزدلی ہے۔ اس دور کے کلام میں، جو جوش اور صدق طلب ہے اس کی مثال شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی۔ یہ طلب اور بہتری کی خواہش ذات کی حد تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں وہ تمام عظیم الشان انسانی گروہ شامل ہیں۔ جن کی زندگیاں کبھی دنیا کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہو چکی تھیں۔ مثلاً "بال جبریل" میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:۔

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا　　کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی
نہ اٹھا پھر کوئی رومی، عجم کے لالہ زاروں سے　　وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اسی مجموعے میں ایک نظم کا آخری شعر ہے۔

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ　　ترے پیمانہ میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

یہاں شاعر کائنات کے اصلی منشائے تخلیق اور اس کے رموز پر پوری طرح حاوی ہو گیا ہے۔ اور جو چیز وہ لکھتا ہے اس میں پورا القان موجود ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی شاعری کہ [illegible] انتقام اور ایک احساس تلافی بھی

پیدا نظر آتا ہے۔ انتقام ہر اس چیز کے ساتھ جو اس کے اصلی منشائے حیات کے حصول میں سدِ راہ ہو اور تلافی کی خواہش ان تمام امور کے متعلق جو اس کی دسترس سے باہر ہوں۔ لیکن ان کے مواخذہ میں وہ گرفتار ہو۔ وہ چیز خواہ اس عالم آب و گل سے تعلق رکھتی ہو یا عالم روحانی سے ذیل کے اشعار میں شاعر کا انداز کس قدر غیر معمولی ہو گیا ہے۔

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد
یہ مشتِ خاک یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد
قصور وار غریب الدیار ہوں، لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

ایک اور نظم میں فرماتے ہیں۔

تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

یہ احساس، اقبال کی آخری نظموں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز گویائی کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں تھی۔ توموں کے عروج زوال کے پوشیدہ رازوں کو بھی اقبال نے صاف یا استعارے کے پیرایہ میں جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ ذیل میں ایسے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

خطۂ پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی
حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا
ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولت قاروں نہ فکر افلاطوں
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے؟
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر
ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

غرض موجودہ زندگی کے بہت کم مسائل ہوں گے جن پر اقبال نے اس زمانے میں روشنی نہ ڈالی ہو یا تنقید نہ کی ہو۔ اگر کوئی قوم جو حالت پستی میں ہو اقبال کے صرف آخری زمانے کے کلام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے تو یقین ہے کہ اس میں حیات کی ایک تازہ لہر پیدا ہو جائے گی۔

عبد القادر سروری

اقبال

بزمِ مشرق تھی فسردہ چپ کھا تھا تارِ رباب
قصرِ بیداری پہ تھی چھائی ہوئی تنویرِ خواب

تھے مہیا ننگِ خاک کی دھندلی جبیں کے خدّ و خال
ڈھل رہی تھی رات کے سانچے میں صہبائے جمال

تیرگی ہی تیرگی تھی شمعِ رخشاں تھی اداس
حسن کا رنگیں تبسم ہو چکا تھا نذرِ یاس

مضطرب تھی سینۂ گیتی کی روحِ تابناک
سر بسر معمورۂ تاریک تھی تعمیرِ خاک

عشق کے مفہوم سے واقف نہ تھی یہ کائنات
مہر و مہ کی شب فروزی میں نہ تھی پہلی سی بات

سو رہی تھی قلزمِ ہستی میں فوجِ ارجمند
رازِ انوارِ خودی سے بے خبر سیلِ بلند

گرچہ تھیں اک نالۂ توفیق کی انگڑائیاں
اٹھیں وہ بھی مگر محوِ فلک پیمائیاں

اس فضائے درد میں آئی وہ آوازِ گداز
لوحِ مشرق مسکرائی جاگ اٹھے خاک باز

نزہت و انوار کی زلفیں بھی لہرانے لگیں
بدلیاں، رقصِ خودی کی دہر پر چھانے لگیں

عشق کے ماتھے پہ نورانی پسینہ آگیا
حسن ساحل کے قریں دل کا سفینہ آگیا

بے خودی کی چاندنی میں سر اٹھاتا تھا جلال
چہرۂ ہر مردِ مومن پر تھا احساسِ جمال

ناشناسی کی شعاعیں منتشر ہونے لگیں
جہل کی کافر ہوائیں منتشر ہونے لگیں

زندگی کی نبض میں رقصاں ہوا خونِ بہار
جی اٹھا ہر صرفِ رنگ و بو، بہ رنگِ برق کار

آسماں والوں میں بھی ہونے لگی کچھ قیل و قال
عرش بھی ہلنے لگا نظر آ گئی ارضِ جمال

ایک دنیا نے کہا آوازۂ یزداں شکار
ایک دنیا نے کہا فطرت کے باغی کی پکار

کوئی بولا سچ تو یہ ہے نغمۂ جبریل ہے
نغمۂ جبریل کیا ہے؟ صورِ اسرافیل ہے

درحقیقت وہ ہے اک ٹوٹے ہوئے دل کا سرود
سوز میں ڈوبے ہوئے الہام کا حسنِ صعود

اقبال کا شاعرانہ فلسفہ

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی ۔۔۔ برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اقبالؔ نے شعر کو فلسفہ اور فلسفے کو شعر بنا دیا۔ اسی میں اس کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ فلسفے اور شعر کا جہاں خوشگوار امتزاج ہو۔ شعر جادو بن جاتا ہے۔ اقبال سے پہلے یہ سعادت مرزا غالبؔ کو حاصل تھی جو اپنی اس انوکھی شانِ کج کلاہی کی بدولت اپنے ہم عصروں میں ممتاز رہے۔ غالبؔ کی شعریت فلسفے پر سدا غالب رہی، لیکن اقبال کی فلسفیت بسا اوقات شعریت پر غالب ہو جاتی ہے اور بحیثیت شاعر یہی اس کی کمزوری ہے۔ جب تک وہ (اقبال) اپنی انوکھی مذہبیت اور "ہمہ اسلامیت" کا دلدادہ نہ ہوا تھا، اس کا کلام مقبول خاص و عام رہا۔

گو ابتدا میں اقبال نے داغؔ سے رشتۂ شاگردی جوڑا تھا۔ لیکن ذہنی اور روحانی حیثیت سے وہ غالبؔ کا پرستار اور غالبؔ کے کلام کا خوشہ چیں تھا۔ غالبؔ کا اثر (چند غزلوں کو چھوڑ کر جو داغؔ کے رنگ میں ہیں) اُس کی ابتدائی کوششوں میں صاف جھلکتا ہے۔ میں شاعر کی ایک نظم کے چند اشعار پیش کروں گا جو کسی مصلحت کے تحت "بانگِ درا" میں شامل نہیں کی گئی۔ نظم کا عنوان ہے "نالۂ یتیم" جو ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ الفاظ، بندشیں، ترکیبیں، اضافتیں، سب پر غالبؔ کا اور خصوصاً غالبؔ کے کلام کا ابتدائی رنگ صاف طور پر نمایاں ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:۔

آمد بوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم ۔۔۔ ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم

لذتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبح دم ۔۔۔ یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کی زیر و بم

رنگ کچھ شہرِ خموشاں پر جما سکتی نہیں

خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتی نہیں

اسی نظم کا آخری بند، سلاستِ زبان اور خاطر نشیں اندازِ بیان کا تنہا نمونہ ہے۔ جس سے اُمید بندھتی ہے کہ شاعر عجب نہیں کہ اپنے روحانی استاد کی طرح آگے چل کر سلاست اور نغمے کے دریا بہا دے۔ اس کے علاوہ، اس نظم کے آخری بند کے اشعار اس امر کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ یہ کاشمیری الاصل، برہمن زادہ، ممکن ہے کہ ہندی قومیت اور ہمالہ کی عظمت کے ترانے اور نئے شوالے، کی دُھن میں ہندی فضاء کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں "حجازی لے" کا دلدادہ نہ ہو جائے۔ یہ ہو کر رہا، اور اسی بنا پر بعض قوم پرست، ہندیوں اور اردو ادب کے پرستاروں کو اقبالؔ سے اس کے جیتے جی دُہری شکایتیں رہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے اپنا قدیم ہندی مسلک (ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا) کیوں چھوڑ دیا، اور پھر یہ کہ اردو کو تج کر ایران کی جانب انتقالِ ذہنی کیوں کیا؟ دوسرا سوال میرے نزدیک خارج از بحث ہے۔ البتہ پہلا سوال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے اور اس کا اجمالی جواب اس مختصر مضمون کا موضوعِ بحث ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں تمام ہندوستان "قومیت" اور "ہوم رول" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ اسی زمانے اور اسی فضا میں اقبال نے اپنی شعری استعداد اور اپنی خداداد ذہانت کا پورے طور پر احساس کیا۔ کوئی شاعر اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے الگ تھلگ اور بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ وہ اپنے آس پاس دیکھتا ہے، اُسے اپنی سرشت کے

حساس سانچے میں ڈھال کر ایک حسین اور دلکش انداز میں بیان کرتا ہے۔ اقبال کا "ہندی ترانہ" "میرا وطن وہی ہے" "نیا شوالہ" اور "تصویر درد" انھیں اثرات کا نتیجہ ہیں۔ ان نظموں کے بیشتر اشعار اس قدر زبان زد خاص و عام ہیں کہ ان کا یہاں دہرانا کوئی تک نہیں رکھتا۔ غرض کہ تمام ہندوستان اقبال کی والہانہ تان اور ترانے سے گونج اٹھا اور اہل ملک نے بلا امتیاز مذہب و ملت، اس نوجوان قومی شاعر کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

اپنی شہرت کا سکہ بٹھا کر ۱۹۰۵ء میں اقبال نے دیار مغرب کا رخ کیا۔ اپنے تین سالہ قیام کے زمانے میں انھوں نے فارسی ادبیات، اسلامیات، فلسفے، اور خصوصاً فلسفۂ قدیم کا گہرا مطالعہ کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تمدن اور وسیع معاشرت سے انھیں ایک بدظنی اور نفرت ہوگئی۔ چنانچہ قیام انگلستان کے دوران میں جو اشعار اقبال نے اپنے دوست (سر) عبدالقادر کے رسالے کے لیے بھیجے تھے، ان سے شاعر کے اس بدلتے ہوئے رجحان کا پتہ لگتا ہے۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

جیسے جیسے اس تنفر میں اضافہ ہوتا گیا، وہ رسول عربی کی سیدھی اور پرجوش تعلیم کے گرویدہ ہوتے گئے۔ اور بہ حیثیت فلسفی انھوں نے اسلام کے اصول کو نظر کے سامنے رکھکر "ایک عالمگیر اخوت اور تکمیل فرد" کا خاکہ ڈالا جس کو نہ تو نطشے اور نہ برگساں کے فلسفے سے کوئی تعلق ہے، جیسا کہ اقبال کے بعض مغربی ناقدوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے "اسرار خودی" کے انگریزی اڈیشن کی اشاعت کے بعد ایک انگریز معترض کے جواب میں خود اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اپنا پہلو واضح کیا ہے۔ علاوہ اس خط کے شاعر کی فارسی اور اردو تصانیف میں بھی جا بجا فلاسفۂ مغرب کی تعلیمات سے بیزاری اور کم اعتقادی کا ثبوت ملتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار جو "ضرب کلیم" سے لیے گئے ہیں۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی؟
کس طرح خودی ہو لازمانی
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

ایک نظم (علم و عشق) کے دو بند اور دیکھیے:-

علم نے مجھ سے کہا، عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا، علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب!

بہرحال یہ خیالات اور احساسات لیکر ۱۹۰۸ء میں اقبال ہندوستان آئے۔ اہل ملک کی آس بندھی کہ اقبال کے منھ سے وہی اگلی تان (ہندوستاں ہمارا) نکلے گی۔ لیکن یہاں مضمون ہی کچھ اور تھا۔ بہتوں کو مایوسی ہوئی۔ لیکن اقبال نے پروا نہ کی اور کچھ دنوں "سارا جہاں ہمارا"، "شکوہ" وغیرہ سنا کر فارسی زبان میں اپنا انوکھا دستور العمل مرتب کرنا شروع کیا۔

یہ محض ایک شاعرانہ خواب تھا جو "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بےخودی" کے اوراق میں مستور بھی عریاں بھی ہے۔

یہ دونوں مثنویاں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ لیکن اردو سے شاعر نے ابھی پورے طور پر عدم تعاون نہیں کیا تھا۔ اور اس کے انوکھے شاعرانہ فلسفیانہ دستور العمل کے شائع ہونے سے کچھ پہلے اور بعد تک بھی چند اردو نظمیں چھپتی رہیں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں جنگ بلقان کے تاثرات اور عالم اسلام اور مسلمانوں کے اضطراب اور بےچینی کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہے۔ یہ نظمیں بہت مقبول ہوئیں، اور کم از کم مسلمانوں نے "ہندی ترانے" سے زیادہ ان نظموں کو سراہا علاوہ اس کے موخرالذکر نظم میں شاعر کے بدلتے ہوئے رجحان اور معتقدات کی جھلک بھی بعض مقامات پر صاف نظر آتی ہے۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے	نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے	پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا	تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا	غیر "یک بانگِ درا" کچھ نہیں ساماں تیرا

"پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا" کا نعرہ ایک ایسا دھکا تھا جس کے بعد ہی قوم پرستوں کو اقبال کی جانب سے بالکل مایوسی ہو گئی۔ اور گو بہ حیثیت شاعر اقبال کی عظمت کے اس کے کٹر مخالفین بھی معترف رہے، لیکن اقبال کی ہمہ اسلامی تحریک ایک مجذوب کی بڑ سمجھی جانے لگی۔ مگر شاعر اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۸ء میں (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا) اپنا منظوم دستور العمل جس کی شیرازہ بندی میں اس کا شاعرانہ دماغ کئی سال سے مصروف تھا۔ آخر کار اہل ملک اور ہندوستان کے باہر رہنے والے مسلمانوں کی ہدایت کے لئے پیش کر ہی دیا، اور "شمع و شاعر" لکھنے کے بعد کئی سال تک اردو کا رخ نہیں کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ "شمع و شاعر" اقبال کا بہترین کارنامہ ہے جس میں فلسفہ اور شاعری کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ اس کا اگر تمام کلام بھی تلف ہو جائے تو اس کی عظمت کے منوانے کے لئے بس یہ ایک نظم کافی ہے۔ یہ نظم شاعر کی شاعرانہ سحرکاری، فلسفیانہ پروازِ نظر، جوشِ عمل، اور انوکھی رجائیت کا نچوڑ ہے۔ انتخاب میں وہ بات کہاں پھر بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات	یہ کبھی شبنم، کبھی گوہر، کبھی آنسو ہوا
دہر میں عیشِ دوام آئین کی پابندی سے ہے	موج کو آزادیاں، سامانِ شیون ہو گئیں
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں	موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
وائے ناکامی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا	مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا، اندیشۂ طوفاں سے کیا؟	ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرہ	دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل	موج مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور	خونِ گل چیں سے کلی، رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں	محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

برطانوی سامراج کے کارندے آخری دو بندوں کے اشعار کا پورے طور پر مطلب سمجھ لیتے تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتے۔ "اسرار" اور "رموز" اور "شمع و شاعر" کی اشاعت کے بعد ایک زمانے تک اقبال نے اور کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خاموشی بے سبب نہ تھی اس لئے کہ جنگ عظیم نے اقوام عالم کو پریشان اور بدحواس کرنے کے علاوہ اقبال کے قصرِ دل کی بنیادیں ہلا دی تھیں، اتحادیوں کے ہاتھ میں "ٹرکی" کی جان کے لالے پڑے تھے اور شاعر کا ہمہ اسلامی خواب یک لخت زائل ہوتا نظر آتا تھا لیکن اقبال شاعر تھا اور کسی نہ کسی طرح اسے اپنے شاعرانہ وجود سے اوروں کو محظوظ کرنا اور اپنے وجود کا ثبوت دینا لازم تھا۔ لہٰذا اب اُس نے عالمگیر اخوت اور خلافت کی بجائے تصوف اور تغزل میں پناہ لی چنانچہ "پیام مشرق" اور دیگر فارسی نظمیں اسی گریز کا نتیجہ ہیں۔ جہاں شعر و نغمہ اور محض فلسفیانہ پرداز نظر کے سوا کوئی تعمیری یا کام کا فلسفہ نظر نہیں آتا۔ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد عالمی کساد بازاری، تجارتی پستی، اور بے روزگاری کے مسئلے نے اہل بصیرت کی توجہ کو شدت کے ساتھ اشتراکی زاویۂ نگاہ کی طرف کھینچا۔ ہمارے شاعر نے بھی ان مسائل پر ہندوستان کے خاص حالات کے تحت غور کیا اور اس ضمن میں پھر مغربی تہذیب کی غارت گری پر حملے کئے ہیں۔ کہیں کہیں حقیقی شعریت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ لیکن "اسرار" و "رموز" کا وہ جوش اور تعمیری جذبہ کہیں نظر نہیں آتا۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ المُلوک ... سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ... تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق ... طب مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو ... آہ! اے ناداں، قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

یہ اشعار شاعر کی مشہور نظم "خضر راہ" کے ایک بند سے لئے گئے ہیں۔ پوری نظم پر تفکر اور مایوسی کی ایک ہلکی سی چادر پڑی ہے۔ اِدھر اُدھر حسب عادت مغربی تہذیب اور ناخدایان مغرب کی عیاری پر لعن طعن ہے۔ لیکن وہ جذبۂ بے اختیار اور "ہمہ اسلامیت" کا خواب شاعر کی نگاہوں سے اوجھل نظر آتا ہے۔

اس نظم کی اشاعت کے دو تین سال بعد مصطفیٰ کمال نے "ٹرکی" کو ساحرانِ فرنگ کے پنجے سے نجات دلائی۔ دنیائے اسلام کی نظریں مصطفیٰ کمال کی طرف پڑنے لگیں۔ اقبال کے دل میں بھی امید اور شعر و نغمے کی لہریں بلند ہوئیں اور "طلوع اسلام" کے عنوان سے ایک نظم شاعر نے پیش کی۔ یہاں اقبال کی تان میں پھر وہ اگلی سی تڑپ صاف طور پر نمایاں ہے۔ لیکن یہ خوشی تا دیر رہنے والی نہ تھی اس لئے کہ مصطفیٰ کمال نے بعد میں جو کچھ کیا اُس سے نہ صرف اقبال بلکہ تمام سادہ دل مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بہرحال اس نظم کے چند اشعار دیکھیئے۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی ... افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا ... سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے ... شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے ... یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے ... کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس کے بعد سے اقبال نے پھر اس سراب رنگ و بو کا رخ نہیں کیا، اور نہ صرف اس میدان ہی سے منھ موڑا بلکہ ایک عرصہ تک "گیسوئے اردو" کی شانہ گیری بھی چھوڑ دی اور مولانا روم اور شمس تبریز کی دنیائے تصوف میں پناہ لی۔ یا اپنی اس سدا بہار دنیا میں جس کے نقوش ملٹن کی "گم شدہ فردوس" اور دانتے کے "آسمانی طربیہ" سے آنکھیں ملاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ تک اقبال پر اپنی من بھاتی امیدوں کے خاک و خون ہو جانے کا اثر ضرور رہا ہوگا۔ مخالفوں کی جلی کٹی باتیں زخم پر نمک کا کام کرتی ہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ "میخانہ" "لاتقنطو" کا یہ پرانا دردی کش تا دیر اثر نہ لے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی "ہمہ اسلامیت" ہمہ مجذوبیت کی مترادف قرار دی جائے اور اس کا دل بے چین نہ ہو؟ جب اس کا تصور کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے بے اختیار وہ سماں بندھ جاتا ہے جب کہ انگلستان کا برگزیدہ نابینا شاعر (جان ملٹن) اپنی پیوریٹن تحریک کی شکست کے بعد اپنے امرت بھرے قلم سے وہ لازوال نقوش تیار کر رہا تھا جن میں جا بجا عبرانی رسولوں کے غضب کی شان دمکتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں بھی بعض مقامات پر وہی دلکش شان غضب ہے۔ "جاوید نامہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو اس حصے سے ماخوذ ہیں جہاں شاعر "فلک زہرہ" پر خدایان کہن کو شادماں دیکھتا ہے۔ ہبل نعلین بجا رہا ہے کہ حق اور دین برحق کی کیسی خواری ہوئی اور کس طرح دنیا از سر نو بت پرستی اور حیلہ جوئی کی طرف عود کر رہی ہے۔

آدم، این نیلی تتق را، بردرید — آن سوئے گردوں، خدائے را ندید

جانش از محدود، می گردد فرار — بو کہ عہد رفتہ، باز آید پدید

زندہ باد افرنگی مشرق شناس — آنکہ ما را از لحد بیرون کشید

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در نگر آں! حلقۂ وحدت شکست — آل ابراہیم بے ذوقِ الست!

صحبتش پاشیدہ، جانش ریز ریز — آنکہ بود از بادۂ جبریل مست!

خونِ او سرد، از شکوہ دیریاں — لاجرم پیرِ حرم، زنار بست!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در جہاں باز آمد، ایامِ طرب — دین ہزیمت خوردہ، از ملک و نسب!

از چراغِ مصطفےٰ اندیشہ چیست؟ — زانکہ او را پف زند صد بولہب!

اہرمن را زندہ کرد افسون غرب — روز یزدان زرد رو از بیم شب! (نغمۂ ہبل، جاوید نامہ)

جاوید نامہ واقعی جاوید نامہ ہے۔ لیکن اس لازوال کتاب اور اس قرآن ثانی پر جو مولانا روم کی مثنوی کی طرح پہلوی زبان میں ہے تفصیلی نقد و تبصرے کا موقع نہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری کے سلسلہ میں اگر موقع ملا تو اس پر تفصیلی تنقید کروں گا۔

بہر حال اقبال کا فلسفیانہ خواب ناکام ہوا، اور ناکام ہونا اس کی تقدیر میں تھا۔ لیکن بہ حیثیت شاعر اس نے اپنی شاعری پر تغزل اور نغمہ و رنگ کے ایسے لطیف پردے ڈالے ہیں کہ پڑھنے والا اس بھول بھلیاں کی ہنسی خوشی سے سیر کرتا ہے۔ زبور عجم، جاوید نامہ، بال جبریل، اور ضرب کلیم اسی قبیل کی چیزیں ہیں جہاں شاعر کے طلسم میں پھنس کر انسان یہ محسوس تک نہیں کرتا کہ یہ وہی شاعر ہے جس نے کبھی نیا شوالہ تعمیر کیا تھا، یا وہ شاعر جو "طلوع اسلام" میں اپنے انوکھے خواب کو پورا ہوتا دیکھتا تھا۔

لیکن اقبال کے فلسفیانہ خواب کا طلسم ٹوٹنے کے بعد بھی اُس کی شاعری کا طلسم برقرار ہے۔ یہ ہے شاعرانہ ساحری، اور یہی حقیقی اقبال ہے۔ وہ شاعر پیدا ہوا، شاعر رہا، شاعر مرا۔ فلسفہ اس کے لئے ایک اکتسابی چیز تھی۔ فلسفے کی رَو میں وہ کچھ دنوں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ لیکن شعر و شاعری اس کا من بھاتا کھاجا تھی۔ اسی میں اس نے سکون پایا۔ اور اسی کے ذریعہ اس نے اوروں کو سکون بخشا۔

ہو سکتا ہے (بلکہ یقین کے ساتھ کہا جائے گا) کہ اسے اسلام اور رسولِ عربیؐ سے عشق تھا۔ لیکن آج کل کے بعض قومی رہنماؤں کی طرح عملی سیاسیات اور دھرم بکھیڑوں میں پھنس کر پرچاری اور اچھوت بننے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ عمر بھر اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں بیٹھ کر درویشانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ اور اس رنگ کو مرتے دم تک نبھا ہا سے

سر آمد روزگارِ آں فقیرے   دِگر دانائے راز آید کہ ناید؟

ابوظفر عبدالواحد

آہ اقبال

مل گیا خاک میں اب علم و عمل کا رہبر
اٹھ گیا دہر سے اسلام کا بیدار نظر

اس کی آواز میں اک درد بھرا رہتا تھا
زخم دل اس کی صداؤں سے ہرا رہتا تھا

آج قدرت کے ارادوں کا مفسّر نہ رہا
جس کی مٹھی میں دل و جاں تھے وہ ساحر نہ رہا

اب نظر آئے گا ہم کو نہ جمالِ نغمہ
مٹ گیا عالمِ فانی سے کمالِ نغمہ

چشمِ انجم کے اشارے کوئی دیکھے تو سہی
حُسنِ مطلق کے شرارے کوئی دیکھے تو سہی

آسماں شوخیِ بے باک سے محروم ہوا
اور جہاں نغمۂ افلاک سے محروم ہوا

اس کے افکار میں گہرائی سمٰوات کی تھی
اس کی آہوں میں چمک، تلخی آفات کی تھی

شعر ہے تازگیِ قطرۂ شبنم پیدا
اس کی ٹھنڈک سے تصور میں تھا اک نم پیدا

محفلِ علم میں اب شعر کا اعجاز کہاں
نغمۂ انجمِ تاباں کا نوا ساز کہاں؟

آہ اسلام کی دولت کے لٹانے والے
آہ ظلمت میں نئی راہ دکھانے والے

آہ وہ شمع کہ جو عشق کی محفل میں نہیں
آہ وہ موج کہ جو حسن کے ساحل میں نہیں

جب عرب اور عجم پر تو عیاں ہوتا تھا
تجھ پہ اک برقِ تجلی کا گماں ہوتا تھا

میں تجھے خاک کی آغوش میں پاتا ہی نہیں
میں تجھے تنگ فضاؤں میں گنواتا ہی نہیں

تو ہے اس وسعتِ جاوید میں سرگرمِ سفر
جو شب و روز تری فکر کے تھی پیشِ نظر

انجم و خاور و مہتاب ہے منزل تیری
روحِ عالی ہے فرشتوں کے مقابل تیری

تیغِ فاروقؓ کے انوار دکھانے والے
فقرِ حیدرؓ کو دل و جاں میں بسانے والے

پیرِ رومیؒ تجھے دامن میں چھپا لیتے ہیں
عرش والے تجھے سینے سے لگا لیتے ہیں

باقی

اقبال کے کلام میں رجائیت کا عنصر

اقبال اپنے وقت کا بڑا شاعر تھا۔ دنیا کی نظر میں "بڑے شاعر" کا مفہوم جو بھی ہو میرے خیال میں بڑا شاعر وہی ہے جس کا کلام آئینہ ہو اس کی سیرت و فکر و بصیرت کا۔

وہ شاعر جو مفکر نہ ہو جو زندگی کو کسی زاویۂ نگاہ سے نہ دیکھتا ہو، جس کا کوئی خاص نصب العین نہ ہو۔ اور جو اپنے کلام میں اپنے معاصرین اور آنے والی نسلوں کے لئے کوئی پیام نہ رکھتا ہو ایک معمولی قسم کا نظم گو ہے۔ چاہے اس کا انداز بیان کتنا ہی پرشکوہ کیوں نہ ہو اور کلام کیسا ہی موثر۔ وہ دنیائے تغزل اور عالم رنگ و بو کے چار عناصر سے باہر نہیں جا سکتا۔

اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی۔ وہ مصلح بھی ہے اور پیامبر بھی۔ اس کی دنیائے شاعری امید اور نوید سے بھرپور ہے۔ اس کے کلام میں یاس و حرماں کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس کا دل آماجگاہ ہے امیدوں کا اس کی ذہنیت مرکب ہے توقعات سے اور اس کی روح متمسک ہے آیۂ ربانی لا تقنطو من رحمتی سے۔

چونکہ اقبال بڑا شاعر ہے اس کے ہر لفظ سے اس کے جذبات ٹپکتے پڑتے ہیں اور اس کے کلام میں اس کے افکار جھلکتے ہیں۔ جو بات دل سے نکلتی ہے دلوں کو گرما جاتی ہے۔ اس لئے اس کا کلام پرزور اور بلند آہنگ ہونے کے علاوہ پرتاثیر بھی ہے۔ اس کے کلام میں رجائیت کا عنصر بہت زیادہ ہے جس کے اسباب کو دریافت کرنے کے لئے شاعر کے خیال، پیام اور فلسفہ پر بھی ایک نظر ڈالنی پڑے گی۔ اقبال ایک بلند نصب العین رکھنے کے علاوہ ایک منظم فکر اور خاص مسلکِ خیال کا حامل ہے۔ وہ اپنے خیال کے اظہار کے لئے ایک ایسا رنگ اختیار کرتا ہے جو اس کے باطنی اضطراب اور شدید جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ اس تڑپ کے اظہار کو بھی جولت بخشنے کے لئے اس کے دل میں ہے ایک پائندہ منفی خیال کرتا ہے۔ شکوہ، جواب شکوہ، فریاد امت وغیرہ اقبال کی وہ نظمیں ہیں جن کا مقصد ملت کے مضمحل قومی اور نیم مردہ جسم میں زندگی کی روح اور قومی اخلاق و ادبیات میں نشاۃ جدید کا پیدا کرنا ہے۔ گو وہ حیات کو مغربی رنگ کی کورانہ تقلید سے الگ رکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشاہیر اسلام اور اسلاف کا بار بار ذکر کرتا اور اپنے مسلک خیال کو اپنے ہی الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

"میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ اور مجھ کو پان اسلامزم کی تحریک پھیلانے والا بتلایا جاتا ہے۔ مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی۔ اور اسلامی روح آخرکار غالب آئے گی۔ اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے اپنی نظموں کے ذریعے سے تمام قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی کہ باوجود دولت و امارت کے وہ اس دار فانی کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ میں جب کبھی دہلی آتا ہوں میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات وغیرہ پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں۔ میں نے ابھی ایک شاہی قبرستان میں ایک قبر پر الملک للہ کا کتبہ لکھا ہوا دیکھا۔ اس سے اس اسلامی جوش کا اظہار ہوتا ہے جو دولت اور حکومت کے زمانے میں

مسلمانوں میں تھی۔ جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول ہو اس کے مستقبل سے نا امیدی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وہ پان اسلامزم ہے جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے اور اس قسم کے خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں"۔

قلب شاعر کے یہی وہ محرکات ہیں جو اس کو کبھی مایوس ہونے نہیں دیتے۔ اقبال کی نظر میں اسلام اور مسلمان کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ مسلمان ہی کیا جس میں فقرِ حیدری، سیاستِ فاروقی، رومی کی بصیرت اور شاہین کی بصارت نہ ہو۔ مومن فخرِ موجودات اور صاحبِ ممکنات ہے سے

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مومن کی شانِ استغنا بھی ملاحظہ ہو۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔ خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں شانِ اسد اللّٰہی

اقبال اپنی وسعتِ نظر، علوِ خیال اور بلند حوصلگی میں مثل ایک شاہین کے ہے جو آسمان فکر و تخیل کی نیلی فضاء میں مصروفِ پرواز ہو۔ جس طرح شاہین کی آنکھیں دور بین ہوتی ہیں۔ اقبال کی بصیرت دورِ حاضر کی مادی دنیا کے تکوینی اور تخریبی حالات کو سر بفلک بلندیوں سے دیکھتی ہے اور اس طرح حکم لگاتی ہے۔

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

الٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

یہی وہ رجائیت ہے جس نے شاعر کے کلام میں جان ڈال دی ہے۔

اقبال کا پیام پیامِ عمل ہے۔ پیامِ جد و جہد ہے۔ اس کی شاعری میں "بڑھے چلو" اور "چلے چلو" کی صدا گونجتی نظر آتی ہے۔ وہ ابراہیم ادہم کی طرح ترک ماسوا اللہ کرنے کا قائل نہیں بلکہ اس کا اعتقاد ہے کہ "زمنزل جادۂ پیچیدہ خوش تر"۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے — قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

مختصر مضمون میں مثالیں پیش کرنے کی کم گنجائش ہے۔ اقبال کی رو سے حقیقت کی منزلِ مقصود تک ایک جہد مسلسل کی بدولت رسائی حاصل ہوتی ہے۔ جو کچھ ہے عمل ہے اور وہ عمل اسلامی تعلیمات کی حقیقی پیروی ہے۔ اس کا ایقان ہے کہ انسان نائب خدا اور حامل اسرار خداوندی ہے۔ وہ اپنے فرض منصبی کو اس وقت پورا کر سکتا ہے جب وہ دنیا کو ترک نہ کرے بلکہ دنیا پر حکومت کرے۔ نفس امارہ کا غلام نہ بنے بلکہ اس کو اپنا غلام بنائے ظالم کے ظلم کا شکار نہ ہو جائے بلکہ اپنے جائز حقوق کی آخر دم تک محافظت کرے۔ قوانینِ قدرت سے آگاہی حاصل کرے اور ان پر عدل کے ساتھ تصرف حاصل کرے۔

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل — حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر — کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے "بتا! تیری رضا کیا ہے"

اقبال کا "پیام مشرق" المانوی شاعر گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے۔ گوئٹے کے مغربی دیوان کے ٹھیک سو سال بعد پیام مشرق سے دنیا روشناس ہوتی ہے۔ گوئٹے کے مغربی دیوان کی اشاعت کا زمانہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فرانس دورِ انقلاب سے گزر رہا تھا۔ جرمن قوم کا زوال ہر پہلو سے نمایاں تھا۔ جرمنی کے مشاہیر شعرا، ادیب اور مفکر خارجی دنیا کی کشمکش اور ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر فطرت انسانی کی کھوج میں لگتے ہیں۔ اور کائنات کی گہرائیوں میں اپنے افکار کو لے جاتے ہیں۔ شعراء اور ادیب کبھی تو حافظ کے رنگ کو پسند کرتے ہیں (جیسے فان ہیمر اور گوئٹے) اور کبھی سعدی کو سراہتے ہیں۔ کوئی نظامی کا دلدادہ ہوتا ہے (جیسے شلر) تو کوئی رومی کا (جیسے روکرٹ)۔ غرض یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن مفکر، شاعر اور ادیب کا طائرِ خیال قریبی ماحول سے تنگ آکر اس نشیمن کا متلاشی تھا جو عالم کون و فساد سے بہت بلند ہے۔

پورے سو سال بعد مشرق کے مایۂ ناز شاعر نے پیام مشرق کو پیش کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی ممالک سیاسی انحطاط کے پست ترین منازل سے گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جمود و سکون کا تسلط ہر طرف نظر آتا ہے۔ اس نازک وقت میں ایک عالی ہمت ہستی اپنا ولولہ خیز جان آفرین پیام سنا کر موت کے سناٹے میں زندگی کی گونج پیدا کر دیتی ہے۔ آہ! غریق رحمت کرے خدا اس محسن قوم کو جس نے مرتے دم تک قوم کی خدمت کی۔ اس کی شاعری صور اسرافیل سے کم نہ تھی جس نے سوتوں کو جگایا اور جاگنوں کو حیاتِ تازہ بخشی۔ کیسی مبارک ذات تھی اقبال کی جس نے عین وقت پر قوم کے درد کو سمجھا اور ایک ایسا پیام پیش کیا جو عشق کے سوز و گداز کو ظاہر کرتے ہوئے فطرت کے اسرار انسانی ہستی کے رموز اور اس کی لامتناہی وسعتوں کو لئے ہوئے ایک نشاۃ جدید کو پیش کرتا ہے ؎

تا مرا رمزِ حیات آموختند — آتشے در پیکرم افروختند

یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام — عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

اقبال نے اپنے اور المانوی شاعر گوئٹے کی نسبت کیا اچھا کہا ہے ؎

او چو بلبل در چمن فردوس گوش ۔۔۔ من بہ صحرا چوں جرس گرمِ خروش
ہر دو دانائے ضمیرِ کائنات ۔۔۔ ہر دو پیغام حیات اندر ممات

شاعر کا حساس دل زمانہ کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس جمود و سکون کا وہ متحمل نہیں ہوتا جو اس کے ماحول میں موجود ہے اس کو مٹانے کے لئے وہ انقلاب کا خواہاں ہے جو ایک ولولۂ حیات، کوششِ پیہم اور آزادیٔ ضمیر کا حامل ہو۔ وہ جمود قوم سے رنجور ہے اس کا دردِ دل اس کے ہر لفظ سے ٹپکتا ہے خصوصاً وہ اشعار جو شاعرِ مشرق نے حکیم سنائی کے مزار پر ایک خاص حالت میں لکھے اس کے جذبات کا آئینہ ہیں۔ یہ اشعار حکیم سنائی کے اس مشہور قصیدے کی بحر میں موزوں ہوئے ہیں جس کا مطلع ہے۔ ؎

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون است و آں والا ۔۔۔ قدم ازہر دو بیروں نہ نہ اینجا باش و نے آں جا

حکیم نے اپنے اشعار میں عارفانہ حقائق کے موتی رولے ہیں مگر اقبال کے اشعار ایک خاص کیفیت، شدید جوش اور قومی درد میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ؎

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی ۔۔۔ یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے ۔۔۔ "گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا"
لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے ۔۔۔ مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا
اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی ۔۔۔ نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

لیکن باوجود قوم کی سیاسی معاشرتی اور اقتصادی پستیوں سے اس قدر متاثر ہونے کے وہ مایوس نہیں ہوتا۔ اس نے کبھی اپنی قوم کو یہ کہہ کر پست ہمت نہیں کیا۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر ۔۔۔ مجھے تو اُن کی خوش حالی سے ہے یاس

بلکہ اس کے وجدان میں امیدوں کی بستی آباد ہے۔ ؎

نومید نہ ہو اِن سے اے رہبرِ فرزانہ ۔۔۔ کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اقبال ایک سچا مسلمان ہے۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا نہیں جانتا۔ کوشش کرنا اور کامیابی کی دعا کے اثرات پر یقین رکھنا اس کا ایمان ہے۔ ایک فلسفی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال عالم اور مافی العالم کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے شاعرانہ وجدان کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی پرجوش اور طوفان خیز موجوں میں تبلیغِ خیال اور پیامِ عمل ہے اور جس کی گہرائیوں میں زندگی کے ارتقا اور تعلیمِ روحانی کے بیش بہا گوہر ہیں۔

وہ خود ایک فلسفی ہے اور تاریخ فلسفہ کا مبصر بھی۔ ارسطو و افلاطون، سینا و فارابی سے لے کر ہیگل، نطشے، شیلر، کارل مارکس، برگساں اور آئنسٹائین کے نظریوں پر عالمانہ اور ناقدانہ عبور رکھتا ہے۔

چونکہ وہ خود ایک منظم فکر کا حامل ہے اس لئے ان شعرا سے کچھ نسبت ہی نہیں رکھتا جو صرف تغزل کی زمینوں کو محدود سمجھ کر تصوف اور فلسفہ کے عارضی زور میں ایک جدید عالم رنگ و بو پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ ان کے دل و دماغ کسی مستحکم خیال و فلسفۂ حیات سے خالی ہوتے ہیں ان کی شاعری روایتی تصوف اور عارضی فلسفہ نگاری کے جھونکوں میں جھول جھول کر رہ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے اقبال کے جذبات مثل ایک ابلتے چشمے کے ہیں جس کے سوتے خاک دانِ حیات سے ابلنا چاہتے ہیں۔ اور شکوہِ خیال اور حوصلہ کی بلندی میں

اپنی آپ نظیر ہیں ؎

در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اقبال کا فلسفہ مغرب و مشرق کے افکار کا خوش گوار امتزاج ہے۔ اقبال اسلامی تعلیم، اسلامی اخلاق اور اسلامی اشراق کا پیام بر ہے مگر اس کا پیام تعلیم جدید رنگ کا ہے۔ اس کا فلسفہ حیات مغربی و مشرقی حکمت کا ایک مفید مرکب ہے۔ وہ اجتناب کرتا ہے اس مادی فلسفہ سے جو مغربی حکمت کا ما حصل ہے۔ اس مادی مفاد اور فانی مسرتوں سے جو مغربی ترقی کا حاصل سمجھی جاتی ہیں۔ روحانیت کا فقدان اس کے لئے ناقابل برداشت اور قابل ملامت ہے ؎

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب — بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب

نہ کر فرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے — کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار — طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر

وہ اس حد تک مشرقی اشراقیین کا ہم نوا ہے۔ جذب و عشقِ حقیقی کے بغیر معرفت ناممکن الحصول ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

حدِ ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی — سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری

اقبال بصارت اور بصیرت میں اسی طرح فرق کرتا ہے جس طرح دوسرے اسلامی عرفا کرتے ہیں ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اگرچہ اس معاملے میں وہ مشرقی اشراقیین کا ہم نوا ہے تاہم اس کا فلسفۂ اشراق عام اشراقیین سے ایک لحاظ سے جدا ہے۔

تمام اشراقیین عالم چاہے وہ کسی ملک مذہب و ملت کے ہوں اس عقیدے میں متفق ہیں کہ (۱) ادراکِ حقیقت ممکن الحصول ہے۔ (۲) اس ادراک کا ذریعۂ حصول جذب باطنی ہے یعنی وہ ایک حال کا عالم ہے۔ جس کے لئے قیل و قال کا ظرف موزوں نہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو بیان میں نہیں آسکتی اور اس کا تجزیہ و ترکیب ممکن نہیں۔ (۳) روحانی شعور کے روشن ہونے سے ادراکِ حقیقت یا شہود حاصل ہوتا ہے۔ جس کا مقصد سکونِ ابدی حاصل کرنا ہے۔ سکون اس عالم کو کہتے ہیں جس میں طالبِ حقیقت کو انتہائی مسرت اور انتہائی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ عالم ہے جس میں داخل ہو کر طالب و مطلوب ایک ہو جاتے ہیں اور ایک سرمدی شعور حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی متصوفین کا بھی کم و بیش یہی عقیدہ ہے۔ جو ان کے مکتوبات اور ملفوظات سے ظاہر ہے۔

اس کے علاوہ اقبال فلسفۂ تصوریت کا قائل ہے اور اس معاملہ میں غالب کا ہم نوا ہے۔

غالب — ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اقبال — نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

اس کے سوا اقبال کا فلسفۂ حیات برگسانی فلسفہ سے ماخوذ نہیں تو متاثر ضرور ہے۔ برگسانی فلسفہ کے لحاظ سے عالم تغیر کو کون و فساد کا

مرکز خود متحرک ہے یعنی حقیقت خود متغیر بھی ہے اور باعث تغیر بھی اور اس کا یہ تغیر دوامی اور مسلسل ہے۔ ؎

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات — سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

برخلاف اس کے افلاطون کے خیال سے عالم کا ظہور تصوراتِ مجردہ سے ہوتا ہے جو تغیر اور کون و فساد سے ماورا ہیں۔ ارسطو کے نزدیک حقیقت محرکِ عالم ہے مگر خود غیر متحرک۔ صوفیائے کرام کہتے ہیں (جس کی سند کلام پاک سے لی جاتی ہے) عالم خلق کا دار و مدار عالم امر اور اعیانِ ثابتہ پر ہے اور یہ عالم بھی متغیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں تغیر پیدا کر سکتا ہے۔ برگساں کے خیال کی رو سے حقیقت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اور اس کا مسلسل تغیر ہی زمانی اور مکانی تعینات کا باعث ہوتا ہے جو اس کے دائمی تغیر کی سطحی حالتیں ہیں جس کا ادراک شعور کی گہرائیوں میں داخل ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ اقبال اپنے اسی مسلکِ خیال پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ چونکہ حقیقت خود متحرک ہے اور تغیرِ پیہم ہی زندگی ہے اس لئے وہ مخلوق جو جد و جہدِ متصل اور کوششِ پیہم کو اپنا نصب العین بنائے حقیقت کے خلاف ورزی کرتی ہے اور قدرت سے جنگ کرنا اور منشائے حقیقی سے اختلاف کرنا اس کا پیش خیمہ ہے۔ اسلام بھی کوشش اور عمل کا حکم دیتا ہے۔ ہادیٔ برحق نے اسی کی تلقین کی اور فرما دیا کہ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ کوشش کرو اور اس کی رحمت کے امیدوار رہو۔ اقبال کا مسلکِ خیال بھی یہی ہے کہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے گا اور ضرور کرے گا ؎ نہیں دیر لگتی اسے کرنے بار — نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

مگر ہر مسلمان کا فرضِ اولین اسلامی تعلیمات کی پیروی ہے۔ اقبال نطشے کے خیال "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا بھی قائل ہے۔ وہ طاقت اور زور کا دلدادہ ہے۔ وہ فوجی قوت کا بھی خواہاں ہے۔ نڈرپن، بے خوفی اور حق کے لئے جنگجوئی کا مداح ہے۔ اس حد تک وہ نطشے کا ہم زباں ہے۔ لیکن نطشے جنون کی حد تک زور اور قوت کا قائل ہے۔ اس کے خیال سے سب کچھ زور اور فوجی قوت کا نتیجہ ہے۔ افسوس ہے کہ ہم یہاں نطشے کے خیالات کا ترجمہ نہیں کر سکتے۔ مضمون کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس کے اصلی جذبات عریاں کر دیئے جاتے۔ اقبال باوجود نطشے کا مقلد ہونے کے اس کے ان خیالات سے محترز ہے جن میں دہریت کی بو آتی ہے۔ وہ طاقت چاہتا ہے لیکن صداقت کے ساتھ، قوت اور زور کا قائل ہے لیکن ساتھ ہی مادہ پرستی اور دنیا پرستی سے متنفر۔ وہ دنیا پر تصرف چاہتا ہے لیکن عدل کے ساتھ۔ زورِ حیدری کے ساتھ سیاستِ فاروقی بھی چاہتا۔ اس لحاظ سے اس کا تفکر نطشے سے مختلف ہے۔ نطشے خدا کا قائل نہیں لیکن اقبال سچا موحد ہے۔ ؎ توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

یہی ہے وہ اسلامی تعلیم اور قرآنی وعدہ کے ایفا کا ایقان ہے جس نے اقبال کو ہمیشہ امیدوارِ فضل و کرم رکھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک کامیاب شاعر بنایا کیونکہ امید دلا دلا کر آمادۂ عمل کرانا نفسیاتی نقطۂ نظر سے عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ اقبال کے کلام میں رجائیت کا عنصر اس کے خیال، مسلک اور فلسفہ کا نتیجہ ہے اگر اقبال اسلامی تعلیمات کا اس درجہ پیرو، فریفتہ اور ثنا خواں نہ ہوتا۔ اگر اسلام اور اصولِ اسلام سے اس کو ایسی شدید تسکین اور محبت نہ ہوتی اگر اقبال نے متصوفینِ اسلام کے مکتوبات کا اتنا گہرا مطالعہ نہ کیا ہوتا اور عرفا، اسلام اور کلامِ ربانی کے مطالب و فلسفہ پر ایسا عالمانہ اور ناقدانہ غور نہ کیا ہوتا تو ایسا مکمل فلسفۂ حیات، پیام، تعلیم اور مسلکِ خیال مرتب نہ کر سکتا۔ اقبال کا کلام الہام سے کم نہیں اور اس میں رجائیت کا عنصر نفسیاتی نقطۂ نظر سے "قم" کی صدا ہے جو سوتوں کو جگاتی اور مُردوں کو اپنے سحر آفریں اثر سے جلا دیتی ہے۔ اقبال کا ہم عصر ٹیگور گیتان جلی میں کم و بیش اقبال ہی کے فلسفۂ خیال کو پیش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں حقیقی یوگ بھگتی یوگ ہے۔ عرفانِ حقیقی کے منازل عمل کے راستے سے طے ہوتے ہیں۔ اور روح نجاتِ ابدی (مکتی) تک عمل ہی کے ذریعے سے پہنچ سکتی ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے ترکِ دنیا کرنا، خانقاہ نشیں ہونا، ریاضت، تسبیح و تہلیل میں وقت بسر کرنا ایک قسم کی روحانی خود غرضی ہے۔

لطیف النساء بیگم

اقبال کی نعتیہ شاعری

انسان کامل سے ان کا قلبی ربط

در جہاں شمع حیات افروختی　　　بندگان را خواجگی آموختی

(کائنات میں آپ ہی نے شمع حیات روشن کی، غلاموں کو سرداری سکھائی)

اردو اور فارسی شاعری کے ہر دور میں نعت گوئی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان ہر دو زبانوں میں نعت شریف کا وافر ذخیرہ موجود ہے ہر دور کے چھوٹے بڑے شعرا بقدر ہمت اس سعادت میں شریک ہوتے رہے۔ دور حاضر کے شاعر اعظم علامہ اقبال نے بھی اپنی مخصوص عظمت کے شایان شان پورے جوش اور اخلاص سے اس میں حصہ لیا۔ اس لحاظ سے بھی کہ وہ مشرق کے شاعر اعظم تھے۔ اس اعتبار سے بھی کہ وہ انسانیت کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ ان کا یہ "پیام انسانیت" ناقص رہتا اگر ان کا تصور انسان کامل تک رسائی حاصل نہ کرتا۔ علامہ اقبال کو ذات رسالتمآب ؐ سے غیر معمولی عشق و محبت تھی۔ ان کے حکیمانہ دل و دماغ نے یہ محسوس کر لیا کہ حب نبوی کے بغیر سارا علم و عمل حجاب ہی حجاب ہے کیونکہ انسانیت کی حقیقی تعمیر کے لئے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا مرجع اور مرکز ذات رسالتمآب ؐ ہی ہے۔

ایں ہمہ از لطفِ بے پایاں تو　　　فکرما پروردۂ احسانِ تو

(سب کچھ آپ کی عنایت بے پایاں ہی سے حاصل ہوا ہماری فکر آپ کی آغوش احسان کی پروردہ ہے)

علامہ اقبال کا یہ حُب ان کے ترقی پذیر کلام کے ساتھ ساتھ تدریجاً نکھرتا اور ترقی کرتا گیا تا آنکہ جب ان کا کلام انتہائی بلندیوں پر پہنچا تو ان پر مقامات "نبوت کبریٰ" بھی اسی لحاظ سے منکشف اور منفتح ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور کا نام مبارک یا ذکر مبارک کسی کی زبان پر آجاتا تو ان کی آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہو جاتیں۔ ابھی حال کا ذکر ہے کہ "یوم اقبال" کے موقع پر مولوی اسلم صاحب جیراجپوری نیاز حاصل کرنے کے لئے گئے تھے وہ اپنی اس ملاقات کا ذکر "جامعہ" میں یوں کرتے ہیں "دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے (۹) نبجے تھے سلسلۂ گفتگو ½ ۱۲ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں کچھ سنایا بھی مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش اینجا و با خاصاں بیامیز　　　کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہو گیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر بالکل آیتہ ان اللہ وملیئکتہ یصلون علی النبی۔ (بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی ؐ پر درود بھیجتے ہیں) کے استغراق کا پرکیف احساس ہے۔

نعت کے پاکیزہ موضوع پر علامہ اقبال کی مستقل نظمیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف نظموں، رباعیوں اور غزلوں میں کہیں جستہ جستہ اور کہیں مسلسل شعر بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی سرمایۂ نجات و فلاح میں ایسے ایسے در شہوار موجود ہیں کہ آیندہ اہل دل اور اہل نظر کسب ضیا کریں گے۔ ملاحظہ ہو

"عندلیب باغ حجاز" اپنے سینائے دل کی فضاؤں میں گرم پرواز ہوکر بارگاہِ صمدیت میں یوں شرف مخاطبت حاصل کرتا ہے

شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تونے ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تونے

بارگاہ قدس سے اپنے حبیبؐ کی صفت وثنا میں ڈوبی ہوئی ندا آتی ہے۔

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ذکر نبی کی ابدیت اور رفعت کی نوید سنائی جاتی ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

اقبال کوئے حبیب کا سکندر دماغ گدا ہے ماشاء اللہ کیا شان گدائی ہے کہ شوکتِ سلاطین اس کا طواف کرے۔

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم وہ گدا کہ تونے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

سبحان اللہ کیا سرفرازی ہے کہ فرشتے بارگاہِ رسالت میں لئے جاتے ہیں۔ یہ "عندلیب باغ حجاز" یوں مخاطبت کی عزت حاصل کرتا ہے

کہا حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

اقبال کا قلبِ صافی آٹھوں پہر سرخوشِ جام ولائے محمدؐ ہے اس کی شکست اور فتادگی غیرت دہ سجدہائے نیاز ہے۔

ہمیشہ "سرخوشِ جام ولا" ہے دل تیرا فتادگی ہے تری غیرت سجود نیاز

حضور رسالتمآب میں آبگینۂ دل نذر میں پیش کرتا ہے۔ جس میں امت کی آبرو اور طرابلس کے شہیدوں کا خون جھلک رہا ہے۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حضرت صدیق اکبرؓ جن کا سینہ آتش عشق و محبت کا مجمر تھا۔ ایک دن سارا سرمایۂ روزگار حضور نبوی میں خدمت اسلام کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ان کے احساس فدائیت کی ترجمانی حضرت اقبال کی زبان سے سنیے۔

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر اے تیری ذات باعثِ تکوینِ کائنات

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

حضرت بلالؓ جن کی فطرت "نور نبوت" سے "مستنیر" تھی ان کے بیتاب جان و دل کا بیان کیا خوب ہوا۔

نظر تھی صورت سلمان ادا شناس تری شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

حضرت بلال کو مثل کلیم نظارے کا سودا تھا۔

تجھے نظارہ کا مثل کلیم سودا تھا اویس طاقت دیدار کو ترستا تھا

ادائے دید کے پردہ میں "نیاز" و "نماز" کی یکجائی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے۔

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اشتیاقِ دید کی سعادت میں اقبال کا دل کس درجہ شریک ہے۔ اس کا اندازہ کیجئے۔

خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا

سیرۃ طیبہ میں معراج ایک مہتم بالشان حقیقت ہے اس کا فیضان بقدر ظرف و ہمت ہر مسلم پر عام ہے۔

کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات رہ اک گام ہے ہمت کیلئے عرش بریں

نکتۂ معراج سر سراپردۂ جاں ہے جس نے اس نکتہ کو سمجھا رفعتِ نظر کی ثریا اس کا ہدف بنی۔

ہے سر سراپردۂ جاں نکتۂ معراج ناوک ہے مسلمان ہدف اس کا ثریا

جس نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اس کا مد و جزر چاند کا محتاج رہا تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج۔

کہیں ملتِ مرحومہ کی تباہ حالی پر اقبال بارگاہِ روحِ نبوی میں عرض کرتے ہیں۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر

آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ

اوپر عرض کیا گیا ہے جوں جوں اقبال کا ربط محبتِ ذاتِ نبوت سے بڑھتا گیا ان کے قلبِ مجلیٰ پر مقامات نبوت کا انفتاح ہوتا گیا یہاں تک کہ انا من نور اللہ والکل خلقھم من نوری۔ (میں اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوں اور تمام مخلوق میرے نور سے) کے جاودانی کیف و سرور کو اقبال کی بصیرت نے پالیا اور ان کی یہ بصیرت اس قدر بلند ہوئی کہ بصارت پر چھا گئی۔ اب وہ خودی کی خلوتوں میں کبریائی اور اس کی جلوتوں میں مصطفائی کا تماشا بے حجاب کرنے لگے۔

خودی کی خلوتوں میں کبریائی خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز ظاہرش ایں جلوہائے دل فروز

اس موضوع پر نسبتاً علامہ اقبال کی فارسی نظموں میں نہایت لطیف اور نازک مضامین زیادہ آئے ہیں۔ ان سب کا احاطہ اس موقع پر ناممکن ہے۔ اس لئے فارسی کے چند شعر پیش کرکے مضمون ختم کئے دیتے ہیں۔

حضور کا ظہور، زندگی کا شباب ہے آپ کے جلوے کے بغیر زندگی ایک خواب بے تعبیر ہے

جلوہ ات تعبیر خوابِ زندگی اے ظہور تو شبابِ زندگی

حضور کے ظہور نے کائنات کے مدارج بلند و بالا کردئے۔ آپ کی دولت فقر نے کائنات کو ابدی حقایق کا سرمایہ دار بنا دیا۔

فقر محمدی کو سرمایۂ کائنات کہنا حقیقت کی کتنی پاکیزہ تعبیر ہے۔

فقر تو سرمایۂ ایں کائنات از تو بالا پایۂ ایں کائنات

حقیقی فقر و شاہی اسی ذات کے فیضان سے ہے یہ ساری تجلیاں اسی جلوے کی دریوزہ گری سے مالامال ہیں:

ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفیٰ فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ

"انیت کبریٰ حضور کا مقام خصوصی ہے۔ اس مقام تک رسائی انسان کا کمال اور معراج ہے حضور کا آشکارا دیدار اور حضور کی حقیقت کا واضح ادراک ہماری سیر اور معراج کا منتہا ہے اور ہم حضور کے ضمیر پاک میں اپنی تجدداتی انتہائی مقام عبدیت) پالیتے ہیں۔

آشکارا دید نقش اسرائے ما | در ضمیرش مسجد اقصائے ما

قندھار میں حضور کے خرقہ مبارک کی زیارت کے بعد اقبال کے حسیات کا ارتعاش اور جذبات کا تلاطم دیکھئے۔

رقص اندر سینہ ام زور جنوں | تا ز راہ دیدہ می آید برون

بوئے پیرہن پاک سے ان کی مشام جان معطر ہو جاتی ہے تو یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

آمد از پیراہن او بوئے او | داد مارا نعرۂ اللہ ہو

آپ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت بلالؓ کے سرود محبت و کامرانی سے محظوظ ہو چکے ہیں اب ذرا ابو جہل کے نوحۂ ہزیمت و شکست کو بھی گوش گزار فرما لیجئے۔ عہد جاہلیت کے افکار و عادات کے خلاف اسلام نے وحدت، اخوت، مساوات وغیرہ کی جو تعلیم دی ہے وہ متکبر مخالفین کے خیال میں فضل عرب کی تباہی کا باعث تھی۔ بوجہل اس پر نوحہ کرتا ہے۔ خصوصیات اور محاسن اسلام کا ذکر ابو جہل کے نوحہ میں نعت گوئی کا نادر پیرایہ ہے۔

مظہرِ شر سے اقرار خیر کا مشاہدہ کیجئے۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ | از دم او کعبہ را گل شد چراغ

اپنے تصورِ جہالت کے خلاف آواز سے بوجہل کا دل و دماغ ٹھکانے نہیں اس لئے سارا معاملہ سحر ہی سحر نظر آتا ہے۔

ساحر و اندر کلامش ساحری | ایں دو حرف لا الہ خود کافری

حالات سے پریشان ہو کر کائنات کو انتقام پر آمادہ کرتا ہے۔

پاش پاش از ضربتش لات و منات | انتقام از وے بگیرائے کائنات

اس کا خیال ہے کہ حقیقت بین غائبہ وابستگی خطا ہے جو چیز چشم محسوس سے اوجہل ہے وہ معدوم ہے۔

دیدہ بر غائب فرو بستن خطا است | انچہ اندر دیدہ می ناید کجا است

اسلام نے ملک و نسب، فضل و شرف خاندانی کی پرستش پر پانی پھیر دیا ایک ممتاز قریشی کے ہاتھوں قبائلی اور نسلی بت کی شکست اس کے لئے حیرت انگیز ہے۔

مذہب او قاطعِ ملک و نسب | از قریش و منکر از فضلِ عرب

اسلام نے آقا و غلام زنگ و ملک کا امتیاز مٹا دیا، مساوات کے خلاف عادت عمل اس کے احسان متکبر پر ایک کاری ضرب ہے۔

در نگاہ او یکے بالا و پست | با غلام خویش بر یک خوان نشست

حضرت اقبالؒ کا جس قدر کلام نعت میں ہے وہ اس قدر بلند وسیع اور کثیر ہے کہ ایک ہی صحبت میں سب کا سب پیش نہیں کیا جا سکتا انشاء اللہ کسی اگلی صحبت میں اس کی تکمیل ہو سکے گی۔

فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

سید وحید اللہ وحید۔ نلگنڈہ (دکن)

آہ اقبال

ہندوستاں پہ چھائیں کیوں شام کی گھٹائیں ڈوبی ہوی ہیں غم کے دریا میں کیوں فضائیں
پھیلی ہوی ہے ہر سو کیوں موت کی خموشی کیوں آج ہے حکومت ہر چیز پر خزاں کی
کیوں زندگی سراپا مغموم ہو رہی ہے بے لطف اک کہانی معلوم ہو رہی ہے
لیلائے شب کی زلفیں کیوں منتشر ہیں اتنی کیوں زرد پڑ گئی ہے شکل آج چاندنی کی
تر آنسوؤں سے کیوں ہیں مژگان چشم انجم کیوں آج لب پہ ان کے رقصاں نہیں تبسم

کیوں چپکے چپکے شبنم آنسو بہا رہی ہے
پیغام موت لے کر کیوں صبح آ رہی ہے

رنگینیاں ادب کی آنسو نہ کیوں بہائیں کیوں شاعری کی شمعیں خاموش ہو نہ جائیں
اقبال وہ سپہر علم و ادب کا اختر وہ فخر ملک و ملت۔ وہ ہند کا سکندر
"بانگ درا" نے جس کی اسلام کو جگایا "پیغام" جس نے اپنا "مشرق" کو کہہ سنایا
وہ جس کی "بال جبریل" اہل سخن نے دیکھی "ضرب کلیم" جس کی سارے جہاں میں گونجی
وہ جس کی شاعری کا چرچا تھا آسماں پر فریاد جس کی پہونچی دنیا سے لامکاں پر
وہ جس سے زندہ شان اسلام ہو چلی تھی رنگین داستان اسلام ہو چلی تھی
مسلم کے دل میں پھونکی ایمان کی روح جس نے دہرائے جس نے قصے اک بار پھر احد کے
وہ جس کی ضو سے روشن ایوان شاعری تھا سرسبز جس کے دم سے بستان شاعری تھا
افسوس آج رخصت وہ ہو گیا جہاں سے ہم دوش ہے بہار شعر و ادب خزاں سے

گریاں رہیں گی آنکھیں ملت کی مدتوں تک
سونی رہے گی بزم معنی بھی مدتوں تک

علی احمد

یادِ اقبال

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے۔

موت ہر شخص کے لئے ہے جو دنیا میں آیا ہے وہ جائے گا ضرور انسان ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کو فنا ہونا ضروری ہے لیکن مرنے مرنے میں بھی فرق ہے۔ یوں تو روزانہ ہزاروں انسان گزر جاتے ہیں کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ ایک وہ موت ہے کہ ایک شخص کے مرنے سے بہت سوں کو رنج ہوتا ہے اُس کی یاد ایک زمانہ تک دوسروں کے دلوں میں تازہ رہتی ہے۔

سر محمد اقبال مرحوم ہمارے شہر کے رہنے والے نہ تھے لیکن ان کے انتقال کی خبر جب حیدر آباد میں پہنچی تو تمام شہر میں بجلی کی طرح گونج گئی بڑے بڑے تعزیتی جلسے ہونے لگے نوجوانانِ دکن نے بہت بڑا جلسہ کیا اور گاؤں گاؤں میں جلسے ہوئے۔ بہت سے اسکولوں میں جلسے ہوئے۔ سب سے پہلا جلسہ میں نے انجمن خواتین دکن کی جانب سے ۲۵ اپریل کو محل ممتاز یار الدولہ کی صدارت سے اسکول صفدریہ واقع ہمایوں نگر میں کیا۔ یہ جلسے وغیرہ آخر کس لئے ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ سر محمد اقبال جب تک زندہ رہے انھوں نے اپنا وقت دوسروں کی بھلائی کے لئے دیا ایسی ایسی نظمیں جوشیلی لکھیں جس کی وجہ سے ہم بیدار ہوئے انھوں نے سونے والوں کو جگایا، اور اپنے ملک سے محبت کرنا سکھایا۔ انہوں نے زندگی کس طرح گزارنی چاہیئے بتایا جو انسان دوسروں کے لئے محنت کرتا ہے جس کے دل میں خلوص رہتا ہے اس کی زندگی میں بھی اس کی قدر ہوتی ہے اس کے بعد بھی اس کی عزّت ہوتی ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر ایران کی تاریخ کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا اس کی سالگرہ ہزار سالہ ہوی اس کی یاد پارسی مسلمان سب کے دلوں میں تازہ ہے یہ کس لئے صرف اس کی نیت اور خلوص کا سبب ہے کہ فردوسی کے مرنے کے بعد سالگرہ ہوی۔ لیکن اقبال مرحوم کی وہ عزت ہوئی کہ ان کی زندگی میں یوم اقبال منایا گیا میرے خیال میں کسی شاعر کی زندگی میں ایسی قدر و عزت نہ ہوی ہوگی۔ مرنے کے بعد جلسے ہوئے تو کیا نہ ہوئے تو کیا مرنے والے کو تو کچھ اس کی خبر نہیں ہوتی۔ بقول شاعر۔

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے
کہ ہم تو یہاں بھی اکیلے رہے۔

یہ اقبال کی اقبال مندی تھی جو اُن کی زندگی میں یوم اقبال منایا گیا ان کو ضرور خوشی ہوی ہوگی بلکہ روحانی خوشی ان کو ان کی زندگی میں حاصل ہوی۔ اب بھی وہ مرے نہیں وہ زندہ جاوید ہیں ان کا کلام اور ان کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اقبال کشمیر کے رہنے والے تھے انھوں نے اپنے بچپن میں جو اشعار کہے وہ لکھتی ہوں

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافہ غزال ہوا ہے ختن سے دور

ہندوستان آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے

ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موت اور زندگی پر مرحوم نے جو اشعار لکھے وہ قابل داد ہیں

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوشنوا　　　شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

آہ کیا آئے ریاض دہر میں اور کیا گئے　　　زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے

میں اقبال مرحوم کی زندگی کے حالات نہیں لکھ رہی ہوں اور نہ ان کا کلام لکھ رہی ہوں اس لئے کہ بہت سے لوگوں نے لکھ دیا ہے اقبال ابر نیساں کی طرح آئے اور موتی برسا کر ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ سر محمد اقبال مرحوم سے میری خط و کتابت ۱۹۲۷ء سے تھی جب میں نے رسالہ النساء حیدرآباد دکن سے جاری کیا تھا تو رسالہ ان کی خدمت میں بھیجا انھوں نے جو خط مجھے لکھا تھا وہ درج کرتی ہوں۔

مکرمہ

تسلیم۔ رسالہ النساء کے لئے نہایت سپاس گذار ہوں یہ بہت اچھا رسالہ ہے مجھے یقین ہے کہ اس کا مطالعہ مسلمان عورتوں کے لئے بہت سبق آموز ہوگا۔ میں کچھ مدت سے اردو میں بہت کم لکھتا ہوں لیکن اگر کچھ اردو اشعار ہو گئے تو بھیجوں گا۔

محمد اقبال بیرسٹر لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۲۷ء

اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں میں نے ایک خط اور لکھا تھا کہ آپ اپنا کلام رسالہ النساء کے لئے بھیجئے اس کا جواب آیا اس کی نقل بھی لکھتی ہوں۔

مخدومہ جناب صغرا ہمایوں بیگم صاحبہ

تسلیم۔ آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں میری صحت ایک مدت سے خراب ہے اس واسطے لٹریری مشاغل کی طرف بہت کم توجہ کر سکتا ہوں۔

پیام مشرق نام ایک مجموعۂ نظم جو فارسی میں ہے تیار ہو رہا ہے شاید دو تین ماہ میں شائع ہو جائے گا۔ انشاءاللہ ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا لیکن چونکہ اندیشہ ہے کہ بھول نہ جاؤں اس واسطے اگر کتاب آپ کو نہ پہونچے تو بلا تکلف یاد دلا دیجئے۔ آپ کے شوہر ہمایوں مرزا صاحب سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہے۔ لیکن میں نے آپ کا خط جو ہزار داستان میں شائع ہوا ہے پڑھا ہے۔ اس خط کے پڑھنے سے مجھے خاص مسرت ہوئی۔ فریاد[1] مرحوم کی لٹریری عظمت سے کس کو کلام ہو سکتا ہے جن کے شاگردوں میں شاد عظیم آبادی ہوں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص۔ محمد اقبال لاہور ۱۸ فروری ۲۳ء

۱۹۲۳ء تک بیرسٹر صاحب اور سر محمد اقبال صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی ۱۹۲۸ء میں جب ہم کشمیر گئے راستہ میں لاہور چند روز ٹھیرنا ہوا ہمارے ہوٹل کے بازو میں سر محمد اقبال مرحوم کا مکان تھا پھاٹک پر بورڈ لکھا ہوا تھا

---

[1] جناب سید شاہ الفت حسینی صاحب فریاد عظیم آبادی میرے خسر تھے اور شاد عظیم آبادی سید ہمایوں مرزا صاحب کے عزیز بھی تھے اور حضرت فریاد کے شاگرد حضرت ... [illegible] ... ہے۔

بیرسٹر صاحب سر محمد اقبال سے ملنے گئے اس کے بعد ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی موٹر بھیجکر مجھے بلوایا۔ میں نے ایک نظم نورجہاں کے مزار پر چڑھانے لکھی تھی وہ ان کو دکھائی۔ اس میں مرحوم نے اصلاح دی اس لئے وہ میرے استاد بھی ہوئے اور میرے اوٹوگراف البم میں سر محمدؐ اقبال صاحب نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جس کا اردو ترجمہ لکھتی ہوں ۔

اسلام کی تعریف میں چند الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں یعنی۔ ذاتِ باری پر پورا بھروسہ ہے اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا

محمدؐ اقبال لاہور ۱۱ جولائی سنہ ۱۹۲۸ء

اس سے ظاہر ہے کہ اُن کے دل میں موت کا ڈر کبھی نہ تھا سنہ ۱۹۲۸ء میں جو میرے اوٹوگراف میں لکھا تھا وہی جملے ان کے آخر وقت بھی زبان سے نکلے۔ وہ اپنی بیوی کو کہیں بھجواتے نہ تھے اور نہ کسی سے ملاتے تھے دوران گفتگو میں لیڈی عبدالقادر صاحب سے ذکر آیا میں نے کہا میں محمدؐ اقبال صاحب کی بی بی کے ہاں گئی تھی انھوں نے چپکے پر مجھے بلایا تھا' تو لیڈی عبدالقادر صاحب کو سخت تعجب ہوا انھوں نے کہا ہمارے صاحب سے اور محمد اقبال سے بہت دوستی ہے مگر آج تک ہم نے بیگم محمدؐ اقبال کو نہ دیکھا اور آپ مل آئیں!

اس سے ظاہر ہے کہ وہ مہمان نواز دل رکھتے تھے اور مسافر کی قدر ان کے دل میں تھی۔ اور ایک اتفاق عجیب ہوا ہم سنہ ۱۹۲۴ء میں لندن گئے کمبرج میں ایک انڈین مجلس ہے جس میں ہر ماہ جلسہ ہوا کرتا ہے کسی نہ کسی بڑے آدمی کو دعوت دی جاتی ہے وہ تقریر کرتا ہے ۔

ہم جب لندن میں تھے اس زمانہ میں سر علی امام صاحب مرحوم کو تقریر کرنے انڈین مجلس والوں نے بلایا تھا سر علی امام نے بیرسٹر صاحب سے اور مجھ سے کہا آپ لوگ بھی چلیئے۔ چنانچہ لندن سے کیمبرج تک لیڈی سر علی امام، سر علی امام صاحب سر کشن گپتا صاحب اور بیرسٹر صاحب ہم سب موٹروں میں گئے وہاں جانے کے بعد مجھے سر کشن گپتا صاحب اور وہاں کے لڑکوں نے کہا آپ بھی تقریر کریں آپ اردو میں تقریر کر سکتی ہیں یہ انڈین مجلس ہے علی امام صاحب کی تقریر کے بعد میں نے تقریر کی میری تقریر لوگوں کو پسند آئی۔ جب ہم کیمبرج سے لندن واپس گئے سر علی امام صاحب اور سر کشن گپتا صاحب نے میری تقریر کی بڑی تعریف لوگوں سے کی کہ یہ تیار نہ تھیں یک بیک مردانہ جلسہ میں زبانی تقریر کی لڑکوں کو خوب نصیحت کی ۔

اسکے بعد مس بک صاحبہ جن کے بھائی مسٹر بک علی گڑھ کالج کے پہلے پرنسپل تھے انہوں نے میرے لئے ایٹ ہوم جلسہ مقرر کیا جس میں عورتوں کی تعلیم پر تقریر کرنے مجھ سے فرمایش کی میں نے اردو میں تقریر کی اس کا ترجمہ انگریزی میں آفتاب اقبال نے کیا بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سر محمد اقبال صاحب کے یہ بڑے فرزند ہیں۔

حضرت اقبال کے لئے ہم جس قدر رنج کریں کم ہے اب ہماری آنکھیں ڈھونڈتی ہیں کہ ان کا جانشین کس کو قرار دیں یوں تو اردو فارسی کے شعرا بہت ہیں لیکن اس جوش سے بیدار کرنے والا نہیں دکھائی دیتا۔

میں دعا کرتی ہوں کہ خدا سر محمد اقبال مرحوم کے پس ماندوں کو صبر عنایت فرمائے اور ہم سب کو بھی صبر دے اور ان کی نصیحتوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ہمیشہ ان کی قبر پر پھول برستے رہیں

صغرا ہمایوں مرزا
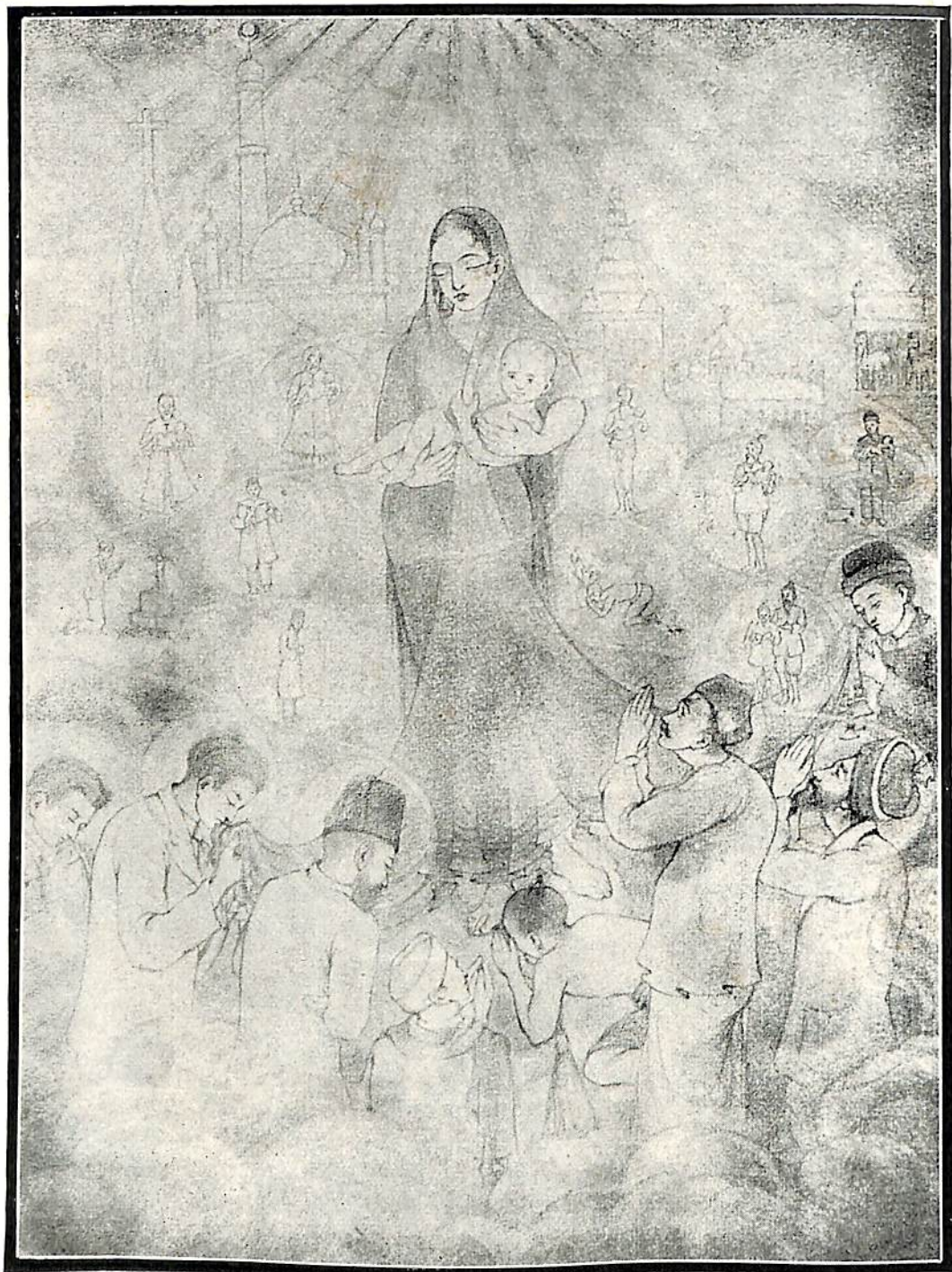
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
"اقبال"

شاعر حکمت شناس

یہ صحیح ہے کہ ایک سائنسداں کے لئے معمل اور آلے ضروری ہیں لیکن لازمی نہیں۔ اس لئے کہ دنیا کے بعض بلند نظر سائنسداں یقیناً معملوں کی پیداوار نہیں تھے نہ اُن کے پاس اُن پیچیدہ اور حساس آلوں کا وجود تھا جن سے موجودہ سائنس متمتع ہے۔ پھر بھی کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج ہمارا بیشتر علم ان ہی بے سروساماں محققین کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ اور ہمارا سرمایۂ معلومات ان ہی مجاہدینِ بلند ہمت کے تجسس وتلاش کا رہینِ منت ہے جنھوں نے جہل کے خلاف ایک دوامی جنگ چھیڑ دی۔

حضرت عیسیٰ سے تقریباً (۵۰۰) سال قبل دیموقریطس نے اپنا وہ مشہور "نظریۂ جواہر" پیش کیا جس پر ہماری سائنس کی بنیادیں کھڑی ہیں اس کے یہاں اور ناو اور معمولی خوردبین کا سادہ تر تصور بھی نہ تھا اور نہ سر جے جے ٹامپسن کے طویل آلے اس کی امداد کو آئے تھے۔ اسی طرح ہائی لی تس اور فیثاغورث کے "نظام سیارگاں" کی دریافت کے لئے نہ تو ولسن کی ہیبت دوربین موجود تھی نہ اکیس کی رصدگاہیں۔

حیرت انسان کا فطری جذبہ ہے اور تجسس اس کا بدیہی نتیجہ اس کے لئے نہ معملوں کی ضرورت ہے نہ آلوں کی۔ بچہ ابھی ماں کو نہیں پہچانتا لیکن دیے کی چمکتی ہوئی لو کو گھورتا ہے، شادی، برات کے باجوں کی جھنک ننھے ننھے سروں کو دریچوں میں اور چھوٹے چھوٹے پیروں کو دروازوں سے باہر کھینچ لاتی ہے۔ چاند ماہوں اپنے ایک شیرخوار بچے کے لئے اتنے ہی مسحور کن ہیں جتنے سر جیمس جینس یا سر آرتھر ایڈنگٹن کے لئے۔ چنانچہ حیرت اور تجسس اس عالم رنگارنگ میں بچے کی آنکھ کھلتے ہی ساتھ ہو جاتے ہیں اور جیسے جیسے اس کے حواس اور قوائے ذہنی کی ترقی ہوتی ہے وہ بھی بڑھتے ہیں۔

سائنس اسی جذبۂ تلاش وجستجو کی نمو یافتہ شکل ہے لہٰذا یہی وہ اولین علم ہے جس کو انسان نے حاصل کیا اور چونکہ انسانی زندگی اور سائنس میں چولی دامن کا ساتھ رہا اس لئے اس کی تہذیب کی ترقی اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ وہ بھی فروغ پاتی رہی۔ اسی کی مدد سے ابتدائی انسان نے شکار کے لئے حجری آلات تراشے اپنے کمزور بازوؤں سے خونخوار درندوں پر فتح پائی۔ تاریک غاروں میں خوفناک ریچھوں کا مقابلہ کیا اور اسی کی کوشش نے سینۂ سنگ سے اس چنگاری کو روشن کیا جس نے انسان کی معاشرت کی کایا پلٹ دی۔

اس لئے فطری تجسس جس کو آپ سائنس کہتے ہیں نہ تو مغرب کی ایجاد ہے نہ مشرق کی بابل والوں نے اس کو پروان چڑھایا نہ ہندیوں نے اس کو سینچا۔ بلکہ اس کی بنیاد اس وقت ہوئی جب خطِ استواء کے گرم میدانوں کی بلند گھاس سے انسان نے اول اول اپنا سر بلند کیا اور میمونیت سے دائرۂ انسانیت میں داخل ہونے لگا اس بے یار و مددگار زمانے میں بھی وہ اس کا سہارا تھی اور آج بھی جب وہ فاتحِ عالم کے تخت پر جلوہ افروز ہے وہ اس کی ہم رکاب ہے۔

اسی جذبۂ تلاش نے انسان میں کائنات اور اس کے مافیہ کی اصل و ماہیت دریافت کرنے کا شوق پیدا کیا۔ اور اسی ذوقِ جستجو نے "ہیں" کے تجزیہ و تشریح کی لگن لگادی۔ دنیا کے بلند نظر مفکر دوررس محقق اور نکتہ شناس سائنسداں اسی "علمِ چیست" کے اطراف چکر لگاتے ہیں۔ عقل کی گہرائیاں کھودتے ہیں اور فکر کے آسمان چھانتے ہیں۔

چنانچہ ان معنوں میں متجسس انسان فطرتاً سائنسداں ہے، فلسفی ہے، شاعر ہے اور جو ظاہر بینوں نے سائنس، فلسفہ اور شاعری میں اختلاف دیکھا ہے وہ غلطی کرتے ہیں۔ اور سخت غلطی کرتے ہیں۔ صرف ریڈیو، ٹلی وژن اور بے تار برقی کی میکانینوں سے واقف آدمی سائنس سے اُسی قدر دور ہے جتنا محض زمان و مکان، نفسی اور خارجی کے مباحث میں الجھا ہوا فلسفی فلسفہ سے، یا فقط ردیف و قافیہ، صنایع و بدایع میں جکڑا ہوا شاعر شاعری سے۔

سائنسداں کائنات کی اصل ماہیت کا جویا ہے، فلسفی عالم کے اصل محرک کا متلاشی، اور شاعر معشوق حقیقی کی تلاش میں سرگرداں، یہہ غلط ہے کہ سائنسداں گیس و بخارات ڈھونڈتا ہے۔ فلسفی خیر و شر کی ٹوہ میں ہے اور شاعر چشم نرگسیں کو گھورتا، عارض گلگوں کو پیار کرتا۔ اور زلف سیاہ میں پھنسا ہوا ہے بلکہ تینوں ایک "حقیقت" کی تاک میں ہیں اور تینوں ایک ہی "شاہد حقیقی" کے جلوۂ بے باکانہ کے منتظر ہیں۔ دراصل یہی سائنس فلسفہ اور شاعری کی حدیں ملتی ہیں۔ وہ گویا ایک مثلث کے اضلاع سے مشابہ ہیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اور شاید اسی مثلث مساوی الاضلاع کا نام مذہب ہے

چنانچہ اگر میں اقبال کو ایک بڑا سائنسداں کہوں تو وہ غلط نہیں ایک روشن حقیقت ہے بنابراں کہ وہ ایک بڑے شاعر اور بڑے فلسفی تھے ان کی شاعری جنسی رجحانات سے پاک تھی اور ان کا فلسفہ منطقی پیچیدگیوں سے بلند تھا۔

میں مبالغہ نہیں کرتا لیکن یہہ مانتا ہوں کہ اگر کسی اور شاعر کے لئے ایسے جراءت طلب دعوے کئے جاتے تو سائنسداں کا ثابت کرنا مضمون نگار کے لئے دوبھر ہوجاتا لیکن جب کوئی اقبال پر لکھنے بیٹھتا ہے تو دلائل کا ایک دریا ہوتا ہے جو نوکِ قلم سے امڈا آتا ہے اور یہی کسی کے بڑے ہونے کی دلیل بھی ہے ایک سائنسداں کی پہلی خصوصیت اس کا ذوقِ مشاہدہ ہے جو اس کو عوام سے ممتاز کرتا ہے۔ کھوج ہر انسان میں ہے لیکن وہ تلاش جس میں غور و فکر کو زیادہ دخل ہے۔ اور جستجو جو زندگی کے لئے غذا پانی کی طرح ضروری ہو جاتی ہے، سائنسداں کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ موجودات پر سرسری نظر نہیں ڈالتا بلکہ اس کی غائر نگاہیں ہر شئے کی تہ تک پہونچنا چاہتی ہیں۔ اُسے ظاہر سے تشفی نہیں ہوتی وہ حقیقت دیکھنا چاہتا ہے اقبال کا کلام اسی تلاشِ مسلسل سے بھرا ہوا ہے۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ　　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

نہ صرف یہہ بلکہ وہ تلاشِ پیہم کو کارخانۂ عالم کا محرک بھی سمجھتے ہیں۔

یہ تلاشِ متصل شمع جہاں افروز ہے　　　توسن ادراک انساں کو خرام آموز ہے

قدرت کی خوبصورت صنعتیں شاعر کے حساس جمالیاتی ذوق پر سحر کا اثر کرتی ہیں۔ لیکن ایک حقیقی شاعر انھیں دیکھ کر صرف متاثر ہی نہیں ہوتا اس کی آنکھیں ان نقوش ظاہری میں حقیقت پردہ نشیں کو ڈھونڈتی ہیں غالبؔ کے یہاں یہی شوق دید کام کر رہا ہے، جب وہ پوچھتے ہیں۔

یہہ پری چہرہ لوگ، کیسے ہیں　　　غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلف عنبریں کیوں ہے　　　نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزۂ و گل کہاں سے آئے ہیں　　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

مگر اقبال کائنات کی دیگر اشیاء کے ساتھ اپنی ذات کے متعلق بھی اسی قدر بے چین ہیں۔ وہ ایک ماہر حیاتیات کی طرح اس "صندوق سربستہ" کو کھولنا چاہتے ہیں۔

پریشاں ہوں ایک ... نہیں کھلتا　　　سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گرد کدورت ہوں

تاریخ تمدنِ آدم شاہد ہے کہ انسان ایک عرصۂ دراز سے "اپنی ذات" کی کھوج میں لگا ہوا ہے۔ آج سے کئی سو سال پیشتر تبریز کے ایک بڑے بزرگ نے دنیا سے سوال کیا تھا۔

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم　　　نہ ترسا و یہودی ام نہ گبرم نے مسلمانم

ایک سائنسداں جانتا ہے کہ کائنات اور ذاتِ انسان کے اصل کی جستجو سے یقیناً انسان ہزارہا ایجادات اور سیکڑوں آسائشوں سے بہرہ یاب ہوا ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہہ اضطراب "ایک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انسان میں ہے" اور احساسِ جہالت جو روز افزوں دریافت کے باوجود گہرا ہی ہوتا جاتا ہے حقیقتِ تلاشِ فطرت کے سینے میں ایک مسلسل کھٹک ہے۔ یہی شعور اور آگہی ہے جس سے ہم پریشان ہیں اور یہی خیال ان ساری بے اطمینانیوں کی وجہہ ہے جو آدمی کے دل کو ایک آن چین نہیں لینے دیتی۔

یہہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار　　خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے　　گل میں جھک شراب میں مستی اسی سے ہے

بستان و بلبل و گل و بُو ہے یہہ آگہی　　اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہہ آگہی

بے تاب ہے ذوق آگہی کا　　کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے　　آئینہ کے گھر میں اور کیا ہے

اس درد استفہام سے اقبال بھی ایک سائنسداں کی طرح رنجیدہ ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ حکمت کی ہزارہا کدوکاوش کے باوجود یہہ بھید نہیں کھلتا اور سائنس کی مسلسل تگ و دو کے بعد بھی یہہ راز اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔ تو وہ عقلِ انسانی کی محدودیت اور حواس کی غیر معتبر شہادتوں پر اس کا سارا قصور رکھتے ہیں :-

چشمِ غلط نگر کا یہہ سارا قصور ہے　　عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

اسی نکتہ کو فانی نے بھی بیان کیا ہے :-

ہر مژدۂ نگاہ غلط، جلوہ خود فریب　　عالم دلیل گمرہیِ چشم و گوش تھا

سر جیمس جینس کے الفاظ میں "کائنات کو ہم مادّی تصور میں یقیناً پیش نہیں کر سکتے۔ بنا بریں میرے خیال میں وہ محض ایک تخیلی احساس ہے"

آپ نے دیکھا کہ جو لوگ سائنس پر تلقین مادیت کی تہمت دھرتے ہیں حقیقت سے ناآشنا ہیں اس لئے کہ ہر پھر کر سائنس بھی ان ہی نتائج پر پہونچتی ہے جو ایک فلسفی یا شاعر کے ماخوذ ہیں۔ اور یہی خیالات ہیں جن سے متاثر ہو کر دنیا کے اکثر مفکرین نظریہ "خود شناسی" کے اطراف جمع ہونے لگے ہیں اور اب ؎

نہاں ہے گوہرِ مقصود جیب خود شناسی میں

کا خیال سائنس میں زیادہ قوی ہوتا جا رہا ہے اقبال نے اسی نکتہ کو بار بار دہرایا ہے اور سچ پوچھیئے تو ان کے سرمایۂ سخن کا زیادہ تر حصہ اسی پیغام کے سنانے میں صرف ہوا ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا　　دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے　　راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا　　ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی　　قیس تو لیلیٰ بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا　　مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

اقبال کی نظروں میں ہر ذی حیات شئے کے وجود کا انحصار کامیاب تنازع البقاء میں ہے۔ دنیا میں وہ جاندار جو کروڑہا سال کی متواتر جنگ کے دوران میں

اپنی نسل قائم رکھ سکے زندہ ہیں۔ اور وہی عضوی قائم رہ سکتے ہیں جو زندگی کی مسلسل دوڑ میں تیز گام تھے چنانچہ لیمارک، یا ڈارون کی طرح وہ "بقاء اہل تر" کے دعوے دار ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ جامد اقوام اسی طرح طبعی انتخاب کا شکار ہوتی ہیں جیسے سوٹزرلینڈ کے ناقابل پرواز پرند اور وہ قومیں جو ہر آن تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں خود کو متوافق نہیں بنالیتیں صفحہ ارض سے امریکی سرخ فام باشندوں کی طرح نابود ہونے لگتی ہیں۔

اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

انسان کے ابتدائی شعور سے لے کر آج تک موت اور حیات کا مسئلہ ایک سب سے زیادہ وقت طلب مبحث رہا ہے۔ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوگا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر انسان نے سب سے زیادہ غور کیا۔

ماقبل تاریخ آدمی کی قبروں میں سامان زندگی کی موجودگی خواہ وہ کتنا ہی مختصر یعنی ۲ دو تین ۳ ہانڈ لیوں اور ایک کلہاڑی پر مشتمل کیوں نہ ہو یہ بتلاتی ہے کہ اس ابتدائی عہد میں بھی حیات بعد موت کا تصور تھا اپنے تمدن کے مختلف مدارج میں انسان نے روح کے غیر فانی ہونے کے دعوے کئے اور تناسخ۔ حشر، پرے وغیرہ کے مسائل ان ہی خیالات کی پیداوار ہیں موجودہ دور میں خواہ کوئی حیات اور موت پر یقین نہ رکھتا ہو یہ ضرور مانتا ہے کہ دنیا میں "زندگی" کا ظہور ایک عجوبہ ہے۔

اپنی حقیقت پر غور کرنا ہو تو کسی اندھیری رات میں چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھئے۔ کیا آپ نے کبھی اُن کے شمار کرنے کی کوشش کی ہے؟ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر تمام دنیا کے ساحلوں کی ریت جمع کی جائے تو اُن ذرّوں کی تعداد غالباً ان ثوابت اور سیاروں کے برابر ہوگی۔ اور ان میں بعض اس قدر جسیم ہوں گے کہ ہماری جیسی ایک ارب دنیائیں اُن کے اندر سما جائیں اور پھر بھی کئی اور کے لئے جگہ بچ رہے۔

اور ان سیاروں کا درمیانی فاصلہ —— ممکن ہے کوئی یقین نہ کرے —— اتنا ہے کہ اگر آپ ان میں سے قریب ترین بنو لاکی سیر کرنا چاہیں تو ....و........و........و........ ۱۵ سال کی ضرورت ہوگی، اور جب آپ اس سفر سے بہ سلامت لوٹیں گے تو اس کا بہت امکان ہے کہ ہماری ننھی سی دنیا کسی دمدار ستارے کے عقب میں سیاہ و برباد پھرتی ہوگی یا کسی مہیب سیارے کے وسیع شکم میں جذب ہو چکی ہوگی یا اس کے لاتعداد ٹکڑے روشن شہاب ستاروں کی صورت میں فضاء بسیط میں ٹوٹتے ہوں گے۔

ان کی عمریں۔ اس حقیقت سے اندازہ لگائیے کہ آپ کی دنیا جو اور ستاروں کی نسبت کل کی ہے ۱۰۔۲۰ ارب سال قدیم ہے اقبال کے الفاظ ہیں

عقل جس سے سر بہ زانو ہے وہ مدت ان کی ہے سرگذشت نوع انساں ایک ساعت ان کی ہے

لیکن آدمی اس وقت اور بھی مبہوت ہو جاتا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس ناقابل قیاس تعداد میں دو ۲ ایک مشتبہ سیاروں کو چھوڑ کر صرف ہماری دنیا کو زندگی ودیعت کی گئی ہے، یعنی دنیا کے تمام سمندروں کے ساحلوں کی ریت یک جا ہو تو اس میں سے ایک ذرۂ بے مقدار کو یہ شرف ملا ہے۔

سر آرتھر ایڈنگٹن کے لحاظ سے ان حالات میں اگر کائنات میں زندگی یا اس کی انتہائی مخلوق انسان کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح جنگل میں ہزارہا اوک کے بکھرے ہوئے بیج سے صرف ایک دو درخت اگ آتے ہیں، ممکن ہے قدرت نے انسان کی تخلیق کے لئے ثوابت کا یہ زبردست جال پھیلایا ہو۔

اس مشہور سائنسداں کی تائید میں اقبال کا یہہ شعر آفتاب یا تابع آفتاب سیاروں سے متعلق کس قدر چسپاں ہوگیا ہے :۔

شعلۂ خورشید شاید حاصل اس کھیتی کا ہے		بوئے تھے دہقان گردوں نے جو تاروں کے شرر

گو ہم جانتے ہیں کہ اقبال کے یہاں نہ کوئی معمل تھی نہ ۱۰۰ انچ دہانے کی انعکاسی دوربین پھر بھی اُن کے الفاظ تک تقریباً وہی ہیں جو اُن سے کئی ہزار میل دور رہنے والے اس جید مہندس اور ہیئت داں نے استعمال کئے تھے شاید ایسے ہی مقامات پر انسان یہہ ماننے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔		شاعری جزویست از پیغمبری۔

اقبال حیات بعد موت پر یقین رکھتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں ان کے دلائل دلچسپ بھی ہیں اور سائنٹفک بھی۔ جب کبھی وہ اس مبحث پر کچھ کہنے لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک رنگین بیان شاعر کی صورت میں ایک خشک سائنٹسٹ حقائق پیش کر رہا ہے۔

سائنس کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ اشیا کی تبدیلیٔ اشکال یا باہمی ترکیب و تحلیل سے مختلف صورتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ کسے نہیں معلوم کہ برف سے پانی اور پانی سے برف ایک ہی مرکب کی کئی حالتیں ہیں ان کی تحلیل سے آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسس اور ان گیسوں کے اتصال سے وہی پانی حاصل ہوگا۔

مانا کہ آکسیجن نہیں لیکن اس گیس کی تبدیل شدہ شکل تو اس مرکب میں موجود ہے اقبال بھی مظاہرِ حیات و موت کو ان ہی مسلسل بدلنے والی کیفیتوں کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے اس حقیقت کو ایک لطیف تشبیہہ میں پیش کیا ہے۔

جس طرح ایک کشتی ساحل پر کھڑے ہوئے انسان کی نظروں سے دور ہوتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی۔ انسان بھی نظروں سے چھپ جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی		نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی
جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہیں		ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہہ کبھی آشنا نہیں ہوتا		نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

اس دعوے میں ایک اور دلیل بھی پیش کی ہے اور دیکھئے وہ کس قدر وزنی ہے۔

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے		ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات		عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں		جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

ہمیں یہہ معلوم ہے کہ دنیا میں زندگی کے کس قدر لاتعداد اور مختلف الاشکال مظاہر ہیں۔ اور ہم یہہ بھی جانتے ہیں کہ ان زندہ صورتوں کی حفاظت کی کیا کیا تدبیریں قدرت کرتی رہتی ہے۔ پھر اگر یہہ یوں ہی ختم ہو جانے والی ہوتیں تو نظامِ کائنات انھیں اس قدر عام نہ کرتا۔

کسی ماہرِ حیاتیات تو کجا جاہل کسان سے کہئے کہ بیج بے جان ہیں اس لئے کہ ان میں کیفیاتِ زیست کا فقدان ہے تو وہ ہنسنے لگے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تخم دراصل دو عامل مدارج کے درمیان ایک سستانے والا وقفہ ہے اور یقیناً شاخ سے اس کی علٰحدگی موت نہیں بلکہ ابتداء ہے کسی آنے والی زندگی کی

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے		کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ		موت سے گویا قبا ، زندگی پاتا ہے یہہ
موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے		خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی		ہے یہہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

اور اپنے اس نظریۂ سے وہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں۔

تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت ہے　　　برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو

لیکن اقبال یقیناً ایک صحیح شاعر نہ ہوتے اگر وہ اس اعتراف مجبوری کا اظہار نہ کرتے جس کو ایک سائنٹسٹ محسوس تو کرتا ہے لیکن اقرار سے ڈرتا ہے "یہی اقبالِ نادانی" ان کی عالی ہمتی کی غمازی کرتی ہے۔

یونان کی اس عدیم النظیر شخصیت نے جس پر فلسفہ کو اب تک ناز ہے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "تمام زندگی کے تفکر کے بعد اس نے یہہ معلوم کیا کہ وہ کچھ نہیں جانتا" پوچھا گیا کہ "پھر آپ اور جاہل میں کیا فرق ہوا" کہا "کہ میں یہہ جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا اور ایک عام انسان یہہ نہیں جانتا کہ وہ کچھ نہیں جانتا"۔

جب عقل کی گرمیاں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں اور تدبیر کی کلیں بوسیدہ ہو جاتی ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس کارخانے میں جس کے سپید و سیاہ میں ہم کو کوئی دخل نہیں ہے انسان مجبور و لاچار ہے۔ نہ صرف وہ بلکہ موجودات کا ہر ذرہ ذرہ ایک غیر یقینی حالت میں گھومتا ہے۔

(Professor Heisen Berg) پروفیسر ہزن برگ کے اصول عدم استقلال کا خواہ ریاضی داں جو چاہیں نتیجہ اخذ کریں ایک بات تو یقینی ہے کہ کارخانۂ عالم کی قسمت غیر یقینی ہے اور ہم مجبور ہیں ہماری عقل لاچار ہے، اور ہماری تدابیر اپاہج ہیں۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے　　　پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں　　　انجم سیماب پا رفتار پہ مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچہ کا سبو گلزار میں　　　سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں

وہ کانٹ کی طرح فکر کی کائنات سے واقف اور عقل کی رسائی سے آگاہ ہیں　وہ حواس کی قیاس آرائیوں سے مجبور انسان کے سرمایۂ علم کا اندازہ لگاتے ہیں۔

فروغ دانش ما از قیاسی است　　　قیاس ما ز تقدیر حواس است

مشرق کا یہہ حکیم جو فلسفی بھی تھا اور شاعر بھی آج ہم میں نہیں ہے اس کا پیغام ایک سرچشمہ ہے جس سے ہر شخص بقدر ہمت خویش فیضیاب ہوتا ہے جس کے کلام میں نوجوانوں کے لئے درسِ عمل اور ضعیفوں کو مژدہ امن و سکوں ہے۔ اس دریائے سخن سے ایک سائنسداں حقائق کے گہر ہائے بے بہا نکالتا ہے فلسفی اخلاقیات کے لاقیمت جواہر اور شاعر مضامین کے درہائے نایاب پاتا ہے۔

یہہ شاعر جسے مشرق نے بے وقت کھو دیا، ایک سائنسداں تھا معلموں سے بے نیاز، ایک فلسفی تھا منطقی پیچیدگیوں سے متنفر اور ایک شاعر تھا تصنع سے برگشتہ۔

ہم نے اسے کھو دیا ہے جس کا بدل ممکن ہے ہندوستان صدیوں میں نہ پا سکے اور ہم سے وہ کلیم جادو بیان چھین لیا گیا ہے جو شاید ہی پھر کبھی مادر وطن پیدا کر سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مہندر راج سکسینہ

اقبال حالات اور شاعری

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے انجمن ترقی طلبہ حیدرآباد کے تعزیتی جلسے میں اقبال پر لکچر دیا تھا' جس کے اہم اجزا درج ذیل ہیں، ممکن ہے کہ کہیں کہیں بعض چیزیں چھوٹ جانے کی وجہ سے عبارت غیر مربوط ہوگئی ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے آخر میں اپنی ایک نظم بھی سنائی جو تاثرات سے لبریز تھی) "شاہد"

اقبال کے متعلق حیدرآباد میں اس سے پہلے دو اجتماع ہوچکے ہیں ایک یوم اقبال کے سلسلے میں جب کہ ابھی ان کی عمرِ مستعار کے کچھ دن باقی تھے دوسرا ان کی وفاتِ حسرت آیات کے موقع پر لیکن یہ اقبال کی ہر دل عزیزی اور دلوں پر گہرے نقش کا بیّن ثبوت ہے کہ لوگ ان کے حالات سننے سے سیر نہیں ہوتے اقبال کی نسبت دو طرح سے گفتگو ہوسکتی ہے ایک یہ کہ صرف ان کی زندگی کے حالات بیان کئے جائیں دوسرے ان کے کلام پر تنقید کی جائے ایک ایسا شخص جس کی زندگی زیادہ تر تصنیف کے کاموں میں بسر ہوی ہو اس کی زندگی کو اس کے حالات سے علحدہ کرنا مشکل کام ہے اقبال جیسے قادر الکلام شخص کی شاعری کا تجزیہ اگر نثر میں کیا جائے تو اس میں اس کے اعجاز کا کماحقہ پتہ نہیں چل سکتا' اقبال کے تمام افکار عالیہ اور دلنشیں خیالات کا قوم پر گہرا اثر پڑا ہے۔ آدم سے لے کر اب تک دنیا نے کوئی ایسا خیال نہیں پیش کیا جس کو بالکل نیا کہا جاسکے لیکن خیالات کو ادا کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے جو ان خیالات کی جان ہے اقبال ہر چیز کو نئے انداز میں پیش کرتا ہے کسی شاعر پر تبصرہ کرتے ہوے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ حسنِ نظر اور حسنِ ذوق سے اس کے کلام کا انتخاب کیا جائے باوجود اس کے اقبال جیسے مفکر شاعر کے متعلق لوگ چاہتے ہیں کہ اس کی شاعری پر فلسفیانہ اور مفکرانہ تبصرہ کیا جائے۔

اقبال ایک کشمیری برہمن خاندان کے فرد تھے جو چند پشتیں ہوئیں مسلمان ہوگیا۔ شاید آپ نے اقبال کی فارسی شاعری میں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے برہمن ہونے پر فخر کرتا ہے آپ کو تعجب ہوگا کہ کیوں فخر کرتا ہے مسلمان اور امبیڈکر برہمنوں کو کچھ بھی کہیں لیکن برہمنوں نے روحانی طریقوں اور نسلی پاکیزگی کی غیر معمولی کوششوں سے خاص تربیت حاصل کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آریائی برہمن ایک خاص قسم کا دماغ رکھتے ہیں۔ اقبال کہتے تھے کہ "ایشیا میں تین ذہین قومیں ہیں' ایرانی' کشمیری اور بنگالی اقبال نے جا بجا اپنے برہمن ہونے پر فخر کیا ہے' ایک اور جگہ ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام نظم لکھی ہے جس میں کہتے ہیں میں تو برہمن ہوں ہست و بود اور فلسفہ کی موشگافیاں میرے رگ و پے میں ہیں تو خیبر شکن علی کی اولاد میں ہو کر اس خیال بافی میں کیوں پڑتا ہے۔ اپنے نکتہ شناس ہونے کو یوں بیان کیا ہے ؎

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

مسز سروجنی نائیڈو نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ شخص برہمن اور اسلام کے امتزاج کے ساتھ (Genius) کے اعلےٰ درجے پر پہنچ گیا۔

وہ اپنی کشمیری ذہانت کی نسبت بھی تفریحاً اس قسم کا ذکر کیا کرتے تھے' فرماتے تھے اُن کے استاد مولوی میر حسن کے سامنے کسی نے ایک کشمیری لڑکے کو کہا اُو بیوقوف مولوی صاحب نے کہا کس کو کہہ رہا ہے کشمیری بھی کبھی بیوقوف ہوتا ہے' اس کے بعد فرمانے لگے کہ تم نے کشمیری کا وہ لطیفہ نہیں سنا کہ "شیطان سے اس کی ملاقات ہوی تو اس نے کہا کہ خدا نے تجھ کو کائنات پر قدرت دے رکھی ہے اگر تم ہم سے شراکت کرو تو بہتر ہے ہم مل کر کاشت کاری کریں گے بارش اور موسموں کو ہمارے مقصد کے مطابق کردو اور جو کچھ پیداوار ہو ہم آپس میں تقسیم کریں گے" شیطان راضی ہوگیا اور کہا کہ "تقسیم کیسے ہوگی" کشمیری نے کہا کہ "زمین کے اندر کچھ پیداوار ہوگی اور زمین کے اوپر کچھ ایک حصہ تم لے لو اور ایک ہمارے لئے چھوڑ دو" شیطان زمین کے اوپر کی پیداوار لینے پر راضی ہوگیا' کشمیری نے آلو بودئے' جب فصل تیار ہوی تو شیطان کے حصے میں فقط اوپر کے پتے آئے اور آلو کشمیری کے حصے میں آگئے' شیطان نے کہا "یوں نہیں جو اوپر نکلے وہ تمھارا اور جو نیچے ہو وہ ہمارا' کشمیری نے گنے کی کاشت کی اسی طرح شیطان دونوں دفعہ نتیجے سے محروم رہا کہتے تھے کہ کشمیری کے ہاتھ سے شیطان پناہ مانگتا ہے۔

میری اس گفتگو کا مطلب یہہ تھا کہ اقبال ایک ذہین نسل سے تعلق رکھتے تھے اور تقدیر کے حسن سے وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوے جب کہ انسان کے لئے ممکن تھا کہ وہ دنیا کے علوم سے بہرہ ور ہو سکے صرف قومی تمدن کے دائرے ہی میں محدود نہ رہے۔ مولانا آزاد نے "نیرنگ خیال" کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ آئندہ لوگ وہ کمال پر پہونچیں گے کہ مشرق اور مغرب کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں ہوں گی۔ اقبال میں خوبی یہہ تھی کہ مذاق مذاق میں بہت ساری باتیں سمجھاتے تھے میر حسن کی تربیت کو وہ شکریہ کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ سیالکوٹ ان کا وطن ہے جو پنجاب کا مردم خیز خطہ ہے۔ شاہ جہاں کے زمانے میں عبدالحکیم سیالکوٹی بہت مشہور عالم گذرا ہے، سیالکوٹ سے لاہور آکر گورنمنٹ کالج سے بی، اے اور ام، اے کامیاب کیا، خوش قسمتی سے آرنلڈ جیسا استاد مل گیا وہ خاص قسم کا معلم تھا، شبلی کی تصانیف اور اس کے انداز تحقیق میں آرنلڈ کی رہنمائی کو بہت دخل ہے، اگر شبلی پر آرنلڈ کا اثر نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ وہ بھی قدیم ملاؤں کی طرح تنگ نظر بن کر رہ جاتا۔ اقبال کو آرنلڈ کی صحبت سے جو فائدہ پہنچا وہ خود اقبال ہی جانتے ہیں آرنلڈ کو بھی اپنے شاگرد پر فخر تھا وہ کہتے تھے کہ "ذہین شاگرد کو پڑھانے سے استاد سیکھتا ہے اقبال کے سوالات سے میرے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔" آرنلڈ کی شان میں اقبال نے ایک قصیدہ بھی لکھا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے دل پر ان کا گہرا اثر تھا اقبال کسی کے احسان کو فراموش نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا ذکر کرتے تھے، اقبال نے سرسری طور پر داغ کی شاگردی بھی کی خط و کتابت کے ذریعے سے داغ سے دو تین غزلوں کی اصلاح لی داغ نے لکھ بھیجا کہ اب آپ کو اصلاح کی حاجت نہیں غزلیں بھیجنے کی زحمت نہ کیجئے۔ تین یا چار غزلیں "بانگ درا" میں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ داغ کے زیر اثر لکھی گئی ہیں اور داغ کے رنگ میں اقبال نے اپنے کو سمو کر لکھا، لیکن اقبال رسمی شاعری اور مصنوعی عاشقی کی غزل گوئی سے متنفر تھے۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا تری آنکھ ہنسی میں ہشیار کیا تھی

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں یہہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا جگر کا خون دے دے کر یہہ بوٹے میں نے پالے ہیں

غالب کا رنگ فطرتاً ان پر غالب تھا وہ غالب کے نہ صرف مداح تھے بلکہ اس کے انداز بیان سے بھی بہت متاثر تھے، فرماتے تھے کہ میرا عرصے سے خیال ہے کہ غالب کے حکیمانہ خیالات کی ایک فلسفیانہ شرح لکھوں افسوس کہ کسی نے غالب کا پورا حق ادا نہیں کیا ایرانی ہندوستانیوں کی فارسی کو فارسی ہی نہیں سمجھتے ایک ایرانی نے کہا کہ غالب ہندوستان میں فارسی کا بڑا شاعر مشہور رہے لیکن ہمیں تو وہ اعلےٰ درجے کا شاعر نہیں معلوم ہوتا اقبال نے کہا غالب کا یہی کمال ہے کہ ایرانی کی سمجھ میں نہ آئے اس کا ذہن ہندی اور زبان تمھاری ہے اقبال، غالب کے اتنے مداح تھے کہ انھوں نے غالب پر ایک نظم لکھی اس نظم میں خوبی یہہ ہے کہ حقیقت میں وہ غالب کی مدح نہیں بلکہ اپنے لئے ایک نصب العین کا تعین ہے۔ اقبال نے اپنے نصب العین کو غالب کے سپرد میں پیش کیا اور بعد کو حرف بہ حرف اس کو پورا کیا کچھ دور چل کر وہ غالب تک پہنچ گئے اور اس کے بعد غالب عطار اور سنائی سے کہیں آگے بڑھ گئے انھوں نے نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کئے۔

اقبال کے کلام میں استعارات، تشبیہات کے ساتھ فکر کی ثروت اس قدر ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا غالب کی نظم میں شعر کے معاملے میں انھوں نے بیان کیا ہے ؎

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں　　تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں　　لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں　　ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے　　شمع یہہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

اقبال نے اُردو کو چھوڑ کر فارسی کی طرف توجہ کی تو سر عبدالقادر نے اقبال کو یاد دلایا ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

اِس کا یہہ اثر ہوا کہ اقبال اپنی آخری عمر میں بالِ جبریل اور ضربِ کلیم جیسی دو گراں بہا کتابیں چھوڑ گئے۔

اسی نظم میں انھوں نے غالب کو گوئٹے سے تشبیہہ دی ہے ؎

گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

گوئٹے اپنے زمانے کا بہت بڑا آدمی تھا نپولین کا ہم عصر تھا اس نے مغرب کی تہذیب کا مطالعہ کر کے اس کو شاعری میں پیش کیا جب مغرب سے تسکین نہیں ہوی تو مشرق کی طرف جھکا اور مشرق کے ترجموں کو پڑھ کر ایک دیوان لکھا یہہ وہی دیوان ہے جس کے جواب میں اقبال نے پیامِ مشرق لکھا۔ غالب سے زیادہ گوئٹے کا ہم نوا اقبال تھا ذہنی ترقی کے بعض پہلوؤں میں وہ گوئٹے سے بھی آگے بڑھ گیا وہ فرنگ کو روحانیت سے خالی سمجھتا ہے اقبال کا خیال مغرب کے بڑے بڑے لوگوں کے متعلق تھا کہ یہہ لوگ محمل تک نہیں پہنچتے بلکہ غبارِ ناقۂ لیلیٰ تک جا کر رہ جاتے ہیں ؎

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است　　شعر مے گردد چو سوز از دل گرفت

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم　　دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

اقبال فلسفہ میں ایسی ٹھنڈی بحث کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہہ شخص روکھا فلسفی ہے۔ میں ایک مرتبہ ان سے ملنے گیا تو ایک فلسفیانہ مکالمہ پڑھ رہے تھے۔ اس کے موضوع کے متعلق گفتگو ہونے لگی، اس بحث میں لطیفہ یہہ ہوا کہ اقبال عقل کی تائید کرتے تھے اور میں وجدان کی وہ کہتے تھے کہ Sharp اور Cold Intellect ہو تو پھر اسی مقام پر پہنچیں گے جہاں وجدان پہنچتا ہے۔

اقبال نے جا بجا اپنا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے لیکن بالکل بے ریا نہ خود مغالطہ میں رہنا چاہتے اور نہ دوسروں کو مغالطے میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ "دیکھو میرے متعلق مشکل یہہ ہے کہ مجھ کو ریا کاری کا فن نہیں آتا اور کبھی اگر میں نے کوشش بھی کی ہے تو کامیابی نہیں ہوی اس لئے میں نے ریا کو بالکل چھوڑ دیا ہے اسی خیال کو ایک نظم میں ظاہر کیا ہے ؎

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے　　عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز

ڈھب مگر قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی　　اور تجارت میں ملتا نہیں استاد کوئی

اقبال پر مذہبیت کا رنگ کچھ نہ کچھ شروع سے موجود تھا جو آخر میں غالب ہو گیا۔ لیکن یہہ مذہبیت ایک خاص رنگ کی تھی۔ وہ ملا نہیں تھے

اقبال نے ہمیشہ ملّائیت سے گریز کیا ہے، وہ رند بھی تھا، فلسفی بھی تھا، صوفی بھی تھا، قلندر بھی مگر مسلّمہ مفہوم کے لحاظ سے ان میں سے کسی صفت کا اطلاق ان پر پوری طرح نہیں ہو سکتا ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا　　اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

ایامِ جوانی میں ان کا جو انداز تھا اس کا صحیح نقشہ انھوں نے ایک مولوی صاحب کی زبان سے کھینچا ہے ؎

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی　　تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی　　لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی　　تھی تہ میں کہیں دردِ خیال ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی　　منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی　　مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے　　تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا　　اقبال کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی　　سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا　　ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی　　ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی　　اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد　　پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی　　تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی　　میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے　　یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قربِ مکانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا　　گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی　　مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں　　کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے !　　کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

جھوٹ موٹ کے زہد و تقوے کا رنگ اختیار نہیں کرتے تھے بعض اوقات بے تکلف رندانہ گفتگو کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے ساتھ بازار میں سے گذر رہے تھے اتفاق سے حسن فروشوں کا بازار رستے میں آگیا گذرتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھتے گئے کہنے لگے کہ بعض صورتیں اس میں نئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس فقرے سے معلوم ہوا کہ وہ ان سب صورتوں کا جائزہ لے چکے ہیں۔

رات کو ۲ بجے تک گانا سن کر گھر واپس آتے اور صبح کو قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کرتے کہ پتھر کا دل بھی پگھل جائے۔ اقبال کو مولویوں کے طعن تشنیع پر کبھی غصہ نہیں آیا ایک دفعہ کہنے لگے کہ ملّا اور مولوی نے اسلام کی مٹی پلید کردی ہے۔ پانچ وقت ٹکر مار کر خدا پر احسان کر دیتے ہیں۔ اگر اسلام کی پیروی میں کہیں ان کا کچھ مالی نقصان ہوتا ہے تو ان کا اسلام باقی نہیں رہتا۔ ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب آکر وعظ کرنے لگے کہ تم اس قدر عالم ہو کر شریعت کا احترام کیوں نہیں کرتے۔ ذرا اپنے علم کی تو قدر کرو۔ میں نے کہا "کیا کروں" فرمانے لگے کہ "ڈاڑھی چھوڑ دو"۔ میں نے کہا کہ "شریعت کی کچھ آپ کو ناہی کرتے ہیں اور کچھ ہیں"۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ مولوی صاحب ایک مقدمے کے سلسلے میں اقبال کے پاس آیا کرتے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کو شرعی حصہ نہیں دینا چاہتے تھے اور اقبال سے طرح طرح کے قانونی مشورے لیا کرتے جس میں اس قسم کی گنجائش ہو کہ وہ اپنی بہن کو حصہ نہ دے سکیں اور بار بار یہی کہتے کہ ہمارے خاندان میں اس قسم کا رواج نہیں۔ اقبال نے کہا مولوی صاحب آج خدا نے آپ کو ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ لائیے ہاتھ ملائیے، آپ اپنی بہن کو حصہ دے دیجئے اور میں ڈاڑھی چھوڑ دیتا ہوں۔ جب وہ ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے تو مولوی صاحب پیچھے ہٹتے جاتے۔

اقبال کی شاعری میں جابجا ان کی زندگی کے متعلق واقعات ملتے ہیں ان کی بے نیازی کا یہ حال تھا کہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ خانہ اور اہل خانہ دونوں کی طرف سے بے نیاز معلوم ہوتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت مطالعہ میں گذرتا تھا۔ بیسیوں عجیب و غریب کتابیں ان کے پاس پڑی رہتی تھیں۔ قانون کی کتابوں کے سوا ہر قسم کی کتابیں ہوتی تھیں ان کو اپنی ضروریات کا ... ۵ یا ۷ ہزار روپے مل گئے تو ان کو اپنے

بال بچوں کا خیال ہوا اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ اپنی نگرانی میں ایک بنگلہ بنا دو۔ بڑے بھائی کہتے کہ چلو بنگلہ بن رہا ہے ایک نظر دیکھ لو اور اپنی رائے دو تو کہتے کہ بنگلہ بن جائے گا تو دیکھیں گے۔ جب حیدرآباد آئے تو مجھ سے سر اکبر نے کہا کہ اقبال کو کنگ کوٹھی سیارک اور رزیڈنسی لے جاؤ۔ میں ان کو کنگ کوٹھی لے گیا اور سر امین جنگ سے مل کر اعلیٰ حضرت سے ملاقات کا وقت مقرر کرادیا۔ وہاں سے رزیڈنسی آئے تو معلوم ہوا کہ رزیڈنٹ بلارام میں ہیں۔ انھوں نے اپنا کارڈ چھوڑ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ رزیڈنٹ سے تو ملاقات نہیں ہوئی چلئے عمارت ہی کو دیکھ لیں بڑی عظیم الشان عمارت ہے قدیم انداز کی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور کہا چلو یہ سرمایہ داروں کی لوٹ ہے۔

ان کے کلام میں قلندری کا جو ذکر ہے وہ شاعرانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے جو لوگ ان کے پاس رہے ہوں وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کھانا ۲۴ گھنٹوں میں ایک دفعہ کھاتے تھے۔ بہت کم سوتے تھے۔ سحر خیز تھے۔

اقبال کا نام الہامی نام تھا۔ ان کے والد صوفی اور پاکیزہ نفس تھے۔ ایک مرتبہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی شستہ اور لطیف گفتگو کرتے تھے ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ اقبال جب پیدا ہونے کو تھے تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک عجیب و غریب رنگ کا خوبصورت پرندہ آسمان سے زمین کی طرف آرہا ہے۔ جب وہ قریب آگیا تو بہت سے لوگوں نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی اور میں خاموش کھڑا رہا وہ پرندہ میری گود میں آگیا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔

اقبال کی ہر دل عزیزی کا یہ حال تھا کہ سیکڑوں نے ان کے کلام کی نقل شروع کردی۔ اقبال نے سیکڑوں ادیب پیدا کئے۔ اقبال کے اندازِ خیال سے واقف ہوں تو معلوم ہو کہ جس طرح سمندر میں ایک چاند سے ہزاروں چاند پیدا ہوتے ہیں اسی طرح اقبال نے بحرِ حیات میں اپنا عکس ڈالا اور ہزاروں چاند پیدا کئے۔ چنانچہ تصویرِ درد میں اپنے متعلق کہا ہے ؎

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے　　چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

لوگوں نے ان کی لے کی بھی نقل کی۔ جس کے متعلق لکھتے ہیں ؎

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے　　چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اقبال کی شاعری کا ارتقاء فطری شاعری سے ہوا اور یہ ان کی عام شاعری تھی۔ پھر اقبال نے حبِ وطن سے متعلق ایسی نظمیں لکھیں کہ کوئی محبِ وطن ان سے بہتر نہیں لکھ سکتا ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا　　جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اقبال دل لینے عشق سے کیا مراد لیتا ہے، اس کے پاس عشق کا مفہوم بہت گہرا ہے۔ دل اور عشق اقبال کے کلام میں ایک مستقل مضمون ہے جس پر اگر کوئی لکھنا چاہے تو کافی مواد مل سکتا ہے ؎

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل　　التجائے اَرِنی سرخیِ افسانۂ دل
یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی　　جادۂ ملک بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب　　جل گئی مزرعۂ ہستی تو اگا دانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہہ نخل ہرا ہوتا ہے

اقبال شروع شروع میں کچھ روایتی تصوف میں پڑے رہے اور یہہ ایک بڑا مضمون ہے کہ وہ کس طرح تصوف سے نکلے۔ تصوف کی دو قسمیں ہیں۔ سکونی تصوف اور حرکی تصوف۔ ایک تصوف وہ ہے جو کمالِ سکون سے حرکی تصوف کی طرف پہنچاتا ہے۔ جس زور سے انھوں نے حرکی تصوف کے پہلو کو واضح کیا ہے آج تک کسی کے کلام میں نظر نہیں آتا۔

یورپ میں تعلیم کے دوران میں ان پر کن تحریکات کا اثر ہوا ہے ایک طویل بحث ہے۔ اقبال نے کفر و دین دونوں سے فیض حاصل کیا نیٹشے سے متاثر ہو کر انھوں نے عمل اور حرکت پر نظمیں لکھنی شروع کیں۔ مثلاً "چاند تارے" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے

کہنے لگا چاند ہم نشینو! اے مزرعۂ شب کے خوشہ چینو
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہہ رسمِ قدیم ہے یہاں کی

اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا شبِ دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہہ گفتگو قمر نے سنی فلک پہ عام ہوی اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

مذکورہ بالا نظم کے ایک ایک لفظ میں معانی اور تاثرات کے جواہرات جڑے ہوے ہیں۔ انھوں نے یہ نظم آرنلڈ کو سنائی تو آرنلڈ نے کہا کہ "دیکھو مشرقی اور مغربی میں یہی فرق ہے۔ تم نے اس کو نیا لباس پہنا دیا ہے"۔ ایک جگہ عمل کی تعلیم نہایت ہی پُر زور انداز میں کی ہے

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسّس جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

اقبال نے قریب قریب ہر چیز کو نئے معنی پہنا دئے فقر کو نئے انداز سے پیش کیا اسلام میں فقر کے دو معنی ہیں حدیث میں ہے "اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ" یعنی فقیری کی وجہہ سے دونوں جہاں میں منہ کالا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے "کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا" یعنے فقر انسان کو کفر سے زیادہ قریب کر دیتا ہے اور ایک جگہ ہے اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ یعنی فقر میرے لئے باعث فخر ہے۔ فقر کی دو قسمیں ہیں ایک وہ فقر جس کو سعدیؒ نے بیان کیا ہے ؎ خداوندِ روزی بحق مشتغل پراگندہ روزی پراگندہ دل

ایک مغربی مفکر کہتا ہے کہ ایک فقر وہ ہے جو خود آدمی اختیار کر لیتا ہے اور ایک وہ ہے جو اس پر عاید کیا جاتا ہے۔ اقبال نے فقر کو عشق کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہوے اس کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ شہنشاہیت سے بڑھا دیا ہے۔ جب کوئی شخص تمام چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو تمام کائنات اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اقبال نے قناعت کے خلاف بھی جہاد کیا ہے۔ —— اقبال عین فقیری اس کو سمجھتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں کو اپنے میں جذب کر لیا جائے۔ اقبال کے ہاں فقیری بڑی وسیع چیز ہے وہ فقیر سمجھتا ہے آنحضرتؐ کو، عمر فاروقؓ کو، اس قسم کے شہنشاہی فقیر اس کی نظروں میں تھے۔

خدا جانے کب سے ابلیس کو برا بھلا کہہ رہے ہیں ایرانیوں کے مذہب میں تو ابلیس کو برائیوں کا خالق قرار دیا گیا، اس کا نام اہرمن رکھا یہی اہرمن ذرا سی صورت بدل کر اسرائیلی مذاہب میں داخل ہو گیا اور ہر برائی شیطان کی طرف منسوب کردی جاتی ہے لیکن بعض صوفیائے کرام اور بڑے بڑے نکتہ داں ہمیشہ شیطان کی تعریف کرتے رہے ہیں۔ اقبال کہتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک فقیر سے پوچھا کہ تو کس کا مرید ہے، اس نے کہا کہ ابلیس کا کیونکہ وہی موحد ہے۔ منصور حلاج نے ابلیس اور موسیٰ کا مکالمہ لکھا ہے۔ آخر میں موسیٰ شکست کھا جاتے ہیں۔ ملٹن کا خدا بھی اس کے شیطان کے مقابلے میں ڈھیلا ڈھالا معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں رکاوٹوں کا نام شیطان ہے اور رکاوٹوں پر قابو پانے کا نام زندگی ہے یہ واقعہ ہے کہ ابلیس کو نکال دو تو جہاں کی رونق باقی نہیں رہتی اقبال نے جبریل اور ابلیس کو لڑا دیا ہے اور جبریل کو شکست دلائی ہے

جبریل۔ ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو　　ابلیس۔ سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے و آرزو
جبریل۔ ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو　　کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو
ابلیس۔ آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے　　کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
جبریل۔ کھو دئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند　　چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو
ابلیس۔ ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو　　میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر　　کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا　　میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے　　قصۂ آدمؑ کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح　　تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

محض ذکر کے ناکافی ہونے کی بابت اقبال نے ایک ایسا لطیف مضمون پیدا کیا ہے کہ اسلامی لٹریچر میں اس سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ قرآنِ کریم میں ہے "یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" یعنی تمام کائنات خدا کی تسبیح میں مصروف ہے اقبال نے اس سے ایک مضمون پیدا کیا ہے کہ خدا کی صرف تسبیح کرنا نباتات اور جمادات کا کام ہے انسان کا کام تو آسمانوں سے اوپر نکل جانا ہے

وہ مذہبِ مردانِ خدا داد و خدا مست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

خلیفہ عبدالحکیم

کلام اقبال کی بعض خصوصیتیں

از شمارِ دو چشم یک تن کم
وز حسابِ خرد ہزاراں بیش

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی موت ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی شاید صدیوں کے بعد ہو سکے۔ ان کی رحلت کا افسوس نہ صرف ہندوستانیوں کو ہے بلکہ تمام دنیائے اردو ان کے غم میں سوگوار ہے، اردو اور فارسی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ ہم کو سنوارنے والا نہ رہا۔ فلسفہ مضطرب ہے کہ اس کے مسائل حل کرنے والا اطمینہ کے لئے غائب ہوگیا۔ ہندوستانی افسوس کر رہے ہیں کہ اب ان کو کون پیغامِ حیات دے گا، حقیقت میں آنکھ اور گوشِ نصیحت نیوش کی ضرورت ہے۔ ہم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگرچہ اقبال کا تنِ خاکی زمین میں دفن ہوگیا لیکن اس کی روح ہر وقت ہمارے لئے پیغامِ حیات لئے پھر رہی ہے۔ "بانگِ درا" اب بھی بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتلا سکتی ہے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی اب بھی حق شناسی کا سبق دے سکتی ہیں۔ پیامِ مشرق ہر وقت ایک نیا پیغام پیش کر سکتی ہے۔ "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" اب بھی سوتوں کو جگا سکتی ہے بشرطیکہ ہم میں شاعرِ اعظم کے پیام کے احترام کا صحیح جذبہ موجود ہو۔

ہر زمانے میں مختلف مقامات پر مختلف پیغمبر آئے اور انھوں نے انسانوں کو صحیح راستہ بتلانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ سننے والوں نے ان کے پیغام کو گوشِ دل سے سنا اور اس پر عمل پیرا ہو کر سعادت حاصل کی۔ جب پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہوگیا تو دنیا کو پیغام دینے والے صرف شاعر رہ گئے۔ جس طرح پیغمبر الہامی کلام کو لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے بالکل اسی طرح حقیقی شاعر بھی اپنے الہامی کیفیات اور وارداتِ قلبی کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات اور کیفیات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ عوام کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرتا اور حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے ؎
شاعری جزویست از پیغمبری

جس طرح پیغمبر کی ہر آواز خدا کی آواز ہوتی ہے شاعر کا ہر لفظ الہامی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چونکہ شاعر عوام کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے ماحول کے نشیب و فراز سے بہت جلد متاثر ہو کر دوسروں میں بھی احساسِ تاثر پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے جس کی باعث شاعر کی ہستی ملک و قوم میں امتیاز حاصل کر لیتی ہے۔

اقبال نے جتنا کائناتِ عالم کا قریب سے مطالعہ کیا ہے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ انھوں نے مشرقی فلاسفہ مثلاً مولانا رومؒ، عطار، سنائی اور رازی کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے خیالات کو دنیا کے سامنے نئے رنگ میں پیش کیا۔ ان کے کلام میں جا بجا ایک بجلی سی کوندتی نظر آتی ہے طاقت اور زورِ بیان کا وہ حال کہ سوتوں کو جگا دے، مردوں کو زندہ کر دے، مایوس دلوں کو شاہ راہِ ترقی پر گامزن بنا دے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کے کلام میں سوز و گداز، تڑپ اور اضطراب جا بجا نظر آتا ہے انھوں نے اپنے کلام سے ہندوستان کی زوال یافتہ قوم میں احساسِ خودی اور جوشِ عمل پیدا کر دیا۔ ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد دل میں ذوقِ عمل اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ہر شعر اہلِ دنیا کے لئے ایک بصیرت افروز پیغام ہے اور ہر پیغام میں حیاتِ جاوداں۔

اقبال کی قوتِ تخیل اور فلسفے نے زندگی کی ایک نئی شاہراہ قائم کر کے نہایت دقیق مشکل اور گہرے مسائل کو عام فہم اور سلیس بنا دیا۔ یہ اقبال ہی کا حصہ تھا۔ اقبال کے کلام کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا رومؒ کی روح نے اقبال کے جسم میں دوبارہ جنم لیا۔

جن اصحاب نے مولٰنا اور اقبالؔ کے کلام کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ غرض اقبالؔ ان کے قدم بہ قدم نظر آتے ہیں۔ جس طرح مثنوی کی وجہ سے مولٰنا رومؒ کا نام زندہ ہے اسی طرح اقبال بھی اپنے حکیمانہ اور فلسفیانہ کلام کے باعثِ رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔

اقبال فطرتاً خود دار آزاد منش تھے۔ شاعرانہ قیود کی جکڑ بندیوں کا پابند رہنا ان کی شانِ خود داری کے خلاف تھا۔ وہ جس چیز کو بیان کرنا چاہتے آزادانہ اور بے باکانہ کہہ جاتے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ ڈھونڈنا باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے۔ خیالات خود اپنے ساتھ الفاظ لئے آتے۔ سادگی، بے ساختہ پن، اپج، شگفتگی ان کے کلام کی اہم خصوصیتیں ہیں۔ ان سب سے زیادہ ان کے کلام میں بلا کا اثر تھا۔ جو بھی لکھتے متاثر ہو کر لکھتے اور دوسروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہتے۔ ان کی انقلاب پسند طبیعت ہمیشہ جمود کے خلاف جنگ کرتی رہتی تھی۔ قوم کو بیدار کرنا اور خودی کا سبق پڑھانا ان کا مطمحِ نظر تھا خاص کر ہندوستان والوں میں جوشِ عمل، اخوت اور خود داری کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا ان ہی کے سر رہے گا۔

اقبالؔ کا کلام ہمہ گیر ہے۔ اس لئے اس کے متعدد پہلو ہیں وہ ہر جگہ حیات کی گتھی سلجھاتے ہیں اور زندگی کو بے نقاب کر کے دکھانا چاہتے ہیں

ترا یک نکتۂ سربستہ گویم	اگر درسِ حیات از من بگیری
بمیری گر بہ تن جانے نہ داری	وگر جانے بہ تن داری نمیری

بہ دریا غلط و با موجش در آویز	حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
کسے کو دردِ پنہانے نہ دارد	تنے دارد و لے جانے نہ دارد

مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ	اگر دم رفت دل باقی ست غم نیست

بگوشم آمد از خاکِ مزارے	کہ در زیرِ زمیں ہم می تواں زیست
نفس دارد ولیکن جاں نہ دارد	کسے کو بر مرادِ دیگراں زیست

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصال	چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام
بہ سازِ زندگی سوزے بہ سوزِ زندگی سازے	چہ بے دردانہ می سوزد چہ بیتابانہ می سازد

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے	زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے
گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر	شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں	وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا	حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال کی جستجو پسند طبیعت اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ تلاش و جستجو کسی نقطہ پر آکر ختم ہو جائے وہ تمام عمر حقیقت کے پردوں کو چاک کرنا چاہتے ہیں۔ بحرِ ہستی میں موج بن کر جدھر چاہتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ ساحل کا خیال ان کے لئے سوہانِ روح ہے۔ ان کی اضطراب پسند طبیعت سکون سے بالکل بے نیاز ہے تنگ دامنی اور قناعت ان کی شان کے خلاف ہے۔ ذوقِ سفر کا وہ عالم کہ منزل بھی سنگِ راہ بن کر رہ جاتی ہے وہ اپنی منزل کو اسی ذوقِ سفر میں مضمر سمجھتے ہیں۔ وہ ایک جگہ مقید رہنا نہیں چاہتے۔ ان کی آزادی پسند طبیعت ہمیشہ پرواز کی طرف مائل نظر آتی ہے ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا	ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج	ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے!	مضطرب ہوں دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں

نہ ہو قناعت پسند گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری	وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم	کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست
گفتنم کہ شوقِ سیر نبردش بہ منزلے	گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است

بہ آشیاں نہ نشینم ز لذتِ پرواز	گہے بہ شاخِ گلم گاہ بر لبِ جویم

مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے اور مسلمانوں کا سا نام رکھ لینے سے کوئی مومن نہیں کہلا سکتا صرف باتوں سے نہیں بلکہ کردار اور عمل سے ایمان کی تجلیات رونما ہونی چاہئیں۔ مومن کی تعریف اور اس کی [illegible] اقبال کی زبان سے سنیئے ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں ہے گم — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت — لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے — امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "نازِ بندگی" کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ انسان کو اپنی خوبیوں اور کمال پر ناز ہوتا ہے مثلاً کوئی حسن پر ناز کرتا ہے تو کوئی دولت پر، کسی کو اپنی قابلیت اور شرافت پر ناز ہے تو کسی کو اپنی حکومت اور سروری پر لیکن اقبال کا ناز انوکھی قسم کا ہے۔ وہ اپنے بندہ ہونے پر ناز کرتے ہیں چنانچہ ان کے کلام میں ہر جگہ یہی عنصر غالب نظر آتا ہے "شکوہ" ان کے نازِ بندگی کی بہترین مثال ہے۔ بعض سطح بینوں نے شکوہ کی گہرائیوں تک نہ پہنچنے کی وجہ سے اقبال پر کفر کے الزامات لگائے جن کے بعد ہی انھوں نے "جوابِ شکوہ" لکھا شکوہ میں اقبال نے خدا سے بغاوت نہیں کی بلکہ خدا کی بے نیازی اور بندگی کے ناز کو واضح کیا ہے ۔

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں — ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں
تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے — آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر — اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ایک جگہ اقبال نے بندگی اور خداوندی پر روشنی ڈالی ہے ۔

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے — خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ — یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

بندگی کے متعلق اقبال کا تخیل بالکل انوکھا ہے۔ وہ درد و سوز اور تلاش و آرزو کو اصلِ حیات سمجھتے ہیں۔ اور اس کی طرف اس قدر مائل نظر آتے ہیں کہ مقامِ بندگی کے بدلے شانِ خداوندی لینا پسند نہیں کرتے ۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

خواجہ حمید الدین شاہد

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں — کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ہندوستان یا اسلامی دنیا کے شاعر نہ تھے بلکہ بہ حیثیت شاعر، مفکر اور فلسفی ان کی حیثیت بین الاقوامی تھی۔ چنانچہ مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار نے آپ کی وفات پر جو بیان دیا ہے اس میں کہا کہ مسولینی اقبال کی بڑی عزت کرتا تھا، اور آپ کی متعدد نظموں کا ترجمہ اطالوی زبان میں ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے اردو اور فارسی شاعری کے ذریعہ دنیا کے بڑے حصہ کو براہ راست اپنا پیغام پہونچایا اور باقی ماندہ دنیا اس کے ترجموں سے مستفید ہوئی، اقبال کی وفات سے مشرق اور بالخصوص ہندوستان کو جو نقصان عظیم پہونچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے، اور مادر ہند اپنے اس عظیم المرتبت فرزند کی جدائی پر جتنی بھی سوگواری کرے کم ہے۔

غالب کے بعد اردو اور فارسی شاعری میں اقبال کا ہی درجہ ہے، خود اقبال غالب سے متاثر بھی ہوا۔ اور ان دونوں میں بعض خصوصیات مشترک بھی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے سر شیخ محمد عبد القادر سابق مدیر مخزن نے بانگ درا کے دیباچہ میں یہاں تک لکھدیا ہے کہ "اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں بھی جا کر چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی پیکر خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے، اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا"

اقبال محض شاعر ہی نہ تھا بلکہ وہ جید عالم بھی تھا۔ اس نے ایک طرف مولانا روم، غالب اور دوسرے مشرقی علماء کے فلسفہ کا مطالعہ کیا تو دوسری جانب نٹشے، برگساں اور گوئٹے کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ اور اس وسیع مطالعہ سے اس نے اپنا ایک جدید فلسفہ پیش کیا، اقبال نے شاعری اور فلسفہ کو ملا دیا۔ اس کے تمام کلام حتی کہ صبح، شام، شفق، جیسی معمولی اور سادہ نظموں میں بھی جابجا فلسفہ موجود ہے۔

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ قومی شاعر نہ تھا، اور ہندوستان میں رہ کر عراق و عرب کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہ حیثیت مسلمان اس کو فلسفۂ اسلام کے مطالعہ میں سہولت ہوی اور اس کا بڑا گہرا اثر اس پر پڑا، مگر اس کے ساتھ ہی اس نے حقائق و واقعات کو نظر انداز نہیں کر دیا۔ در اصل یہ سوال کچھ آسان بھی نہیں ہے کہ کسی شاعر کا کسی بات کے متعلق صحیح اور قطعی نظریہ کیا ہے۔ کیونکہ اس کے پیش نظر تو حقایق اور مشاہدات ہوتے ہیں اور وہ ہر پہلو پر جدا جدا روشنی ڈالتا ہے اقبال مذہب کو کسی ملک سے وابستہ نہیں کرتا وہ عالمگیر اخوت پر زور دیتا ہے، وہ غلط قومیت کو بھی مہلک سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ان خیالات کا جابجا اظہار کرتا ہے، طارق کی زبان سے کہلواتا ہے۔

طارق چو بر کنارِ اندلس سفینہ سوخت | گفتند کار تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم | ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت | ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

جواب شکوہ میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مذہب کا تعلق کسی خاص ملک یا خطہ سے نہیں ہے۔

تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے | نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

وطن کی محبت بلاشبہ ایک عزیز ترین شے ہے۔ مگر اس میں مبالغہ اور غلو سے کام لینا بھی مناسب نہیں موجودہ زمانہ میں وطنیت کی انتہائی شدت اکثر ممالک میں نظر آ رہی ہے، اور دنیا اس کے خطرناک نتائج سے بھی ناواقف نہیں ہے، چنانچہ اقبال کسی ملک کی قید بھی گوارا نہیں کرتا۔

مصر و حجاز سے گذر، پارس و شام سے گذر | تو ابھی رہ گذر میں ہے، قیدِ مقام سے گذر

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے حسب ذیل اشعار دیکھ کر کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کو ہندوستان سے محبت نہ تھی وہ تو نہ صرف وطن بلکہ اس کے پہاڑوں، دریاوں، وادیوں، اور مناظر تک سے الفت کرتا ہے، اس کو خاکِ وطن کا ذرہ ذرہ عزیز ہے۔ وہ وطن سے دور رہ کر بھی وطن کو یاد کرتا ہے۔ ورڈس ورتھ کے "لولے" کی طرح گو اونچی فضاؤں میں پرواز کرتا ہے مگر اس کا دل ہر دم اپنے آشیانے کی طرف ہی لگا رہتا ہے۔ ہندوستان کے متعلق کہا ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا | ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا | ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ہندوستانی بچوں کے قومی گیت میں لکھتا ہے۔

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا | نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا | جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے۔ میرا وطن وہی ہے۔

شاعر کو وہ "دیدۂ بینائے قوم" سے تشبیہہ دیتا ہے، اور دیدۂ بینا کا ملک کی تباہ حالی پر آنسو بہانا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ بھی اپنے ملک کی حالت پر روتا ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو | کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

وہ ہندوستانیوں کے آپس کے نفاق اور نااتفاقیوں کو دور کرنا چاہتا ہے، ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتا ہے ان میں عزم و استقلال کی ایک نئی روح پھونکنا چاہتا ہے۔ مگر جب دیکھتا ہے۔ کہ ملک پر جوں تک نہ رینگی تو فیصلہ کن لہجے میں کہہ دیتا ہے۔

سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو | تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

ہندوستان میں قدیم زمانے میں ہندو مسلمانوں میں جو یگانگت اور خلوص پایا جاتا تھا اس کے قصے ہر ایک نے اپنے

بزرگوں سے سنے ہونگے، اور آج جو بات بات پر لڑائی، جھگڑا، دنگا فساد، مار پیٹ، کی نوبت آرہی ہے، وہ ہم سب کے سامنے موجود ہے، شاعر کی پیش نظر دونوں چیزیں تھیں اس نے ساری کیفیت کو اس شعر میں پیش کیا ہے

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستور محبت قائم تھا
یا بحث اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

ہندوستان میں قومیت کا تخیل بالکل جدید چیز ہے ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد سے اس کا آغاز سمجھنا چاہئے، اور ۱۹۳۵ء کے نئے دستور کے بعد اس میں جان ڈالنے کی کوشش شروع ہوئی، شاعر نے اس تخیل کو بہت عرصہ پہلے اس صورت میں پیش کر دیا تھا۔

سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالا اس دیس میں بنا دیں

اقبال نے اگر ایک جانب ابوبکر صدیق رض بلال رض اور اسلام کی دوسری برگزیدہ ہستیوں کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ تو دوسری جانب ہندوستان کے مشاہیر اور بزرگوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا، سوامی رام تیرتھ، رام مہاراج، گرونانک، جیسے بزرگوں سے بھی وہ عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ رام مہاراج کے متعلق لکھتا ہے

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

گرونانک کے متعلق ارشاد ہے

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اقبال کے اسلام میں ایک جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے، وہ انسان کو پستی سے رفعت کی جانب لے جانا چاہتا ہے اس کو عزم و استقلال، کوشش، نیک کرداری، صداقت، اور بہادری کی تعلیم دیتا ہے۔ زندگی مصیبتوں اور خطروں سے پر ہے مگر بلند ہمت انسان ان خطرات سے نہیں گھبراتا۔ وہ ان کا جان توڑ مقابلہ کرتا ہے۔ اور زندگی میں کامیابی حاصل کرتا ہے ذیل کے اشعار میں ان ہی چیزوں کو پیش کیا ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
زندگی کی راہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے
خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

وہ اکثر جگہ اپنے مخاطب نوجوانوں کو بناتا ہے کیونکہ وہ قوم کا انحصار انہی پر ہے۔ یہی ان کی

قسمتوں کو بگاڑ اور بنا سکتے ہیں ان کے لئے کس قدر بلند نصب العین پیش کرتا ہے

ضمیر پاک، نگاہ بلند، مستی شوق　　نہ مال، و دولت قارون نہ فکر افلاطون

کسی ملک کے نوجوانوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی زندگی تعیشات وتنوعات میں بسر کریں۔ بالخصوص غلام ملک کے نوجوان کو اس وقت جب کہ اس کے ہم وطن ملک و قوم کی خاطر قربانیاں کر رہے ہوں، جاہ و منصب، آرام و آسائش، اور مال و دولت کی تمنا نہ کرنا چاہیئے، چنانچہ کہتا ہے

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

موجودہ دور سرمایہ داری کا دور ہے، سرمایہ داروں نے مزدوروں پر جو مظالم روا رکھے ہیں، ان کی داستان بڑی تلخ اور طویل ہے، مزدور جو دراصل دولت پیدا کر رہا ہے، اس کو اپنی پیدا شدہ دولت کا اتنا حصہ بھی نہیں ملتا کہ وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی اچھی طرح شکم پری بھی کر سکے اور وہ لوگ جو پیدائش دولت میں قطعی کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں، مزدوروں کے خون اور پسینہ کی کمائی سے اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کر رہے ہیں اور تو اور مزدوروں کی پیدا شدہ آمدنی کی بدولت مزدوروں کے حقوق غصب کرنے میں مدد لیتے ہیں، اس طویل داستان کو کس عمدہ پیرایہ میں ایک شعر میں بیان کیا ہے،

دست دولت آفرین کو مزد یوں ملتی رہی　　اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

لینن کی زبان سے خدا کے حضور میں کہلوایا ہے۔

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں۔ گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات۔ یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبیر، یہ حکومت۔ پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں۔ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات۔ کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ۔ دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

روس میں جو انقلاب ہو رہا تھا وہ اس کے سامنے تھا۔ دوسرے ممالک میں مزدور جو آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں وہ بھی اس کے پیش نظر تھی، اس لئے وہ یقین کر لیتا ہے کہ اب سرمایہ داروں کا خاتمہ قریب ہے۔ اس لئے کہتا ہے۔

پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے　　گیا دور سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے　　ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دور سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے، غریبوں کو ان کے جائز حقوق مزدوروں کو ان کی مزدوریاں دلوانے، مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ گرفت سے چھڑانے، اور نام نہاد مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کی غلط تعلیم و تدریس کے خلاف آواز بلند کرتا ہوا خدا کی زبان سے کہلواتا ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو　　گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے　　کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے۔ پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

وہ اس ساہوکار کو جو اپنی ناجائز ترکیبوں سے غریبوں کی آمدنی کا بڑا حصہ بشکل سود وصول کرتا رہتا ہے۔ اور اس نظام سلطنت کو جس میں غریبوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو، جہاں وہ اپنی داد خواہی نہ کر سکیں، جہاں کوئی ان کی آواز سننے والا نہ ہو، ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔　چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں　ساہوکاری، بسوہ داری، سلطنت

دنیا کا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں اور بڑے جانور چھوٹے جانوروں کا شکار کر لیتے ہیں۔

جو جتنا کمزور ہوتا ہے اس کو اتنا ہی زیادہ دبایا جاتا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد کس طرح یورپ کی مختلف حکومتوں کو دبایا گیا، ان کی نو آبادیاں چھین لی گئیں، فوج و اسلحہ میں کمی کی گئی تاوان جنگ عاید کیا گیا اور دنیا خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی۔ مگر جب یہ ملک خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے، اور قوت و اقتدار حاصل کیا تو پرانے معاہدوں کو کالعدم قرار دیا، اسلحہ و فوج میں اضافہ کیا نئے نئے ملکوں پر قبضہ کر لیا اور دنیا نے بھی بے چون وچرا ان کے حقوق کو تسلیم کیا۔ شاعر یہی کہتا ہے کہ جب تک دوسروں کی مدد اور بھروسہ کا انتظار کروگے اسوقت تم ہرگز کامیابی حاصل نہیں کرسکتے، اگر واقعی زبردست بننا چاہتے تو خود اپنے اندر قوت وصلاحیت پیدا کرو تب ہی دنیا تمہارا لوہا تسلیم کریگی، ورنہ کمزوروں کو تو دنیا پیستی ہی رہتی ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

ان اشعار کو دیکھکر کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ شاعر انقلاب نہ تھا، وہ بادشاہت، سرمایہ داری اور ظالمانہ قومیت کے خلاف ہے اور ببانگ دہل ان کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ جدید تعلیم کے رواج سے ملک میں تعلیم یافتہ افراد ضرور پیدا ہو گئے ہیں مگر ان کی بڑی تعداد مغرب کی تقلید میں مصروف ہے، مغرب کی جن مختلف باتوں کی تقلید کی جارہی ہے، ان میں سے ایک چیز الحاد بھی ہے، سوسائٹی ان لوگوں کو قدامت پرست تصور کرتی ہے، جو باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اقبال کہتا ہے

ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئیگا الحاد بھی ساتھ

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ یوں پیش کیا ہے۔

دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل

دوسرا شعر آج سے ۲۵، ۳۰ سال پہلے کا ہے، ورنہ آج تو یہ حال ہے کہ دنیا بھی نہیں ملتی، وہ موجودہ تعلیمی نظام سے بھی مطمئن نہیں اس کا خیال ہے، اور جو بالکل صحیح ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم ہم میں صحیح علمی مذاق، پختہ فکر، پیدا نہیں کرتا، اور ہماری تعلیم محض کتابی تعلیم ہوکر رہ جاتی ہے۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں

حکمران قومیں کبھی یہ نہیں چاہتیں کہ ان کے محکوم ممالک آزاد ہوں، خواہ ان سے بجائے معاشی فائدہ کے نقصان ہی کیوں نہ پہونچ رہا ہو، ریاست ہائے متحدہ امریکہ باوجود جمہوریت کی دلدادہ ہونے کے اور باوجود جمہوریت کا دم بھرنے کے فلپائن کے چند معمولی جزیروں کو بھی مکمل آزادی نہیں دینا چاہتیں، زبردستی ان کو محکوم بنائے ہوئے ہیں، یہی صورت دوسری حکمران قوتوں کی ہے اگر کبھی محکوم ابھرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو مختلف حیلوں، بہانوں اور تدبیروں سے ان کو تھپک تھپک کر سلا دیا جاتا ہے، شاعر نے اس حکمت عملی کو یوں بیان کیا ہے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

مسلمانوں کے پاس اول تو جائداد ہی نہیں، اور جو کچھ ہے وہ بھی ان کی فضول خرچیوں اور بری عادتوں کی بدولت ان کے قبضہ سے نکلتی جارہی ہے۔ اس خیال کو کس لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

قانون وقف کے لئے لڑتے ہیں شیخ جی پوچھو تو وقف کے لئے جائداد بھی ہے

پیرون کی جس قدر عزت و وقعت ہمارے ملک مین ہے، شاید ہی کسی ملک مین ہو، خود مرید کے گھر مین کھانے کو نہ ہو مگر حضرت پیرومرشد کی خدمت میں نذر، جلوے مانڈے، دستار و تہہ بند کا پیش کرنا ضروری ہے، دراصل ان میں اور ساہوکارین کوئی فرق نہین، ایک غریبوں کی آمدنی بہ شکل سود وصول کرتا ہے، اور دوسرا بہ شکل نذرانہ۔ بعض مرتبہ اپنے رکیک افعال سے ان بزرگون کو بھی بدنام کرتے ہیں، جن کے یہ نام لیوا ہیں مگر اس کے باوجود بھیڑوں کے لباس میں بھیڑیوں سے کوئی بدگمان نہیں۔ اور ان کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہا جاتا ہے، شاعر نے کس انداز اور خوبی سے ان لوگون کی قلعی کھولی ہے، نیز نظم کا عنوان "باغی مرید" قرار دیا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب ارادت و عقیدت مرید تو ان کی شان مین اس قسم کی گستاخی کرنے کی جرأت بھی نہین کر سکتا۔

ہم کو تو میسر نہین مٹی کا دیا بھی ۔ گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ ۔ مانند بتاں پجتے ہیں کعبہ کے برہمن
نذرانہ نہین سود ہے پیران حرم کا ۔ ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث مین آئی ہے انھیں مسند ارشاد ۔ زاغوں کے تصرف مین عقابوں کے نشیمن

اُردو شاعری کے جدید دبستان کے امام مولنا حالی تھے، جنھون نے گل و بلبل، سنبل و ریحان، اور ہجر و وصال کی پارینہ داستانون کو چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی، اقبال اس دبستان کے پہلے اور سب سے اہم علمبردار تھے، انھون نے اس نوشگفتہ کلی کو گل نورس مین تبدیل کیا انھوں نے اعلیٰ جذبات، قومی سیرت، انسانی عظمت، صحیح ذوق طلب، اور سیاست حاضرہ پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھکر شاعری کو زندہ جاوید بنادیا۔ اقبال نے فطرت کی ان چیزون میں بھی حقیقت کی جھلکیاں دیکھین جنکو دوسرے مبتذل اور عامیانہ سمجھکر نظر انداز کر چکے تھے، چنانچہ انھون نے گائے، گلہری، مکڑی، مکھی، جگنو جیسی بے حقیقت اور معمولی چیزوں پر اعلیٰ قسم کے نظمین لکھکر اپنی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت دیا۔ جگنو جیسے حقیر کیڑے پر جو نظم لکھی ہے۔ غالباً اُردو ادب اب تک تو اس کا جواب پیش نہ کر سکا، کہتا ہے

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن مین ۔ یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑکر کوئی ستارہ ۔ یا جان پڑگئی ہے مہتاب کے کرن مین
یا شب کی سلطنت میں دن کو سفیر آیا ۔ غربت مین آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
چھوٹے سے چاند میں تھی ظلمت بھی روشنی بھی ۔ نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن مین
کثرت مین ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی ۔ جگنو مین جو چمک ہے وہ پھول مین مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو ۔ ہر شے مین جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا، مغرب میں کافی عرصہ تک قیام کیا، مگر وہ مغرب کی پرشکوہ عظمت و شہرت سے مرعوب نہ ہو، وہ ہر مغربی شے کو اپنے شوق معیار پر جانچنے کی کوشش کرتا تھا، وہ مشرقی تہذیب کا علمبردار تھا، اس نے مغربی خیالات کی رو مین اپنے پاؤں اکھڑنے نہ دیئے اس کی شاعری میں مشرقی نشاۃ ثانیہ کی روح موجود ہے، اس نے قدامت اور جدت میں اس صحیح اور موزون تناسب کو قایم رکھا جو ہر دور مین کسی رہنمائے فکر، معلم، شاعر یا مجدد کا فرض ہے۔ ایسے افراد جو قوموں کی رہبری کرتے ہیں، ان کا ادب بناتے ہیں، ان میں جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں ہر وقت اور ہمیشہ پیدا نہین ہوتے، میرا یہ عقیدہ ہے کہ میر نے ان ہی ہستیوں کے متعلق کہا ہے ۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ۔ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اقبال ہم سے جدا ہو چکا ہے، زندگی میں کبھی اس کی عظمت کا وہ احساس پیدا نہو سکا جو اب ایک خلا کی صورت مین محسوس کیا جارہا ہے جو اس کی وفات سے پیدا ہو گیا ہے، گو اقبال آج ہم مین موجود نہیں مگر اس کا کلام جو فنائیت کی دسترس سے باہر ہے، ہمارے ادب کا گرانبہا خزانہ ہے جس سے نہ صرف ہم بلکہ آنے والی نسلین بھی مستفید ہونگی، وہ ان کے لئے شمع ہدایت کا کام کریگا محفلوں کو گرمائے گا، دلوں مین جولانیاں پیدا کریگا خفتہ قوموں مین جوش و ولولہ اور عزم و استقلال پیدا کریگا، یہی ایک باکمال بلند پایہ اور بلند مرتبت شاعر کا کمال ہے ۔

محمد احمد سبزواری ۔ بھوپال ۔

اقبال کی وطن پرستی

اقبال کی شاعری میں جس عنصر کو سب سے کم نمایاں کیا جاتا ہے ۔ وہ اس کی وطن پرستی ہے ۔ حالانکہ ہندوستان کا یہہ شاعر اعظم جس نے اپنے جادو اثر نغموں سے دنیا کا دل موہ لیا تھا، ایک حقیقی محب وطن ہے ۔ ان کا ترانہ اور اکثر و بیشتر اشعار علی الاعلان اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں ۔ اس لئے وہ لوگ جو اقبال کو فرقہ پرستی کے رنگ میں دیکھنے کے عادی ہیں حقیقت نہیں جانتے ۔ قطع نظر اس کے ان کا ایک خاص سیاسی مسلک تھا، ہم ان کی وطن پرستی پر کوئی شبہ نہیں کر سکتے برخلاف اس کے یہہ خیال ناممکن نظر آتا ہے کہ ایسا ذی حس شاعر جس کا دل محبت و عشق کے انتہائی جذبات سے معمور ہو اپنے ملک سے کوئی انس نہیں رکھتا تھا حقیقت پوچھئے تو وطنیت انسان کی فطرت مین داخل ہے، چنانچہ آدمی میں جس قدر یہ جذبہ ترقی یافتہ ہوگا وہ اس کے بلند احساسات کو ظاہر کریگا ۔ یہہ ناممکن ہے کہ بچہ ماں کی گود سے لاگو نہ رہے، گہوارہ سے انس نہ رکھے اور پھر جب بڑا ہو تو گھر کی چار دیواری سے محبت نہ کرے یہی وجہ ہے کہ اکثر نئے مقامات پر بچوں کو نیند نہیں آتی اور وہ چڑچڑے ہو جاتے ہین، جیسے جیسے ہم ہوش سنبھالتے ہیں ہمیں ہمسایہ سے لگاؤ ہو جاتا ہے، پھر محلہ کی باری آتی ہے، اس کے بعد شہر اور ملک سے انس پیدا ہوتا ہے، اور یہہ کیفیت اشرف المخلوقات تو کجا ادنیٰ حشرات الارض، چیونٹیوں، مکوڑوں، شہد کی مکھیوں، اور کئی جانداروں میں پائی جاتی ہے، پھر اقبال جو نوع انسانی کی ایک بہتر پیداوار تھے، کیونکر اس جذبہ سے معرا ہوتے، آج ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر ان کا ترانۂ ہندی ہے اور اب بھی ملک کے مدرسوں کے در و دیوار "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" کے نغموں سے گونج اٹھتے ہیں بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے سرمایۂ سخن کا سارا جوش، پوری قوت اور تمام لطیف احساس کو ان چند منظوم جملوں مین مرکب کر دیا گیا ہے اور ایک ایسا قوام پیدا ہوا ہے، جس نے قوم کے معطل دماغ کو جگا دیا، اس کی مردہ رگوں مین خون کی روانی تیز کر دی اور اس کے پژمردہ اعصاب میں ایک نئی رُوح پھونکدی اور شاید ہندوستان کی آیندہ تاریخ مین اس ترانہ کا ہر بند ایک غیبی تقدس کا حامل رہیگا ۔

نہ صرف یہہ بلکہ ملک کی ابتر کیفیت نے اقبال کے دل کو سخت متاثر کیا تھا، وہ اپنے وطن کی گرتی ہوی حالت کو دیکھ کر تڑپ جاتے تھے، اکثر ان کے اشعار اس احساس کو کچھ اس طرح رقت انگیز الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ خود غرض طبائع بھی تصویر درد بن جاتے ہیں ۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو ۔۔۔ کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ مین گلچیں ۔۔۔ تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستین مین بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے ۔۔۔ عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے ۔۔۔ تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

انھیں اپنی اس حب وطنی پر ناز ہے، اور وہ فخریہ کہتے ہیں کہ

عطا ایسا بیاں مجھکو ہوا رنگین بیانوں مین — کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں ہیں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دیدیا گویا — لکھا کلک ازل نے مجھکو تیرے نوحہ خوانوں ہیں

بعض وقت وہ اس جذبہ سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ جنت نشان وطن کی زمین کا چپہ چپہ ان کی نظروں میں آسمان سے بلند ہو جاتا ہے۔

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا — نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینہ۔
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینہ — جنت کی زندگی ہے جس کی ہوا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

وطن کے ان روز افزوں اختلافات اور فرقہ آرائیوں سے وہ متنفر ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ملک کے ان بکھرے دانوں کو محبت وعشق کی ایک نظم میں منسلک کر دیں۔ کہتے ہیں۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو — جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے — تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کر کے چھوڑونگا

اسی خیال کو کس بہتر کنایہ میں پیش کیا ہے۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دین
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامان آسمان سے اس کا کلس ملا دین
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

نفاق پرور فضا سے وہ گھبرا جاتے ہیں، اور اس پریشانی میں جو صدائے درد ان کے حساس قلب کی گہرائیوں کو چیرتی ہوئی نکلتی ہے، وہ سامع پر بجلی کا اثر کرتی ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے — ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آموز ہے
بدلے یکرنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب — ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں — اس چمن مین کوئی لطف نغمہ پیرائی نہین
لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں — اختلاط موجۂ وساحل سے گھبراتا ہوں مین

ہندوستان کا یہ جلیل القدر شاعر ایک سچا وطن پرست مفکر تھا وہ آج ہم میں نہین لیکن اس کے کلام نے جس نے کشمیر سے لیکر راس کماری تک بلا لحاظ امتیاز مذہب وملت دلوں کو گرما دیا ہے وہ اس ظلمت کدہ میں ہزاروں مایوس دلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا

گروچرن داس سکسینہ

اشک خونیں

تیرہ و تاریک نظروں میں، نہ ہو کیونکر جہاں — سایۂ اقبال سے محروم ہے ہندوستاں
گونج اٹھی، جس کے نغموں سے فضائے بوستاں — اٹھ گیا دنیا سے اب وہ بلبلِ شیریں بیاں

جس کے نغموں کا ترنم، جاں نوازِ زندگی
جس کا سوزِ دل پئے ملت تھا سازِ زندگی

ملہمِ اسرارِ غیبی، آہ جو خاموش ہے — قلبِ ملت میں الٰہی حسرتوں کا جوش ہے
واقفِ رازِ حیاتِ دہر، خود روپوش ہے — واصلِ حق، آخرش وہ عارفِ ذی ہوش ہے

قوم کو درسِ بصیرت، جو سدا دیتا رہا
کشتئ ملت جو اپنے ہاتھ سے کھیتا رہا

قوم مردہ کو دیا جس نے پیامِ زندگی — جس کی ہر تصنیف ہے نقشِ دوامِ زندگی
جس کا اک اک شعر ہے، روحِ کلامِ زندگی — منضبط جس کے تخیل سے نظامِ زندگی

جس نے ملت کو سکھائے درسِ اطوارِ خرد
منتشر آفات میں کر ڈالے انوارِ خرد

مبدءِ فیاض سے پائی وسیع المشربی — فیض سے سیراب جس کے مشرقی و مغربی
رفعتِ افکار میں شامل تھی، تعلیمِ نبیؐ — راز جویانِ حقیقت کی بجھی تشنہ لبی

آشکارا کر دئے، ہستی کے اسرارِ نہاں
راہ گم کردہ کو منزل کا دیا جس نے نشاں

روح پرور ہیں جو اس شاعر کی نغمہ سنجیاں — موت میں بھی شان اس کی زندگی کی ہے عیاں
اس کے نقشِ پا، ہمیں منزل کا دیتے ہیں نشاں — جس کے ہیں درسِ بصیرت رہنمائے کارواں

زندۂ جاوید بعدِ مرگ بھی اقبال ہے
تیرے نغموں میں نوائے زندگی اقبال ہے

نوشابہ خاتون

علامہ اقبال کے ساتھ چند لمحے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی موت مشرق کے لئے، ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، اور ایسی ہستیاں جن کے دل میں وطن کا درد ہوتا ہے، ضرور اپنی جدائی سے اہل وطن کو رنج والم میں مبتلا کر دیتی ہیں، یقیناً اقبال اپنے اہل وطن اور خصوصاً اپنی قوم کی ترقی و بیداری کا آرزومند تھا، مشرق کا یہ مایۂ ناز شاعر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا فلسفی، سیاست داں اور رہادئی قوم بھی تھا، عام شاعری اس پر اپنا رنگ نہ جما سکی بلکہ شاعری کو اس نے اپنے رنگ میں رنگا اور اس کے ذریعے سے مقتضائے وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اہل ملک کو ترقی اور بیداری کا سبق دیا، اس شاعر کی آہ اور واہ ہماری زبوں حالی کا مرثیہ اور ہماری عظمت گذشتہ کی تصویر تھی اور اس کی آرزو ہماری امید ترقی۔ اقبال کا پیام صرف مسلمانوں یا ہندوستانیوں سے مخصوص نہ تھا، بلکہ دنیا میں جہاں کہیں غلام قوم آباد ہے وہ مشعل ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ اقبال کی حیثیت بین الاقوامی تھی، میں اس وقت اس مختصر سی گفتگو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو دو سال قبل کشمیر جاتے ہوئے اس شاعر اعظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے پر ہوی۔ عجب اتفاق کہ اوائل مئی اور لاہور کی گرمی ہونے پر دن کے تقریباً بارہ بجے تھے کہ میں اپنے چند رفقا کے ساتھ سر اقبال کی قیام گاہ "جاوید منزل" پہنچا۔ گو وقت ایسا غیر موزوں تھا لیکن اطلاع ملتے ہی فوراً اپنی آرام گاہ میں آنے کی ہم کو اجازت دی۔ وراندے میں سے گذر کر ہم لوگ کمرے میں داخل ہوے۔ اس وقت مشرق کا یہ شاعر عظیم پلنگ پر تکیہ سے ٹیکہ لگائے نیم دراز لیٹا ہوا تھا، صرف تہمد اور کرتہ زیب بدن تھا۔ ہاتھ میں حقے کی نلی تھی، اور ایک صاحب سامنے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے کچھ نوٹ کرایا جا رہا تھا۔ ہماری جانب پشت تھی لیکن جونہی، ہم داخل ہوے ہماری طرف مڑ کر سلام لیتے ہوے اور مصافحہ کرتے ہوے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اقبال کی علالت کا خیال کر کے جس کی وجہ سے شرف نیاز حاصل ہونے میں بھی ہم کو شک تھا، ہم لوگوں نے مشورہ کر لیا تھا کہ بہت ہی کم بات کریں گے، غرض گفتگو کا آغاز اسی ممتاز ہستی پر چھوڑا، سر اقبال نے ٹھیر ٹھیر کر اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے گفتگو فرمائی اور بات کرتے وقت سانس کی آواز زور سے آرہی تھی۔ گفتگو کبھی اردو میں اور کبھی انگریزی میں کی زیادہ تر انگریزی ہی میں گفتگو رہی، سر اقبال نے ہماری آمد کی وجہ دریافت کی اور جب ہم نے اپنا کشمیر کا قصد بتلایا تو فرمانے لگے کہ۔ "جہاں تم جا رہے ہو وہ اصل کشمیر نہیں، میں بھی اصل کشمیر دیکھ نہ سکا، کشمیر اندرونی مقامات میں واقع ہے، جن کا راستہ دشوار گذار اور اکثر برف سے بند رہتا ہے" گویا سر اقبال نے وادئ کشمیر کو جس میں سری نگر آباد ہے، یا خاص کر سری نگر کو اصل کشمیر قرار نہ دیا، بلکہ وہ جنت نظیر مقامات جہاں کا راستہ صرف چند روز کے لئے کھلا رہتا ہے، اور جہاں جانے کی شاعر کو آرزو رہی، اس کے بعد دردمند قوم نے ہماری پستی اور زبوں حالی کا مرثیہ چھیڑا اور ہماری ترقی کی فی الحال بہت کم امید ظاہر کی جب ہم نے یورپ کے

موجودہ مسلمانوں کا ذکر کیا تو ارشاد ہوا کہ ان کو میں تم سے زیادہ جانتا ہوں، اکثر برائے نام ہیں، اور حقیقی جوش ان میں مفقود ہے، ہندوستان کے متعلق فرمایا کہ یہاں کی حالت عیاں ہے، سلطان ٹیپو کے زمانے میں مسلمانوں کی امیدیں دکن سے وابستہ تھیں، اب شمالی ہند سے وابستہ ہیں، اس سے سر اقبال کا مطلب یہ نہ تھا، کہ خدانخواستہ دکن کے مسلمان راہِ ترقی میں پیچھے ہیں، بلکہ مراد یہ تھی کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کی امیدیں دکن سے وابستہ تھیں اور جب سلطان ٹیپو کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو وہ امید باقی نہ رہی۔ اب کہ انگریزی حکومت ہے اور جمہوریت کا آغاز اور چونکہ مسلمانوں کی اکثریت شمالی ہند میں ہے، اس صورت میں اس قسم کی امیدیں بھی وہیں سے وابستہ ہیں، اس کے بعد فرمانے لگے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت خراب ہے، شمالی ہند کے امرا اور شرفا کو غدر نے تباہ و برباد کر دیا اور اکثر حیدرآباد کے امرا و شرفا کو عیش پرستی نے برباد کیا، یہ کہہ کر سر اقبال نے میری طرف دیکھا اس میں شک نہیں کہ یہ حیدرآباد پر حملہ تھا لیکن کچھ صداقت پر بھی مبنی تھا، میں نے کہا کہ اس کا اطلاق سب پر نہیں ہو سکتا اور یوں تو دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس قسم کی بدعنوانیاں نہ ہوں تو اقبال مرحوم نے مسکراتے ہوئے فرمایا "ہاں ٹھیک ہے، لیکن حیدرآباد اس کے لئے بدنام ضرور ہے" اس قسم کی گفتگو سر اقبال نے اس وجہ سے فرمائی کہ ہم سب مسلمان تھے اور اس میں شک نہیں کہ اپنی قوم کی اصلاح اور ترقی کی عظیم المرتبت شاعر کو بے چینی سے آرزو تھی، اس کے بعد ہم نے وفاق کا مسئلہ چھیڑا۔ یہ وہ پیچیدہ مسئلہ ہے، جو حل ہونے کا نام نہیں لیتا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کب اور کس شکل میں حل ہوگا۔

سر اقبال وفاق کی موجودہ صورت کے بالکل خلاف تھے، ان کی رائے میں ہندوستان کی تین حصوں میں تقسیم ہونی چاہئے تھی یعنی دیسی ریاستیں، ہندو اور مسلم ہم نے اس کے امکانات پر سوال کیا تو فرمانے لگے کہ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے، اور اب کہ انڈیا ایکٹ پاس ہو چکا ہے، اس پر بحث کرنی بیکار ہے، ان دنوں شہید گنج کا مسئلہ تازہ تھا اور مسٹر جناح کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر سمجھوتے کے لئے مقرر کیا تھا، اس کے متعلق دریافت کرنے پر فرمایا کہ تفصیل اور واقعات تو تم نے اخبار میں دیکھے ہوں گے مسٹر جناح ایک شریف انسان ہیں، ان میں لیڈر ہونے کی پوری قابلیت موجود ہے۔ اور مجھ کو ان پر کامل اعتماد ہے، یہ دو برس پہلے کی بات ہے اور اس کے بعد مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر اور بلا اختلاف مسلمانوں کے لیڈر بنے، میں نے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا، کیونکہ اب پھر سر اقبال نے تکیہ کو ٹیکا دیدیا تھا۔ میرے دوستوں نے اپنی اپنی آٹوگراف بک پیش کی، سر اقبال یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ ہیرو ورشپ اسلام کے خلاف ہے۔ مسلمان کو اس قسم کا شوق نہ رکھنا چاہئے، اپنی دستخط کی۔ سر اقبال کا یہ فرمانا میرے موافق ہوا، کیونکہ نہ تو میرے پاس اس وقت آٹوگراف بک تھی اور نہ مجھے اس کا شوق جب میری طرف کتاب کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے کہا، آپ کی ہدایت پر میں پہلے ہی سے عمل پیرا ہوں، تو مسکرانے لگے، اس کے بعد مصافحہ کر کے ہم خوش خوش اقبال سے رخصت ہوئے یہ ایک اتفاقی ملاقات کی سرسری گفتگو تھی جو مختلف موضوعوں پر بہی تفصیل سے اقبال عمر بھر کہتے رہے، ان کا کلام ہمیشہ کے لئے جب تک اردو فارسی زندہ ہے زندہ رہیگا، اس پہلی اور آخری ملاقات کا مجھ پر بہت اثر ہوا اس وقت کی پوری تصویر میری نظر کے سامنے ہے گفتگو اور طرز گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ قوم کا درد اس قومی شاعر کے قلب میں حقیقی طور پر جاگزیں ہے، اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ مرحوم کو غریق رحمت کرے [illegible] ہم کو [illegible] نصیب کرے جس کی مرحوم کو آرزو تھی۔

محمد [illegible]

اقبال کا نوجوانوں کو پیغام

اقبال نے عام طور پر نوجوانوں کو مخاطب کیا اور مختلف جگہ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ حقائقِ زندگی اور سرمایۂ حیات وغیرہ کے متعلق فرماتے ہیں
جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر　تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ　خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات　فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ
طلبائے علی گڑھ یونیورسٹی کے نام آپ نے جو پیام بھیجا ہے اس میں فرماتے ہیں کہ میرا پیام اوروں کے پیام سے نرالا ہے، اور پھر اس کے بعد رازِ حیات اور زندگی وغیرہ کے متعلق یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں ؎ آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں　کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو　گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے　شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز　غم کدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے
اور پھر تعجب کرتے ہیں ؎ بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی　رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی　ایک جگہ اپنے متعلق فرماتے ہیں ؎ عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا　بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے　ایک جگہ نوجوانوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎ ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی　لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں　نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

پھر دلاسا دیتے ہیں ؎ نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے　امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
اُن کے نزدیک نوجوان ایک پرند ہے جس کو ہر قسم کی مصیبت ہر قسم کی تکلیف اور مہم کا سابقہ کرنا چاہیئے، آپ یہ نہیں چاہتے کہ نوجوان بڑے بڑے عالیشان محلات میں آرام کی زندگی بسر کریں ؎ نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
اقبال کے نزدیک خودی کی پرورش نہ کرنے والے شخص کی کوئی اہمیت نہیں ان کا خیال ہے کہ خودی کی پرورش کرنے والا شخص ایک بلند خیال اور بلند مرتبہ آدمی بن سکتا ہے متعدد جگہ انھوں نے اس کا اشارہ کیا ہے ؎
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے　اس آبجو سے کیئے بحرِ بیکراں پیدا　وہی زمانے کی گردش سے باز آتا ہے　جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
ان کے خیال میں خودی سے استغنائی کیوجہ سے تمام لوگ میں کر کے ہوئے ہیں ؎
خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور　خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام　خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر　قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
غرض آپ نے ثابت کر دکھایا ہے کہ خودی کی حفاظت نہایت ضروری ہے، اس کے علاوہ دوسری اور چیزوں کے متعلق بھی انھوں نے جو ہدایت فرمائی ہے...... کہ انسان کو جس قدر بھی تکلیف یا ذلت سہنا ہو ہمیشہ خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے مثلاً فرماتے ہیں ؎
طریقِ اہلِ دنیا ہے گلہ شکوہ زمانے کا　نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شانِ درویشی　یہ نکتہ پیر دانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا　کہ ہے ضبطِ فغاں شیری، فغاں روباہی و میشی
وہ ہمیشہ کاہل اور بیکار آدمیوں سے نفرت کرتے تھے، بلکہ ان کے سایہ میں اپنا گزر حرام سمجھتے ان کا خیال تھا کہ لاابالی زندگی سے دنیا میں ابتری اور تباہی پیدا ہوتی ہے، اور یہی وجہ تھی کہ اقبال ہمیشہ اپنے دوستوں کو اور خصوصاً نوجوان طلباء کو ہدایت کرتے کہ کوئی بہتر کام انجام دیا جائے، ان کا خیال تھا کہ سستی اور کاہلی موت کے مساوی ہے مثلاً ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

آزادیٔ افکار ہے ان کی تباہی　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ　ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

ان کا قول تھا کہ جس چیز سے دنیا کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا وہ چیز بالکل بیکار ہے، بلکہ ایسی چیز کا دنیا سے فنا ہو جانا بہتر ہے ؎

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی بھی ہے — یہ ایک نفس دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

الغرض اقبال کا پیام نوجوانوں کے لئے اس سارے بیان سے یہی نکلتا ہے کہ (۱) مسلم نوجوانوں کو اسلام سے محبت والفت پیدا کرنا اور اقبال نے مسلمانوں میں جو غلطیاں پائیں انھیں رفع کرنے کی کوشش کی یہ اقبال کا پہلا مقصد تھا اور نوجوان طلباء کے لئے یہہ پیغام تھا کہ خود کو پہچانو، خود کو جانو اور خودی کا احساس پیدا کرو، اس کے علاوہ خاص مسلمانوں کے لئے جو پیغام بھیجا تھا وہ یہ کہ سارے دنیا کے مسلمان دراصل ایک ہیں، اور انھیں چاہئے کہ آپس میں متفق ہوکر یک جہتی کی کوشش کریں، اقبال کے نزدیک عملی جدوجہد زندگی اور کاہلی وبیکاری موت ہے، اقبال کا پیغام اعلیٰ تخیلات کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے، جس کے سمجھنے کے لئے ایک اعلیٰ دماغ کی ضرورت ہے، اقبال کا پیغام بالکل سچائی پر مبنی ہے، اور ایک خاص روحانی جذبہ کا اثر رکھتا ہے، واقعہ یہہ ہے کہ ع "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"، یہی وجہ ہے کہ اقبال کی سچائی اور نیک نفسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا کلام اس قدر مقبول عام ہوا، وہ اپنی قوم والوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ غفلت وسستی کو ترک کرو خود کو سمجھو، اپنے اوپر بھروسہ کرو اسلاف کے درخشاں کارناموں پر نظر ڈالو اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرو، اقبال کے کلام میں خوشامدانہ الفاظ نہیں پائے جاتے۔ بلکہ ان کا پیغام سچائی اور سچے جوش پر مبنی ہے، مختصر یہ کہ اقبال کا پیغام عمل وکوشش کا پیغام ہے، آج یہہ عالمگیر شاعر یہہ خوشنوا طائر اس چمن سے پرواز کر گیا ہے، لیکن اس کے سچے پیغام ہمارے لئے شمعِ ہدایت ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

کلراج پرشاد

کاشفِ رازِ حقیقت

آہ وہ چرخِ ادب کا مہرِ تاباں مٹ گیا — صفحۂ ہستی سے لاثانی سخن داں مٹ گیا
چھوڑ کر بے وقت ہائے اپنا ساماں مٹ گیا — نیّرِ برجِ شرافت ماہِ رخشاں مٹ گیا
وہ صفِ اوّل کا اک بے مثل شاعر گم ہوا
نظم ونسقِ شاعری اب درہم وبرہم ہوا
مشرقی شاعر کا ماتم حشر تک تڑپائے گا — عمر بھر منصورؔ اس غم کا ترانہ گائے گا
ایسا ہمدم چرخِ کج رفتار کیونکر پائے گا — سرپرستِ قوم ایسا پھر کہاں سے لائے گا
مصلحِ اقوامِ ملت ہم سے رخصت ہو گیا
کاشفِ رازِ حقیقت ہم سے رخصت ہو گیا

محمد احمد اللہ خاں منصورؔ
(آصف آباد)

زندۂ جاوید اقبال کی خدمت میں

شعراء کا خراج تحسین

ذیل میں ہم ان نظموں سے منتخب شعر درج کرتے ہیں جو ہمیں "اقبال نمبر" کے لئے وصول ہوی ہیں (سب رس)

وہ روز نہیں، ماہ نہیں، سال نہیں ہے — اندھیر ہے دنیا میں کہ اقبال نہیں ہے
جاتی رہی اب رونق دنیائے تکلم — وہ رنگ نہیں، قیل نہیں، قال نہیں ہے
رونا ہے وزیر اس کا کہ تھا شاعر بے مثل
صد حیف کہ اب ثانیٔ اقبال نہیں ہے

محمد وزیر وزیر

لاہور کی زمیں ہے آرام گاہ اس کی — تھا جس کے دم سے باقی قومی نشاں ہمارا
اب بھی اگر نہ جاگیں، مشرق کی مردہ قومیں — لٹ جائے گا وطن کا سب کارواں ہمارا

محمد سکندر علی سکندر

ضرب کلیم، سرِ خودی، رمزِ بے خودی — تیری نشانیوں سے ہے دنیا بھری ہوی
پیغام مشرق، بانگِ درا، علمِ اقتصاد — تا حشر ہم کو تیری دلاتے رہیں گے یاد
جاوید نامہ، فلسفۂ مسلم و عجم — اور بالِ جبرئیل کو دیکھیں گے جب کہ ہم
لیں گے دعائے خیر سے اقبال تیرا نام
تیری نشانیوں کا کریں گے ہم احترام

میر کاظم علی برق موسوی

جس کے دم سے اک اجالا مشرق و مغرب میں تھا — ہائے وہ شمعِ شبستانِ جہاں جاتا رہا
حریت کی روح جس نے پھونک دی تھی ہند میں — قوم کا ہادی، امیرِ کارواں جاتا رہا

مرزا شاکر علی دانش

یکایک سرزمینِ ہند کا چہرہ دمک اٹھا — ستارہ دفعتاً اقبال کا اپنے چمک اٹھا
اٹھا پنجاب سے اقبال، قومی رہنما بن کر — لیا ہم بے کسوں کو اپنے سائے میں ہما بن کر
دیا افراد کو احیائے ملت کا پیام اس نے — کیا یوں اپنی ملت کی بقا کا اہتمام اس نے
وہ جس کی اک نوا سے عہد ماضی ہو گیا تازہ — جو باندھا رفتہ اشعار سے ملت کا شیرازہ
ہزار افسوس ایسا رہنما رخصت ہوا ہم سے — ہمارے قلب بیٹھے جا رہے ہیں آہ اس غم سے

اس کا ہر نغمہ تلاطم خیز بر و بحر میں — ہر طرف اس کی صدائیں گونجتی ہیں دہر میں
مرتے دم بھی اس کے دل پر کچھ نہ تھا خوف و خطر — ہاں مگر تھی قوم ہی کی بہتری پیشِ نظر

مسکراہٹ تھی لبوں پر کیسا استقلال تھا
کیوں نہ ہو وہ صاحبِ ایمان و دیں اقبال تھا

ابو المحامد محمد احمد اللہ احمد

اٹھ خدا کے واسطے اٹھ ہوش میں پھر ہم کو لا — نغمۂ توحید سے پھر وجد میں عالم کو لا
جس طرح اٹھا تھا پھر چشمِ محبت بن کے اٹھ — ہے جہاں میں فتنہ برپا اٹھ قیامت بن کے اٹھ

خشک ہو جو مہر کے پرتو سے وہ دریا نہیں
لاکھ آئے موت پر شاعر کبھی مرتا نہیں

غلام دستگیر خاں یکتا قائم خانی

الوداع اے مادرِ گیتی کے فرخندہ پسر — الفراق اے شاعرِ اسلام، اے صاحب نظر
تو نہیں اقبال، تیری زندگی جاوید ہے — اہلِ بینش کو ترا ہر شعر تیری دید ہے

آج تو ہم میں نہیں تو کیا ترا پیغام ہے
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

خمور علوی

ہم سب کے جو دل میں تھا وہ لکھا تو نے — ہم سے جو چھپا تھا راز وہ دیکھا تو نے
ہم سب کو چکھا کے زندگانی کا مزہ — آخر کو مزا موت کا چکھا تو نے

سید فخر الحسن لکچرار ٹریننگ کالج

اشکِ خونیں موت پر اقبال کی روتا ہوں میں — آج اے دل بے نیازِ رنگ و بو ہوتا ہوں میں
موت یہ تیری نہیں، اردو زباں کی موت ہے — موت میں پنہاں تری ہندوستاں کی موت ہے
جز ترے ہندوستاں کا پاسباں کوئی نہ تھا — شکرِ اردو کا میرِ کارواں کوئی نہ تھا
یاد تیری حشر تک مشرق بھلا سکتا نہیں — تجھ سا پھر اقبال، ہندوستان پا سکتا نہیں

مرزا باقر علی زاہد

سکہ بھی اسے اعزاز ملا، اور سر میں اس کے فلسفہ تھا
وہ شاعری کی ٹکسال میں آکر سکہ اپنا ڈھال گیا
اقبال کو اب کیا روتے ہو، کیوں اشکوں سے منہ دھوتے ہو
شاعر نہیں اس کے شعر تو ہیں ماقال رہا من قال گیا

آزاد نے حکم احمد [illegible] کے لئے یہ شعر لکھے
ایسا نہ ہو کوئی یہ کہہ دے تو حکم احمد ٹال گیا

میٹھے میٹھے شکوہ ہائے خالقِ ارض و سما — قوم کی پستی سے تھیں دل میں ترے بیتابیاں
قیل و قالِ دہر سے کچھ واسطہ تجھ کو نہ تھا — ساری دنیا سے انوکھا تھا ترا طرزِ بیاں
تو تو ہے آرام سے شہرِ خموشاں میں مگر — بن گیا ہے غم میں تیرے غم کدہ سارا جہاں

میر حسن علیخاں یمینؔ

ہندوستاں نہ ہو کیوں رشکِ جہاں ہمارا — باغ و بہار ہستی یہ آشیاں ہمارا
دورِ فلک نے اس کی گو دھجیاں اڑائیں — لہرا رہا ہے لیکن اب تک نشاں ہمارا
بلبل تھا وہ اسی کا ہم نغمہ زن ہیں جس کے
ہے مرغ زارِ عالم ہندوستاں ہمارا

گورسرن بلی آزادؔ

گھٹا رنج و الم کی ہر طرف چھائی ہوئی سی ہے — چمن میں ان دنوں گویا خزاں آئی ہوئی سی ہے
کہا جس نے کہ رازِ زندگی پنہاں ہے حرکت میں — دلیلِ کامرانی "سعیٔ پیہم" ہے حقیقت میں
کریگا یوں تو شاعر سیکڑوں ہندوستاں پیدا
نہیں ممکن کہ ہو اقبال سا معجز بیاں پیدا

محمد جمال

شکوہ سنا جو ہم نے ترا لاجواب تھا — آنکھوں میں پھر گیا وہ زمانہ جو خواب تھا
شکوہ کا تیرے ہوشربا وہ جواب تھا — واللہ میری آنکھیں تھیں یا اک سحاب تھا

محمد اکرام الحق صدیقی عجبؔ

جس کا کہنا تھا کہ مسلم موت سے ڈرتا نہیں — جس کے دل میں ہو صداقت وہ کبھی مرتا نہیں
گلشنِ علم و ادب کی ہر کلی افسردہ ہے — تو بظاہر مر گیا پر نام تیرا زندہ ہے

ابو المکارم محمد مشایخ عارف چتیاپوری

انتخابِ قطعاتِ تاریخی

حزن و غمِ شاعر
۱۳۵۷ھ

محمد سکندر علی سکندرؔ

سر اقبال خلدِ بریں کو گئے
۱۳۴۷ف

علامہ سر اقبال بہشت آج گئے ہیں
۱۳۵۷ھ

ابو المحامد محمد احمد اللہ احمدؔ

عزتِ قوم ہے مردہ اگر اقبال نہیں
۱۳۵۷ھ

بشیر النسا بیگم بشیرؔ

محمد اقبال رضی اللہ تعالیٰ عنہ

معین الدین رہبر فاروقی

راہیٔ خلد ہوئے میر محمد اقبال
۱۳۵۷ھ

کی قضا اقبال نے افسوس ہے
۱۳۴۷ف

محمد اصغر صدیقی امجدؔ

چل دئے عرشِ معلیٰ پہ ٹہلنے کے لئے
۱۳۴۷ف

جمیلؔ

گئے مر کر بہشت کو اقبال
[illegible]

شیخ حسین شاغلؔ

سجاد حسین   راس باتھم   سر محمد اقبال   سر راس مسعود   غلام السیدین   ڈاکٹر خالد شلڈریک

اقبال کا تخیّل

تخیل اور طرز بیان ادب اور خصوصاً شاعری کی جان ہیں، اُردو زبان میں ان گنت شاعر اور ناظم ہر دور میں گذرے ہیں اور ان میں جو ممتاز تھے تذکرے ان کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں اور ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں لیکن بہت کم شاعر ایسے ہوئے ہیں جو تخیل کی بلند پروازی اور طرز بیان کی دلاویزی کے مالک تھے، ایسے شاعر جن کا تخیل نرالا ہو اور جن کے طرز بیان میں ندرت ہو یعنے جو تخیل اور بیان دونوں کے اعتبار سے بہت بڑی حد تک ایک انفرادی حیثیت کے مالک ہوں، کم سے کم اُردو زبان میں بہت ہی کم ہوئے ہیں، یہ اردو زبان کی ترقی کی فال نیک تھی کہ اقبال جیسا شاعر جو صدیوں ہی میں کسی ملک اور زبان کو نصیب ہوتا ہے اُردو کے موجودہ عبوری دور میں اس کو حاصل ہو گیا تھا، اور اپنے تخیل و طرز بیان سے اس زبان کو رفعت و ترقی کے ان اعلیٰ مدارج پر پہنچا رہا تھا جو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کو حاصل ہیں اور جن کی وجہ سے ایک دنیا ان زبانوں کا مطالعہ کرتی ہے اس کے وجد آفریں نغموں کا لطف اٹھانے اور اس کے تخیل کی دنیا میں سیر کرنے کے لئے شائقین ادب اسی شوق سے اُردو کی طرف متوجہ ہونگے جس شوق سے گوئٹے کا کلام پڑھنے کے لئے جرمن ہومر کے مطالعہ کے لئے یونانی اور سعدی و حافظ، مولانائے رُوم اور عمر خیام کے لئے فارسی زبان پڑھتے ہیں۔

(۲)

اقبال شاعر تھا اور فطرت کی طرف سے شاعری کے ایسے تقاضے لے کر آیا تھا کہ باوجود شاعری سے بیزار ہونے اور ترک شعر کی کوششوں کے وہ شعر گوئی سے نہیں رکا، اس کی شاعری جوالا مکھی پہاڑ کے لاوے کی طرح ایک بے پناہ جوش و جذبہ کا نتیجہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کی ہر نظم ایک غیر معمولی زور بیان اور رفعت تخیل کا نمونہ ہے، فطری صلاحیت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم اور فلسفہ مشرق و مغرب کے مطالعہ اور اساتذہ قدیم کے افکار عالیہ پر گہری نظر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، اس کی ہر نظم میں اس کی انفرادیت کی جھلک نظر آتی ہے، وہ بعض دفعہ روندے ہوئے اور بہت ہی پامال مضامین کو کام میں لاتا ہے لیکن اپنے انداز بیان سے ان میں بھی ایک جان تازہ ڈال دیتا ہے۔ بچپن کے زمانے میں جب کہ وہ کتابوں کا بستہ بغل میں دبائے مدرسے سے گھر لوٹتا تھا، تو راستے میں ایک جگہ چند خوش فکر شعرا کا مجمع دیکھا مشاعرہ منعقد تھا اور واہ واہ کی آوازوں میں لوگ شعر سنا رہے تھے، اقبال نے بھی اس مشاعرے میں ایک غزل سنائی جو اس کی بالکل ابتدائی مشق اور طفلانہ کوشش سے زیادہ نہیں تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی سے اس میں انفرادیت کے آثار نظر آتے ہیں۔ پندرہ سولہ برس کا سن اور یہ شعر ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے　　قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

بعض صاحب نظر اور مبصر حضرات نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، یہ لڑکا شاعر ہے اور آگے چل کر بڑا شاعر ہوگا، یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور اقبال آج نہ صرف اُردو بلکہ سارے ممالک مشرق کا شاعر اعظم کہلاتا ہے

سید محمد

بچوں سے دو باتیں

"اقبال" کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ یہ آپ کے وطن کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس نے پچھلے مہینے وفات پائی۔ دنیا کو جدائی کا رنج دے گیا۔ اقبال نے آپ جیسے کم عمر بچوں کے لئے بھی بعض بڑی اچھی نظمیں لکھی تھیں۔ فرصت کے وقت ان کو ضرور پڑھیئے۔

"سب رس" بھائیوں اور بہنوں نے اپنے "سب رس" کے لئے اقبال پر بہت اچھے مضمون بھیجے۔ بعض مضمون ہم اس لئے نہیں چھاپ سکے کہ ان کے لئے "سب رس" میں جگہ نہیں تھی۔ ان مضامین کے لکھنے والوں کو جو سب رس میں جگہ نہ پا سکے رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ ان کی بجائے، ان کے دوسرے بھائیوں کے مضامین چھپ گئے ہیں۔

اب کی دفعہ ہم آپ کے لئے "پہیلیاں" نہیں چھاپ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اپنا تمام وقت اپنے شاعر کے حالات پڑھنے میں گزاریں۔ آئندہ مہینے میں ہمیشہ کی طرح ہم اسی نمبر کی پہیلیوں کے حل اور نئی پہیلیاں چھاپیں گے۔

آپ کے ہاتھ میں رسالہ پہنچتے ہی آپ کی نظروں نے ایک تبدیلی دیکھی ہوگی۔ اور آپ اس کو دیر تک دیکھتے رہے ہوں گے۔ یہ سرورق کی تبدیلی ہے۔ آپ مسٹر خلیل سے واقف ہی ہوں گے۔ جنھوں نے آپ کے رسالہ کے لئے پہلے بھی ایک سرورق بنایا تھا۔ اور جس کے متعلق آپ میں اکثر بھائیوں اور بہنوں نے ہمارے سوال کا جواب دیا تھا۔

"اقبال" کے متعلق جو مضمون لکھے گئے ہیں ان پر خواجہ حمید الدین صاحب شاہد نے جو بڑی محنت سے آپ کے رسالہ کا انتظام کرتے ہیں، سراج الدین احمد صاحب اور سب رس کے مشہور مدد دینے والے معین الدین احمد انصاری صاحب نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ہم آنے والے مہینے میں اعلان کریں گے یہ انعام کس نے حاصل کئے۔

میکش

معمۂ اقبال

ہر لفظ کے سرحرف کو جوڑنے سے ایک نام نکلتا ہے اور یہ تمام نام اقبال ہی سے متعلق ہیں۔

مثلاً :۔ باسط۔ قاضی۔ احمد۔ لیاقت۔ اکبر = (اقبال)

(۱) اسد۔ بغداد۔ ناصر۔ گاجر۔ رحیم۔ اقبال۔ داؤد۔

(۲) لیمن۔ سراج۔ انصاری۔ لیئق۔ وحید۔ کریم۔ ٹٹو۔

(۳) سراج۔ امجد۔ معین۔ لاج۔ منی۔

(۴) رفعت۔ ضعیف۔ باجا۔ لاگ۔ یاد۔ امجد۔

یادِ اقبال

عزیز سب دی بچو! تم کو بھی بہت رنج ہوا ہو گا۔ اور کیسے نہ ہوتا۔ اقبال کی موت صرف بڑوں ہی کے لئے باعث رنج نہیں تمہارے لئے بھی ہے۔
اقبال تمہارا بھی ہے۔ اقبال کو تو شاید نہ دیکھا ہو گا لیکن سب بس کے بڑے نمبر میں ان کی تصویر دیکھ لو۔ ایک بڑے آدمی کو کیسا ہونا چاہیئے تمہیں معلوم
ہو جائے گا۔ چہرے سے کتنی ذہانت، سنجیدگی اور بڑاپن ٹپکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشکل مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی
زندگی قوم کے لیئے وقف تھی۔ قوم کا درد ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ قوم کی موجودہ خراب حالت ہی نے ان کی جان لی۔
ہندوستان بھر میں کشت و خون ہو رہا ہے کہیں ہندو مسلم فسادات ہیں تو کہیں شیعہ سنی کے جھگڑے۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے کٹ رہے ہیں۔
اقبال جیسا قومی شاعر اس حالت سے جس قدر بھی متاثر ہوتا کم تھا۔

مرنے والا مر جاتا ہے لیکن اس کی باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اب کی دفعہ جو "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" گنگناؤ گے تو
تمہاری آواز ضرور بھرا جائے گی۔ لکھنے والے کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگے گی۔ سوچو گے کہ وہی شخص جس نے کل اپنی مردہ قوم کو زندہ کرنے پر
کمر باندھی تھی آج خود مردہ ہے۔ "موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں" یہ نہ سمجھنا کہ جتنے بڑے آدمی ہوتے ہیں وہ کبھی تم جیسے ...... نہ رہے ہوں گے۔
اقبال بھی اپنے زمانے میں ایک دبلے پتلے لڑکے تھے۔ روزانہ مدرسہ جایا کرتے تھے۔ شرارت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مدرسہ دیر سے پہنچے
استاد نے پوچھا "تم اکثر دیر سے آیا کرتے ہو" اقبال نے جواب دیا "جی ہاں اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے"۔ بڑے ذہین اور ہونہار طالب علم تھے
سارے استاد ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اور یہ خود اپنے والدین سے زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے۔ ایک انگریز استاد سے ان کو اتنی محبت ہو گئی
تھی کہ اس سے ملنے کے لئے انگلینڈ گئے۔ وہاں ان کی آنکھیں کھلیں۔ مغرب اور مشرق کا مقابلہ کیا دیکھا کہ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ واپس
آئے تو ایک قومی شاعر بن گئے۔ قوم کی اس خراب حالت پر اشعار لکھنے شروع کئے۔ ان کی شاعری ایک آئینہ تھی جس میں قوم نے اپنے مکروہ چہرے کا
عکس دیکھا۔ ترقی کے لئے ہاتھ پاؤں مارے ... اور بگڑتی حالت درست ہو چلی تھی۔ اور درست ہو جاتی۔

اقبال کو بچوں سے کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ تمھیں ان کی کتابیں پڑھنے سے ہو گا۔ جاوید نامہ انھوں نے اپنے بیٹے کے نام پر ہی لکھا۔
"بانگ درا" میں بچوں کے لئے کئی نظمیں ہیں۔ "ایک پہاڑ اور گلہری" "مکڑا اور مکھی" "بچہ اور شمع" میں انھوں نے بچوں کی فطرت پر روشنی ڈالی
ہے۔ بچہ کتنا نا سمجھ اور بھولا ہوتا ہے ... دوست دشمن میں تمیز نہیں کر سکتا۔ تم تو خیر اب اس درجہ سے گذر چکے ہو۔ تم میں برے بھلے کی تمیز ہے۔
دوست دشمن کی پہچان ہے۔ تم میں نہ معلوم کتنے ایسے ہیں جو آگے چل کر بڑے بڑے آدمی بنیں گے۔ اقبال یا اور کوئی۔ اقبال جس وقت چھوٹے تھے ان کے
دل میں شاید یہ آرزو تھی کہ "زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری" اور "ہر طرف میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سچے دل سے
نکلی ہوئی دعا بارگاہ الٰہی میں قبول ہو کے رہی۔ اقبال جب تک زندہ رہا، شمع محفل بنا رہا۔ محفل کو اپنی روشنی سے منور کرتا رہا۔ پروانوں کو محبت اور
ایثار کا سبق سکھاتا رہا۔ اور آخر ... یہ شمع بجھ گئی۔ ساری محفل میں اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ اندھیری راتوں میں بجلی چمکتی ہے ..... روشنی
ہوتی ہے اور پھر وہی تاریکی۔ لیکن اس چمک سے بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ بھٹکے ہوئے راہ سے لگ جاتے ہیں۔

اقبال نے بچھڑوں کو ملانے کی کوشش کی۔ بھٹکوں کو راہ پر لگانا چاہا۔ ایک نیا شوالہ بنایا۔ ایک نیا راستہ بتایا۔ جو سب کو ایک کرنے والا ہے

اقبال تم سے کیا چاہتا ہے؟ وہ تم سے ارادہ اور عمل کی توقع رکھتا ہے۔ تمھیں تمھارے بزرگوں کے قصے سناتا ہے۔ تمھاری سوئی ہوئی حمیت کو جگانا چاہتا ہے۔ وطن کی حمیت تم پر فرض گردانتا ہے۔ وطن کی بھلائی کے لئے تمھاری عزیز جانوں کی قربانی چاہتا ہے۔ آپس میں اتفاق کی توقع رکھتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان سے دوستی رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کی قبر پر پھول نہ چڑھاؤ، فاتحہ نہ دو، آنسو نہ بہاؤ، مگر ان کی ہدایتوں پر عمل کرو۔ اسی ایک چیز سے اس کی روح کو اطمینان اور خوشی ہو سکتی ہے۔ اپنے آپ کو بچہ نہ سمجھو قوم کی ترقی کے ذمہ دار تم بھی ہو۔ اقبال کی باتوں کو مرنے والے کی نشانی سمجھ کر، ایک بڑے آدمی کی بھیک سمجھ کر... سن لو۔ سمجھ لو..... اور پھر انہیں کے مطابق کام کرو۔ اپنے کمرے میں اقبال کی تصویر آویزاں کرو۔ روزانہ اسے دیکھتے رہو۔ سمجھ لو کہ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہونا چاہئیے اور سب سے بہتر "خدمت وطن ہے"۔ اقبال مرا نہیں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ قوم کو زندہ کرنے والے مرتے نہیں۔ زیادہ افسوس نہ کرو۔ موت بڑے چھوٹے کو نہیں دیکھتی۔ اور وہ بچے جن کے نام "اقبال" ہیں وہ تو اور بھی صبر سے کام لیں۔

رشید قریشی

اقبال

ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی ان کے استاد شمس العلما، مولانا میر حسن صاحب اپنے وقت کے نہایت جید عالم تھے اقبال نے فارسی اور عربی کی تعلیم علامہ موصوف ہی سے حاصل کی مولانا ممدوح اپنے ہونہار طالب علم اقبال سے نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے تھے اور زیادہ وقت ان ہی کی تعلیم میں صرف کرتے تھے اقبال نے گھر کی تعلیم کے سوا اسکول کی تعلیم بھی حاصل کی حتی کہ انٹرنس کامیاب کیا اس کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی، اے کا امتحان دیا چونکہ اقبال کو فلسفہ اسلام سے بہت لگاؤ تھا اس لئے ان کا ارادہ ہوا کہ مسٹر آرنلڈ کے پاس جو اپنے وقت کے زبردست مستشرق اور اس زمانے میں لاہور کالج میں فلسفہ اسلام کے پروفیسر تھے تعلیم حاصل کریں صاحب موصوف کو بھی اقبال سے بیحد دلچسپی تھی وہ نہایت دلچسپی سے تعلیم دیا کرتے تھے۔ سر محمد اقبال دو سال کے بعد فلسفہ کے ام، اے ہو گئے۔ اقبال بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ سیالکوٹ کے جلسوں میں نظمیں وغیرہ کئی دفعہ اقبال نے پڑھی تھیں اور اس زمانے میں استاد داغ کی بڑی شہرت تھی اور آپ کی شاعری کا غلغلہ سارے ہندوستان میں بلند تھا اس لئے سر محمد اقبال انہیں سے اصلاح لیا کرتے تھے لیکن اقبال کی بلند پردازی و اعلیٰ خیالات نے ان کے کلام میں وہ پختگی پیدا کر دی کہ بہت جلد جناب داغ نے فرمایا کہ اب اصلاح کی گنجائش نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں اقبال جیسے شاگرد پر جس قدر ناز کروں کم ہے سر محمد اقبال نے ۱۸۹۹ء میں نالۂ یتیم کے نام سے ایک ایسی اچھی نظم لکھی کہ اس دل گداز نظم کو پڑھنے کے بعد کونسا ایسا شخص ہے جو آنسو کے چند قطرے نہ بہادے اب یہ نظم کتاب کی صورت میں شایع ہو چکی ہے۔ سر محمد اقبال نے ۳۲ سال کی عمر میں بیرسٹری پاس کر لئے علاوہ فارسی عربی سنسکرت اور یورپ کی زبانوں میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اقبال کے اس ترانے نے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

ننھے بچوں، جوانوں، بوڑھوں سب کے دل میں وطنیت کی ایک نئی روح پھونک دی۔ لیکن افسوس اب کہاں ہے وہ اقبال جو اپنے شیریں نغمے دنیا کو سناتا تھا۔ اب کہاں ہے وہ اقبال جو کسی جلسے کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر اپنی سحر آفریں آواز سے دنیا کو محبت والفت کا سبق پڑھاتا تھا۔ سچ ہے۔ "کل من علیہا فان"

محمد شفیع الدین خاں (بشیر آباد)

نامور اقبال

"سب رس" کے ننھوں سے جی چاہتا ہے کہ اچھی اچھی باتیں کروں۔ کیا کسی اچھے کھیل کی نسبت کچھ لکھوں؟ نہیں یہ بھی کچھ ایسا موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اب سمجھ میں آیا آج "سب رس" کے ننھوں کو ایک ایسے شخص کا حال سناؤں گی جس کو پڑھ کر یقین ہے ننھے بہت خوش ہوں گے۔ اچھے بچے اچھے آدمیوں کے حالات سن کر اچھے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب اچھے بن جاتے ہیں تو لوگ بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ پھر وہ دنیا میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ اچھا اب ذرا کان دھر کر سنو کہ وہ شخص کون تھا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ "وہ نامور شخص ڈاکٹر سر محمد اقبال ہیں یہ ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اقبال اپنے بچپن میں بڑے پیارے بچے تھے۔ خوب جی لگا کر سبق یاد کرتے۔ محنت کرتے۔ جس کا صلہ انہیں یہ ملا کہ وہ ہمیشہ اپنی جماعت میں اول رہتے۔ اس سے اُن کے استاد بھی سمجھنے لگے تھے کہ یہ بچہ ضرور بڑا ہو کر نام پیدا کرے گا۔ اور ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔ اسکول کی تعلیم ختم کر کے اقبال لاہور چلے گئے۔ اور وہاں کے کالج میں ام اے کامیاب کیا۔ اورنیٹل کالج میں فارسی کے پروفیسر بھی بن گئے۔ کچھ دنوں بعد گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ لیکن انہیں علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا اسی لئے ۱۹۰۵ء میں عمر کے انتیسویں سال وہ قانون اور فلسفہ پڑھنے کے لئے کیمبرج یونیورسٹی گئے۔ اور تیسرے سال فلسفہ کی ڈگری لی اور بیرسٹری کا امتحان کامیاب کیا۔ پھر جرمنی چلے گئے۔

"فلسفۂ ایران" جرمنی میں لکھی۔ اور میونیخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں لاہور واپس آئے اور وکالت شروع کردی۔ اقبال کو شعر کہنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے کالج کے زمانے ہی میں شعر کہا کرتے تھے۔ انھوں نے تم جیسے ننھوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ تم کو اقبال کی کتاب "بانگِ درا" ضرور پڑھنی چاہئے۔ اس میں بچوں کے لئے بہت سی مفید چیزیں ہیں۔

ہاں! تو جب انگلستان سے واپس آئے تھے تو اسی زمانے میں بلقان، طرابلس وغیرہ میں لڑائیاں شروع ہو گئیں تھیں۔ یورپین قومیں عربوں اور ترک مسلمانوں پر بہت ظلم کر رہی تھیں۔ اور ان کو غلام بنالیا تھا۔ اس سانحہ پر اقبال چونک پڑے۔ اور چونکہ ان کے دل میں قوم کا درد تھا۔ اسی لئے انھوں نے ایسی نظمیں کہنی شروع کیں جن کو پڑھ کر مسلمانوں کو اُن کا پچھلا وقار اور شان و شوکت یاد آگئی۔ ان نظموں کا اتنا اثر ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی فلاح کے لئے بہترین کوشش شروع کی۔ ہندوستانیوں کے آئے دن کے نفاق کو دیکھ کر انھوں نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں جن میں "نیا شوالہ" اور "ہندوستاں ہمارا" بہت مشہور ہیں اور ان کو درسی کتابوں میں داخل کر دیا گیا ہے۔ جب تم خوب کوشش کر کے بڑی جماعتوں میں آؤ گے تب تم کو معلوم ہوگا کہ اقبال نے تمھارے لئے کیا کیا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اقبال کو پنجاب کونسل کا ممبر بنایا گیا۔ اور مسلم لیگ کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ ہندوستانیوں کی جانب سے گول میز کانفرنس میں نمائندگی کی۔ ان کی سب تقریریں کتابی صورت میں محفوظ ہیں۔ اسی سال ہماری ریاست میں "یوم اقبال" بھی منایا گیا تھا۔ اور اقبال کو عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی تھی۔ ان کا ارادہ حجاز جانے کا تھا۔ لیکن ۲۱ اپریل کو وہ اس ارادہ کو ساتھ لئے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ اور لاہور کی جامع مسجد میں دفن ہوئے۔

سعیدہ مظہر (کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ)

دوستوں کا مکالمہ

انور :۔ بھئی سراج آج مجھے کچھ بے کلی سی محسوس ہو رہی ہے۔ دل بھی اداس معلوم ہوتا ہے طبیعت پریشان سی ہے۔ اور مشرق کا چہرا اترا ہوا۔ ارد گرد کے چہرہ پر موت سی مردنی نظر آتی ہے۔

سراج :۔ ہاں آج ہر طرف ایک قسم کی اداسی ہی اداسی چھائی ہوئی ہے۔ اخبارات کے کالم بھی دردناک خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اکثر کالم سیاہ حاشیہ لئے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے اس کا موقعہ نہ ملا کہ میں ان خبروں کو پڑھ سکوں۔

اسد :۔ خوب آپ لوگوں کو اس وقت تک معلوم ہی نہیں ایک صاحب نے تو اخبار دیکھا ہی نہیں دوسرے نے صرف سیاہ حاشیہ ہی پر نظر ڈالی۔ مشرق نے ایک زبردست چیز کھو دی اور اپنے اس عظیم ترین نقصان پر آنسو بہا رہا ہے لیکن آپ لوگ دنیا سے بے خبر ہیں۔ آج کا دن مشرق کی تاریخ میں نہایت منحوس ہے جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ آج مشرق کا اقبال ختم ہو گیا۔

انور :۔ کیا آج مشرق کا اقبال ختم ہو گیا؟ اب مشرق کو زوال آچکا ہے؟ کیا اب مشرق پھر دوبارہ اقبال نہیں پا سکتا؟

سراج :۔ پھر تو ہندوستان اور مشرق کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کے اقبال کی شمع حیات ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی اور دیارِ مشرق کو تاریک کر گئی افسوس وہ شمع گل ہو گئی جس کی ہر شعاع ہند کے ظلمات کو نور بخش رہی تھی۔ جو خودی نا آشنا پروانے کو شمعِ خودی کا پروانہ بنا رہی تھی۔

اب تو ہم کو مجبوراً یہی کہنا پڑیگا ؎

آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے　　شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

اسد :۔ نہ صرف آج بلکہ ہمیشہ دنیا اقبال پر خون کے آنسو بہاتی رہے گی۔ مشرق اپنے اس اقبالِ تلافی نقصان پر جس قدر کفِ افسوس ملے کم ہے۔ مشرق کا یہ وہ اقبال مند فرزند تھا جس نے نہ صرف مشرق کو بلکہ پوری دنیا میں اپنی قابلیت اور دماغی کاوشوں کے ذریعہ سے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ دنیا اس کو ایک بہت بڑا مفکر اور نوع انسان کا پیغامبر مانتی تھی۔ اس نے اپنی ادبی اور فلسفیانہ خدمات اور قلمی کاوشوں کے ذریعہ سے مشرق کی موجودہ نسل کی ذہنیت کو متاثر کیا۔

انور :۔ نہ صرف یہ بلکہ اقبال نے ہمارے اسلاف کی عظمتِ ماضی کے ترانے دنیا کو سنائے ہم کو واقعات پارینہ کے راگ شیریں لے میں سنا کر دنیا میں زندوں کی طرح جینے کا گر سکھایا۔ اس نے مغرب کی وادیوں میں اذاں کی صدا دی۔ "رموزِ بے خودی" اور "اسرارِ خودی" کے ذریعہ سے دلوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور خودی کا درس سکھلایا۔

سراج :۔ نہ صرف یہ بلکہ مردہ قوموں میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ پست ہمت اور بزدلوں کی ہمت بڑھائی۔ ان میں جوش اور ولولہ پیدا کیا اور وطن سے غافل رہنے والوں کو بہ آواز بلند کہا ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اسد :۔ تم اس شعر پر کیا زور دے رہے ہو اس کا ہر شعر اپنے اندر حقائق لیا ہوا ہوتا ہے اس کے قلم سے نکلنے والا ہر نقطہ کسی نہ کسی خاص خوبی کا حامل نظر آتا ہے اس کی قلمی کاوشیں قیامت تک صفحۂ ہستی سے مٹائی نہیں جا سکیں۔ اس کا کلام دنیا والوں کو رہتی دنیا تک پیغامِ عمل دیتا رہے گا۔ وہ جو تعلیم دے گیا ہے اس کو دنیا والے ہرگز ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔ خصوصاً میرے دل سے یہ اشعار کبھی نہیں بھلائے جا سکتے۔

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم　　جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
مری ہستی نہیں وحدت میں کثرت کا تماشا ہے　　کہ خود عاشق ہیں خود معشوق ہیں خود ذرہ ذرہ ہیں
یہی صہبا ہی جو نعمت بنا دیتی ہے پستی کو　　اسی صہبا سے آنکھیں دیکھتی ہیں راز ہستی کو
مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے　　دل اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

انور :۔ کیا کہنے اقبال کی ہر ادا میں ایک رمز پوشیدہ ہے۔ اس کی ہر آواز نغمۂ وحدت ہے۔ اس کا ہر شعر ایک زبردست درس کا حامل ہے اس نے

نہ صرف مشرق بلکہ تمام دنیا کو اسلام کی حقیقی عظمت سے واقف کرایا۔ خودی کے فلسفہ میں لکھ کر دنیا کو اسرار زندگی کے حقائق سے روشناس کرایا اور خودی سے آگاہ کر کے انسانیت اور فلسفۂ حیات کی تشریح کر دی۔

نمود تیری، نمود اس کی، نمود اس کی، نمود تیری
خدا کو تو بے نقاب کر دے خدا تجھے بے نقاب کر دے

سراج:- دوست واقعہ تو یہ ہے کہ ہم اس کے کلام کی خوبیاں بیان نہیں کر سکتے وہ بظاہر انسان تھا لیکن اس کے صفات فرشتوں کے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے کلام ہی پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اس کے کلام میں کیا کیا خصوصیات موجود ہیں سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ قومیت کا عنصر ہے۔ حقیقت، درد، بصیرت، تاثیر، جوش عمل، ماضی کی سچی تصویر، احساسات، رجائیت، رنگینی، راز انسانیت، وطن پرستی، سلاست، پیام زندگی، روحانیت، فرض شناسی، شکوہ، فلسفۂ حیات، بے باکی، بلند پروازی، اسلامیت، اقبال کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اسد:- حقیقت میں اقبال نے دنیا والوں کے دلوں پر وہ گہرے نقش چھوڑے ہیں کہ مٹ نہیں سکتے بلکہ ہمیشہ ابھرتے ہی رہیں گے اس کا کلام بنی نوع انسان کے حق میں ہمیشہ شمع ہدایت کا کام کرتا رہے گا اور یہی وہ چیز ہے جس سے انسان کو بقائے جاوداں حاصل ہوتی ہے۔

انور:- ٹھیک ہے ایسے ترجمان حقیقت، علمبردار آزادی، مفکر اعظم مجاہد اسلام کو دنیا کیسے بھلا سکتی ہے۔ جس کی عالمگیر شہرت کی یہ حالت ہو کہ مسلمان اور ہندو اقبال کو ہندوستان کی آزادی کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ ہر قوم و ملت کا فرد اس کا دل سے احترام کرتا ہے۔

سراج:- میرا جی تو یہی کہتا ہے کہ جس نے ہندوستانی نوجوانوں کی ذہنیت میں انقلاب عظیم برپا کر دیا ہو۔ جس کا دائرۂ وطنیت جغرافی حدود سے باہر ہو۔ جس کو دنیا ایک بڑا فلسفی مانتی ہو۔ جس کی سیاست کا دنیا پر سکہ جما ہوا ہو۔ وہ کیسے بھلایا جا سکتا۔

مرزا عثمان بیگ
متعلم ہفتم فارم سٹی کالج

بچے کی دعا

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے!
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے!

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب!
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

(اقبال)

محسنِ قوم اقبال

بچہ:— میری امی جاں مجھ سے کہیے ذرا — یہ تھا کون اقبال جو مر گیا

یہی ذکر ہر صبح ہر شام ہے — جدھر دیکھو اقبال کا نام ہے

بہت یوں تو مرتے ہیں دنیا میں لوگ — نہیں ہوتا لیکن کسی کا یہ سوگ

خبر پڑھ کے اخبار میں موت کی — لگی رونے اُس روز تھیں آپ بھی

ہر اک اس کے مرنے سے بے تاب ہے — میں حیراں ہوں امی یہ کیا بات ہے

ماں:— مِری جان تھا وہ بڑا آدمی — تڑپ قوم کی اس کے سینے میں تھی

نہ روؤں میں کس طرح اس پر بھلا — وہ محسن تھا پیارے مِری قوم کا

بہت اس نے ہم پر کئے ہیں کرم — جنہیں یاد کر کر کے روتے ہیں ہم

یہ تعلیم دی ہم کو اسلام نے — ادا کرو احسان، احسان سے

تِری قوم کا میرے نورِ نظر — ہے خم مرنے والے کے احساں سے سر

ادا اُس کے احسان ہوں گے کہاں — مگر یاد رکھے گا اِن کو جہاں

ابھی سے زمانے میں بس نام ہے — بڑی چیز انسان کا کام ہے

بڑا کام اُس نے کیا قوم کا — جو چاہو کہ احساں ہو اس کا ادا

جگہ اس کی لے لو مرے لال تم — بڑے ہو کے بن جاؤ اقبال تم

لطیف النساء بیگم

حضرت اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی؟

پیارے بچو! تم نے حضرت اقبال کا نام سنا ہوگا۔ ان کی کوئی نہ کوئی نظم کہیں نہ کہیں پڑھی یا سنی ہوگی۔ آپ ہندوستان کے سب سے بڑے قومی شاعر تھے۔ آپ نے سوتوں کو جگایا اور ان میں زندگی کی روح پھونکی آپ کی شہرت مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ بے رحم موت نے آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ اگرچہ آپ ہم سے جدا ہو چکے مگر آپ کا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور زندگی کے جنگل میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو راستہ دکھاتا رہے گا۔ آج ہم تمھیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی ہے؟

اس میں شک نہیں کہ حضرت اقبال کے کلام کا زیادہ حصہ جوانوں اور بڈھوں کے لئے ہے۔ مگر آپ نے بچوں کی بھی کافی خدمت کی ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ آپ اپنی قوم کی اٹھتی ہوئی پود کو بھول جاتے۔ یوں تو ہندوستان کے دوسرے بڑے شاعروں نظیر اکبر آبادی، حالی پانی پتی، آزاد دہلوی اور رفعت حیدر آبادی نے بھی بچوں کے لیئے نظمیں لکھی ہیں۔ مگر حضرت اقبال کی بچوں کے لئے لکھی ہوئی نظمیں خاص ہیں۔ اس کے سوا حضرت اقبال نے بچوں کے لیئے نظمیں لکھکر ہندوستان کے شاعروں کو دکھایا ہے کہ بچوں کے لئے کس قسم کی نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ بچوں کے لئے کچھ لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ وہی لوگ بچوں کے لئے کچھ لکھ سکتے ہیں جو بچوں کی فطرت کو جانتے ہوں اور جن کی مشق پکی ہو۔

حضرت اقبال نے بچوں کے لئے یہ نظمیں لکھی ہیں۔ (۱) بچے کی دعا (۲) ہمدردی (۳) ماں کا خواب (۴) پرندے کی فریاد (۵) ایک مکڑا اور مکھی (۶) ایک گائے اور بکری (۷) ایک پہاڑ اور گلہری (۸) ہندوستان ہمارا (۹) میرا وطن وہی ہے۔ ان نظموں میں صرف پہلی نظم دعا کے طور پر لکھی ہے کچھ نظمیں عام رنگ میں اور اکثر نظمیں قصے کے پیرایے میں کہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بچوں کو قصوں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے اور مثال کے بعد نتیجہ نکال لینے میں آسانی معلوم ہوتی ہے جو شاعر قدرت کا یہ راز نہیں جانتے وہ نتیجہ پہلے بیان کرتے ہیں اس کے بعد مثال پیش کرتے ہیں۔

پیارے بچو! ہم تمھیں سب سے پہلے بچے کی دعا سناتے ہیں۔ اس نظم میں ایک بچہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ وہ علم کی شمع کا پروانہ بن جائے۔ اس دھن میں وہ شمع کی مانند پگھلے دنیا کی جہالت کا اندھیرا اس کے ذریعہ دور ہو کر ہر طرف علم کی روشنی پھیل جائے۔ وہ اپنے وطن کے لئے رونق ہو۔ اس کی زندگی کا مقصد غریبوں، کمزوروں اور دکھیوں کی مدد کرنا ہو۔ خدا اسے برائی سے بچائے اور نیک راہ پر چلائے۔ بے شک یہ نظم رات دن وظیفے کے طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ اس لئے آج ہی تم اسے زبانی یاد کر لو۔ اصل نظم یہ ہے:-

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے — ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت — جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب — علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا — درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو — نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

پیارے بچو! نظم [illegible] ہیں۔ اس لئے

حضرت اقبال نے چند قصے نظم بھی کیے ہیں۔ یہ نظم کیے ہوئے قصے بہت دل چسپ اور نصیحت سے بھرے ہوئے ہیں۔ زبان میٹھی اور بہت آسان ہے۔ بیان کا طرز سیدھا سادہ۔ قصے کے جوڑوں کو ملا کر موتی کی لڑی بنا دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آنکھوں دیکھی بات لکھی ہے۔ بیان کی طاقت سے لفظی تصویریں بنا دی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظمیں بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک دو قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلے مکڑے اور مکھی کی کہانی سن لو۔ کہتے ہیں کہ ایک مکڑا کسی دن سے بھوکا تھا۔ ایک دن جب کہ وہ اپنے جالے میں بیٹھا ہوا تھا اُدھر سے ایک مکھی کا گزر ہوا۔ مکڑے نے مکھی کو اپنے چھوٹے سے گھر میں آنے کی دعوت دی۔ مکھی نے جواب دیا "جو کوئی تمھارے گھر میں قدم رکھتا ہے پھر وہ باہر نکلنے نہیں پاتا۔ میں نادان نہیں، جو تمھارے دھوکے میں آؤں۔" مکڑے نے جواب دیا "میرا گھر اگرچہ باہر سے چھوٹا سا نظر آتا ہے۔ مگر اس کا اندرونی حصہ بہت سجا سجایا ہے۔ دیواروں پر آئینے لگے ہوئے ہیں دروازوں پر پردے پڑے ہیں۔ مہمانوں کے آرام کے لیے بستر بچھائے ہیں اور آرام کے دوسرے سامان بھی مہیا کیے ہیں۔ ایسی آرام کی چیزیں تمھیں دوسری جگہ نہ ملیں گی۔" مکھی نے کہا "آپ سچ کہتے ہیں۔ مگر میں آپ کے گھر نہ آئی ہوں نہ آؤں گی۔ کیوں کہ جو کوئی آپ کے نرم بستر پر سو رہتا ہے وہ پھر کبھی نہیں جاگتا۔" جب مکڑے نے دیکھا کہ لالچ دینے سے کام نہیں بنتا ہے تو اس نے خوشامد کرنی شروع کی۔ کیوں کہ دنیا میں خوشامد ہی سے کام بنتے ہیں۔ اس لیے اس نے کہا "جو کوئی آپ کی صورت ایک بار دیکھ لیتا ہے۔ اس کو آپ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کی آنکھیں ہیرے کی کنیوں کی طرح جگمگاتی ہیں۔ سر پر کلغی ہے پھر آپ کا حسن، لباس، خوبی اور صفائی تو بہت ہی اچھی ہے۔ اور سب سے زیادہ آپ کا اڑتے ہوئے گانا سب کو بھاتا ہے۔" مکڑے کی ان میٹھی چپڑی باتوں نے مکھی کا دل موہ لیا۔ وہ پسیجی اور بولی "انکار کرنا اور کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں۔" یہ کہہ کر اُڑ کے قریب گئی۔ مکڑے نے کود کر اُسے پکڑ لیا۔ اور بے فکری سے گھر بیٹھے ہوئے اسے چٹ کر گیا۔

اس قصے کا حاصل (Moral) یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ غرض والوں کی خوشامد پر نہ پسیجے۔

اب گائے اور بکری کا قصہ سنو۔ ایک ہری بھری چراگاہ تھی۔ جس میں ہر طرف صاف پانی کی ندیاں بہتی تھیں۔ انار اور پیپل کے کئی ایک سایہ دار درخت تھے۔ چڑیوں کا چہچہانا، ٹھنڈی ہوا کا چلنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں ایک بکری آنکلی اس کی نظر ایک گائے پر پڑی۔ بکری نے گائے کو سلام کرکے کہا "بڑی بی! مزاج کیسے ہیں" گائے بولی "مصیبت میں جان ہے۔ بری بھلی زندگی گزار رہی ہوں۔ میری قسمت ہی بری ہے۔ انسان سے کام پڑا ہے۔ اس نے نت نئی چالوں سے مجھے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اگرچہ میں اسے دودھ پلاتی ہوں۔ اس کے بچوں کو پالتی ہوں۔ مگر جب کبھی دودھ کم دیتی ہوں۔ تو وہ میری شکایت کرتا ہے۔ اور جب دبلی ہو جاتی ہوں تو بیچ کھاتا ہے۔ اس طرح نیکی کے بدلے بدی سے پیش آتا ہے۔" بکری نے گائے کی رام کہانی کو سن کر کہا "مجھے معاف کیجیے۔ میں کھری کھری سناتی ہوں۔ کہیں آپ بے مزہ نہ ہو جائیں۔ خدا لگتی بات کڑوی لگتی ہے۔ آپ کو یہ چراگاہ، لہلہاتی گھاس، سایہ دار درخت، خوشیاں، بےفکریاں اور آرام سب کچھ انسان کا دیا ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں جنگلوں میں دشمن کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے۔ اس لیے ہمیں گلہ نہ کرنا چاہیے۔ اور آرام کی قدر کرنی چاہیے۔" یہ جواب سن کر گائے شرما کر بولی "بی بکری! اگرچہ تم چھوٹی ہو۔ مگر تمھاری باتیں دل کو لگتی ہیں۔" اس کہانی کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ احسان کی قدر کرے۔

پیارے بچو! تم نے ابھی ابھی جو دو قصے پڑھے ان میں اشعار کو بول چال میں ادا کیا گیا تھا۔ اب ایک نظم کی ہوئی کہانی حضرت اقبال کی زبانی پڑھ لو۔ کہانی کا عنوان ہے "ہمدردی"

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اُڑنے چگنے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا سن کر بلبل کی آہ وزاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے مجھے دیا بنایا ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

پیارے بچو! تم نے حضرت اقبال کی ان نظموں کا حال پڑھ لیا جو انہوں نے تمہارے لئے لکھی ہیں۔ ان میں شہد کی مٹھاس، پھول کا بانکپن، دھنک کی رنگینی، چاند کی خوب صورتی، اور دریا کی روانی موجود ہے۔ ان کے پڑھنے سے طبیعت میں تازگی، اور دل کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ دماغ سے سوچنے اور ہاتھ پاؤں کو کام میں لگا رکھنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نظمیں وقت کو بے کار نہ کھونے، وطن دوست اپنے پرائے سے محبت اور ہمدردی کرنے، برائی سے بچنے، نیک راستے پر چلنے، خوشامد سے بچنے، احسان ماننے اور شریفانہ عادتیں ڈالنے کی دعوت دیتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ تم ان نظموں کا شوق سے مطالعہ کرتے رہوگے۔

محمد عبد السلام ذکی بی اے، ٹی، ڈی (عثمانیہ)

سر محمد اقبال

سر محمد اقبال مشرق کے بہت بڑے شاعر اور اردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے۔ ان کی اچانک موت سے ہندوستان کو بہت بڑا نقصان پہنچا۔

سر محمد اقبال ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کو بچپن ہی سے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ مشن کالج سیالکوٹ سے انہوں نے انٹرمیڈیٹ بی، اے اور ایم، اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔

۱۹۰۵ء میں وہ لندن تشریف لے گئے اور وہاں ال، ال، بی کی ڈگری حاصل کی۔ اقبال کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ آپ نے "نالۂ یتیم" "فلسفۂ ایران" اور دوسری پُرجوش نظمیں لکھیں۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے اپنی غزلوں اور نظموں کے مجموعہ کو "بانگ درا" کے نام سے شایع کیا۔ ۱۹۳۵ء میں "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کے نام سے دو مجموعے شایع کئے۔

سر اقبال نے اپنی وفات سے قبل یہ رباعی کہی تھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

سر اقبال مرتے دم تک بھی تصنیف کے کام میں مصروف تھے۔ اسی سے ان کا علمی شوق ظاہر ہوتا ہے اور چند لمحے پہلے آپ نے فرمایا تھا۔ "میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا اور خوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں" سر اقبال کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ دنیا میں بعض ایسی ہستیاں ہیں جو روئے زمین سے بالکل نیست و نابود ہو چکی ہیں لیکن ان کا نام اب تک زندہ ہے۔ بڑے لوگوں کی سوانح سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم بھی اپنی زندگی کو باعظمت بنا سکتے ہیں اور رخصت ہوتے ہوئے زمانے کی ریت پر اپنا نقش قدم بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ سب لوگ محنت پسندی ہی کی وجہ سے نامور ہوئے۔ آرام پسندی سے بہت سی قومیں تباہ و تاراج ہو چکی ہیں جن کے نام اس دنیا سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔

الواحم

حیاتِ اقبال

سب رہی بھائیو! تم نے یہ خبر سنی ہوگی کہ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر اور فلسفی ڈاکٹر سر محمد اقبال کا بمقام لاہور انتقال ہوگیا۔
سر محمد اقبال ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی وفات ہندوستان کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔
انھوں نے بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں یہ نظمیں بہت دلچسپ ہیں۔ ہم ان کی زندگی کے کچھ حالات سپرد قلم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال سنہ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ (سیالکوٹ پنجاب کا ایک ضلع ہے) ان کا خاندان ہندو تھا۔
لیکن بعد میں مسلمان ہوگیا۔ ان کا نام اقبال رکھا گیا۔ یہ نام ان کو ایسا راس آیا کہ ہندوستان کے اقبال ہو کر رہے۔ جس کی موت کے سبب
آج ہندوستان سوگوار ہے۔ اردو اور فارسی ادب خون کے آنسو بہا رہا ہے۔

جب ان کی عمر پڑھائی کے قابل ہوئی تو مقامی مشین اسکول میں شریک کر دیے گئے وہ ہمیشہ اپنی جماعت میں اول آتے۔ اور اساتذہ بھی
ان کی دل جوئی کرتے رہتے تھے۔ جب انھوں نے وسطانی درجے کی تعلیم ختم کی تو ہائی اسکول میں شریک کر دیا گیا۔ اقبال اپنے مدرسہ میں
مشہور تھے۔ اور اپنی خدا داد قابلیت کی وجہ سے وظیفہ پاتے رہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال بچپن ہی سے حاضر جواب اور بیدار مغز تھے۔ کہتے ہیں کہ جب ایک روز مدرسہ دیر سے پہنچے تو استاد نے کہا اقبال تم
ہمیشہ دیر سے آتے ہو، انھوں نے فوراً جواب دیا کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔ اقبال نہ صرف پڑھائی میں امتیاز رکھتے تھے۔ بلکہ تقریر میں
بھی سب پر سبقت لے جاتے تھے۔ لیکن کبھی فخر نہیں کیا۔ فوقانی تعلیم کے ختم کرنے کے بعد سیالکوٹ کالج میں شریک ہو گئے۔ اقبال اپنی ہر دلعزیزی
کے باعث بہت مشہور تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی جو دوست احباب فرمائش کرتے اس کی تعمیل کرتے۔ ایف، اے، کامیاب کرنے کے بعد
لاہور آئے۔ ان کو فلسفہ اور شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ اتفاق سے آرنلڈ جیسا شفیق استاد ملا۔ کالج کے زمانے میں فلسفیانہ اور نئی طرز کی شاعری کی
وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ ان دنوں پنجاب میں مشاعرے بھی ہوتے تھے اور اقبال اُن مشاعروں میں برابر شرکت کرتے۔ ان کی شاعری میں انگریزی
خیالات ہوتے تھے۔ دوستوں نے مجبور کر کے ایک مشاعرے میں لا کھڑا کر دیا۔ اور جب سنانے کے لئے تیار ہو گئے تو ترنم میں پڑھنے پر اصرار
کیا۔ اقبال ترنم سے بھی واقف تھے اور آواز بھی اچھی تھی۔ انھوں نے اپنی نظم ہمالہ سنائی۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اس نظم میں انگریزی خیالات تھے۔ اور یہ ایک بالکل نئے طرز میں لکھی گئی تھی۔ اس لئے بہت مقبول ہوئی اس جلسہ میں مدیر مخزن بھی
موجود تھے جب انھوں نے ان سے نظم طلب کی تو یہ کہہ کر ٹال دینا چاہا کہ ابھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ کب ٹلنے والے تھے۔ نہ صرف
اسی نظم کو لیا۔ بلکہ مخزن کے لئے اور نظمیں لکھنے کا وعدہ بھی لیا۔ اور کئی نظمیں رسالہ مخزن میں شایع ہوتی رہیں۔ اقبال انجمن حمایت اسلام کے
سالانہ جلسوں میں بھی اپنی نظمیں پڑھتے تھے۔ اقبال اب وہ اقبال نہ تھے جو کہ پہلے تھے۔ پہلے اپنے دوستوں میں مشہور تھے۔ لیکن بعد میں سارے
ہندوستان میں مشہور ہوئے اور ترجمان حقیقت کے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔ سفر یورپ کے بعد اُن ممالک میں جہاں جہاں کسی نہ کسی طرح
ان کا کلام پہنچا۔ ان کی شہرت کے ڈنکے بجنے لگے۔ اقبال نے اردو شاعری کا چولا اتار پھینکا۔ اور ایک نیا لباس پہنا دیا۔ دوسروں نے ان کی
تقلید کی۔ اقبال کو حالی، شبلی اور اکبر الہ آبادی [illegible] داغ کے ہاں

خط کے ذریعہ سے بھیج کر اصلاح کرلی۔ کچھ زیادہ یہ سلسلہ جاری نہ رہا لیکن داغ مرحوم اس پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔
اقبال کی خوش قسمتی سے ایسے استاد ملے کہ اپنے فن کے ماہر تھے اور اقبال کو بھی ماہر بنا کر چھوڑا۔ فارسی کے استاد شمس العلماء سید حسن صاحب تھے
ان کی وجہ سے اقبال نے فارسی میں کافی قابلیت حاصل کرلی۔ پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ اور اقبال میں محبت اس درجہ بڑھی کہ خود اقبال کو انگلستان
جانے پر مجبور کیا۔ اقبال نے انگلستان کی جامعہ کیمبرج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی، اسلامی فلسفہ پر مقالہ لکھ کر جرمنی سے 'پی ایچ۔ ڈی' ہو گئے۔
انگلستان میں 'اسلام' پر تقاریر بھی کیں۔ اور اپنے استاد آرنلڈ کے ایام رخصت کے زمانے میں خود ان کی جگہ کام کرتے رہے۔ ہندوستان کے
اتنے بڑے آدمی کا انتقال ہندوستان کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اقبال مرتے وقت بھی یہ کہہ کر مرے کہ "میں موت سے نہیں ڈرتا
مسلمان ہوں اور خندہ پیشانی سے موت کا خیر مقدم کرتا ہوں" شاید ہی اب ایسا بڑا شاعر پیدا ہو۔ آخر میں ہم اقبال سے اس طرح شکوہ کرتے ہیں۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
"تو ہمارا شکوہ تجھ سے اور آزادانہ ہے"

اقبال زندہ ہے!

شیخ رحیم الدین ظہیر آبادی

موت و حیات کی عمر نہایت طویل اور دراز ہے۔ ان کا نام سنتے سنتے اور ان واقعات کا مشاہدہ کرتے کرتے انسان اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ نہ اس کو موت سے کھٹکا ہوتا ہے اور نہ پیدائش سے کوئی تعجب انگیز مسرت۔ البتہ اس کلیہ سے پیدا ہونے والے یا مرنے والے کے والدین اور متعلقین مستثنیٰ ہیں۔ کیوں کہ والدین کو اگر بچے کی پیدائش سے خوشی اور موت سے رنج نہ ہو تو دنیا کا نظام قطعاً درہم برہم ہو جائے گا۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے جن کے جسم پر موت کے نام سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہوں مگر کسی خاص ہستی کی مرگ ناگہانی پر اظہار تاسف و تعزیت کرنے والے کثیر التعداد ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی موت پر ہر کس و ناکس رنج کرتا ہے اور جس طرح بھی ممکن ہو اپنے دلی رنج آمیز جذبات کے اظہار کی کوشش کرتا ہے۔ میرے نزدیک شہرت اور اقبال کی دو صورتیں ہیں ایک عارضی اور دوسری دائمی۔ عارضی شہرت کا مالک وہ شخص ہو سکتا ہے جو حقیقی معنوں میں شہرت کا مستحق نہیں ہوتا۔ لیکن شہرت کی ہوس رکھتا ہے اور ناجائز طریقہ سے اس کو حاصل کرتا ہے۔ ایسی شہرت اور ایسا اقبال چند روزہ اور غیر مستقل ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات اس قسم کی نیک نامی بدنامی میں بدل جاتی ہے۔ دائمی شہرت کی صورت یہ ہے کہ یہ نہ صرف زندگی بھر ساتھ دیتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح قائم رہتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مالک شہرت کو مرنے کے بعد عمر جاوداں بخشنے والی یہی شہرت ہوتی ہے۔ ایسی شہرت حاصل کرنے والے کو حرص و ہوس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنی قابلیت، لیاقت، محنت اور مشقت سے اس کو اپنا تابع بناتا ہے اور خود شہرت و "اقبال" کی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کا ہو رہے اور تاقیامت اس کے قدم چومنے کو اپنی عزت سمجھے۔ یہی ہے وہ شہرت اور "اقبال" جس کے واحد مالک ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے اور یہی حقیقت یہ ہے کہ "اقبال" کی تمنا اور آرزو اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ وہ اقبال کے قدموں پر اس طرح پڑا رہے کہ پھر موت کا پنجہ آہنی اقبال کو دنیا سے لے جا سکے۔ مگر اقبال کے اقبال کو ہرگز ہرگز نہ مٹا سکے چنانچہ یہی ہوا۔ اقبال کی موت کی خبر قابل یقین اور ساتھ ہی قابل افسوس بھی ہے مگر اقبال کے "اقبال" کی عمر جاودانی مسرت انگیزانہ پہلو لئے ہوئے ہے۔ "سانچ کو آنچ نہیں" اقبال کی شہرت حقیقی ہے اور اس پر دھبہ آنا ناممکنات سے ہے۔ بانگ درا قوم کو زندہ رکھے گی اور علی ہذا القیاس ان کی دوسری تصنیفات بھی۔ اقبال کو زندہ رکھنے والی چیزیں اس کے وہ افکار ہیں جو قلم سے ٹپکے اور فلسفہ بن کر رہ گئے۔ اور وہ اشعار ہیں جو زبان سے نکلے اور نصیحت کا کام دے گئے۔ اور وہ نکات ہیں جو دماغ سے نکلے اور آدمیوں کو انسان بنا کر غالب کے قول کی تردید کی "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" یہ سچ ہے کہ ایک عالم کی موت ایک عالم کی موت ہے چنانچہ صرف اقبال نہیں مرا بلکہ ایک فلسفی مر گیا ایک شاعر اعظم مر گیا، ایک مفکر مر گیا، ایک مصلح قوم مر گیا، ایک علوم مشرقیات کا ماہر مر گیا، اور ایک معز ریاست کا صاحب ذوق مر گیا اور ایک ایسا شخص گذر گیا جو ہزاروں جانوں کو زندہ کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی کیونکہ "اقبال زندہ ہے" اور اقبال کو زندہ رکھنے والی اس کی تصنیفات زندہ ہیں۔ اسی وجہ سے [illegible] ہمارا ہندوستان ہمارا) اس شعر کا کہنہ الاپ گیا لیکن جو کچھ کہا ہے وہ باقی ہے اور قوم کو باقی رکھنے کے لئے کافی ہے [illegible]

اقبال

(یہ مضمون پیام برادری کے تعزیتی جلسے منعقدہ رفعت منزل میں پڑھا گیا تھا۔)

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

جناب صدر و معزز حاضرین! آج ہم ہندوستان کے ایک بڑے شاعر کا تعزیتی جلسہ کرنے کے لئے اس وقت یہاں جمع ہیں۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی!

مگر ایسے بلند مرتبہ ہندوستانی مشرقی شاعر کی موت ملک و قوم کے لئے ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ اقبال نہ صرف شاعر تھے بلکہ وہ ایک بڑے فلسفی، انشا پرداز اور رہبر بھی تھے۔ مختصر یہ کہ "خدا بخشے بہت ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ مشن کالج سیالکوٹ میں آپ کی ابتدائی تعلیم انٹرنس تک ہوئی اور گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی میں علمی ذوق اور فلسفہ زندگی حاصل کیا۔ اسی زمانے میں اورنٹیل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ کے لکچرار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کی تعلیم دینے لگے۔ گورنمنٹ کالج سے وہ یورپ روانہ ہوئے اور وہاں تین سال تک قیام کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگری لے کر جرمنی گئے وہاں کی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لندن میں رہ کر بیرسٹری کا امتحان کامیاب کیا۔ اقبال کی شاعری کا حال جس قدر ہم پڑھتے یا سنتے ہیں یا جس کا ہم کو علم ہے یہ ہے کہ بیسویں صدی سے کچھ قبل اردو کلام کی ابتدا ہوئی۔ یوں تو طالب علمی ہی کے زمانے سے وہ شعر کہنے لگے تھے۔ اور مشاعروں میں بھی ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھی جانے لگیں لیکن ۱۹۰۱ء سے کچھ زمانے پہلے کسی جلسہ میں ان کی نظم "ہمالہ" جب انہوں نے پڑھی تو لوگ حیران رہ گئے اس میں انگریزی خیالات فارسی بندشیں اور سب سے بڑھ کر وطن پرستی کا رنگ عیاں تھا۔ اس لئے بہت پسند کی گئی اور بے حد مقبول ہوئی اس کے بعد سے رسالہ مخزن میں ان کی ایک نہ ایک نظم ضرور شایع ہوتی۔ ہر طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں۔ اب تو یہ حال تھا کہ ایک نشست میں بے شمار شعر کہتے جاتے اور ان کے دوست احباب جو موجود ہوتے لکھتے رہتے۔ طرز ترنم سے خوب واقف تھے جب لے سے اپنا کلام سناتے تو لوگ وجد کرتے اور اکثر دم بخود رہ جاتے۔ ان کی نظمیں سننے کے لئے جلسوں میں ہزاروں کا مجمع ہوتا۔ اقبال کی شاعری کو تین دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا ابتدائی زمانہ ۱۹۰۵ء تک دوسرا ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اور تیسرا ۱۹۰۸ء سے شروع ہوا جس میں زیادہ تر فارسی کلام کہا کرتے تھے۔ یوں تو اردو نظمیں بھی بہت سی کہیں اور نہایت عمدہ لیکن فارسی میں بھی کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی یہ تین کتابیں "اسرارِ خودی" "رموزِ بےخودی" اور "پیامِ مشرق" بہت مشہور ہیں۔ ہر ایک کی زبان نہایت آسان اور دلچسپ ہے۔ ان کتابوں کی وجہ سے اور زیادہ تر فارسی شاعری کی وجہ سے ہندوستان سے باہر اور تمام اسلامی دنیا میں جہاں فارسی مروج تھی ان کا کلام پہونچا اور بے حد قدر کی گئی۔ اقبال کا اردو کلام بھی کئی مرتبہ شایع ہوا اور بہت پسند کیا گیا جس میں سے ضربِ کلیم۔ بالِ جبریل۔ بانگِ درا۔ مشہور کتابیں ہیں۔ بچوں کے لئے بھی انھوں نے کئی نظمیں لکھیں جن سے ہم کو بہت کچھ سبق حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً بچے کی دعا، پہاڑ اور گلہری مکڑا اور مکھی، گائے اور بکری، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد۔ چونکہ زبان سلیس اور مضمون دلچسپ ہوتا ہے۔ اس لئے بچے شوق سے پڑھتے اور یاد کرتے ہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہوتی ہے جس سے ہمارے اخلاق و عادات کی اصلاح مقصود ہے۔ اکثر نظمیں ہمارے نصاب کی کتابوں میں آئی ہیں۔ قومی ترانے ہر جگہ ہر گھر اور ہر مدرسہ میں گائے جاتے ہیں۔ اکثر اشعار ایسے ہیں جو مذہبی رنگ میں

لکھے گئے ہیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ دونوں بڑی اور مشہور نظمیں ہیں۔ فطرت نگاری میں بھی اقبال کو کمال حاصل تھا۔ اکثروں نے ان کو "ترجمانِ حقیقت" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ کونسا طرز ایسا ہے جس کو اقبال نے اختیار کیا اور اس میں کمال حاصل نہ کیا ہو۔ ان کے چند ظریفانہ اشعار بھی ہم لوگ پڑھتے ہیں۔ بہرحال ہماری زبان عاجز اور ہم قاصر ہیں کہ اقبال کے حالات ان کی خوبیوں کے بیانات، بے مثل شاعری، قومی اصلاح و ہمدردی پر اپنے خیالات کا اظہار مفصل طور پر کر سکیں۔ اس لئے اب اقبال کی ایک نظم کے چند اشعار سنا کر میں اپنی اس مختصر تقریر کو ختم کر کے دوسروں کو عمدہ خیالات کے اظہار کا موقع دیتا ہوں۔

مہرِ روشن چھپ گیا اٹھی نقابِ روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام

یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے

کر رہا ہے آسمان جادو لبِ گفتار پر
ساحرِ شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر

منظرِ حرمان نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں

تھم ذرا بیتابیٔ دل! بیٹھ جانے دے مجھے
اور اس بستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے

اے مئے غفلت کے سرمستو کہاں رہتے ہو تم؟
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی؟
اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا

اضطرابِ دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے
علمِ انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے

دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی؟
لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا
واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا

آہ وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

آہ سر اقبال

معین الدین احمد انصاری

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کا دن ہمارے لئے نہایت ہی منحوس تھا کیوں کہ اس دن ہماری قوم کے ایک بڑے رہبر نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ سر اقبال کی اچانک موت سے قوم کو نقصان عظیم پہنچا ہے اس کا بدل نہ ہو سکے گا۔ سر اقبال جیسی بیش بہا ہستیاں دنیا میں بہت کم ہوئی ہیں۔ آہ موت کے ایک اچانک جھونکے نے اقبال کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ کاش سر اقبال کچھ دن اور جی جاتے۔ سب ریسی بھائیوں اور بہنوں کی آگاہی کے لئے چند اور مختصر حالات پیش کرتا ہوں۔ آپ ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان کشمیر سے سیالکوٹ میں آیا ہوا تھا۔ ابتدا میں سیالکوٹ ہی میں تعلیم پاتے رہے بعد کالج کی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ کچھ دن بعد آپ کے بھائی نے یورپ جانے کا انتظام کیا۔ وہاں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ قومی شاعری میں اپنے دور کے یکتا شاعر تھے۔ خیالات کی بلندی اور فلسفہ حیات اقبال کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ خصوصیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اقبال کی اردو شاعری سے کچھ زیادہ بلند ان کی فارسی شاعری ہے۔ عموماً فارسی شاعری میں فلسفہ اسلام کو پیش کیا ہے۔ گزشتہ ماہ تک بھی اقبال موجود تھے اور قوم کے بڑے رہبروں میں سے سمجھے جاتے تھے۔ "بانگ درا" "بال جبریل" "جاوید نامہ" "ضرب کلیم" "اسرار خودی" "رموز بیخودی" "پیام مشرق" ان کی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہیں۔

کھویا ہوا شاعر

سب رس کے بھائیو اور بہنوں آؤ ہم آپ کو ہندوستان کے شاعرِ اعظم علامہ اقبال کے کچھ حالات سنائیں۔ شیخ محمد اقبال نام اور اقبال تخلص تھا۔ آپ کے آباواجداد کشمیری نسل سے تھے۔ آپ ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مروجہ حاصل کرنے کے بعد ایک شفیق فاضل سید میر حسن سے فارسی کا صحیح مذاق حاصل کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ اور فلسفہ کی جس سے ان کو طبعی مناسبت تھی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ اور انتہائی ڈگریاں اعزاز کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے وہ سلیم الطبع اور ہردل عزیز واقع ہوئے تھے۔ اور عام اور خاص جلسوں میں جب انھوں نے اپنا اردو کلام سنایا تو ایک وطن پرست شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ اس اثنا میں ایک مشہور مستشرق "مسٹر آرنلڈ" نے اس جوہر کو انگے کمالات سے آگاہ کیا۔ ان کے مہربان بھائی نے یورپ میں پڑھنے کے لئے انتظام کر دیا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ اور فلسفہ کے استاد ڈاکٹر "میکٹا گارٹ" اور "سورے" جیسے ماہر فلسفہ کے شاگرد رشید ہو گئے اور وہاں ذہنی تربیت حاصل کی۔ بعد ازاں جرمنی کی ایک یونیورسٹی "میونک" میں داخل ہوئے اور وہاں علوم اسلامیہ اور فلسفہ کے عمیق مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ اور ایک رسالہ "ایران میں الٰہیات کا ارتقا" کے موضوع پر لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ممتاز ڈگری حاصل کی۔ جرمنی کے فلسفہ جدید اور مسلمان صوفیہ کے کلام سے مستفید ہوئے۔ ان کی طبیعت فارسی زبان کی طرف زیادہ مائل تھی۔ انھوں نے تہذیب مشرق و مغرب کا مقابلہ کیا اور یورپ سے واپس آنے کے بعد کئی کتابیں لکھیں۔ (۱) پیام مشرق (جرمنی شاعر گوئٹے کا جواب) (۲) اسرار خودی (اقبال کی مشہور مثنوی فارسی۔ جو مولانا روم کی دلکش طرز اور بحر میں ہے جس نے علمی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔) (۳) رموز بے خودی (فارسی کی دوسری مقبول مثنوی) (۴) زبور عجم ان کے علاوہ وہ فلسفہ اسلام پر متعدد لکچر اور مقالے لکھے جو کتاب کے طور پر بھی شایع کئے گئے ہیں۔

آپ کے کلام کی شہرت ہندوستان کی سرحد سے گزر کر تمام دنیا میں پہنچ گئی۔ اس لئے ۱۹۲۳ء میں گورنمنٹ کی طرف سے اردو اور فارسی ادب کی خدمت گذاری کے صلہ میں آپ کو (سر) کا خطاب ملا۔ آپ کے اردو تصانیف میں "بانگِ درا" بالِ جبریل" ضربِ کلیم" شکوہ جواب شکوہ قابل داد ہیں۔ آپ حقیقت کے ترجمان، ملت و قوم کی زبان، فلسفی زبان، ہندوستان کی مجلس مقننہ کے بھی ممبر رہ چکے ہیں۔ آپ کے دیگر اوصاف مثلاً علمی سیاسی خدمات اور سرکاری اعزاز کو اگر قلم بند کریں تو ایک رسالہ ہو جائے۔ کچھ دن پیشتر اقبال کے انتقال کی خبر سن کر ہمیں تو کیا بلکہ ساری دنیا کو افسوس ہوا۔ کیوں کہ وہ لایق، فاضل، شاعر، ادیب، اور فلسفیانہ طبیعت کے مالک تھے۔ فطرت نے گو اقبال کو جسمانی حیثیت سے ہم سے جدا کر دیا ہے۔ لیکن اس کی تصانیف ہیں بار بار اس کی یاد دلاتی ہیں اور ان ہی تصانیف کی وجہ سے وہ قیامت تک زندہ رہے گا۔

محمد علی فاضل ہفتم وسطانیہ شاہ گنج

اقبال نے بچّوں کے لئے کیا لکھا؟

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

بچوں کا پہلا شاعر:- اردو ادب کے سرمایہ پر جب کبھی بھی نظر ڈالی جائے تو ہر ایک شخص اسے بری طرح محسوس کرے گا کہ اردو کے شاعروں نے بچوں کی طرف بہت ہی کم توجہ کی ہے۔ جن لوگوں نے بچپن گزر جانے کے بعد شاعری کی تو انھوں نے ماضی کی طرف نگاہ ہی نہ ڈالی اور جن رنگین مزاج طبیعتوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کی تو انھوں نے نہ صرف اپنے ہم عمروں کی ترجمانی اور اصلاح کی طرف سے آنکھیں پھیریں بلکہ اپنے بڑوں کی تقلید میں خود بھی بلبل وصیاد، فراق ووصال، آہ وفغاں، عشق ووفا کی بھول بھلیوں میں پھنس کر ایسے گم ہوگئے کہ ادھر سے نکلنے کا نام تک نہ لیا یا اگر نکلنے کی کوشش بھی کی تو راہ نہ ملنے کی وجہ سے اور بھی بھٹک گئے۔

انیسویں صدی تک یہی حالت رہی لیکن جب حالی نے شعرائے اردو کو نظم لکھنے کی دعوت دی اور جب خود بھی مسدس لکھ کر ایک مثال قائم کردی تو اکثروں نے حالی کو سرے سے شاعر ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بعض حالی کی قائم کردہ راہ پر چلنے تیار ہو گئے۔ اقبال بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں۔

اقبال کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اپنے ملک اور قوم کے بچوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا جائے، ان کی رہنمائی کی جائے اور انھیں صحیح راستہ پر لگایا جائے۔ اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال پہلا شاعر تھا جس کے دل میں یہ احساسات پیدا ہوئے اور اسی بات پر ہندوستانی بچوں کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

سلیس اور پُراثر شاعری:- مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

اقبال کا دماغ بچپن ہی سے شاعرانہ واقع ہوا تھا۔ شاعرانہ دماغ کا ساتھ زبان نے دیا اور ان دونوں کے ملاپ نے دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اقبال کا کلام موزوں الفاظ کا ایک بے معنی مجموعہ نہیں بلکہ واقعات کا مرقع ہے۔ جسے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔

اقبال کے اس کلام پر نظر ڈالی جائے جس میں انھوں نے بچوں کے متعلق لکھا ہے تو یہ بات بہت ہی واضح طور پر نظر آئے گی کہ ان کا کلام تصنع، تکلفات، اور استعاروں سے پاک ہے جس کی وجہ سے بچوں کے حلقوں میں اقبال کا کلام حد درجہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ مگر اس مقبولیت میں زبان کی سلاست اور دلچسپ طرز بیان کو بھی کافی دخل ہے۔ اقبال کے ہر شعر میں متانت اور شگفتہ بیانی کافی واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ اقبال ایسی خوبیوں کے مالک تھے جو کسی گذرے ہوئے اور موجودہ شاعر میں نظر نہیں آتے۔ ان ہی اوصاف کا نتیجہ ہے کہ بچے اقبال کے کلام کو شوق سے پڑھتے ہیں اور اس پر خوشی سے عمل کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے اقبال کے ناصحانہ کلام کو بھی اس شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں گویا وہ کوئی دلچسپ کہانی پڑھ رہے ہیں۔ یہ اقبال کا انوکھا انداز بیان ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دراصل نصائح بیان کرنے کے لئے بھی ایک خاص انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے جو اتنا دلکش ہو کہ پڑھنے والے کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلے اور اتنا دلچسپ ہو کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ کوئی نصیحت پڑھ رہا ہے۔ اقبال کے کلام میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے۔

اس کے علاوہ جب کبھی وہ قصہ بیان کرتے ہیں تو اس کے آخر میں کوئی نصیحت نہیں نکالتے، بلکہ قصہ خود اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا نہایت ہی آسانی سے نصیحت حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً

دل کو لگتی ہے بات بکری کی یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی اور کچھ سوچ کر کہا اس نے دل میں پرکھا بھلا بُرا اس نے

ایک دوسری جگہ انھوں نے فلسفۂ مساوات نہایت ہی آسانی سے حل کرتے ہوئے لکھا ہے ؎ ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں ؎ نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

مساوات کے فلسفے کو بیان کرنے کے بعد وہ ہمدردی کے متعلق لکھتے ہیں ؎ ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اتحاد کے متعلق بھی آپ کے جواہر ریزے ساری دنیا کے نہ صرف بچوں کو بلکہ بڑوں کو بھی سبق دینے کے لئے کافی ہیں ؎

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎ مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

قیامِ بزمِ ہستی ہے انہیں سے ظہورِ اوج و پستی ہے انہیں سے ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

اقبال مذاق میں بڑی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں ؎

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجیے"

بچوں کا قومی شاعر:۔ مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

اس میں شک نہیں کہ اقبال جہاں بچوں کے ایک مصلح تھے وہ ان کے ایک قومی شاعر بھی تھے۔ ان کی یہی خواہش تھی کہ بچوں کے دماغ سے بھوت پریوں کے خیالات نکال کر قومی خیالات بھر دیئے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" لکھا جس میں انھوں نے ہندوستان کی عظمت کی کہانی سنائی ہے وہ وطن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندوستان کی عظمت دکھانے کے بعد وہ ہندوستان کی موجودہ حالت کی تصویر کھینچ کر ہندوستانی بچوں کو عبرت دلاتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

بچوں کا مصور جذبات و ترجمان:۔ نکلی تو لب اقبال سے ہے کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا پیغام سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی

اقبال نے بچوں پر لکھنا ہی اس غرض سے شروع کیا تھا کہ انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا جائے۔ اقبال نے بچوں کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ ہندوستانی بچوں کو مشکور ہونا چاہیئے کہ اقبال نے ان کے لئے بھی وقت نکالا۔ شیر خوار بچے کے متعلق لکھتے ہیں ؎

زندگانی ہے تری آزادِ قیدِ امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

آگے چل کر اقبال طفلِ شیر خوار کا درجہ کتنا بڑھا دیتا ہے ؎

تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں طفلِ ناداں میں بھی ہوں

ایک جگہ ایک بچہ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

اگر فلسفہ دانوں کو اس بات پر ناز ہے کہ اقبال ایک زبردست فلسفی تھا۔ اگر قانون دانوں کو اس پر ناز ہے کہ اقبال ایک قابل قانون داں تھا۔ اگر قوم پرستوں کو اس پر فخر ہے کہ اقبال ایک قوم پرست تھا اگر شاعروں کو اس پر فخر ہے کہ اقبال ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا تو بچوں کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ اقبال ان کا پہلا ترجمان، پہلا ناصح اور پہلا شاعر تھا۔

اقبال اگرچہ گذر گیا مگر اس نے ہمارے لئے اپنا وہ غیر فانی کلام چھوڑ گیا۔ جو ہمارے لئے ہوا سے زیادہ ضروری اور غذا سے زیادہ مفید ہے۔

ح انصاری (متعلم رزیڈنسی ٹل اسکول)

زندۂ جاوید

تاریخ عالم نے کئی لافانی ہستیوں کو پیش کیا ہے۔ غالب کے بعد مشرقی دنیا سے صرف اقبال ہی نے ہر لحاظ سے دنیا سے اپنا لوہا منوایا۔ جیسا کہ دنیا میں غالب، غالب رہا اور ہمیشہ غالب رہے گا اسی طرح دنیا کی اس بلند اقبال ہستی کا اقبال، رہتی دنیا تک اقبال مند رہے گا۔ جس طرح ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے غالب کا مغرب کے کثیر التعداد فلسفیوں سے موازنہ کیا ہے اسی طرح اگر آج ہم اقبال کا بھی دنیا کے بڑے بڑے مدبر، فلسفی، اور قابل ہستیوں سے موازنہ کریں تو مشرق کی یہ غیر فانی ہستی بہر تو قابلِ احترام اور مستحق پرستش ثابت ہوگی۔

اردو اور فارسی کے اس شاعرِ اعظم نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے دنیا کو آسمانی پیغام سنایا۔

اقبال ایک بہت بڑے محبِ وطن تھے جب وہ ہندوستان سے یورپ کو چلے تو انھوں نے اپنے وطن کا حسب ذیل اشعار میں یوں ذکر کیا تھا ؎ موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

بچپن ہی سے ان میں شاعری کے اثرات نمایاں تھے...... داغ کی تلمیذی کی لیکن اپنے قول کے مطابق۔ ع
"شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست" ان کی طبیعت کسی ... اقبال کا طرزِ بیان تمام اردو شعرا سے جدا نظر آتا ہے۔ ایک جگہ داغ کی شاگردی پر اس طرح فخر کرتے ہیں ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

فطری اور قومی شاعری ان کی خصوصیات ہیں ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ اسلامیت کی روح مولوی عبدالرزاق صاحب کے خیال کے مطابق اقبال کا کلام میر کے سوز و گداز غالب کی جدت و اجتہاد مومن کی نازک خیالی، ذوق کی روانی و صفائی، درد کی تاثیر و دلاویزی، کا نچوڑ ہے۔ ان کے کلام میں اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جو مختلف شعرا کی زمین اور قافیہ و ردیف میں لکھے گئے تھے۔ اور رنگ میں رنگ ملانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ ذیل میں انھوں نے میر کے رنگ میں لکھا ہے ؎

نفا ہونے پہ بھی گویا وفا شعار ہوں میں
جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں میں

نشہ میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
تو اپنا وعظ کہے جا کہ ہوشیار ہوں میں

تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لئے بوسے
کہا جو سر کو جھکا کر گناہ گار ہوں میں

داغ کے رنگ میں ملاحظہ کیجیے۔

محفل ہو شغل مے ہو شبِ ماہتاب ہو
اور میں گروں تو سنبھالا کرے کوئی

دے کر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے
اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

اس کے علاوہ اقبال نے شبلی، حالی، اکبر اور غالب کے رنگ میں بھی دخل پایا ہے۔ چنانچہ غالب کی ایک غزل کی طرح میں کہا ہے ؎

حلقہ زنجیر کا ہر جوہرِ پنہاں نکلا
آئینہ قیس کی تصویر کا زنداں نکلا

وسعت افزائی آشفتگیٔ شوق نہ پوچھ
باغِ ہستی میں متاعِ نفس ارزاں نکلا

ملٹن کے اس نظریہ کو "کہ ہر عمل کے ساتھ ردِ عمل لازمی ہے" یوں سمجھاتے ہیں۔

ہر عمل کے لئے ہے ردِ عمل
دہر میں نیش کا جواب ہے نیش

شیر سے آسمان لیتا ہے
انتقامِ غزال و اشتر و میش

شمع پروانہ را بسوخت ولے
زود بریاں شود بہ روغنِ خویش

اقبال کے حسب ذیل تصنیفات رہتی دنیا تک قائم رہیں گی۔ علم الاقتصاد۔ معاشیات کے مضمون پر ۱۸۹۶ء میں لکھی گئی تھی۔ فلسفۂ عجم اسرارِ خودی (فارسی کی مثنوی مولانا روم کی طرز میں لکھی تھی یورپ نے اس کی تراجم و نقادانہ مضامین کے ذریعہ قدر کی) رموزِ بے خودی پیامِ مشرق، (گوئٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں) بانگِ درا۔ ضربِ کلیم۔ شکوہ، جواب شکوہ۔ نالۂ یتیم۔ کلیاتِ اقبال۔ بالِ جبریل، تصویرِ درد۔ زبورِ عجم — ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کا دن تاریخ ہند میں یادگار رہے گا کہ اس دن ہندوستان کے جلیل القدر ہستی مشرق و مغرب کے مفکر شاعرِ اعظم علامہ سر محمد اقبال نے جسمانی اعتبار سے دنیا کو خیرباد کہا اور عدم آباد کی راہ لی اور آسمانِ علم و فضل کا نیرِ درخشاں غروب ہو گیا۔ لیکن علامہ موصوف کی علمی ادبی و سیاسی خدمات تاریخ کے زریں صفحوں پر ہمیشہ ہمیشہ کندہ رہیں گی اور ہمیں یقین ہے کہ اقبال زندہ ہے اور جس وقت تک دنیا قائم رہے گی اقبال زندہ رہے گا۔ اقبال جسمانی حیثیت سے نظروں سے غائب ہو گیا لیکن قیامت تک اس کے کارنامے صفحۂ ہستی سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ اس کے بیش بہا خیالات دنیا کے لئے ہمیشہ شمعِ ہدایت ثابت ہوں گے۔ بقول اقبال ؎

موت یہ میری نہیں میری اجل کی موت ہے [illegible] کیوں ڈروں [illegible] کہ مر کر بھی نہیں [illegible]

مرزا معین بیگ

سٹی کالج [illegible]

پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھکو گذرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مرجاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھکو کر دے او قید کرنے والے
میں بےزباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

(اقبال)

اقبال کے چند منظوم مکالمے اور کہانیاں

ایک مکڑا اور مکھی:- ایک مکھی کا گزر ایک مکڑے کے گھر سے ہوا تو وہ اس کو دیکھ کر اس طرح کہنے لگا۔ مکڑا! تمھارا روز اس راہ سے گزر ہوتا ہے۔ لیکن کبھی میری کٹیا کی قسمت نہیں جاگی کہ تم اس کو اپنے قدم سے عزت افزائی کرتے اگر تم غیروں سے ملنا پسند نہیں کرتے تو اپنوں سے یہ کج ادائی ٹھیک نہیں۔ سامنے سیڑھی موجود ہے اگر آنا چاہیں تو اس کے ذریعہ سے آسکتی ہو۔

مکھی نے یہ سن کر کہا۔ حضرت! کسی نادان کو یہ دھوکا دیجئے۔ میں کبھی اس جال میں آنے کی نہیں کیونکہ جس نے آپ کی سیڑھی پر چڑھا تو پھر اترا نہیں۔ مکڑا (غصہ سے) واہ تم نے تو مجھے فریبی بنا دیا۔ دنیا میں تم سا کوئی نادان نہ ہوگا۔ مجھے تمھاری خاطر منظور تھی میرا کوئی فائدہ نہیں تھا خدا جانے تم کہاں سے اڑتی ہوئی آرہی ہو۔ میرے گھر ٹھیر جائیں تو کیا برائی ہے۔ اس گھر میں کئی چیزیں تم کو دکھلانی ہیں۔ یہ چھوٹی شئے کیا ہے جو باہر سے نظر آرہی ہے اس کے دروازوں پر باریک پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ میں نے دیواروں کو آئینوں سے سجایا ہے۔ مہمانوں کے آرام کے لئے بستر حاضر ہیں ہر شخص کو یہ سامان آرائش کہاں سے میسر آتا ہے۔

مکھی! خیر! یہ سب درست ہے لیکن آپ مجھ سے یہ امید نہ رکھیں کہ میں آپ کے دولت خانے میں آؤں گی۔ مجھ کو خدا ان نرم بستروں سے محفوظ رکھے۔ اگر کوئی ان پر لیٹ جائے تو پھر اٹھ نہیں سکتا۔

مکڑے نے جب یہ دیکھا کہ اس کی یہ چال بھی کارگر نہیں ہوئی تو دل میں غور کرنے لگا کہ اس کو کس طرح سے پھانسا جائے۔ دنیا میں خوشامد سے سو کام نکلتے ہیں جس کو دیکھو خوشامد کا بندہ ہے یہ خیال کر کے کہنے لگا" آپ کی صورت جس نے دیکھی اس کو آپ کی صورت سے محبت ہو جاتی ہے۔ آنکھیں کیا ہیں ہیروں کی چمکتی کنیاں ہیں۔ آپ کے سر کو اللہ نے کلغی سے سجایا ہے آپ کا یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی، پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ اڑتے ہوئے گانا ایک قیامت ہے۔ مکڑے کی یہ چال کارگر ہوگئی۔ اس خوشامد سے مکھی کا دل نرم ہوگیا اور کہنے لگی۔ مجھ کو آپ سے کوئی خوف نہیں۔ میں انکار کرنا برا خیال کرتی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا۔

یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اڑی اور مکڑے کے قریب آئی مکڑے نے اچھل کر اس کو پکڑ لیا۔ کئی روز سے یہ بھوکا تھا اب آرام سے گھر بیٹھ کر مکھی کو مزے لے کر کھایا۔

ایک پہاڑ اور گلہری:- ایک مرتبہ ایک پہاڑ گلہری سے اپنی بڑائی کا اس طرح اظہار کرنے لگا۔ اگر تجھ کو ذرا بھی شرم ہو تو پانی میں ڈوب مر۔ اپنی عقل، سمجھ اور شعور پر تجھ کو دعویٰ ہے۔ خدا کی شان ایک ناچیز ہستی اور غرور۔ بدتمیز اور ناداں یوں مہذب اور عقلمند ہونے کا دعویٰ کریں۔ میری شان اور شوکت کے آگے تیری بساط ہی کیا ہے زمین بھی میری آن بان کے سامنے پست ہے۔ مجھ میں جو خوبیاں ہیں وہ تجھ کو کہاں سے نصیب ہو سکتی ہیں بھلا پہاڑ کہاں اور ایک غریب جانور کہاں۔

گلہری نے جواب دیا ذرا منہ سنبھال کر بات کر یہ باتیں دل سے نکال دے گو میں تیرے مانند بڑی نہیں ہوں

لیکن تو بھی تو میری طرح چھوٹا ہے ہر چیز خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ یہ اس کی حکمت ہے کہ کوئی بڑا ہے تو کوئی چھوٹا۔ تجھ کو اگر دنیا میں

بڑا بنایا تو مجھ کو درخت پر چڑھنا سکھایا۔ تجھ کو قدم اٹھانے کی ذرا سی بھی طاقت نہیں۔ تجھ میں صرف بڑائی ہی بڑائی ہے اور اس کے سوا تجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ اگر تجھ کو بڑائی کا دعویٰ ہے تو میری طرح کوئی اپنا ہنر دکھلا۔ تو یہ اس چھالیہ کو ذرا توڑ کر تو دکھلا دو۔ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کوئی برا نہیں ہے۔

ایک گائے اور بکری:۔ کسی جگہ ایک سبزہ زار اور پُر بہار چراگاہ تھی جس کا سماں احاطۂ قلم سے باہر ہے جس کے چاروں طرف ندیاں رواں تھیں انار کے ان گنت اور پیپل کے سایہ دار درخت تھے چاروں طرف سے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کہیں سے ایک بکری چرتی ہوئی ندی کنارے آئی تو ایک گائے سے ملاقات ہوی پہلے اس کو جھک کر سلام کیا پھر ادب سے اس طرح گویا ہوی۔

کیوں بڑی بی مزاج کا کیا حال ہے۔ گائے! شکر ہے اچھی ہوں بری اور بھلی جس طرح سے بھی ہو زندگی گزار رہی ہوں زندگی کیا ہے ایک مصیبت ہے۔ قسمت بری ہے اس کا کیا شکوہ کروں نصیب میں جو لکھا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ انسان سے کوئی اچھا سلوک نہ کرے خدا نہ کرے کہ کسی کو اس سے پالا پڑے اگر دودھ کم دیتی ہوں تو بڑبڑاتا ہے اگر دبلی ہو جاؤں تو بیچ کر دام سیدھے کر لیتا ہے۔ اپنے ہتھکنڈوں سے غلام بنا لیتا ہے مکر اور فریب سے رام کرتا ہے۔ میری وجہ سے اس کے بچوں کو دودھ نصیب ہوتا ہے کیسا زمانہ آگیا ہے کہ نیکی کا بدلہ بدی سے دیا جاتا ہے۔ اے اللہ تجھ سے فریاد ہے۔" بکری "ایسا گلہ ٹھیک نہیں سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ مگر میں خدا لگتی کہوں گی یہ ہری چراگاہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا یہ ہری ہری گھاس اور ساری خوشیاں ہم کو کہاں سے نصیب ہوتیں یہ ساز و سامان کہاں اور ہم غریب بے زبان کہاں یہ تمام لطف انسان کے دم سے باقی ہیں اس کی وجہ سے ہماری زندگی ہے۔ ایسی قید جس میں سراسر آرام ہو بہتر ہے اس آزادی سے جس میں سو طرح کی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ خدا اُس زندگی سے محفوظ رکھے ہم پر انسانوں کا بڑا احسان ہے ان کا شکوہ کرنا زیبا نہیں۔ اگر تم موجودہ آرام کی قدر و قیمت کا اندازہ کرو تو پھر سے کبھی گلہ نہ کروگی۔

گائے بکری کی نصیحت آمیز گفتگو سن کر شرما گئی اور انسان کو سخت سُست کہنے سے پچھتائی اور دل میں برا اور بھلا کہنے لگی کچھ غور کر کے اس نے کہا بکری یوں تو چھوٹی ہے مگر اس کی بات دل کو لگتی ہے۔

ہمدردی:۔ کسی درخت کی ٹہنی پر ایک بلبل اداس سا بیٹھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا کہ رات سر پر آرہی ہے سارا دن اڑنے چگنے میں گزرا اب کس طرح آشیانے تک رسائی ہوگی۔ کیونکہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔

جگنو جو کہیں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا بلبل کی آہ و زاری سن کر کہنے لگا اگرچہ کہ میں ذرا سا کیڑا ہوں مگر دل وجان سے مدد کو حاضر ہوں رات اندھیری ہے تو غم کس بات کا میں رستے میں روشنی کردوں گا۔

اللہ نے مجھ کو مشعل دی ہے مجھے چمکا کر چراغ بنا دیا ہے۔ وہی لوگ دنیا میں اچھے ہیں جو دوسروں کے کام آتے ہیں۔

محمد معین الدین
(مدرسہ فوقانیہ دار الشفاء)

ماں کا خواب

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مرا اضطراب

یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں

لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال
قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال

جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی

زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے
دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں

اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر

وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا

کہا میں نے پہچان کر میری جاں !
مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں ؟

جدائی میں رہتی ہوں میں بیقرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی !

جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب

رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری ؟
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے ؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے !

(اقبال)

دورِ عثمانی کا سب سے بڑا اور پہلا نمائش گاہ سے طلائی تمغے یافتہ

ہندوستان کا واحد کارخانہ ہے جہاں جرمن مشین
ہمہ اقسام کی جلد سازی کے علاوہ حسب ذیل
تیار کیا جاتا ہے ہر قسم کے نمونہ جات ہر وقت

اعلیٰ اوزارات بہترین ماہران فن کے ذریعہ
سامان بالکل انگلش طرز پر نہایت نفیس
شو روم میں موجود رہتے ہیں معائنہ مفت

تفصیل سامان

ٹیبل بلاٹنگ پیاڈ ۔ رائیٹنگ پیاڈ ۔ سفری بلاٹنگ پیاڈ ۔ فائیل بورڈ سادہ و مطبوعہ ۔ کلپ بورڈ ۔ فوٹو البم ۔ اسٹامپ البم فرامین البم ۔ دیواری کیالنڈر سادہ و باتصویر ۔ ٹیبل کیالنڈر سادہ و باتصویر ۔ ڈائریاں وکلاء و عوام مختلف قسم ۔ نوٹ بک ۔ اکسرسائز بک لیڈر بک ۔ سمپل بک پارچہ ۔ لفافہ جات ہر قسم ۔ کیالیکو کے ڈبے ۔ چمڑے کے ڈبے ۔ مقوے کے ڈبے ۔ کاپی کور ۔ یادداشت پاکٹ کور ۔ نوٹ بک نیوڈزائن ۔ فائیل کور ۔ رسائل کور ۔ ڈرائنگ کاپی کور ۔ فوٹو کے فریم دیواری و ٹیبل ۔ چرمی پاکٹ ۔ آئیل کلاتھ پاکٹ ۔ ٹکٹ پاکٹ ۔ وزیٹنگ کارڈ پاکٹ ۔ اسکول بک بیگ ۔ وکلاء کے فائیل بیگ ۔ کارڈ بورڈ پوسٹر ۔ نوٹ پیپر و لفافہ جات کے ٹیبل اسٹانڈ ۔ یادداشت ٹیبل اسٹانڈ ماہوار و ہفتہ وار ۔ اڈورٹائیزنگ ٹیبل اسٹانڈ ۔ محبوبیہ بک پالش ۔

ایک وقت ہمارا شو روم دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیے آپ ضرور مسرور ہوں گے

ہندوستان کے مشہور ادبی رسائل کے نستعلیق بلاک بصرف کثیر بنا کر رکھے گئے ہیں ان کی جلدیں ہمارے کارخانہ میں تیار کرا کے اپنے کتب خانوں کی زینت بڑھائیے ۔

آپ کی تشریف آوری کا متمنی

شیخ محبوب قریشی بانی و مہتمم کارخانہ

علامہ اقبال کی زندۂ جاوید تصانیف

بانگ درا - یہ علامہ اقبال کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے، جو پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں مجموعہ کی شکل میں شائع ہو کر اردو شاعری کی دنیا میں ایک انقلاب اور تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہ تین حصوں پر منقسم ہے، حصہ اول میں ۱۹۰۵ء تک حصہ دوم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اور سوم میں ۱۹۰۸ء سے تقریباً ۲۳-۱۹۲۲ء تک کا کل کلام درج ہے۔ علامہ سر شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچہ میں تحریر فرمایا "یہہ دعویٰ سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں ہے، جس میں خیالات کی فراوانی ہو اور اس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں" قیمت ہے

بال جبریل - اردو کلام کا دوسرا مجموعہ ہے، جو پہلے مجموعے کے ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا، اس میں زیادہ تر وہ غزلیات و منظومات درج ہیں، جو مغربی ممالک، خصوصاً ہسپانیہ (اندلس) اور ممالک اسلامیہ میں لکھی گئیں۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی گذشتہ شان و عظمت، شاعر مشرق کو جن حیات افروز بصیرت کشا جذبات سے لبریز کرسکتی تھی، اس کے پُر درد تاثرات اس مجموعے میں ملاحظہ فرمائیے قیمت ہے ۱۲/

ضربِ کلیم - اردو کلام کا یہ تیسرا مجموعہ ہے جو "اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف" سے موسوم ہے۔ اس مجموعے میں ایسا کلام ہے، جو دنیا کی موجودہ بے بسی، بے حسی، بے عملی اور تصنع پر خلوص و صداقت کے ضربات لگا کر عمل صادق، علو خیال اور وسعت نظر کا ایک پرجوش پیغام پہونچاتا اور ایک نئی دعوت فکر پیش کرتا ہے۔

رسالہ **اردو** - کی رائے میں "ان میں شاعر کے خیالات کا نچوڑ ہے جو اس کے غائر مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں اس میں جابجا حکمت کے موتی بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں" قیمت ہے

پیامِ مشرق (فارسی) علامہ نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے مشہور دیوان کے جواب میں یہہ لاجواب مجموعہ شائع فرمایا تھا۔ اس کتاب کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور روحانی حقائق کو پیش کرنا ہے، جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ مشرق بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے یہہ کتاب اس کے لئے مشعل راہ، اس کی لغزشوں کے لئے ایک مستحکم سہارا ثابت ہوگی قیمت للعہ ۶/

جاوید نامہ (فارسی) علامہ نے اپنی مخصوص طرز میں، حق و صداقت، جوش و فکر اور حرکت و زندہ دلی کا پیام پہونچایا، جس کے ایک ایک شعر کے حقیقی منشا پر عمل شروع ہو جائے تو قومیں قعر ذلت سے نکل کر بامِ عروج پر پہونچ جائیں گی قیمت للعہ ۶/

پس چہ باید کرد اور مسافر (فارسی) "مسافر" یہ افغانستان کی چند روزہ سیاحت پر علامہ کے شاعرانہ اعلیٰ وارفع حسیات کا مجموعہ ہے خیبر، سرحد، کابل، غزنین اور قندھار کے حیرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر حقیقت شناس کے خون کے آنسو ہیں اور "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" میں شاعر مشرق نے اپنا جو آخری پیام دیا ہے، دیکھنے کے بعد انقلاب کن و غفلت شکن اثرات طاری ہو جاتے ہیں قیمت عہ/

نوٹ - علامہ مرحوم کی دو معیاری کتابیں (فارسی)

زبورِ عجم
مثنوی اسرار خودی رموزِ بے خودی } زیر طبع ہیں

TURAB

مشتہر - مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن

فلسفۂ عجم۔ مترجمہ میر حسن الدین صاحب بی اے۔ ایل ایل بی۔ حضرت اقبال کی ایک بلند پایہ فلسفیانہ تصنیف "دی ڈیولپمنٹ آف میٹافزکس ان پرشیا" کا اردو ترجمہ ہے علامہ کی نثر میں (ترجمہ) اس قدر ضخیم یہی واحد کتاب ہے اس کتاب میں ایرانی قوم کی مخصوص روح اور اس کی امتیازی سیرت کو منکشف کیا گیا ہے علامہ نے تمہید میں کتاب کے مطالب کے متعلق تحریر فرمایا ہے "میں نے ایرانی تفکر کے منطقی تسلسل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس کو میں نے فلسفہ جدید کی زبان میں پیش کیا ہے، تصوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹفک طریقے سے بحث کی ہے"............ قیمت عال ۸ر

ختم نبوت اور قادیانیت (مترجمہ ایضاً) یہ عالمانہ مقالہ پنڈت جواہر لال نہرو کے بعض استفسارات کے سلسلے میں علامہ نے تحریر فرمایا تھا، جس کے مطالعے سے اسلامی قومیت اور فرقہ کے تصور پر خاص روشنی پڑتی ہے خصوصاً قادیانی مذہب کے اصول، معتقدات اور تحریکات کے متعلق جمہور اسلامی نقطۂ نظر سے عقلی و نقلی دلائل سے بحث کی گئی ہے قیمت ۶ر

چند متفرق نظمیں۔ شکوہ ۲/۶ر۔ جواب شکوہ ۵ر۔ ہمدرد ۷/۶ر۔ فریادِ امت ۳/۹ر۔ تصویر درد ۵ر
نالۂ یتیم ۳/۹ر۔ خضر راہ ۵ر۔ شمع و شاعر ۵ر۔ ترانہ ۲/۶ر۔ مکمل ترانہ ۳/۹ر

رسالہ سب رس مفت

مکتبہ سے حسب دلخواہ نقد للعہ، عـنہ، عـلہ روپے کی کتابیں خریدنے پر علی الترتیب یک سال، شش ماہ اور سہ ماہ کے لئے سب رس مفت جاری کرایا جائے گا۔ اور متفرق طور سے خریداری پر اسی وقت مستند تفصیلی رسید خریدار کے حوالہ کردی جائے گی، بعد تکملہ معینہ رقم رسائد داخل کرنے پر پرچہ جاری کرادیا جائے گا۔ علم دوست و اہلِ ذوق حضرات جلد توجہ فرمائیں اور ہماری اس خادمانہ پیش کش سے فائدہ اٹھائیں۔

نیز! اردو ادب کی جملہ قدیم و جدید کتابیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔ اس طرف گذر ہو جائے تو ہمارے ادارہ میں تشریف لاکر ایک نظر دیکھ جائیے، یا ہمیں حکم دیجئے کہ آپ کی مذاق کی کتابیں آپ کے دولت خانے پر پیش کریں، خریدنے یا نہ خریدنے کا سوال ہماری خدمات سے خارج ہے۔ یا مطلوبہ کتب کی فہرست طلب کیجئے۔ دریافت طلب امور کا جواب حتی الامکان جلد دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ممتاز علمی، ادبی اور فلمی جرائد کی ایجنسی بھی قائم ہے۔ امید کہ! اس قدیم ادارہ کی ہمیشہ سرپرستی فرمائی جائے گی۔ فہرستیں مفت روانہ کی جاتی ہیں۔

مکتبہ ابراہیمیہ مصطفٰے بازار حیدرآباد دکن

ادب لطیف کا افسانہ نمبر

افسانہ نگاری پر لاجواب تنقیدی مقالات ——— فن افسانہ کے ہر پہلو پر گرانمایہ مضامین

دکھی زندگیوں کی اشک افشاں کہانیاں ——— سرور ہستیوں کے مسکراتے ہوئے افسانے

مغربی شاہکار افسانوں کے کامیاب تراجم ——— روح پر وجد طاری کرنیوالی منظوم داستانیں

دلپذیر تصاویر!!

شاندار گیٹ اپ!!

"ادب لطیف" کا افسانہ نمبر حقیقتاً

اردو کے افسانوی ادب میں ایک دلآویز اضافہ ہے

ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۱۲ر

اگر آپ یہ افسانہ نمبر اور ضخیم سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی تین روپے چار آنے بھیجکر خریدار بن جائیے

مقام اشاعت

مکتبہ اردو ۱۵-سرکلر روڈ۔ لاہور

مشتہرین حضرات کے لئے یہ نایاب موقع ہے جلد اشتہار دیکر فائدہ اٹھائیں

ہر وقت اور ہر موسم کے لئے

ہناوا ریویرا آرٹلن گولڈ اسٹنڈرڈ

بہترین پارچہ جات ثابت ہوئے ہیں

ہر ۲ گز کے کنارے پر ٹریڈ مارک ملاحظہ فرمائے

ساختہ

دی بکنگھم وکرناٹک ملز۔ مدراس

دی بنگلور اُولن ملز۔ بنگلور

یف۔ ڈی۔ خاں۔ اینڈ کو

تاجر پارچہ

محی الدین بلڈنگ

عابد روڈ حیدرآباد دکن

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

۱- **ہمایوں** اتنا پابندِ وقت ہے کہ جنوری ۱۹۲۲ء سے لے کر (جب یہ جاری ہوا تھا) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی۔ اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی۔

۲- **ہمایوں** آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب "ہمایوں" مرحوم جج ہائی کورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کیلئے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مدِ نظر نہیں رکھی جاتی

۳- **ہمایوں** کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں فحش اشتہارات، عریاں تصاویر اور مخربِ اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر طلبہ اور خواتین کے ہاتھوں میں دیا جا سکتا ہے۔

۴- **ہمایوں** کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء کے قابل ہاتھوں میں ہے۔ اسکی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیاری کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ "ہمایوں" کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کیلئے یکساں جاذبِ توجہ ہوتا ہے

۵- **ہمایوں** کے مضامین محض پُر از معلومات ہی نہیں ہوتے بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے "ہمایوں" اپنی نظیر آپ ہے۔

۶- **ہمایوں** صحتِ زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔

۷- **ہمایوں** میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

۸- **ہمایوں** ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے اور ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے

۹- **ہمایوں** کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

۱۰- **ہمایوں** کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زاید قیمت نہیں لی جاتی۔

چندہ سالانہ صہ اور ششماہی سے (مع محصول) ہے

خاکسار

سید عبد اللطیف

مینجر رسالہ ہمایوں لاہور

آسمان کے تارے
آپ کے حکم سے زمین پر نہیں آسکتے۔ مگر آپ کے
ایک خط پر دیئے ہوے حکم سے ہزاروں اور
لاکھوں کا مال یورپ، جاپان، امریکہ وغیرہ
ہر ملک سے آسکتا ہے۔
ہم ہر قسم کا پارچہ راست منگواکر ارزاں بیچتے ہیں
اور
شادیوں کے لئے ہر قسم کا پارچہ ہمیشہ تیار رکھتے ہیں۔
پتہ یاد رکھئے
آر۔آر۔ جیون لال
تاجر پارچہ پتھر گٹی حیدرآباد دکن

سب رس
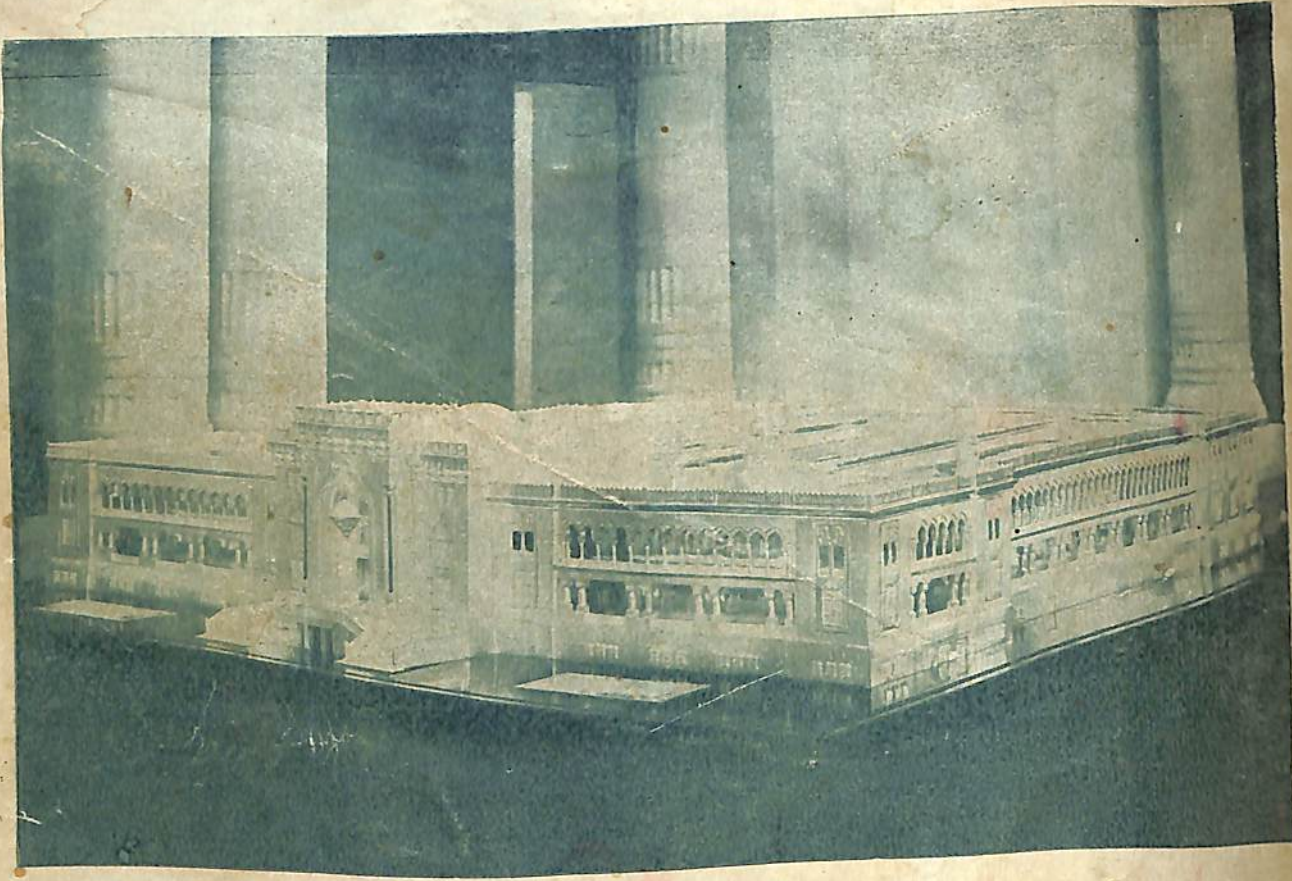
اردو نمبر

ادارۂ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

نشان پتہ آصفیہ (۱۵۳)

رجسٹرڈ نمبر (M3850)
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)

اردو نامہ

یعنی

"ادارۂ ادبیات اردو کے ماہنامہ"

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبدالحفیظ صدیقی (بی اس سی)
معین الدین احمد انصاری

دفتر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "ادارہ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کرکے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۴۸) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ر روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

سب رس معلومات کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

خاص نمبر:— محرم نمبر ۱۲/ - اقبال نمبر عہ/ - دکن نمبر عالی - اردو نامہ عالی

سب رس معلومات

حیدرآباد کے مشہور و مقبول رسالہ سب رس کے اس ضمیمے میں مشاہیر کی زندگیاں، عام فہم سائنس کے مضامین، تعلیمی اور سیاسی خبریں، مسابقتی امتحانات سے متعلق معلومات، کھیل کی خبریں وغیرہ شامل رہیں گی۔ اس ضمیمے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو لوگ حیدرآباد یا برطانوی ہند کے مسابقتی امتحانات میں حصہ لینا چاہیں ان کے لئے اردو زبان میں قیمتی معلومات اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق تمام باتیں فراہم کی جائیں۔ ایسے حضرات کے علاوہ جن لوگوں کو علمی باتوں اور معلومات سے دلچسپی ہے اور غزلوں اور افسانوں کو چھوڑ کر زمانے کی رفتار پر بھی نظر رکھنا چاہتے ہیں، یقین ہے کہ وہ اس حصے سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

سب رس۔ اردو نامہ۔ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

فہرست تصاویر

مشاہیرِ اردو کا تاریخی گروپ

فرش پر بیٹھے ہوئے:۔ (۱) سر عبد القادر (۳) حافظ ساجد علی وکیل اورنگ آباد (۴) ظفر عمر۔

کرسیوں پر سامنے:۔ (۱) غلام محمد منشی (۲) سر اکبر حیدری (۳) وقار الملک (۴) حکیم محمد اجمل خاں (۵) حالی (۶) عزیز مرزا (۷) محسن الملک۔ (۸) مرزا محمود علی خاں (۹) منشی محبوب عالم۔

کرسیوں پر دوسری صف:۔ (۱) علی الدین حسن (۲) شبلی (۳) پروفیسر آرنلڈ (۴) نذیر احمد (۵) نواب ابوالحسن خاں۔

کرسیوں پر تیسری صف:۔ (۱) ظفر علی خاں (دستار میں) (۲) سر محمد اقبال (۳) نور المنیب اللہ حیدر آبادی (شملے میں)

پیچھے کھڑے ہوئے:۔ (غلام محمد منشی سے حکیم اجمل خاں تک) (۱) ابوالحسن (۲) خواجہ غلام الثقلین (شملے میں) (۳) حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۴) مسعود علی محوی۔

پیچھے کھڑے ہوئے:۔ (منشی محبوب عالم کے پیچھے) (۱) قاسم دین (شملے میں) (۲) مصطفیٰ علی وکیل جالندھ۔

وسط میں استادہ:۔ ظفر علی خاں کے پیچھے ستون سے لگے ہوئے غلام جیلانی۔ نور المنیب اللہ کے پیچھے شرف الحق۔

نوٹ:۔ اس اہم تاریخی گروپ کے اصحاب کے پہچاننے میں سر عبد القادر اور مولوی نور المنیب اللہ صاحب وکیل نے سب رس کی جو مدد کی ہے اس کے لئے ادارہ شکر گزار ہے۔ یہ تصویر اگرچہ پہلے سب رس بابت جولائی ۱۹۳۰ء میں شایع ہو چکی تھی لیکن مولوی نور المنیب اللہ صاحب کی مدد اور مشورہ ہی کی وجہ سے دوبارہ بڑی بنا کر چھاپی جا رہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اصحاب کے نام معلوم ہو سکیں اور جو نام غلط لکھ دیئے گئے تھے ان کی تصحیح ہو سکے۔

مشاہیر اردو کا تاریخی گروپ

فہرست مضامین

غزلیات

خوابِ شیریں

تو خواب کے مانند گزر جاتا ہے
تو آنکھوں میں نیند کی طرح آتا ہے
تو پاس آتا ہے جب، میں سو جاتا ہوں
تجھ کو پا کر میں آپ کھو جاتا ہوں

رباعی

بے خود میں رہوں، تو وہ قریں آتا ہے
اس پردے میں، وہ پردہ نشیں آتا ہے
جب وہ آتا ہے، میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں، وہ نہیں آتا ہے

اے نیند عجیب طرح ڈالی تو نے
میری آنکھوں میں رہ نکالی تو نے

رباعی

کو نین کی فکروں سے فراموشی ہے
خاموشی میں کیفیتِ سرگوشی ہے
آنکھیں لذّت میں ڈوب کر بند ہوئیں
یہ نیند ہے، یا تری ہم آغوشی ہے

ان بند پپوٹوں نے چھپایا ہے کسے
ان نور کی پتلیوں نے پایا ہے کسے
مستی میں بھی ہوشیار ہوں، واہ رے میں
بند آنکھوں سے دیکھتا ہوں اللہ رے میں
ہے صاحبِ عرش کا مکاں آنکھوں میں
ہے نورِ زمین و آسماں آنکھوں میں

رباعی

اصلیت اگر نہیں، تو دھوکا ہی سہی
اللہ! بہت نہیں، تو تھوڑا ہی سہی
تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو
رُویت ممکن نہیں، تو رویا ہی سہی

سید احمد حسین امجد

کایا پلٹ

(میکش صاحب ورڈز ورتھ کی نظموں کا آزاد منظوم ترجمہ کر رہے ہیں "کایا پلٹ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شاہد)

اس کاغذی گلزار میں بُو ڈھونڈنے والے!
ابرو میں شکن ہے، ترے ماتھے پہ پسینہ
غیروں کے بنائے ہوئے لقموں کو چبانا
انوارِ بصیرت پہ نہ چھا جائے "سیاہی"

بے جان لکیروں میں لہو ڈھونڈنے والے!
ساحل سے مگر دُور ہے "کاغذ کا سفینہ"
ایسا ہی ہے جیسے کسی "گونگے کا ترانا"
آنکھوں کے لئے مانگ لے آزاد نگاہی

اٹھ اور نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے
فطرت کے حسیں رخ سے نقابوں کو ہٹا دے

وہ دیکھ حسیں شام کی رنگین جوانی
وہ دامنِ کہسار میں جھرنے کا ترنم
جگنو میں جھلکتا ہے، مہِ نو کا اشارا

کھنبوں کو سناتی ہے بہاروں کی کہانی
تتلی کے وہ چھو لینے سے کلیوں کا تبسم
لیتے ہوئے مخمور فضاؤں کا سہارا

کر دفن کتابوں میں غمِ لاتناہی
پیپل کی لچکتی ہوئی ٹہنی کو جھکا کر
سوگند مری روح کی، یہ مست ترانے
دیکھ، ان میں حیات آفریں نکتوں کی روانی

وہ دیکھ کہ لی طائرِ رنگیں نے جماہی
آکاش پہ تاروں کو بلاتا ہے وہ، گا کر
دنیا میں لٹاتے ہیں، مسرت کے خزانے
سن، ان میں خرد بخشیٔ فطرت کی کہانی

ان نغموں میں گم ہو کے تمنائے اثر سیکھ
خوابیدہ دماغوں کو جگاتے ہیں یہ نغمے

تسخیرِ جہاں کے لئے اندازِ نظر سیکھ
فطرت کی طرف دل کو بلاتے ہیں یہ نغمے

بکھرے ہوئے پھولوں کی بھی اک ہلکی سی جنبش
انساں کی حقیقت کا کھلا راز ہے گویا

ہے بربطِ تحقیق کا اک نغمۂ دانش
اک دُور سے آئی ہوئی آواز ہے گویا

یہ عقل، فریب آشنا، تخیل کی دشمن
یہ عقل، سیہ داغ ہے فطرت کی جبیں پر
اس عقل کے ہاتھوں سے بگڑ جاتی ہے ہستی
اس عقل و خرد کو رہِ فطرت میں گنوا دے

انساں کے لئے "محنتِ فردا" کی ہے الجھن
پھبنکی ہوئی اک آگ ہے فردوسِ بریں پر
زنجیرِ تعین میں جکڑ جاتی ہے ہستی
آزاد نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے

اٹھ اور یہیں اپنے لئے مانگ لے "وہ دل"
ہر شئے میں نظر آئے جسے علم کا حاصل

میکش

اداریہ

"سب رس" کی زندگی کا تیسرا سال "اُردو نمبر" سے شروع ہو رہا ہے۔ گزشتہ دو سال میں اس کی ترقی جس صحت بخش طریقے سے ہوئی ہے، اس کا اظہار یہاں بے ضرورت ہوگا اس لیے کہ "سب رس" ارباب ملک سے ہمیشہ قریب تر رہا ہے اور ملک کے دماغوں سے نکلے ہوئے علمی و ادبی سرمائے کو ملک کے دماغوں تک پہنچانے میں اُس کی پُرخلوص کوشش قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی۔

یورپ کی موجودہ صورت حال صحافت کے لیے صبر آزما بن گئی ہے۔ اشیاء کی غیر معمولی گرانی نے ظاہری معیار کو پست کر دیا ہے اور ارباب صحافت کے لیے اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ چندہ میں اضافہ یا موجودہ چندہ کا بدل۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ خدمت ادب کی راہ میں کسی عذر کو خواہ وہ حقیقت سے قریب ہی کیوں نہ ہو "سنگ گراں" باور کرائیں۔ اسی احساس کے پیشِ نظر ہم نے اپنے اعلانات کے مطابق "اُردو نمبر" کو شاندار بنانے کی کوشش کی ہے اور سب رس کا روایاتی معیار باقی رکھا ہے بلکہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس کو بلند تر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

سرورق "اُردو نمبر" کے لیے سرورق کا انتخاب یقیناً ایک نازک کام تھا۔ اس لیے کہ ادبیات کے جدید دور نے "ظاہر و باطن" کی حدیں ملا دی ہیں جس طرح ادب اور زندگی کو علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اچھی کتاب نام ہے، اپنے موضوع، انداز بیان اور دیدہ زیبی کا۔ ایک بدنما پھول، اپنی خوش بُو کے باوجود گیسوؤں کی زینت نہیں بن سکتا۔ ہم نے جب موزوں سرورق کے متعلق غور کیا تو ہمارے تصور میں جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی وہ حسین و شاندار عمارت آئی جو اپنی طرز تعمیر میں تہذیب و تمدن کا ایک سرمایہ رکھتی ہے۔ جامعۂ عثمانیہ نے ترقی اُردو میں جو حصّہ لیا ہے وہ عہد آفریں ہے۔ کلیۂ فنون کی عمارت ہند و مسلم تہذیبوں کے امتزاج کا خوش گوار نمونہ ہے اور اس عمارت کا افتتاح اُردو کے سب سے بڑے محسن اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ نے فرمایا ہے۔ یہی وہ غیر معمولی خصوصیات ہیں جن کے باعث اُردو نمبر کے سرورق پر جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی تصویر ہی موزوں ترین سمجھی گئی۔

یہ تصویر جو "اُردو نمبر" کے سرورق پر دکن کی "خدمت اُردو" کے نمایاں ثبوت میں شایع کی جا رہی ہے، اصل میں چاندی کے اس کیسکٹ کا عکس ہے جو پندرہ ہزار روپیے کے صرفے سے تیار ہوا اور بارگاہِ سلطان العلوم میں افتتاح کلیۂ فنون کے موقع پر گزرانا گیا۔ کلیۂ فنون کی عمارت چونے اور پتھر سے بنائی گئی ہے اور اس کا یہ نمونہ چاندی سے تیار کیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں عثمانیین کے دلوں کا سکوں پرور اضطراب، روح کا تقدس اور علم و عمل کی پاکیزگی دکھائی دیتی ہے۔ فن کاروں کا یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ انھوں نے حُسن کو حقیقت سے ہم آہنگ کر دیا۔

تصویریں "اُردو نمبر" کی مناسبت سے اس کی تمام تر تصویریں یا تو اُردو ادب کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اُردو سے تعلق رکھتی ہیں جیسا

ہم نے پہلے بھی کہا ہے، جنگ کی وجہ سے کاغذ، بلاک سازی اور طباعت میں جو گرانی پیدا ہوگئی ہے اُس کے پیشِ نظر ایک ہی نمبر میں تقریباً پچاس تصویروں کا شائع کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ اس واقعے کا اظہار ہم محض یہ بتانے کے لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں "سب رس" کتنا عزیز ہے اور ہم اس کو مقبول و مفید بنانے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

مشاہیر اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط۔ ادبیات میں مکتوبات کی خاص اہمیت ہے۔ اس لیے کہ مکتوبات زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں جن میں کاتب بے تکلفی کے ساتھ اپنی زندگی کے عکس پیش کرتا ہے۔ چونکہ مکتوب چھپوانے کے خیال سے نہیں لکھا جاتا اس لیے اس میں سادگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ اسی لیے مشاہیر کے خطوط کا ذخیرہ ہر زبان میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے۔ اُردو میں بھی مکتوبات کے بعض مجموعے شائع کیے گئے ہیں۔ آپ کو اس نمبر میں مشاہیر اُردو کے سولہ غیر مطبوعہ خطوط ملیں گے جو پہلی دفعہ شائع ہو کر منظر عام پر آ رہے ہیں۔ شبلی، داغ، ......، طیبہ بیگم، گرامی، شاد عظیم آبادی، راشد الخیری اور ممتاز علی وغیرہ کے نام اور کام سے ہر اُردو داں واقف ہے۔ یہ مکاتیب اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ ادارۂ ادبیات اُردو اکثر مشاہیر اُردو کی غیر مطبوعہ تحریریں جمع کر رہا ہے اور اسی ذخیرے سے چند اُردو خطوط اُردو نمبر کے لیے حاصل کیے گئے ہیں۔

اُردو پروفیسروں کے حالات اُردو ادب کی تاریخ، ان خاموش خدمت گزاروں کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی جن کی رہنمائی نوجوانوں میں اپنی زبان کی خدمت کرنے کا ذوق پیدا کرتی ہے، زبان کے ان خدمت گزاروں پر بہت کم لوگوں کی نظر گئی ہے۔ ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کو سراہنے والے ان کو کسی طرح نہیں بھلا سکتے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ اس نمبر میں ہم نے ہندوستان کی مختلف جامعات کے اساتذۂ اُردو کے حالات اور خدمات سے اہل زبان کو روشناس کرایا ہے۔ افسوس ہے کہ بعض حضرات نے اپنے حالات روانہ نہیں کیے ورنہ یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا۔ اب اس کی تکمیل کا یہی طریقہ رہ گیا ہے کہ اس کو ایک جداگانہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔ "ادارۂ ادبیات اُردو" ایسی ایک کتاب شائع کر رہا ہے جس میں گزشتہ اساتذہ کے حالات و خدمات کا تذکرہ بھی شریک رہے گا۔

حصۂ نظم و نثر اُردو نمبر کا حصۂ نظم پُر تنوع اور بلند پایہ ہے۔ اس کے لیے اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں خاص طور پر حاصل کی گئی ہیں۔ جلیل، امجد، علی منظور، ماہر، ساغر، حفیظ جالندھری، صفی اورنگ آبادی، احسان دانش، جنجر، مخدوم، وجد وغیرہ کی غزلوں اور نظموں میں جو قدیم اور جدید طرز شاعری کے نمونے ہیں، آپ اُردو شاعری کے مختلف رجحانات دیکھیں گے۔

حصۂ نثر میں ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے شامل ہیں، جو "سب رس" کے لیے خاص طور پر حاصل کیے گئے ہیں۔
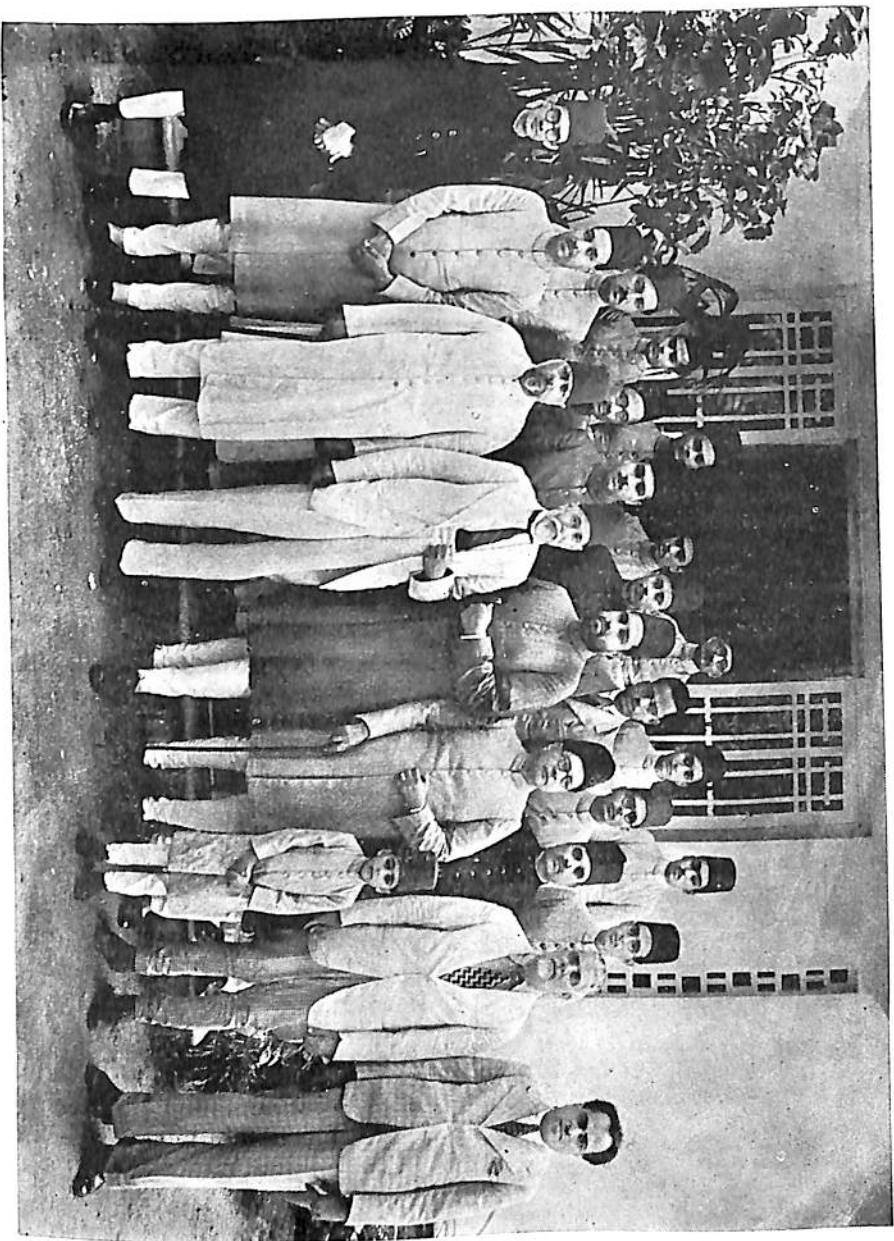
ڈاکٹر زور۔ احسن یار جنگ۔ سید عارف الدین۔ عزیز یار جنگ۔ بہادر یار جنگ۔ سر عبدالقادر۔ محمد اکرام۔ سیف علیخان۔ ہاشمی

اقبال علی۔ پروفیسر سروری۔ ظہیر الدین احمد۔ پروفیسر سید محمد۔ ناصر الدین احمد۔ پروفیسر فضل حق۔ ڈاکٹر امیر علیخان

عارف علی۔ کمال علی۔ پروفیسر مجید صدیقی۔ سراج الدین احمد۔ عبدالحفیظ۔ حمید الدین شاھد

مرزا فرحت اللہ بیگ، ایم اسلم، ماہر القادری، علامہ ڈاکٹر نجم الدین احمد جعفری، پروفیسر عبد القادر سروری کے علاوہ متعدد ایسے اصحاب کی قلم کاری کے نتائج آپ کو اس نمبر میں ملیں گے جنھوں نے اپنی زندگی خاص خاص موضوعوں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

سب رسی معلومات

اس نمبر سے بچوں کے ضمیمہ کے علاوہ ایک اور ضمیمۂ معلومات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جس میں عام فہم طریقے سے تازہ معلومات فراہم کی جائیں گی۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے ایک طرف وقت کو تنگ بنا دیا ہے اور دوسری طرف رفتار زمانہ سے واقف رہنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ضمیمہ ان طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ہوگا جو امتحانات مقابلہ کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں سائنس اور دیگر جدید علوم کے علاوہ مقابلہ کے امتحانوں کی ضروریات اور اطلاعیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اس ضمیمہ کی ترتیب کا کام مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی بی، ایس سی کے سپرد کیا گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضمیمہ ان اصحاب کے لیے جو اپنی مصروفیتوں کے باعث مطالعہ کے لیے بہت کم وقت دے سکتے ہوں، کار آمد ہوگا۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو

بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے باعث اس وسیع کام کو جس کی انجام دہی مرکزی ادارے کے لئے دقت طلب ثابت ہو رہی تھی، شعبہ واری تقسیم کے ذریعے سے پھیلا دیا گیا ہے۔ اس طرح اب تک شعبۂ زبان، شعبۂ تالیف و تراجم، شعبۂ تاریخ دکن، شعبۂ [illegible]
شعبۂ سائنس، شعبۂ امتحانات، شعبۂ نسواں، شعبۂ اطفال اور شعبۂ طلبہ قائم ہو چکے ہیں۔ اور ادارہ کے کام میں تنظیم کے ساتھ وسعت ہوتی جا رہی ہے۔ ملک کے علم دوست اور اہل ذوق خواتین و اصحاب کی معاونت سے ان شعبوں نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے اور ہر شعبہ اپنے مفوضہ کام کو دلچسپی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ یہ شعبے نہ صرف مختلف مسائل پر غور و خوض کر رہے ہیں بلکہ ان کی جانب سے خاص موضوع پر کتابیں تصنیف و تالیف کروائی جا رہی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ یہاں ادارے کی شعبہ جاتی مصروفیتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کریں لیکن ادارہ سے ہم سفارش کر رہے ہیں کہ وہ ایک کتابچہ شائع کرے جس میں ادارے کی مکمل روداد ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ادارہ نے حیدر آباد میں اپنے خلوصِ عمل اور ذوقِ کار سے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اس کی علمی کوششوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس لئے ایسے کتابچے کی اشاعت اربابِ ملک کو یہ واقف کرانے کے لئے ضروری ہے کہ ادارے نے اب تک کیا کیا؟ اور اب وہ کیا کر رہا ہے؟

ایک وسیع کتب خانے کے قیام کی اسکیم جس میں تمام قدیم و جدید اردو کتابیں ہوں زیر غور ہے تاہم فی الحال ادارہ کے دفتر ہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کتب خانے میں دکنی مخطوطات کا بھی ایک قابلِ لحاظ ذخیرہ ہے۔ ملک کے وہ اہلِ ذوق اصحاب جو زبان کی خدمت کو ایک مقدس فرض سمجھتے ہیں، اس کتب خانے کے لئے قلمی و مطبوعہ کتابیں فراہم کرنے میں مدد دیں تو یقین ہے کہ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں اور اردو ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کی ایک مشکل حل ہو جا سکتی ہے۔

"مرکزی ادارے" نے صرف بلدے کے اصحاب ذوق کا تعاون حاصل کیا تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ اضلاع حیدرآباد کے خدمت گزاران اردو اپنی اعانت سے ادارے کو محروم رکھیں۔

اردو زبان حیدرآباد کی قومی اور سرکاری زبان ہے اس لئے اس کے ہر دیہات میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن بلدہ سے زیادہ اہلِ دیہات میں اشاعتِ اردو کا کام اس لئے ہونا چاہئے کہ ..... وہ شہر سے دور ایسے گوشوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں، جو شہری سہولتوں سے محروم ہے۔ ادارہ کی شاخیں اب تک اورنگ آباد، محبوب نگر، جالنہ اور عثمان آباد میں قائم ہو چکی ہیں۔ اور توقع ہے کہ حیدرآباد کے ہر گوشے میں اس کی شاخ قائم ہو جائے گی۔ ہم اضلاعی شاخوں سے بلند آہنگ توقعات وابستہ کرنے میں غلطی نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اضلاع میں رہ کر اضلاع کی ضروریات سے بہت زیادہ واقف ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی پرخلوص کوشش سے حیدرآباد کے ہر گوشے میں اردو ادب عام ہو جائے۔ یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کے خلاف ایک مستحکم محاذ قائم کیا جائے۔

یہ کوئی دقت طلب کام نہیں ہے اگر ارادہ میں پختگی، مزاج میں استقلال اور دل میں خلوص ہو۔ ادارہ نے شعبۂ امتحانات قائم کر کے ایک راہِ عمل کھول دی ہے۔ اس لئے اضلاعی شاخوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو ادارہ کے امتحانات کی تیاری کے لئے آمادہ کریں اور ترغیب و مدد سے انھیں اس قابل بنائیں کہ وہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

شاخ محبوب نگر:۔ صدر، مولوی سید تقی صاحب بلگرامی بیرسٹر ایٹ لا ناظم عدالت ضلع۔ نائب صدر، مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدسی بی اے ال ال بی۔ معتمد، مولوی حسن علی مرزا صاحب وکیل۔ شریک معتمد مولوی عمر علی صاحب فاروقی وکیل۔

اراکین:۔ پنڈت نارائن راؤ صاحب وکیل۔ ہنمنت راؤ صاحب وکیل۔ مولوی عبدالرزاق خاں صاحب صولت بی اے ال ال بی وکیل۔ نندگیری وینکٹ راؤ صاحب بی اے ال ال بی وکیل۔ ڈاکٹر افتخار الدین صاحب سیول سرجن۔ سید ساجد علی صاحب مہتمم تعلیمات۔ مولوی سالم مسدوسی صاحب۔ مولوی عبدالعزیز صاحب گتہ دار۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب آوآز گتہ دار۔

شاخ جالنہ:۔ صدر، مولوی افضل علی صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ معتمد، مولوی افضل عابدی صاحب وفا۔ مہتمم مولوی سید عمر صاحب مولوی فاضل۔ کتب خانہ دار مسٹر غازی۔

نشرگاہ حیدرآباد

موجودہ زمانے میں نشریات نے جو غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ ریڈیو تفریحی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے تمدنِ حاضرہ میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ برق کی ترسیلی قوت نے صوتی لحاظ سے ایک عالمی ارتباط پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے دنیا کے مختلف گوشے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے ہیں جتنے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔

ریڈیو نے ملک و قوم کی خدمت کے نئے راستے کھول دئے ہیں۔ جس طرح فلم سے تعلیم و تہذیب کی اشاعت میں مدد لی جا سکتی ہے، اسی طرح ریڈیو کے ذریعے سے بھی زیادہ وسعت کے ساتھ تعمیری کام لیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو سے جو خدمات ہو سکتی ہیں، ان میں خدمت زبان بھی ہے۔ دنیا بھر کی نشرگاہوں سے ادبی پروگرام کی نشر عوام میں "ادبی ذوق" پیدا کر رہی ہے۔ چونکہ ریڈیو کا راست تعلق عوام سے بھی ہے اس لئے ذریعۂ نشر وہی زبان ہو سکتی ہے جو عوام کی مشترکہ زبان ہو۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں زبان کے مسئلہ کو سیاسی رنگ دیا گیا ہے اور یہ بحث ختم ہوتی نظر نہیں آتی کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو ہے یا ہندی؟

افسوس ہے کہ ادنیٰ تعصبات کی پھیلی ہوئی تاریکی میں ایک کرن بھی ایسی نہیں جو انتہا پسندوں کو ایک مقام پر لاسکے۔ لیکن جب "آل انڈیا ریڈیو" نے اپنے سننے والوں سے دریافت کیا کہ وہ کس زبان میں پروگرام سننا پسند کرتے ہیں تو زیادہ خط اردو (ہندوستانی) کی تائید میں وصول ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح ہندوستان کے فنون لطیفہ اپنے میں ہندوستانی تمدن کی روح رکھتے ہیں اسی طرح اردو بھی ہندوستان کے مشترکہ تمدن کی نشانی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ حیدرآباد میں زبان کا مسئلہ ابھی تک خارزار سیاست میں نہیں الجھا ہے اور "سیاسی دیوانگی" کا داؤں ہمیشہ پٹ ہی پڑا ہے۔ اردو حیدرآباد کی قومی اور ملکی زبان ہے۔ اس لئے اردو کی خدمت نہ صرف ملک و قوم بلکہ اپنی حقیقی تہذیب کی خدمت ہے۔

نشرگاہ حیدرآباد کا کل ہند بنیادوں پر حال ہی میں افتتاح ہوا ہے۔ لیکن وہ اردو کی جو خدمت کر رہی ہے قابلِ مبارکباد ہے ہمارے ملک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے، ہماری دفتری زبان اردو ہے، ہمارا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ہمارا ذریعۂ نشر بھی اردو نہ ہو۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں نشرگاہ کی سرکاری اور غیر سرکاری تقریروں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ اردو کے موجودہ رجحانات کا صحیح عکس ہے۔ اس کو ہندی نوازی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ فارسی و عربی آمیز اردو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم ملک کے تمام حقیقت شناس باشندوں کی جانب سے یقین دلاتے ہیں کہ یہی زبان ہماری زبان ہے۔ ہم نشرگاہ حیدرآباد سے استدعا کریں گے کہ وہ بے جا اعتراضوں کو درمیان میں لائے بغیر زبان کے معاملہ میں موجودہ حکمت عملی ہی پر کاربند رہے تاکہ پروگرام کو زیادہ سے زیادہ لوگ سنیں اور سمجھیں۔

چونکہ نشرگاہ حیدرآباد کی تقریریں عوام میں ایک علمی و ادبی بیداری پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں اس لئے ادارۂ ادبیات اردو نے ان کو مقرر صاحبان کی اجازت سے اپنے ماہنامہ سب رس میں یا کتابوں کی صورت میں شایع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی کتاب "سائنس کے کرشمے" شایع ہو چکی ہے۔ جس کو ادارہ کے مخلص رفیق میر حسن صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سائنس کے کرشموں پر ملک کی قابل ہستیوں کی عام فہم تقریریں جمع کی گئی ہیں۔

سب رس کی مجلس ادارت نے تصفیہ کیا ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں "سب رس" کا ایک "فضائی ادب نمبر" شایع کیا جائے جس میں ان نشری تقریروں کا انتخاب پیش کیا جائے جو اب تک نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکی ہیں۔ ہم آئندہ شمارے میں اس نمبر کے متعلق تفصیل کے ساتھ عرض کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ فی الحال صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ ایسا تنوع، شاید ہی آپ نے کسی رسالہ میں دیکھا ہوگا جیسا کہ سب رس کے فضائی ادب نمبر میں ہوگا۔

جامعہ عثمانیہ

جامعہ نگر گزشتہ چند دنوں تک غیر معمولی علمی چہل پہل کا مرکز بنا رہا۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت کا افتتاح اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے بہ نفس نفیس فرمایا۔ جس عمارت کی بنیاد حضور شاہانہ نے اپنے دست مبارک سے رکھی ہو اور جس کا افتتاح خود حضور شاہانہ فرمائیں، وہ یقیناً علم و عمل کی پرورش کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اس موقع پر ارباب جامعہ اور طلبائے انجمن اتحاد کی جانب سے بارگاہ شاہانہ میں عقیدت مندانہ سپاس نامے پیش کرنے کی عزت حاصل کی گئی۔ ان سپاس ناموں کا

جو جوابِ شاہانہ ارشاد فرمایا گیا وہ عثمانیین کی زندگیوں کے لئے نہایت ہی بصیرت افروز ہے۔ حضور اقدس و اعلیٰ کے ارشاداتِ عالیہ جامعہ عثمانیہ کے بلند تر مستقبل کی ضمانت ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ برادرانِ جامعہ نے اپنی زندگیوں کے لئے "اپنی زندگیوں کے مرکز" سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو انھیں از راہِ عطوفت خسروی عنایت فرمایا گیا۔ اس سر زمین پر جہاں "علم نامانوس زبانوں کی قید سے آزاد کیا گیا" اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تشریف آوری ایک فالِ نیک ہے جس نے عثمانیین کے جذبۂ عمل کو تیز تر کر دیا ہے۔

کلیۂ فنون کی جدید عمارت میں افتتاح کے بعد ہی دو شاندار علمی اجتماعات ہوئے۔ ایک تو ماہرینِ فلسفہ کی کانفرنس، اور دوسرا، ماہرینِ ریاضی کی کانفرنس۔ ان دونوں کانفرنسوں میں ہندوستان کی مختلف جامعات کے مندوبین جمع ہوئے تھے، جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں اپنے فنون کے متعلق غور و خوض کیا۔ ان دونوں کانفرنسوں کے لئے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنے لطف و کرم سے پیاماتِ کامیابی عطا فرمائے۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت نے اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں دو ایسے شاندار اجتماعات دیکھے جو شاید ہی کسی جامعہ کو آٹھ دن کی قلیل مدت میں نصیب ہوئے ہوں گے۔

طلبائے جامعہ کی جانب سے حسبِ معمول اس سال بھی "یومِ جامعہ" منایا گیا۔ لیکن اس کی ایک اہم خصوصیت ایسی ہے جو دوسری ایسی تقریبوں سے اسے ممتاز کر دیتی ہے اور وہ مشاعرہ میں والا شان حضرت معظم جاہ بہادر شجیع کی تشریف آوری ہے۔ شہزادۂ والا شان نے جامعہ کے مشاعرہ کی صدارت قبول فرما کر خانوادۂ شاہی کی ان مبہم عنایات کا ایک اور نمایاں ثبوت دیا جو جامعہ عثمانیہ پر ہمیشہ مبذول رہی ہیں۔ فرزندانِ جامعہ کے شعری رجحانات "زندگی اور ادب" کو قریب تر کر رہے ہیں۔ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی کتاب "شعرائے عثمانیہ" میں اس کی جابجا جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جو حسنِ اتفاق سے انہی دنوں میں شائع ہوئی۔ ان شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں شاہزادۂ والا شان کی دلچسپی جن کا پاکیزہ ذوقِ تغزل اردو شاعری پر دکن کے روایاتی الطافِ شاہانہ کا زندہ ثبوت ہے بلا شبہ معاون ثابت ہوگی۔

" انجمنِ طیلسانیینِ عثمانیہ" ملک کی واحد انجمن ہے جس میں تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ اراکین ہیں۔ ہم یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ انجمنِ طلبائے قدیم اور انجمنِ طیلسانین کو ایک مرکز پر لالینے سے کیا کوئی ایسے نقصان کا امکان ہے جو ان دونوں انجمنوں کے مفادات کو متصادم کر دے گا۔ ہم ہمیشہ سے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اصحاب کو ایک ہی مرکز پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ بہر حال جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دونوں انجمنیں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں سرگرم عمل ہیں تو ہمیں اس کا زیادہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ عثمانی طیلسانیوں کی کانفرنس، اس سال اورنگ آباد میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ایک موسس مولوی عبد المجید صاحب صدیقی نے کی۔ اور جس کا افتتاح حضرت بسالت جاہ بہادر نے فرمایا۔ نواب بسالت جاہ بہادر کو ملک کی تعلیمی ترقی سے جو گہری دلچسپی ہے اس کا ثبوت ان کی مصروفیتوں سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

انجمن کی معاشی کمیٹی نے گزشتہ سال کی طرح، اس سال بھی باغ عام میں ایک عظیم الشان صنعتی نمائش منعقد کی ہے۔ اس قسم کی نمائشیں نہ صرف ملکی صناعوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہیں بلکہ اربابِ ملک کے دلوں میں بھی ایک احساسِ ترقی پیدا کرتی ہیں

دکن کی صنعتوں کا زوال ہماری سرد مہریوں کا نتیجہ ہے۔ اور آج جب کہ نظام زندگی کی بنیاد معاشی مسائل پر قائم ہے ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ پیدائش دولت کے بغیر ہماری انفرادی حالت ترقی نہ کر سکے گی۔ معاشی کمیٹی قابل مبارک باد ہے کہ اس نے ملک کی صنعتوں کو ارباب حکومت کے سامنے پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملکی صناع کا داغ دل، دراصل ملک کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ ہے۔

فلموں کی زبان

ہندوستان کے طول و عرض میں فلموں کی زبان کے متعلق چہ می گوئیاں زمانے سے جاری ہیں۔ اور فلموں کو دیکھنے والوں نے افسوس کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ اکثر فلموں کی زبان کا پلہ اس غیر مانوس زبان کی طرف جھکا ہوا ہے جس کو کم از کم اہل حیدرآباد سمجھنے سے قاصر ہیں۔ فلم میں بھی وہی زبان استعمال ہونی چاہیے جو ہماری مشترکہ زبان ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے نہیں تیار کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ایک طولانی بحث ہے جس کو ہمیشہ اٹھایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اردو سے محبت رکھنے والوں کا کیا یہ مقدس فرض نہیں ہے کہ وہ ایسے فلموں کی حوصلہ افزائی کریں جو اردو کی اشاعت میں مدد دے رہے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جس کے انکاری جواب کا ہمیں گمان تک نہیں۔ ہم ہندی نواز فلمی کمپنیوں کی نیتوں پر حملہ کئے بغیر اپنی زبان اور اس کے ذریعے سے اپنے تمدن کی حفاظت کے دل سے آرزو مند ہیں۔ یہی وہ احساس تھا جس کے تحت مسٹر سہراب مودی کا جب وہ اردو نواز دکن میں آئے تو خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ وہ سہراب مودی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدمتگزار اردو کی حیثیت سے ہمارے تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ ذاتیات کی الجھنوں میں الجھ کر خدمات کو فراموش کر دینا کوئی ایسی قابل تعریف بات نہیں جس کو ہنگامہ آرائی کے لئے بہانہ بنایا جائے۔ "کون کیا ہے"؟ کا سوال "کس نے کیا کیا؟" کے درمیان کیوں لایا جائے۔ جو لوگ اردو کے سہارے جیتے ہیں وہ تعصبات ظاہری میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیں گے۔ ہمیں اس کا دلی افسوس ہے کہ غلط فہمی یا کسی اور بنا پر اس بارے میں عوام کی رائے کو غلط راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ بہر حال یہ ایک وقتی چیز تھی، لیکن کام قدر حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسٹر سہراب مودی کی حیثیت صاف ہے اور اردو کے متعلق انھوں نے جو خیالات اپنی نشری تقریر میں ظاہر کئے ہیں، ان کی وجہ سے ان کی عزت اردو دنیا میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔

امدادی سرمایۂ جنگ

گزشتہ مہینے امدادی سرمایۂ جنگ کے لئے ٹاؤن ہال باغ عامہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت "ادارۂ ادبیات اردو" کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس پرنس آف برار نے فرمائی۔ یورپ کی نازک صورت حال، ایک عالمی تشویش کا باعث بن گئی ہے اس لئے ساری دنیا کے امن و امان کو آمری قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مخالفین نبرد آزما ہیں۔ امن و امان کے تحفظ کا جذبہ یقیناً ایک مقدس جذبہ ہے اس لئے ان کی امداد ضروری ہے جو ہماری سلامتی کے لئے اپنی سلامتی کو خاطر میں لائے بغیر لڑ رہے ہیں۔ اس جلسہ میں ہز ہائنس پرنس آف برار کے علاوہ شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر، سر رکن السلطنۃ، ہز ایکسلنسی سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر اور نواب سالار جنگ بہادر نے بھی تقریریں فرمائیں۔ یہ جلسہ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلا جلسہ ہے جس کے اسٹیج سے ایک ہی وقت میں ملک کی پانچ [illegible] شخصیتوں نے اہل شہر کو مخاطب کیا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لئے نواب کمال یار جنگ بہادر کو منتخب کیا گیا ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس ہندوستان کی علمی بیداری میں قابلِ لحاظ حصہ لیتی رہی ہے۔ اور نواب کمال یار جنگ بہادر ملک کے ان گنے چنے امراء میں سے ہیں جو ملک و قوم کا حقیقی درد رکھتے ہیں۔ خصوصاً دکن کے قحط زدہ غریبوں کے لئے انھوں نے حال ہی میں جو پُرخلوص کوششیں کی ہیں، کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اس لئے ایجوکیشنل کانفرنس کے حالیہ اجلاس کی صدارت کے لئے ان کا انتخاب اربابِ کانفرنس کی بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔ ہم نواب کمال یار جنگ بہادر کو پُرخلوص مبارکباد دیتے ہوئے ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی ملک و قوم کی تعمیری خدمت میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ کانفرنس میں جو تحریکیں منظور ہوئیں ان میں سب سے زیادہ اہم شمالی ہند کی جامعات اور خاص طور پر جامعہ علی گڑھ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور جہاں ابھی تک اردو کی تعلیم اختیاری مضامین کے طور پر نہیں دی جا رہی ہے وہاں اس کا انتظام کرنے سے متعلق ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنے تمام وسائل سے کام لے کر اس تحریک کو عملی جامہ پہنائے بغیر چین نہیں لے گی۔

انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ

دہلی میں "انجمن ترقی اردو" کی منتقلی کے بعد حیدرآباد میں اس کی ایک شاخ قائم کی گئی ہے۔ "انجمن ترقی اردو" نے اردو کی ترقی و اشاعت میں ہمیشہ سرگرم حصہ لیا ہے۔ اور ایسے وقت میں جب کہ اردو ہندی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے اردو کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس انجمن کو حکومت حیدرآباد کی جانب سے ایک جشن قرار رقم سالانہ امداد کے طور پر دی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں اس کی شاخ کے معتمد ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو فنِ ریاضی میں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے۔ اس انجمن سے ہماری خوش گوار توقعات بے جا نہیں ہیں۔

بے بنیاد افواہ

حال ہی میں ایک شگوفہ چھوڑا گیا اور وہ یہ کہ مقامی انجمن ترقی اردو اور ادارۂ ادبیات اردو میں اختلاف ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بے بنیاد افواہ کیوں پھیلائی گئی اور اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ اردو اکاڈمی جامعۂ ملیہ دہلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد، اردو مرکز لاہور، کی طرح ادارۂ ادبیات اردو بھی، انجمن ترقی اردو یا کسی اور ایسی انجمن کے ساتھ تعاون عمل کرنے ہمیشہ تیار رہا جس کا مقصد اردو کی خدمت گزاری ہے۔ انجمن ترقی اردو ہندوستان بھر میں اردو کے سیاسی اور ثقافتی اقتدار کو برقرار رکھنے کی جو انتھک کوشش کر رہی ہے، وہ غالباً دوسری کسی انجمن سے ممکن نہیں۔ انجمن کے اغراض کی تکمیل کے لئے جس قدر زیادہ شاخیں قائم کی جائیں اچھا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے ادارے جن کے نام ہم نے اوپر مثالاً دئے ہیں، وہ اپنی برسوں کی کارگزاری اور اس کے لازمی وجوبات (Obligations)، کے ساتھ اپنا وجود ختم کر دیں۔

انعامی مضامین کا اعلان

سب رس ۱۹۳۹ء کے بہترین مضامین کے لئے حسب ذیل اصحاب نے انعامات عطا فرمائے ہیں۔ انعامات دینے کا تصفیہ ایک مجلس کے سپرد کیا گیا ہے جس کا نتیجہ فروری ۱۹۴۰ء کے سب رس میں شایع ہوگا۔

(۱) اصلاحی مضمون یا افسانہ:- محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا۔

(۲) ضمیمۂ سب رس دلچسپ کے لئے کا بہترین مضمون یا افسانہ یا نظم نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیردار۔

(۳) سب رس کا بہترین علمی و ادبی مضمون:- ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور میکش

پہلی صف ۱۔ اشک۔ ۲۔ ذکی ۳۔ قریشی ۴۔ زور ۵۔ اکبر ۶۔ رشدی
دوسری صف ۷۔ مخدوم ۸۔ وجد ۹۔ رگھونندن راج سکسینہ ۱۰۔ باقی
تیسری صف ۱۱۔ مہندر راج سکسینہ ۱۲۔ شکیب ۱۳۔ میکش

اردو ادب کا مطالعہ

زبان خواہ مادری ہو یا غیر مادری، ادب خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان سب کے مطالعہ کے اصول اور تحصیل کے طریقے تقریباً متحد ہیں۔ متمدن اقوام مادری زبان کو بغیر کسی خاص کاوش کے حاصل کر لینے کو فطری طریقہ سمجھتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس کو ہم فطری طریقہ سمجھتے ہیں اس میں ہماری اکتسابی قوت کا جزو کہاں تک شریک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان، خواہ وہ آغوشِ مادر میں سیکھی جائے یا استاد کے سایۂ شفقت میں، بغیر تکرار اور اعادہ کے حاصل نہیں ہوتی۔ بچہ ولادت کے وقت کوئی زبان بولتا ہوا نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ جس ماحول میں وہ آنکھیں کھولتا ہے اور جن لوگوں سے دوچار ہوتا ہے ان کی آواز اور زبان وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار لگاتار سنتا رہتا ہے۔ جتنی آوازیں اس کے کان تک پہونچتی ہیں وہ اس کے دماغی اعصاب پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ جب بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی زبان ہلا سکے تو سب سے پہلے وہ مفرد الفاظ کو استعمال کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ الفاظ کو جملوں کے ذریعہ ادا کرتا ہے۔ اس طریق تحصیل کے تحت میں اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اعادہ و تکرار کا نفسیاتی پہلو سامنے آئے گا۔ جن جملوں کو بچہ بار بار سنتا ہے ان کا کچھ عرصہ بعد بلا تامل اور بلا اختیار اپنی زبان سے اعادہ کرتا ہے۔

اس طور سے اور انہیں اصول کے بنا پر جب ہم کسی غیر زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو مفرد الفاظ اور مکمل جملوں کو بار بار دہراتے اور انہیں کو لکھ کر مشق و مزاولت پیدا کرتے ہیں۔ مادری اور غیر مادری زبان کے استعمال میں جو فرق ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ مادری زبان کے سننے اور بولنے کے موقعے ہم لوگوں کو بہ نسبت غیر مادری زبان کے زیادہ ملتے ہیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو نوجوان کسی غیر ملک میں جا کر کسی خاندان میں قیام پذیر ہوتے ہیں تو وہ جلد تر وہاں کی زبان اور اس کے روزمرہ اور اور محاورں پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس تمہید کی غرض یہ ہے کہ ہم اس بین اصول کو پوری طرح ذہن نشین کر لیں کہ زبان اور ادب خواہ وہ کسی ملک کا ہو اکتسابی ہے نہ کہ وہبی۔ انفرادی استعداد، ذہانت اور طباعی کا اثر ادب کی تحصیل اور تخلیق میں اکثر پایا جاتا ہے۔ مگر ان فطری صلاحیتوں کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص محض ذکاوت اور طباعی کے بھروسے پر رہ کر بغیر محنت اور کسب کے زبان پر قدرت حاصل کر لے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بغیر کد و کاوش اور بغیر محنت و جانفشانی کے کوئی علم یا ادب حاصل نہیں ہو سکتا۔

عرصۂ دراز تک اردو زبان کی تحصیل اور صحت کا دار و مدار اہل زبان ہونے پر غلط فہمی سے مانا جاتا تھا۔ جو لوگ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے ہوتے انہیں کو یہ طغرائے کمال حاصل تھا کہ وہ صحیح زبان لکھنے اور بولنے کے اہل سمجھے جاتے۔ اس کمزور نظریہ کی سبب سے اردو زبان کی ترقی کو بہت بڑا نقصان پہونچا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی معمولی ذہانت اور عقل و فہم کا انسان اگر کافی توجہ اور تندہی سے کسی ادب کا عموماً اور اردو کا خصوصاً بالاستیعاب مطالعہ کرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کچھ عرصہ میں اس پر قابلِ رشک قدرت نہ حاصل کر لے۔ ہمارے ادیبوں میں اکثر و بیشتر جن کو لکھنؤ یا دہلی کے شہری ہونے کا فخر نہیں حاصل تھا، باوجود اس امر کے وہ آسمانِ ادب کے درخشاں ستارے مانے جاتے ہیں اور ان کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ شبلی، حالی، نذیر احمد، عبد الماجد دریاآبادی

سید سلیمان ندوی، عبدالسلام، مہدی حسن، وہ اہلِ قلم ہیں جن کو براہِ راست دہلی یا لکھنؤ سے کوئی واسطہ نہ تھا پھر بھی ان کے علمی کارنامے ایسے وقیع اور ٹھوس ہیں جن کی اہمیت سے کوئی ادیب انکار نہیں کر سکتا۔

اب زمانہ آگیا ہے کہ ہم کو ایسے پیش پا افتادہ اور فرسودہ نظریوں سے انحراف کرنا ہوگا۔ دہلی اور لکھنؤ کی مرکزیت کے خیالات نے اردو کی لسانی ترقی کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔ جو الفاظ یا محاورے قدیم دہلی یا لکھنؤ کے شعراء کے کلام میں نہیں ملتے تھے، ان کو ثقہ حضرات مستند نہیں مانتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کو اس امر کا دھندلا سا بھی خیال نہیں ہے کہ زبان انسانی جذبات اور خیالات کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔ جیسے جیسے ہماری ضروریاتِ زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور نئی چیزوں کا انکشاف ہوتا جاتا ہے انہیں کے ساتھ ساتھ نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں بھی معرضِ وجود میں لائی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو ہمارے وہ شعراء اور ادبا جن کو قدامت پرستی پر اصرار ہے پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ وہ اس امر کو فراموش کر جاتے ہیں کہ وہ الفاظ اور محاورے جو متقدمین شعرا کے زیرِ استعمال تھے ان میں سے اکثر و بیشتر اب متروک سمجھے جاتے ہیں اسی طور سے جن محاوروں کو وہ ان دنوں اپنے استعمال میں لاتے ہیں ایک عرصے کے بعد وہ بھی پس پشت ڈال دئے جائیں گے۔ کسی زبان کا لغت دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر دسویں سال اس کے الفاظ میں معتد بہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ یورپین زبانوں میں ہمسایہ زبانوں کے الفاظ کثرت سے ایک دوسرے کی زبان میں داخل کر لئے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد انگریزی زبان کی جو لغات شایع ہوئی ہیں ان میں غیر زبانوں کے بہت سے نئے الفاظ درج ہیں جو اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ جب قومیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو ان کے الفاظ سے بھی کافی متاثر ہوکر بہت سے خارجی الفاظ کو اپنا بنالیتی ہیں۔

ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم چند تجاویز طلبہ کی ہدایت کے لئے پیش کرتے ہیں تاکہ اس پر عمل پیرا ہوکر اردو ادب سے نہ صرف آشنا ہوں بلکہ اس پر کافی دست گاہ حاصل کر سکیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ملکی ادب کو اسی اہمیت اور شغف کے ساتھ حاصل کریں جس طرح ہم انگریزی ادب کی تحصیل میں اب تک مصروف رہے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہم منتخب اور اعلیٰ پیمانے کے شاعروں، ادیبوں اور نثاروں کی کتابوں کو توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں اور الفاظ اور محاورات کی تحقیق کریں اور یہ کام ہم اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب کہ ہم مستند لغات کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ بار بار کے مطالعہ سے جملوں کی ساخت اور الفاظ کے استعمال ہمارے جزو دماغ ہوجائیں گے اور ہم لکھنے اور بولنے وقت بلا اختیار انہیں جملوں اور لفظوں کا اعادہ کریں گے۔ کسی بلند، غامض اور حکیمانہ خیالات کے اظہار کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم زبان کے مختلف الفاظ اور ان کے استعمال سے پوری طور پر واقف ہوں۔ ہمارے طلبہ اردو لغت کو بھولے سے بھی ہاتھ نہیں لگاتے ہیں اس لئے الفاظ کے مختلف معنی اور جو اوزان ہیں ان سے ناواقف رہتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کو ایک تولہ وزن کے الفاظ استعمال کرنا چاہیے وہاں غلط فہمی اور نادانی کی وجہ سے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کا وزن ایک سیر سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ادب کے باقاعدہ مطالعے کے لئے ضروری ہے کہ ہم چند ضمنی اور ضروری علوم سے بھی ایک گونہ واقفیت رکھیں مثلاً کوئی شخص اردو یا فارسی علم و ادب پر پوری قدرت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس کے ادبی نکات کو سمجھ سکتا ہے اگر وہ مذہبی تلمیحات، اعتقادات اور روایات سے ناواقف ہے۔ ہمارے شعرا، متقدمین ہوں یا متوسطین مذہبی جذبات اور روایات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ان کا کلام جگہ جگہ پر مذہبی تلمیحات سے پُر ہے۔ محسن کاکوروی کے نعتیہ قصائد یا مومن، غالب اور ذوق کے قصائد اور غزلوں کو بغیر مذہبی معلومات سے واقفیت حاصل کئے ہوئے کوئی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ ید بیضا، کوہ طور، جنت عدن، جنت الماوا، تحت الثرا، رستخیز، شجر طوبیٰ، لن ترانی، گلزار ابراہیم، آتش نمرود وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو مذہبی روایات سے بیگانہ شخص کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح موٹے موٹے تاریخی واقعات سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ شاعر یا مصنف جس زمانے میں پیدا ہوتا ہے وہ اس دور کے مذہبی، معاشری، سیاسی اور اخلاقی ماحول سے کافی طور پر متاثر ہوتا ہے لہذا اس زمانے کے اخلاقی، تاریخی واقعات سے بغیر واقف ہوئے کوئی طالب علم شاعر کے ادبی رجحانات اور اس زمانے کی تحریکوں سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح شاعر کے مفصل سوانح حیات اور اس کے معاصرین کے خیالات اور حالات کا ایک حد تک جاننا بھی بہت ضروری ہے اس لئے کہ شاعر کبھی تو آپ بیتی اور کبھی جگ بیتی واقعات قلمبند کرتا ہے۔ جس وقت شاعر اپنے زمانے کی بلندی یا پستیٔ اخلاق کا ذکر کرتا ہے تو اس پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کس تاریخی دور سے ہو کر گزرا ہے اس زمانے کے افراد یا جماعت کے اخلاق بلند یا پست تھے۔ میر حسن اپنی مثنوی کو شاہزادہ بدر منیر کی زبان سے ایک فرضی قصے کو نظم کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ لکھنؤ کے معاشری اور سیاسی حالات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ مثنوی بدر منیر کے مطالعے سے لکھنؤ کی سوسائٹی کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس لئے تاریخی واقعات سے ایک گونہ واقفیت بھی ادب کے مطالعے کے لئے ضروری ہے۔

اگر یہ کلیتہً صحیح ہے کہ ادب حیات انسانی کے مختلف شعبوں کی ترجمانی کرتا ہے تو ہم اس نتیجہ پر بلا تامل پہنچ سکتے ہیں کہ بغیر حیات انسانی کی گہرائیوں کو سمجھے ہوئے ہم کسی ادب پر حاوی نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے رموز و نکات کو سمجھ سکتے ہیں۔ جو شخص انسانی جذبات کی پیچیدگیوں اور بوقلمیوں سے ناواقف ہوگا یا ذہنی شعور کے مختلف پہلوؤں کو نہ جانتا ہوگا وہ رنج و غم، حسرت و یاس، وصل و فراق، کامیابی اور ناکامیابی، نقصان اور فائدہ، بغض و کینہ، ہمدردی اور سنگ دلی، رقابت اور دوستی کی نفسی کارفرمائیوں سے بے بہرہ رہے گا اور جب کہ شاعر اپنے واردات قلب کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر مزین کرے گا تو وہ شخص جو نفسیات انسانی کی مبادیات سے بھی ناآشنا ہو کماحقہ شاعر کے حقیقی مافی الضمیر کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے جو شخص عادت کے فلسفہ کو نہ جانتا ہو اور اس کی زبردست طاقت سے ناواقف ہو وہ غالب کے اس مشہور شعر کے اصلی مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا ؎

صد بار دام عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

یا نواب شیفتہ محل کا یہ شعر ؎

کہتا ہے کون یار کی محفل اُداس ہے
کوئی نہیں اُداس مرا دل اُداس ہے

اس شعر کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کو یہ معلوم ہو کہ ہماری دنیا ہمارے جذبات اور خیالات کا عکس ہوا کرتی ہے جس کی طبیعت مضمحل یا پژمردہ نہ ہوئی ہو وہ اس شعر سے بھلا کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

میری آخری تجویز یہ ہے کہ ادب اردو کا مطالعہ بے لاگ سچائی اور ذہنی ایمان داری کے ساتھ کرنا چاہیے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ادیب اور ناقد جب کسی سے خوش ظن ہوتے ہیں تو اس کے کلام کے ہر پہلو کی تعریف کرتے ہیں خواہ بلند پایہ کلام نہ ہو اسی طرح سے اگر وہ کسی سے بدظن یا ناخوش ہوتے ہیں تو اس کا کلام خواہ کتنا ہی پُر معنی اور پُر مغز کیوں نہ ہو پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے یہ رویہ اصولِ تنقید کے منافی ہے۔ کلام کو پرکھتے وقت اس کے حسن و قبح پر یکساں نظر ڈالنی چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم شاعر سے خوش ظن ہیں یا بدظن۔ ذاتی مناقشات اور اختلافِ رائے کو پس پشت ڈال کر اور اپنے رذیل جذبات پر قدرت حاصل کر کے ہم کو ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تنقید کا بے لاگ اصول یہ ہے کہ جس کلام میں جتنے محاسن ہیں ان کو سراہیں اور ان کی ادبی خوبیوں اور باریکیوں کو منظرِ عام پر لاویں اور جتنے معائب ہوں ان کو بلا کم و کاست اور بغیر کسی تحقیر و تذلیل کے مہذب طریقے سے جتا دیں۔ اردو ادب کو سب سے زیادہ نقصان ہمارے ذاتی مناقشات اور غیر ضروری اختلافات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے پہونچا ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے کلام کی منصفانہ قدر نہ کریں گے اور ذہنی ایمان داری کو اپنا اصولِ زندگی نہ بنائیں گے ہماری زبان اور ادب کو ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ بغیر یا ہمی ہمت افزائی اور قدر دانی کے ہونہار اہلِ قلم اپنی محنت اور جاں کاہی کے ثمرہ سے ہم کو فیض یاب کر سکتے ہیں۔

م حفیظ سیّد

فنِ انشا پردازی۔ اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب، مضمون نگاری اور انشا پردازی کے راز اور فن تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں ہر قسم کے موضوعوں پر لکھنے کی ترکیبیں اور انشا پردازی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل۔ اوسط تقطیع۔ ۱۱۶ صفحات قیمت ۱۲/ عہ

اردو کے اسالیب بیان۔ اردو نثر نگاری کی تاریخ جس میں آغاز سے عہد حاضر تک کے بلند پایہ اور معیاری اردو انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسلوب کی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے موجودہ نثر نگاروں کے اسالیب پر جداگانہ اور مستقل تبصرہ جدید اردو نثر کے رجحانات اور اس کے مستقبل کے متعلق مشورے۔ طبع سوم۔ ۱۷۶ صفحات قیمت ۱۲/ عہ

میر حسن ایم اے

۹۶ / ۱۵ جولائی

عظیم آباد

S. A. M. SHAD

PATNA

حبیب محتشم عزیز مکرم دام لطفکم بعد سلام شوق و اشتیاق دیدار کے واضح ہو

حیدرآباد دکن ہمایوں نگر . صغرا منزل
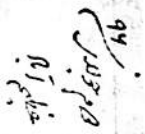
عکس خط شاد عظیم آبادی

محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا
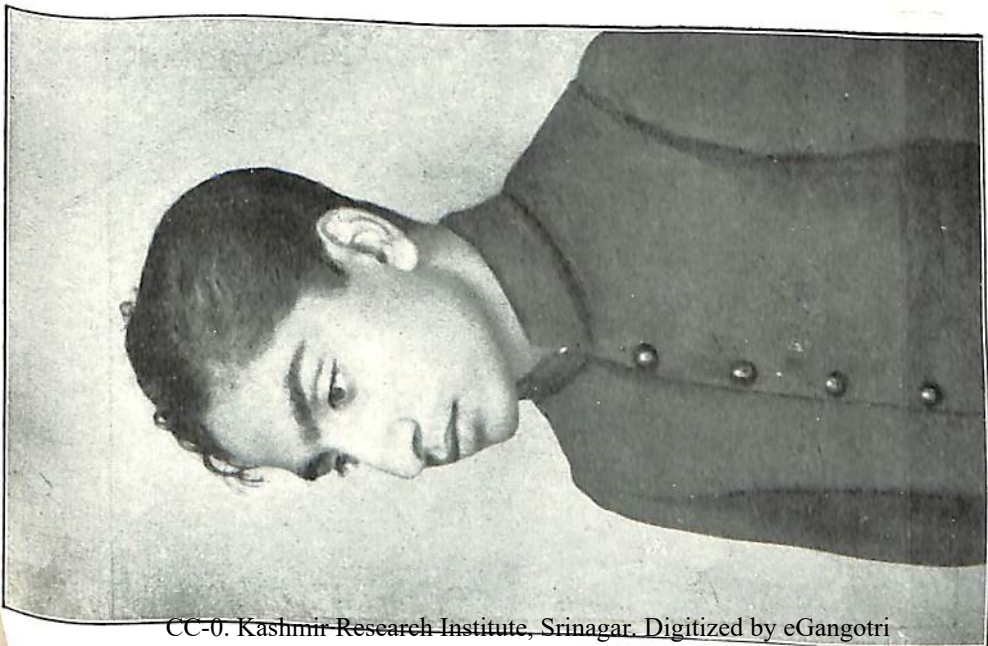
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

دکنی بولی

(یہ مضمون لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا تھا۔)

دکنی بولی آج اردو زبان کی ایک شاخ ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اپنے آغازی دور میں اور اس کے بعد بھی کئی سو سال تک اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی وہ زبان ہے جو گولکنڈہ، بیجاپور اور دکن کی دوسری سلطنتوں میں ایک عرصے تک تعلیم یافتوں کی معیاری تحریری اور بول چال کی زبان کی حیثیت سے راج کرتی رہی ہے۔

دکنی زبان کی اہمیت اور اس کے نشوونما کے خاص حالات پر غور کرنے کے لئے اردو زبان کی تاریخ میں سیکڑوں سال پیچھے کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اردو زبان جیسا کہ سب جانتے ہیں، فارسی بولنے والے مسلمانوں اور کھڑی بولی بولنے والے ہندوؤں کے پنجاب میں میل جول کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ صوبہ ہے جہاں سلطان محمود غزنوی کی حکومت بڑے عرصے تک قائم رہی۔ اس کے بعد محمد غوری کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں بھی اردو کے خدوخال موہوم ہی رہے۔ اور اس میں انفرادیت یا شخصیت کا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

خلجیوں کے دور میں اردو، جس نے پنجاب میں جنم لیا تھا، علاءالدین خلجی کے ساتھ دکن پہنچی۔ یہاں اس کی پرورش شمال سے بالکل مختلف اور دکنی طبائع کے میلانات کے مطابق جداگانہ قسم کے ماحول اور اثرات کے تحت ہوئی۔ دکن کی یہ اردو دکنی کہلانے لگی۔

دکنی زبان نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے عروج کے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ اس میں سو ڈیڑھ سو سال تک ادبی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شمال میں اردو صرف بول چال کی زبان تھی۔ علم و ادب شعر و شاعری یہاں تک کہ خط و کتابت کی زبان بھی ایرانی تھی۔ شمال میں اردو سے بے توجہی اور ایرانی کے فروغ کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں صدیوں تک ایرانی علماء اور شعراء کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ اور سرکاری زبان بھی ایرانی ہی تھی جسے ہندوؤں کے لئے بھی ملازمت کے لئے ضروری قرار دے کر راجہ ٹوڈرمل نے ترقی کی رفتار اور تیز کر دی۔

برخلاف اس کے دکن کے حالات شمال سے مختلف رہے۔ ہندوستان کے اس حصے پر زیادہ تر یورشیں شمال ہی کی طرف سے ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس زمانے میں بندھیاچل کو عبور کر کے دکن پہنچنا بڑی زحمت کا باعث ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی سلطنتوں میں سالہا سال تک امن رہا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہوئے اور ایک مخلوط دکنی تمدن کی بنیادیں قائم ہوئیں۔

اردو زبان اور ادب کے دکن میں فروغ پانے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کی عدالتی اور سرکاری زبان دکنی تھی۔ اس کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے بیشتر بادشاہ نہ صرف خود عالم اور اہل قلم تھے بلکہ علم و ادب کی سرپرستی بھی بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔

ان سازگار حالات اور شاہی سرپرستیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے عالموں نے دکنی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ابتدا ایرانی ادب کے زیر اثر شعر و شاعری سے ہوئی۔ اور تقریباً تمام مروجہ اصناف شعر مثلاً قصیدہ، مثنوی، رباعی، مراثی، اور غزل میں درباری شعرا نے خوب زور دکھلایا۔

اس عہد کے مشہور شاعروں میں غواصی، ابن نشاطی، ملا قطبی، جنیدی، سعدی، نوری، شاہی، مرزا، طالب، مومن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جن میں سے بعض کے کلام کے نمونے "اردو شہ پارے" میں شایع ہو چکے ہیں۔

مرثیہ گوئی کو اس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ کیونکہ شعرا مرثیہ گوئی کو دین اور دنیا دونوں کی بہتری کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ مرثیے سنا کر ایک طرف درباروں میں انعام پاتے تھے اور دوسری طرف انھیں ثواب اور نجات کی بھی امید تھی۔

بیجاپور کے عادل شاہی دربار کے شاعروں میں نصرتی، ہاشم، مرزا، امین، شاہ ملک اور مومن قابل ذکر ہیں۔

دکنی دور کی نثری تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت ملا وجہی کی "سب رس" کو حاصل ہے۔ جو ۱۰۴۵ء میں یعنی آج سے تقریباً تین سو سال قبل لکھی گئی۔ یہ اردو زبان کی سب سے پہلی نثری تصنیف سمجھی جاتی ہے اور انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے چھپ کر شایع ہو چکی ہے۔

ملا وجہی سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ کا درباری شاعر تھا۔ سب رس اسی بادشاہ کے حکم سے شایع ہوئی۔ قدیم دکنی اردو نثر کے بعض نمونے اس سے پہلے کے بھی ملفوظات اور مذہبی رسائل کی شکل میں ملتے ہیں۔ لیکن "سب رس" ایک مکمل اور جامع تصنیف ہے۔ اس سے پہلے کی کسی کتاب میں ایسی خوبیاں پائی نہیں جاتیں، جو گولکنڈہ کے اس مصنف کی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ سب رس کا موضوع حسن و دل کا قصہ ہے جو تمثیلی پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ نثر مقفیٰ ہے اس کے باوجود زبان سادہ سلیس اور شگفتہ ہے۔ وجہی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں بعض مقامات پر دکنی زبانوں مثلاً تلنگی اور مرہٹی کے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کیے ہیں۔

دکنی ادب کی ترقی کے سلسلے میں اس وقت تک جن لکھنے والوں کا ذکر ہوا تقریباً ان سب کی شہرت بیسویں صدی کے اوائل تک مقامی رہی۔ دکن کا پہلا شاعر جس کا کلام نہ صرف سارے دکن میں مقبول ہوا بلکہ جس نے بندھیاچل کو عبور کر کے شمالی ہندوستان کو بھی مسخر کر لیا ولی تھا۔ ولی اورنگ آبادی کا کلام جب شمال پہنچا تو اہل کمال نے اس کی دل سے قدر کی۔ یہ ولی ہی کا اثر تھا کہ شمال میں حاتم، آبرو، آرزو اور دوسرے اساتذہ نے پہلی دفعہ اردو میں شعر کہنا شروع کیا جس کا ثبوت خود ان کے کلام سے ملتا ہے۔ ولی کے اثرات سے دکنی الفاظ اور محاورے شمالی ہند کے متقدمین کے کلام میں کثرت سے داخل ہوئے اور اپنی دل آویزی اور انوکھے پن کی وجہ سے ادب میں ایسے رچ گئے کہ متوسطین کے کلام میں بھی اس کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

شمال میں اردو نویسی کو مزید تقویت یوں بھی ہوئی جب شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ گولکنڈہ کے شاہی کتب خانہ کی نادر دکنی کتابیں دلی پہنچیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ادبی ذوق رکھنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اردو شعر و نثر کا دور شمال میں بھی شروع ہوگیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ شمال اور جنوب کے درمیان کی رکاوٹیں روز بروز دور ہوتی گئیں۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کی آسانیوں نے دور افتادہ مقامات کو بھی گویا ایک دوسرے سے قریب کردیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کے سارے حصوں کی انفرادیت اور مقامی خصوصیات پر کل ہند اثرات حاوی ہونے لگے۔ بہت جلد وہ زمانہ آگیا جب کہ دکنی ادبی زبان کے لئے ناموزوں ہوگئی اور ناموزوں سمجھی جانے لگی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند اور خاص طور پر دلی اور لکھنؤ کی زبان نے معیاری زبان ہونے کا امتیاز حاصل کرلیا۔ اس انقلاب کی وجہ صاف ہے جو یہ ہے کہ جس حصۂ ملک کے اہل قلم تصنیف و تالیف میں پیش پیش رہتے ہیں وہیں کی زبان معیاری اور قابل تقلید بن جاتی ہے۔

دکن میں جس وقت تک علم و ادب کا زور رہا دکنی معیاری زبان بنی رہی گو اس کا دائرہ مختلف وجوہات کی بنا پر بہت بڑی حد تک محدود ہی رہا۔ اور جب شمال میں ایک سے ایک بڑے اور باعظمت شاعر اور نثر نگار پیدا ہونے لگے جنھوں نے اپنی تحریروں سے اردو کو غیر فانی بنا دیا تو انہیں کی زبان لازمی طور پر ادبی زبان کے رتبہ پر پہونچ گئی۔

معیاری اردو نے شمالی ہند میں جنم لیا لیکن آج وہ تمام جغرافی پابندیوں سے آزاد ہوکر سارے ہندوستان کے تعلیم یافتوں اور انشاپردازوں اور شاعروں کی زبان ہے۔ دکنی اپنی خاص دلکشیوں کے باوجود ایک مقامی بولی ہوکر رہ گئی ہے اس کے بولنے والوں میں دکن کے دیہات کے رہنے والے اور شہروں اور اضلاع کے ان پڑھ باشندے ہیں۔ تعلیم یافتوں کے اثر سے شہر کے عوام کی زبان تو آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مصداق ہے لیکن بعض اضلاع والوں کی زبان باہر کے اثرات سے اس وقت تک اس قدر محفوظ ہے کہ ان سے باتیں کرنے میں "سب رس" پڑھنے کا لطف آجاتا ہے۔

بازاری دکنی بڑی پرلطف بولی ہے جو دکن اور خاص طور پر ریاست حیدرآباد کے شہری علاقوں میں بے تکلف رائج ہے۔

میر حسن

فاتحۂ سالانہ

آج مصروف نظر آئے نہ کیوں ریحانہ
کیسے دم ساز کا ہے فاتحۂ سالانہ

عورتیں آئی ہیں کثرت سے محلے والی
اس بڑے گھر میں جگہ رہ گئی ہے کم خالی

یہ جو پھیلا ہوا سامان ہے بریانی کا
فرض کرتی ہے ادا اس کی نگہبانی کا

اک یہی فرض نہیں، اس کے فرائض ہیں کئی
آگئی کوئی عزیزہ تو یہ ملنے کو گئی

عورتیں خاص عزیزوں میں کم ایسی ہوں گی
جو کسی خاص سبب ہی سے نہ آئی ہوں گی

کام بھی کرتی ہے باتیں بھی کئے جاتی ہے
داد سنجیدہ خیالی کی لئے جاتی ہے

۲

حیرت انگیز ہے اس کا "عمل آرا" عالم
زعفراں حل کبھی کرتی ہے کھرل میں مبہم

گوشت بنوائی ہے بیٹی کی مدد سے گاہے
جو ہو خوددار وہ اوروں سے مدد کیوں چاہے

دیگ کے نیچے کبھی آگ یہ بھڑکاتی ہے
چہرہ تپتا ہے تو دم بھر کو سرک جاتی ہے

کبھی یخنی کے مصالح کی یہ لیتی ہے خبر
غرض، آتی ہے نظر گاہ ادھر گاہ ادھر

جب کسی کام میں دیتی ہے بہو اس کا ساتھ
کام کرتی ہوئی کر لیتی ہے کچھ کام کی بات

یاں بہو، منتظرِ حکم ہے باہر بیٹا
دل کسی کام میں اس کا نہیں ہوتا ہیٹا

۳

عمر چالیس[40] کے لگ بھگ ہے مگر اس پر بھی
نظر آتی ہے یہ فی الحال جواں ہمت ہی

چلن اس غم زدہ بی بی کا شریفانہ ہے
سبق آموزِ جہاں عصمتِ ریحانہ ہے

زخمِ دل ہے ستمِ ہجرِ دوام شوہر
آہ کس طرح بھلا دیتی یہ نام شوہر

کون یاد آئے گا پھر گر نہ اسے یاد کیا
جس نے اکیس[21] برس ہر جہتی ساتھ دیا

بست و یک سالہ رفاقت کا اثر کیا کہنا
اس کو آسان ہے اب اس کی ہی دھن میں رہنا

پختہ کارانہ تصور پہ ہیں اس کے سب ڈھنگ
ایک تصویر میں برسوں سے بھری جاتی ہے رنگ

یہ مناتی ہے جس انداز سے یوم شوہر
اس کے ہر سال ہوا کرتے ہیں چرچے گھر گھر

علی منظور

سرسید احمد خاں

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی
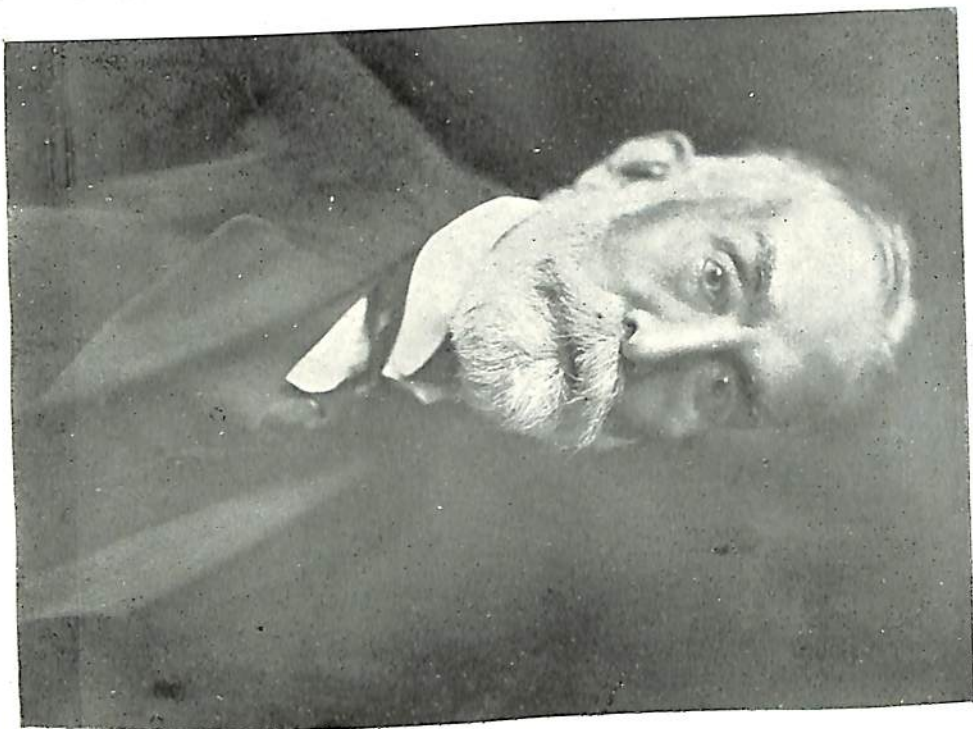
مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا اسد اللہ خاں غالب

حیدرآباد تا دلّی

ایک انگریزی مثل ہے کہ "بعض واقعات قصہ کہانیوں سے بڑھ جاتے ہیں" حیدرآباد سے چلتے وقت مجھے شان گمان بھی نہ تھا کہ ایسا کوئی واقعہ خود مجھے پیش آنے والا ہے۔

چھتیس ۳۶ گھنٹے کے لگاتار سفر سے وحشت تو ضرور تھی مگر یہ کیا خبر تھی کہ راستے میں یہ وحشت دہشت کا رنگ اختیار کر لے گی۔ ۲۷ نومبر کو گھر سے چلا اسٹیشن پر یار دوست چھوڑنے آئے۔ گھنٹی بجی گارڈ نے سیٹی دی۔ انجن نے چیخ ماری۔ پھیپھوں نے گردش کی۔ گاڑی چلی اور ہم حیدرآبادی سے دلّی والے بننے شروع ہو گئے۔ بعض دوستوں نے دور ہی سے سلام علیک کھینچ ماری۔

بعض ریل کے ساتھ ساتھ چلتے اور ہاتھ ملاتے رہے۔ مگر کہاں تک ذرا سی دیر میں "ایک میں تھا ایک خدا کی ذات تھی" معلوم نہیں مسافروں کو مجھ سے کیا دشمنی تھی کہ ایک بھلا آدمی بھی میرے درجے میں نہیں آیا۔ اور حیدرآباد سے لگا کر دہلی تک میں رہا اور چار ۴ قدم لمبا اور تین ۳ قدم چوڑا درجہ بعض مسافر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خالی درجہ پاکر خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کو اگر وہ واقعہ پیش آئے جو مجھے پیش آیا ہے تو یقین مانیے کہ وہ خالی درجے میں بیٹھنے سے اتنا ہی ڈریں جتنا یو۔ پی کے زمیندار آج کل نئے قانونِ اراضی سے ڈر رہے ہیں۔

ہاں صاحب تو، خیر، گاڑی چلی ہم کھڑکی میں سے جھانکتے اور دیکھتے رہے کہ فلاں صاحب کا گھر سامنے سے گزر گیا، فلاں صاحب کا بنگلہ نکل گیا۔ خیرت آباد کا اسٹیشن آیا، حسین ساگر جنکشن آیا اور گھس گھس، گھس گھس کر کے ریل سکندرآباد پہونچ گئی کہنے کو تو

گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس کی دُم ہے، مگر شاید ہی کوئی اسٹیشن ہوگا جہاں یہ سستانہ لیتی ہو۔ شوال کی پانچویں شب تھی۔ تھوڑی سی دیر میں چاندنی غائب ہو گئی۔ اس لئے ناچار کچھوے کی طرح گردن کھڑکی سے اندر کر لی جھلملیاں چڑھا دیں۔ بستر پر سے کوئلے کے ریزوں کو جھٹکا اور چادر اوڑھ سونے کی تیاری کی۔ مگر جو شخص رات کے گیارہ بارہ بجے سوتا ہو اس کو بھلا نو بجے نیند کیوں آنے لگی تھوڑی دیر لوٹتے پوٹتے خیال آیا کہ اوہو ابھی تک نماز تو پڑھی ہی نہیں لاؤ وہ بھی پڑھ لیں۔ غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور نماز کو کھڑے ہو گئے مگر ریل کے جھٹکوں کی وجہ سے بیٹھ جانا پڑا۔ خیر نماز تو ہو گئی مگر کیسی ہوئی یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کتاب اٹھائی کہ شاید پڑھنے ہی میں کچھ وقت کٹ جائے مگر سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ اس وقت خیال آیا کہ یار اگر اس وقت افیون ساتھ ہوتی تو مزا آ جاتا۔ میں اوپر کے درجے میں سفر کرنے والوں کو صلاح دیتا ہوں کہ وہ سفر میں اپنے ساتھ افیون کی دو چار گولیاں رکھ لیا کریں تاکہ اگر سفر دور کا ہو اور درجہ خالی ملے تو یہ گولیاں "داشتہ آید بکار" بن سکیں۔

جعفر زٹلی فرماتے ہیں "گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است" سوچے کہ لاؤ افیون نہ سہی سگریٹ ہی سے اس کمی کو پورا کریں۔ ڈبہ پاس تھا کھولا اور سگریٹ پر سگریٹ دھنکنے شروع کیے۔ لیکن اس کے دھوئیں نے دماغ میں وہ خشکی پیدا کی کہ رہی سہی نیند اور بھی اڑ گئی۔ دس بجے قاضی پیٹھ پہونچے، وہاں ہماری گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس میں جڑنے والی تھی اور اس گاڑی کے آنے میں دیر تھی اس لئے پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کیا مگر یہ چہل قدمی

چالیس قدم کے اندر ہی رہی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ ذرا ادھر
ادھر ہوئے اور مال دوستوں کا ہوگیا۔ خدا خدا کر کے
مدراس کی گاڑی آئی اور ہم مشرق کی بجائے شمال کی طرف
چلنے شروع ہوئے۔ یہاں جس حصۂ ملک میں سے ریل گزرتی
ہے اس میں انسانوں سے زیادہ جانور آباد ہیں اور چونکہ
وہ مسافروں کو اتارنے چڑھانے بہت کام آتے ہیں اس لئے
یہ اسٹیشن اکثر سنسان کف دشت میدان بنے رہتے ہیں
ہاں اگر کبھی کوئی شیر یا چیتا ادھر آنکلتا ہے تو ذرا چہل
پہل ہوجاتی ہے۔ بہر حال ریل چلتی رہی اور ہم بنچ پر لوٹ
مارتے رہے۔ اسٹیشن آتا تو کھڑکی کھول کر ذرا جھانک لیتے
اور اگر کوئی اللہ کا بندہ نظر آجاتا تو اسی سے پوچھ بھی لیتے کہ
"بھئی یہ کونسا اسٹیشن ہے" مگر وہ ذات شریف کچھ ایسے
لہجے میں جواب دیتے کہ اس کا سمجھنا ہماری عقل سے
باہر ہوتا۔ خدا خدا کر کے رات کے چار بجے بلہار شاہ اسٹیشن
آیا اور اس وقت ذرا طبیعت بحال ہوئی کہ چلو اب صبح
قریب ہے اور کچھ نہیں تو کم سے کم آدمیوں کی شکلیں تو
دکھائی دیں گی۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد پو پھٹی، مشرق
کے کنارے سرخ ہوئے اور جھپٹ سے صبح ہوگئی۔ اس روز
صبح ہونے کی جس قدر خوشی مجھے ہوئی ہے وہ بیان نہیں
ہوسکتی رات کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ میں اکثر سوچا
کرتا تھا کہ شاعر شبِ فراق اور عالمِ تنہائی کا رونا اس قدر روتے
ہیں مگر جب دیکھو تن تازہ موچھوں پر تاؤ دیتے نظر آتے
ہیں۔ ریل میں اس رات کے گزارنے کے بعد یہ مسئلہ بآسانی
حل ہوگیا اور پتہ چلا کہ واقعی شبِ فراق ان بیچاروں پر
سخت گزرتی ہے مگر صبح کی آمد پھر ان کو جیسے کا ویسا
کردیتی ہے۔

کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے واردھے کا اسٹیشن آیا۔ آج کل
اس اسٹیشن نے ریل کی آمدنی بہت بڑھا دی ہے۔ ذرا کہیں
کچھ گڑبڑ ہوئی اور چل مرے یار واردھے کو۔ یہاں ہم نے
وہ کنکنا بادامی رنگ کا پانی پیا جس کو عرفِ عام میں چائے
کہا جاتا ہے کوئی بیس برس کی بات ہے کہ ہمارے محلہ میں
ایک شخص کافی بیچنے آتا اور بڑے سخت لہجے میں آواز
لگایا کرتا تھا کہ "کافی ایٹ گرم" چنانچہ اس کا نام ہی "کافی
ایٹ" پڑ گیا تھا۔ خوب بکری ہوتی تھی مگر خدا معلوم کیا بات
ہوئی کہ اس نے یہ چلتا ہوا دھندا چھوڑ ہمارے ہاں
نوکری کرلی۔ ایک دن سب نے اس سے فرمایش کی کہ کافی
بناؤ۔ اس نے پانی دیگچی میں چڑھا، خدا معلوم کیا کیا الابلا
ڈال کافی بنا ہمارے سامنے لا رکھی۔ آپ یقین مانیے کہ
اس کافی کے تھے تو دس بارہ اجزا مگر اس میں بن نام کو
نہ تھے۔ اسی نمونے کی وہ چائے ہوتی ہے جو اسٹیشنوں پر
ملتی ہے اور زہر مار کی جاتی ہے۔

میں پالیٹکس سے ہمیشہ دور رہتا ہوں مگر خبر نہیں کہ
یہ واردھے کی چائے کا زور تھا یا وہاں کی آب و ہوا کا
اثر کہ ایک دفعہ ہی میرے خیالات پولیٹیکل ہوگئے اور
ان خیالات کا وہ زور بندھا کہ بڑی مشکل سے یہ زور
ساڑھے نو بجے ناگپور کے سنتروں کی ترشی سے اترا۔ میں
ہر اس مسافر کو جو ناگپور پر سے گزرتا ہے آگاہ کئے دیتا
ہوں کہ اسٹیشن پر سنتروں کی جو ٹوکریاں بکنے آتی ہیں
ان کو ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں ورنہ بھئی وہ جانے اور
ان کا کام جانے۔ انگریزی کی ایک مثال ہے کہ "ہر وہ چیز
جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی" اسی طرح سمجھ لو کہ "ہر وہ چیز
جو [illegible] ہوتی ہے سنترہ نہیں ہوتی" ہم نے بھی

ایک ٹوکری خریدی۔ پہلے بارہ آنے مانگے گئے آخر جب ریل
چلنے لگی تو دو آنے پر تصفیہ ہوا۔ چلتی گاڑی سے ہم نے
دوانی باہر پھینکی اور اس نے سنتروں کی ٹوکری اندر لڑھکا
دی ٹوکری میں سے جو سنترے نکلتے ہیں وہ بس دیکھنے کے
قابل تھے۔ کھانے کے کام کے تو تھے نہیں۔ ہاں خاصہ بھلا
چنگا آچار تھا۔ اوپر کی تہ ذرا اچھی تھی، سوچے کہ چلو دو آنے
میں چھ سنترے ہی کیا بُرے رہے۔ ایک کو چھیلا پھانک کو
صاف کیا، بیج نکال کر پھینکے پھانک منہ میں رکھی اس کے
بعد کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوا۔ بس یہ سمجھ لو کہ کھٹاس افعل التفضیل
کے صیغہ کے ساتھ منہ میں داخل ہو گئی۔ گھبراہٹ میں
بغیر سوچے سمجھے کلی کی نتیجہ یہ ہوا کہ دانت بیکار ہو گئے
ذوق مرحوم فرماتے ہیں ؎

دشنام ہو کے ترش وہ مجھ کو ہزار دے
یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اگر جاڑے میں استاد مرحوم ناگپور کے سنترے کھاتے تو
ہرگز یہ شعر نہ لکھتے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کونسے عاشق
ہیں جو جاڑے میں ناگپور کے سنترے کھائیں اور اس
ترشی سے ان کا نشۂ عشق ہرن نہ ہو جائے۔

ناگپور سے آگے جو اسٹیشن پڑتے ہیں ان کو معناً اس لئے
تو اسٹیشن کہا جاسکتا ہے کہ وہاں گاڑی ٹھیرتی ہے ورنہ بغیر
دوربین کے ان کو دیکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ہاں سنترے
ہر جگہ ملتے ہیں اور خدا کے فضل سے کھائے بھی جاتے ہیں بھلا
ناگپور کے سنتروں کا مزہ چکھنے کے بعد میری کیا ہمت ہو سکتی تھی کہ
ان کے خریدنے کا خیال بھی دل میں لا سکتا۔ اس لئے دور ہی سے
ان کا نظارہ کرتا اور کھانے والوں کے کام و دہن کی تعریف
کرتا رہا۔ وقت کسی طرح کاٹے نہ کٹتا تھا اس لئے ناول نکالا
ایک آدھ صفحہ پڑھا تھا کہ پان کا خیال آیا یہ کچھ عجیب بات ہے کہ
جب تک پان منہ میں نہ ہو میں نہ کچھ لکھ سکتا ہوں اور نہ پڑھ
سکتا ہوں۔ دانتوں کی حالت مجھے معلوم تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا
ڈبیا میں سے پان نکالا ڈرتے ڈرتے منہ میں رکھا،
پان منہ میں رکھتا تھا کہ دانت "کرکر" کرنے لگے
آخر پوپلوں کی طرح منہ چلایا تھوڑی دیر میں ترشی کا اثر
ذرا دور ہوا اور پڑھنے میں دل لگنے لگا کوئی بارہ ساڑھے
بارہ بجے ہوں گے کہ پیٹ نے فریاد بلند کی کہ "بیار ہر چہ داری"
کھانے کی گاڑی ریل میں لگی ہوئی تھی دوسرے ہی اسٹیشن پر
کھانا منگوایا۔ یہ تو خدا ہی کو خبر ہے کہ اس میں کیسی کیا کیا
چیزیں۔ مگر بھوک کا وہ زور تھا کہ "زر خوردن" کی گردان
کرتے کرتے ساری رکابیاں صاف کر دیں۔ اس کے بعد
اطمینان ہوا۔ پان کھایا۔ سگریٹ سلگایا اور ناول پڑھنا
شروع کیا۔ پانچ بجے اٹارسی پہونچے۔ یہاں خوب ڈٹ کر
چائے پی۔ ہوشنگ آباد پہونچتے پہونچتے شام ہوگئی۔ سات بجے
بھوپال آیا یہاں میرے ایک عزیز اپنی عنایت سے
بہت مرغن کھانا لائے کھانا اپنی رکابیوں میں الٹ
ان کی پلیٹیں ان کے حوالے کیں۔ بھوپال سے نکلنے
کے بعد خیال آیا کہ کھانا کھا کر اب لوٹ مارو۔ چوبیس
پچیس گھنٹے کے جاگے ہوئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ
بیمار پڑ جاؤ۔ کھانا کھایا عشاء کی نماز پڑھی۔ کھڑکیاں
چڑھائیں۔ دروازوں کے کھٹکے لگائے روشنی گل کی
کمبل تانا اور اپنے آپ کو نیند میں ڈالا۔ نیند تو راہ دیکھ
ہی رہی تھی جھٹ آنکھ لگ گئی۔

خدا معلوم وہ کونسی جگہ تھی کیا وقت تھا کہ ایک دروازہ
کی کھڑکی پٹ سے گری اور اس آواز کے ساتھ ہی میری

آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑکی میں سے کالے دستانے
پہنا ہوا ایک ہاتھ نکلا۔ ساتھ ہی آہستہ آہستہ دروازہ کھلا
اور ایک صاحب سیاہ اوور کوٹ ڈانٹے نقاب منہ پر ڈالے
ایک پستول ہاتھ میں لیئے اندر تشریف لائے اندر آکر انھوں نے
بجلی تو نہیں کھولی ہاں ان کے دوسرے ہاتھ میں جو چھوٹی
سی بیاٹری تھی اس کو روشن کیا۔ مگر روشنی کا رُخ نیچے
کی طرف رکھا اور نہایت متانت سے کہا کہ "اٹھیے" میں
اُٹھ بیٹھا کہنے لگے "لاؤ تمھارے پاس کیا ہے" میں نے
کہا "تین روپے چھ آنے نو پائی اور دلی کا ٹکٹ" کہنے لگے۔
"مذاق کرتے ہو" میں نے کہا "جناب والا ایسی حالت میں
کیا کوئی بھلا آدمی مذاق کر سکتا ہے" مگر نہ معلوم یہ کیا بات
تھی کہ باوجود ایسا نازک موقعہ ہونے کے ان حضرت کا اثر
مجھ پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ پستول ایک خطرناک
چیز ہے مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ یہ کسی پلپلے آدمی کے
ہاتھ میں ہے تو پھر اس کا ڈر ور کچھ نہیں رہتا۔ میں اسی
ادھیڑ بن میں تھا کہ انھوں نے پھر ذرا اونچی آواز میں کہا
"نکالتے ہو یا نہیں" میں نے کہا "بہت اچھا نکالتا ہوں"
یہ کہہ کر میں ذرا جھکا بنچ کے نیچے میرا کالا پمپ شوز پڑا
تھا وہ میں نے اٹھایا اور ایک دفعہ ہی زور سے کہا کہ
"ہیں، یہ دروازہ میں کون ہے" میری اس آواز پر انھوں نے
دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے پمپ شوز کے پچھلے حصے کو
مٹھی میں دبا اور اس کی نوک سامنے کرکے کہا "رکھ دو
پستول نہیں تو گولی مار دوں گا" اب جو وہ میری طرف
مڑ کر دیکھتے ہیں تو ایک زبردست پستول ان کے سینے
کی طرف ہے۔ بیاٹری کی روشنی نیچے پڑ رہی تھی اس لیئے

وہ میرے پستول کی ماہیت کو نہ سمجھ سکے آہستہ سے اپنا
پستول میرے سامنے والے بنچ پر ڈال دیا بیاٹری نیچے
پھینک دی اور دونوں ہاتھ اونچے کرکے کھڑے ہو گئے
میں نے بنچ پر سے ان کا پستول اٹھایا اُٹھ کر بجلی کا بٹن
دبایا۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ ان کے پستول سے زیادہ
میرا جوتا بکار آمد ثابت ہوا۔ میں نے بہت ڈانٹ کر کہا
"سامنے بنچ پر بیٹھ جاؤ" وہ حضرت یا تو اس زوروں سے
آئے تھے یا تھر تھر کانپنے لگے اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے
اٹھ کر چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچوں کہ انھوں نے رونا شروع
کیا اور کہا کہ "خدا کے لیئے زنجیر نہ کھینچیے میں گاڑی سے
کود کر جان دیدوں گی" ہیں! جان دیدوں گی" ایں چہ
معنی دارد۔ میں نے کہا کہ "تم ہو کون" انھوں نے کہا "عورت"
میں نے کہا "نام" کہا "راسخہ" میں نے کہا "سبحان اللہ"
آپ کو دیکھیئے آپ کے کرتوتوں کو دیکھیئے۔ اللہ کی بندی
تجھے گھر میں بہو بیٹی بن کر بیٹھنا تھا یا اس طرح ڈاکے ڈالتے
پھرنا" کہنے لگی "مصیبت سب کچھ کراتی ہے اور رفتار زمانہ
سب کچھ سکھاتی ہے" میں نے کہا "نقاب اتارو" کہنے لگی
"نہیں" میں نے کہا "نہیں؟ تو اچھا میں زنجیر کھینچتا ہوں"
آخر ناچار ہو کر بچاری نے نقاب اٹھائی خاصی اچھی شکل کی
جوان عورت تھی مگر آنکھوں کے نیچے کی کالی کالی لکیریں
بتا رہی تھیں کہ مصیبت زدہ ہے۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے
کو دیکھتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے تیور دیکھ کر سمجھ
گئی کہ میرا ارادہ اس کو پولیس کے حوالے کرنے کا نہیں ہے
کیونکہ وہ ایک دفعہ ہی کھڑی ہو گئی اور کہا کہ "خدا حافظ"
میں نے پستول کا رُخ اس کی طرف کرکے کہا کہ "بیٹھ جاؤ"

اس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا کہ "پہلے پستول کو تو دیکھ لیجئے کہ یہہ چلتا بھی ہے یا نہیں آپ نے جوتے کے پستول سے لکڑی کا پستول چھین کر کوئی بڑا کمال نہیں کیا ہے۔" اب جو میں نے غور سے پستول کو دیکھا تو واقعی لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ گو شکل صورت میں عین مین پستول تھا میں نے کہا "کچھ ہرج نہیں پستول کام دے یا نہ دے۔ میرے ہاتھ پاؤں تو کام دیتے ہیں اب بیٹھتی ہے یا میں اٹھوں" یہہ سن کر وہ بیٹھ گئی اور کہنے لگی "آخر اس سے آپ کا مطلب" میں نے کہا کہ "میں تمھاری داستان سننا چاہتا ہوں"۔ پوچھا "یہ کیوں" میں نے کہا "مضمون لکھنے کو" کہنے لگی "تو اچھا آپ مضمون نگار ہیں اور آپ کا اسم شریف" میں نے کہا "فرحت اللہ بیگ" کہنے لگی "اوہو آپ ہی مرزا صاحب ہیں، آداب عرض کرتی ہوں آپ کے مضمون پڑھتی تھی۔ آپ کو دیکھنے کا شوق تھا چلو وہ بھی اللہ نے پورا کردیا۔ اجی مرزا صاحب! میں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں ایک مصیبت زدہ عورت ہوں۔ ایف اے تک تعلیم پائی ہے۔ چھوٹی عمر میں شادی ہوئی، دو ہی برس کے بعد وہ مرگئے۔ سسرال والوں نے ان کے مرنے کا سبب مجھ کو ٹھیرایا، الزام یہ تھا کہ میں سسرال والوں پر بھاری ہوئی کہ ایک ہی سال میں ایک چھوڑ چار کو کھاگئی، میکے میں آکر رہی وہاں سوتیلے بھائیوں نے ٹکنے نہ دیا۔ آخر ایک بھلے آدمی سے نکاح کرلیا وہ اللہ کے فضل سے ڈاکو نکلے، دن کو گھر میں رہتے اور رات کو خدا معلوم کہاں کہاں جاکر ڈاکہ ڈالتے۔ مجھے بچپن ہی سے ڈاکوؤں اور سراغ رسانوں کے قصے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں ان کے سر ہوگئی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلا کرو۔ پہلے تو وہ "نہیں نہیں" کرتے رہے لیکن بعد میں راضی ہوگئے اور اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں مجھے گھوڑے کی سواری بھی آگئی اور چلتی ریل میں چڑھنے اترنے کی مشق بھی ہوگئی۔ ابھی ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ تبارکؔپور کے گاؤں والوں نے ان کو گھیر لیا اور گولی مار کر شہید کردیا۔" میں نے کہا "شہید کردیا کی بھی بہت ہوئی یہ کیوں نہیں کہتیں کہ جہنم واصل کردیا" کہنے لگی "مرزا صاحب دیکھئے خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں مگر ان کے متعلق اگر آپ نے کوئی برا لفظ زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا" میں نے کہا "تو بیگم صاحبہ آپ چاہتی ہیں کہ میں ایک ڈاکو کی تعریف کروں" کہنے لگی "ساری دنیا ڈاکو ہے کوئی اپنی عقل سے دنیا کو لوٹتا ہے۔ کوئی اپنے ہاتھ پاؤں کے زور سے۔ ایک کی آپ تعریف کرتے ہیں اور دوسرے کی مذمت ورنہ ہیں دونوں ڈاکو" میں نے کہا "اللہ رے تیری منطق، اچھا اس جھگڑے کو تو چھوڑو اور اپنا قصہ ختم کرو" کہنے لگی "اس کے بعد اب قصے میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد سال بھر تک تو اپنی جمع پونجی پر گزارہ کرتی رہی جب وہ ختم ہوگئی تو میں نے اکّا دکّا مسافروں کو لوٹنا شروع کیا۔ چنانچہ خوش قسمتی سے آج آپ سے نیاز حاصل ہوگیا۔ اچھا اب اجازت ہے" میں نے کہا "راسخہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم شریف اور تعلیم یافتہ ہوکر اپنی ڈاکہ زنی پر فخر کرتی ہو" کہنے لگی "اجی مرزا صاحب، مثل مشہور ہے کہ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے رذیل سے ڈرنا چاہیے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ یہ دونوں ایسے خطرناک نہیں ہوتے جتنے بگڑے ہوئے تعلیم یافتہ شریف یقین

مانیے کہ اگر ان لوگوں میں ذرا سی ہمت کا اضافہ ہو جائے تو یہ دنیا کو ہلا دیں۔

وہ تو کہو کہ خدا نے گنجے کو ناخن ہی نہیں دیئے ورنہ کبھی کا کھجا کر خدا معلوم اپنا کیا حال کر لیتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ پیشہ چھوڑ دو۔ میں آج ہی چھوڑے دیتی ہوں مگر میرے کھانے پینے کا تو بندوبست کر دو" میں نے کہا" پھر کسی سے نکاح کر لو" کہنے لگی" کس سے، آپ سے" میں نے کہا۔ " مجھ سے نکاح کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ میری بیوی پکی مغلانی ہے میں نے تو جوتے سے پستول کا کام لیا تھا مگر وہ چپل سے استرے کا کام لے گی" یہ سن کر اس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا" مرزا صاحب، آپ کی باتوں میں آج مزا آ گیا۔ ہاں، لایئے سیدھے ہاتھ سے اب کچھ دلوایئے۔ خدا کی قسم میرے پاس کھانے کو ایک پیسہ نہیں ہے کل سے بھوکی ہوں" میں نے بٹوہ کھول اس کے سامنے کر دیا بٹوے میں کئی نوٹ تھے مگر اس اللہ کی بندی نے صرف دو روپے نکال لئے اور کہا" شکریہ" چلو چلتے چلتے آپ پر بھی ہاتھ صاف کر ہی دیا۔ اچھا فی امان اللہ" یہ کہہ دروازہ کھول ریل سے اس طرح نیچے اتر گئی کہ کوئی گارڈ بھی کیا اترے گا۔ چلتے چلتے اپنی بیاٹری اور پستول بھی اٹھا کر لے گئی۔ میں سوچتا تھا کہ بارالٰہ جب شریف زادیاں اس طرح ڈاکہ ڈالنے پر اتر آئی ہیں تو یہ دنیا کیا رنگ پکڑنے والی ہے۔

گھبرا کر بنچ سے اٹھا، کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے کا کھٹکا اندر سے لگا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یاالٰہی یہ کیا معاملہ ہے بڑی دیر تک غور کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ تیرے چوبیس ۲۴ گھنٹے تک جاگنے، ثقیل غذا کھانے اور سخت بنچ پر پڑے رہنے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ شریف زادیاں تو شریف زادیاں ہی ہوتی ہیں ان کو بھلا ایسے کاموں سے کیا واسطہ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے بٹوے میں سے دو روپے کیوں کم ہو گئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

دردناک مُشاہدہ

(۱۹ نومبر کو انارکلی چوک نیلا گنبد لاہور کا ایک چشم دید واقعہ احسان دانش کے پانچویں مجموعۂ کلام "نقیرِ فطرت" کا ایک ورق)

کل صبح ایک شخص پریشان و مضمحل
پامالِ روزگار، مسرّت سے دُور تر

بیٹھا تھا اِک دوراہے پر غم میں گھِرا ہوا
سانسوں میں جا رہی تھی کھنچی خاکِ رہ گزر

ٹوٹی سی ٹوکری میں سنگھاڑے لئے ہوئے
چلّا رہا تھا "پیسے کے لے جاؤ سیر بھر"

گاہک مگر نہ کوئی بھی آتا تھا اُس کے پاس
حسرت سے اُٹھ رہی تھیں نگاہیں اِدھر اُدھر

۲

اِتنے میں ایک شخص رجسٹر لئے ہوئے
باشان و باشکوہ و باندازِ کرّ و فر

اس کی طرف بڑھا تو یہ سمجھا وہ نامُراد
"میری نوا سے گرم گئی تا دل و جگر"

لیکن یہ جب سُنا "ابے محصول کرا دا"
"بیٹھا ہے صبح صبح دوراہے کو گھیر کر"

منہ رہ گیا کھُلا کا کھُلا، سانس رُک گئی
اُٹھی نہ جھک کے سوگ میں ڈوبی ہوئی نظر

اُس ششدری کے بعد لرزتی زبان سے
کہنے لگا "ہو آپ کا رتبہ بُلند تر"

"آیا ہوں جب سے ایک بھی گاہک نہیں نصیب"
"میں کیا کروں، نہیں مری تقدیر سازگر"

"محصول سے کہاں مجھے انکار کی مجال"
"مہلت ہو اِس قدر کہ جب آپ آئیں لوٹ کر"

اِس التجا پہ طیش محرّر کو آگیا
ٹھوکر لگائی ایسی بچارے کے تان کر

نالی میں گر گئی وہ سنگھاڑوں کی ٹوکری
چپ تھا غریب ضعف سے تھامے ہوئے کمر

۳

یہ ہے یہاں غریب کا معیارِ زندگی
یہ غم زدوں کے حال پہ ہے لطف کی نظر

یہ قدر آدمی کی یہاں آدمی کو ہے
شرمائیں جس کو دیکھ کے جنگل کے جانور

یہ خستہ کامیوں کی مدارات، الاماں!
یہ نامرادیوں پہ عنایات، الحذر!!

یہ فاقہ مستیوں پہ سخاوت کی بارشیں!
ناداریوں پہ یہ ہیں کرم ہائے اہلِ زر!!

یہ مُلک میں ہے عزتِ باشندگانِ ملک
محصول دے سکیں تو کریں زندگی بسر

یہ زندگی پہ جور و ستم ہائے زندگی!
یہ دورِ خودنما "کہ بشر کا خدا بشر"!!

مذہب غلام، روح غلام، آبرو غلام
آزادیٔ ضمیر، نہ آزادیٔ نظر

احسان دانش

موجودہ اردو شاعری

آج کل کی اردو شاعری، گرد و پیش کے اثرات کے لئے جس قدر کشادہ آغوش بن گئی ہے، ایسی کسی زمانے میں بھی نہیں تھی۔ وہ تمام قومی اور ملکی سیاست، عالمی معاشی اور سیاسی افراتفری، نظری اور حکمی علوم کی توسیع اور حسن کاری کے اگلے تخیلات کی تبدیلیاں، جن سے ہماری قومی زندگی متاثر ہو رہی ہے، ان کا تھوڑا بہت عکس، ہماری موجودہ شاعری میں بھی اتر رہا ہے۔

موجودہ شاعری کے پس منظر میں، دو واقعات، بے حد نمایاں اور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پہلا اور سب سے اہم واقعہ، مغربی قوموں سے ہمارا تصادم ہے۔ جس کا انجام بالآخر، ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کی صورت میں ہوا۔ لیکن یہ انجام ہماری شاعری کے لئے چند اہم تحریکوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ انگریزی تسلط کے بعد ہماری شائستہ زندگی کا رخ، ایران سے انگلستان کی طرف پھر گیا۔ ہمارے خیالات، اعتقادات، رہنے بسنے کے طور طریق غرض ہر چیز میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کا اثر ہمارے ادبی تخیلات پر بھی پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ بدلی ہوئی فضا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ہم کو جو جد و جہد کرنی پڑی، اس کا تھوڑا بہت اثر ہماری شاعری پر بھی پڑا۔ اس زمانے میں نئی روشنی کو ہماری زندگیوں میں داخل کرنے کا باعث، اس عصر کے اولین مصلح، سر سید احمد خاں بنے، اور اس تحریک کو شاعری میں، داخل کرنے کا باعث آزاد اور ان سے بڑھ کر حالی تھے۔

حالی کی تحریک کا مقصد، اردو شاعری کو اس کے مخصوص فنی تخیلات سے ہٹانا تھا۔ اس میں ان کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ، فنِ شعر کے نظریہ میں ایک ہلچل برپا ہو گئی اور ہماری شاعری، نیچرل شاعری قومی شاعری، جیسی تحریکوں اور سادہ طرزِ بیان سے روشناس ہوئی۔ لیکن شعر کی صنفیں اور شکل و صورت ابھی تک معرضِ بحث میں نہیں آئی تھی۔ حالی، مروجہ شاعری کے مضامین کے ساتھ، ردیف اور قافیہ کی "اوگھٹ گھاٹوں" سے بھی بیزار تھے۔ لیکن ان کی عملی ذہنیت اصنافِ شعر کو چھیڑنے کا مشورہ نہیں دیتی تھی۔ تاہم یہ تخم بھی بو یا جا چکا تھا، اور طوفان راہیں تلاش کر رہا تھا۔ ایسے میں، دوسرا اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ یورپ کی جنگِ عظیم تھی اس اہم عالمی حادثہ کا اثر، ہماری شاعری پر شاید براہِ راست نہیں پڑا، اس جنگ کے بعد سے عالمی سیاست میں جو گتھم گتھا ہو گئی تھی، اس کے سبب ہم ان اثرات سے، بے تعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

اس جنگ کا اثر دنیا پر کس قدر دوررس ثابت ہوا، اس کا پورا پورا اندازہ ابھی تک بھی نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ سے جہاں بہت سا جانی اور مالی نقصان ہوا، اور دولت مند قومیں مفلس ہو گئیں، وہیں، مشرقی قوموں کے دلوں میں آزادی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ترکی انقلاب نے، راستہ اور بھی ہموار کر دیا۔ اور یورپ، اور خاص کر انگریزوں کی برتری کا طلسم ہمارے ذہنوں سے ٹوٹنے لگا۔ یہی زمانہ ہماری شاعری میں، قومی جوش اور حبِ وطن کے ترانوں کا زمانہ ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے رہنمائی کی، اور چکبست، سرور اور نوجوان شعرا کی ایک بڑی تعداد ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگی۔ اقبال کا مشہور ترانہ [illegible]

ہوا۔ یورپی شاعری میں، قومی جوش وخروش کا زمانہ عین
جنگ کا زمانہ تھا۔ لیکن اردو شاعری میں یہ احساس
مابعد جنگ اثرات کا پیدا کردہ ہے۔

جنگ کے بعد دنیا سمٹ کر اتنی قریب ہو گئی کہ
دنیا کی ساری قومیں ایک دوسرے کی ہمسایہ بن گئیں۔ دوران
جنگ میں، اس مصیبت کو جلد سے جلد یکسو کرنے کے لئے
علمائے سائنس کے جو ذہن تیزی سے کام کر رہے تھے۔
بعض وقت تمام حدوں کو توڑ کر آگے نکل گئے، اور یوں تو
بہت سی اچھی بری چیزوں کو وہ وجود میں لانے کا باعث
ہوئے۔ لیکن، دنیا کو قریب تر لانے میں، جن سے بہت
مدد ملی، وہ ہوائی جہازوں کی ترقی اور لاسلکی کی ایجاد ہے۔

جنگِ عظیم میں جو جانی نقصانات ہوئے، ان کے
اثرات، وہیں پر ختم ہو گئے، لیکن اس کے مالی نقصانات
بہت دور رس ثابت ہوئے۔ اس حادثے نے جیتنے والے
اور ہارنے والے، سب کو یکساں مفلس بنا کر چھوڑا۔ جنگ کے
زمانے میں امن کے خوش گوار خواب دیکھنے والوں کے لئے
جنگ کے بعد کا زمانہ اور بھی حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ معاشی
ابتری کی وجہ سے ان کی زندگی کے سارے نظامات
درہم برہم ہو گئے تھے۔ فطرتاً ان کا سب سے بڑا نصب العین
معاشی ترتیب بن گئی۔ جنگ کی تلخیوں نے، ان کے
مذہبی جذبے کو خدا اور اس کی دنیا کے نظام کے خلاف
انتقام کے جذبے میں تبدیل کر دیا، اگلی گھریلو زندگی
کی راحتیں اب خواب وخیال ہو گئیں اور، صنعتی تعلقات
میں نیکی، بدی کا کوئی سوال نہیں رہا۔ ان کی حسن کاری
کا سارا تناظر بھی چوپٹ ہو گیا، جس کا اثر، تعمیر کاری،
مصوری اور شاعری غرض تمام فنونِ لطیفہ میں نمایاں ہے

غرض یورپ کی جنگ زدہ قومیں، اپنے آپ کو
بدلی ہوئی فضا کے ہم آہنگ بنانے کے لئے بیٹھیں، تو
انھیں جیسی جیسی ضرورت ہوئی، حیات کے نئے نئے
نظامات ترتیب دینے پڑے، اشتراکیت، اشتمالیت،
فاسطیت، جیسی تحریکیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ ان کے
علما نے بھی، اس معاملے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اور حیاتیات
نفسیات، معاشیات، اور سائنس کے عالموں کی
تحقیقات نے، زندگی کے لئے بہرحال، سہارا پیدا
کر دیا۔ جو نئی معاشرہ انھوں نے ترتیب دی، اس کا
دارومدار معاشیات پر تھا۔ زیادہ سے زیادہ دولت
پیدا کرنے کے وسیلے، کلوں اور دوسری مصنوعات کی صورت
میں فراہم کئے گئے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ
اٹھانے کے لئے، ایسے اجتماعی نظریے وجود میں آئے
جن کی بدولت، فرد، ایک nonentity بن کر
رہ گیا۔ ہم بھی چونکہ اس عالمی کل کے جز بن گئے تھے
ان تمام تحریکوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔
ان تحریکوں کو ہمارے درمیان اور بھی چلتا کرنے
میں، ہمارے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے
جو اب انگریزی برتری کا ہوا دور ہونے کے سبب یورپ
کی جامعات کو بھی علم وفن کا اسی طرح مرکز سمجھ کر جانے لگے
جس طرح وہ اس سے پہلے صرف انگریزی جامعات کو سمجھتے
تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف یورپ کی اہم زبانوں
اور ان کے علوم وفنون سے بہرہ ور ہوئے، بلکہ وطن لوٹتے
ہوئے ان کی نئی نئی تحریکوں کے اثرات بھی ساتھ
لیتے آئے۔ اس کا اشتراکی اور بعض وقت اشتمالی نظامِ حیات
ان کے لئے سب سے زیادہ جاذبِ نظر ثابت ہوا۔

ان عالمی تحریکوں کے علاوہ ہم اپنے ذاتی ملکی اور قومی مسائل سے بھی دوچار ہیں، جن میں سب سے اہم مغربی یلغاروں سے اپنے آپ کو بچانا اور اپنی قومی انفرادیت اور آزادی پر قابو پانا ہے۔

ان تمام تحریکوں کے اثرات اور ان کے ردِ عمل کا سب سے بڑا مظہر اس عصر کے شاعرِ اعظم اقبال کی شاعری ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا رہ گیا ہوگا جس کو ان کی فکر نے نہ چھیڑا ہو۔ لیکن اور نوجوان شعرا کی طرح وہ، ان تحریکوں کی نظر فریبیوں پر قانع نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے وسیع علم اور ان کی دقیق نظر نے کسی تحریک کو چھان بین اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کرنے نہیں دیا۔ ان کی دوررس نگاہیں "دم کٹی لومڑی کے فلسفہ" کی تہ تک آسانی سے پہنچ گئیں۔ انھیں صاف نظر آگیا کہ یورپ کا سارا نظام کھوکھلی عمارتوں پر تعمیر ہوا ہے۔ اور جو چیزیں ضرورت زمانہ کی مجبوریوں سے وجود میں آئی ہوں، ان کا ہر حالت میں پائدار ہونا ضروری نہیں ہے۔ انھیں مغالطوں کو دور کرنے اور پائدار اہمیت کی چیزوں پر نظر جمانے کی تلقین کے لئے انھوں نے اپنی ساری شاعرانہ، ملہمانہ اور مصلحانہ قوتیں بلکہ اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ فرد کی حیات اور اس کی خودی کو وہ ایک اتفاقی چیز نہیں سمجھتے تھے، اور جنگ کے مابعد اثرات نے جو موقتی فضا پیدا کر دی تھی، اس کے حل کے ساز و سامان کو وہ اٹل نظام زندگی نہیں تصور کر سکتے تھے۔ جمہوریت جیسی کہ عام طور پر یورپ میں رائج ہے ان کی نظر میں ایک ایسی طرز حکومت تھی، جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" قومیت کا احساس بھی، وقتی فرقہ بندی کے جوش و خروش کا نتیجہ تھا۔ اصل چیز، انسانیت ہے۔ بین قومیت، جو دراصل "قومیت" کے مفروضہ کا نتیجہ ہے، ظاہر ہے، بے بنیاد چیز ہے۔ مجلس اقوام، ایک "داشتہ پیرک افرنگ" اور "کفن چوروں" کی ایک محفل ہے۔ غرض اقبال نے تمام مسائلِ حاضرہ کی ترجمانی کی ہے۔ اور ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ انہیں کے الفاظ میں "ضربِ کلیم" ہے یعنی اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف"۔

اقبال جتنے بڑے شاعر تھے، اتنے ہی بڑے مفکر بھی تھے۔ انھوں نے انسان کے لئے جو نظامِ حیات ترتیب دیا تھا، اس کے تمام خد و خال انھوں نے واضح کر دیے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری اجزا سے نہیں بلکہ ان کی ترتیب سے جانچی جانی چاہیے۔

نئی تحریکوں میں، اشتراکیت کی طرف وہ اپنے مخصوص اعتقاد کے سبب مائل تھے، جس کا ثبوت ان کی کئی نظمیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ زبان زد "پنجاب کے کسان سے" ہے۔ اور یہی نظامِ حیات، ہمارے نوجوان شعرا میں سے اکثروں کو بھی بہت پسند ہے۔

اقبال کی سی وسیع نظر، ظاہر ہے کہ عام شعرا کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اسی لئے ان میں سے ہر ایک ان تحریکوں کا اثر اپنی اپنی بساط کے مطابق لیتا ہے۔ اور ان کی ترجمانی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کرنے میں بھی وہ فطرتاً مجبور ہیں۔

ایک چیز جو آج کل کی شاعری کے معیار پر برا اثر ڈال رہی ہے وہ صحافت کی گرم بازاری اور طباعت کی آسانیاں ہیں۔ اس کی وجہ سے پیش پا افتادہ کارنامے عام ہو گئے ہیں۔ اس "کثیر پیداوار" کے دور میں، اچھے اور

پائدار دلچسپی رکھنے والے کارناموں کی پیدائش شاذ ہوگئی ہے اور ان کے لئے یہ فضا ساز گار نہیں ہے۔ اسی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام سطح سے ابھرنے کے لئے شاعر، بعض وقت عجیب و غریب اسالیب اور اندازِ بیان کا اختراع کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یورپ میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ لیکن اس بدیع اسلوبی کے اختراع کا سہرا وہاں ان شعرا کے سر ہے، جو الفاظ کی عام بے قدریوں سے جل کر، انتقام لینے کے لئے، ان کے استعمال کے عجیب عجیب انداز وضع کر رہے ہیں، اس سے یورپی شاعری کا ایک بڑا حصہ نہایت ادق اور عوام کی سمجھ بوجھ سے باہر ہوگیا ہے۔

زبان کے ابتدائی کارناموں کی تحقیقات کا بھی خاصہ اثر اس زمانے کی شاعری پر پڑرہا ہے۔ موجودہ شعرا میں، ایک خاصہ گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو شاعری کو قدیم زمانے کی سادہ اور سلیس زبان اور اندازِ بیان کی طرف لوٹانا چاہتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی کہنے کو تو حالی سے ہوئی تھی کیونکہ وہ میر کی سادہ زبان کو اپنا مطمح نظر سمجھتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں یہ کوئی تحریک نہیں بنی تھی۔ اسمٰعیل میرٹھی اور شوق قدوائی نے اپنے ذوق کی بدولت اس اصول کی پیروی کی تھی۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کے ہاتھوں میں یہ ایک شدید تحریک بن گئی۔ اور انتہا پسندوں کی ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہوگئی، جو میر اور ولی کی زبان سے بھی آگے بڑھ کر، برج بھاشا کی نقل اتارنا چاہتی ہے۔

آج سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے، ہمارے ایک رسم و قیود سے بیزار شاعر نے، "غزل" کی تنگنائی کی شکایت کی تھی، اور [illegible]

شامل کر کے، وہ اپنے بیان کے لئے وسعت چاہتا تھا۔ لیکن قدامت پسندوں کی گراں گوشی کے لئے یہ صدا بے اثر ثابت ہوئی۔ ایک اور آزاد رو شاعر نے مقبول شاعری، من مانی صنفوں میں پیش کی وہ بھانڈ سمجھا گیا۔

حالی نے اسے محسوس کیا، لیکن وہ قدیم اصناف کی اصلاح اور توسیع کے خیال سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن موجودہ زمانے میں، اس تحریک کے برپا ہونے کی سہولت موجود تھی۔ اس میں کچھ تو زبانوں کے بولنے والوں کی عام ذہنی وسعت کا تقاضا تھا اور کچھ قدیم قیود کی سختیوں کا ردِ عمل۔ چنانچہ آج کل کی شاعری میں صورت شعر کے لحاظ سے جو نت نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان کو حصر کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اقبال اور جوش جیسے درمیانی مسلک پر چلنے والے شعرا مسلسل، غزل، قطعہ یا مثنوی کے قافیہ کی ترتیب کو قائم رکھ کر خیال کے اٹھان کے لحاظ سے، ان کے ٹکڑے کر لینے پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن انتہا پسند، انھیں سرے سے سامنے سے ہٹا دیتے ہیں۔ یہ تحریک دراصل "قدیم زبان کی طرف رجعت" کی تحریک کے دوش بدوش چلی ہے۔ چنانچہ عظمت اللہ خاں مرحوم اور ان کے دبستاں کے شاعروں نے، عروض و قوافی کی قیدوں کو سرے سے توڑ دیا ہے۔ عظمت اللہ خاں، ہندی اوزان کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اور انھوں نے ایسی نفیس نفیس نظمیں سرانجام کیں کہ، ان کی بدولت وزنوں کے اختراع کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اور اب ہندی پنگل اردو شعر کے مسلّمہ اوزان میں داخل ہوگیا ہے۔ موجودہ عصر کے مقبول شعرا جیسے حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، احسان بن دانش، روش صدیقی، حافظ غازی پوری

اس طرح کی نظمیں لکھنے میں بڑی دست گاہ رکھتے ہیں۔ ہندی وزن کے علاوہ، فارسی بحروں میں بھی وہ حسبِ ضرورت ترمیم کر لینے کو برا نہیں سمجھتے۔

اگلے اساتذہ کے مسلّمہ اوزان استعمال کرنے والے شعرا بھی، بعض وقت قافیہ کے تمام ضوابط کی پابندی ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس سے بلا شبہ اردو شاعری کی صنفوں میں توسیع ہو گئی ہے اور اردو میں بہت سی مترنم بحریں استعمال ہونے لگی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیز شاعر کے ذوق پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کے غلط استعمال سے، بہت سی ایسی چیزیں بھی شاعری کے نام سے معرضِ وجود میں آ رہی ہیں۔ جن کا شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ایک خاص صورت نظم کی جو مقبول ہے، وہ ایک طرح مستزاد ہے۔ جس میں، خیال کے ٹکڑوں کے لحاظ سے چھوٹے بڑے مصرعے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کی نظمیں، غنائی شاعری میں بہت استعمال ہونے لگی ہیں۔ اور یہ قدیم شاعری کے یکساں لب و لہجہ کے مقابلہ میں ایک پسندیدہ جدّت ہے۔

اس طرح اردو شاعری کی موجودہ پیداوار پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ آج کل کی شاعری میں ظاہر اور باطن ہر لحاظ سے اتنی وسیع تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے کی شاعری کو بھی اس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ جتنا انقلاب ہماری شاعری میں رونما ہو چکا ہے اتنا ہماری واقعی حالت میں شاید پچاس سال کے بعد بھی نہ ہو سکے گا۔ اور یہ ہمارے ذہنی تاثرات کی موجودہ تاریخ ہے۔

عبدالقادر سروری

غزل

ضرورتاً کافرِ محبت، حقیقتاً دین دار بھی ہوں
خموش ہوں بے قرار بھی ہوں، اسیرِ زلفِ بہار بھی ہوں
نظر نظر اس کی یوں جھجکتی ہے جیسے سلمائے پاک دامن
تری محبت، تری پرستش میں دل پہ قابو نہیں ہے مجھ کو
عیاں ہے دنیا پہ میری پستی، مٹے مٹے ہیں نقوشِ ہستی
بہار آتے ہی میرے "ہونے" سے باغباں کیوں کھٹک رہا ہے
محاسنِ انتظارِ محبوب پر دلائل کی کیا ضرورت
مری ہی تخلیق ہے زمانہ میں خوش مذاقی و کور ذوقی
چمن کے پھولوں سے دل لگانے کا بزدلی سے نہیں تعلق
یہ مجھ پہ آزادیوں کی بنیاد رکھنے والوں کو کیا ہوا ہے
شناورِ گنگ شعر جتنے ہیں اشارہ گر ما نتے ہیں مجھ کو

زمانہ مصلحت پرستی میں لائقِ اعتبار بھی ہوں
میں شاعرِ دل فگار ہی کیا، مصوّرِ حسن کار بھی ہوں
ادا ادا کہہ رہی ہے عصمت مآب و عفت شعار بھی ہوں
تری محبت تری پرستش میں صاحبِ اختیار بھی ہوں
نقوشِ ہستی نظر کو حائل نہ ہوں تو اک شاہکار بھی ہوں
نہیں الجھتا میں دامنوں سے تو کیا قباحت کہ خار بھی ہوں
وفائے وعدہ سے باخبر ہو کے، مائلِ انتظار بھی ہوں
میں رحمتِ روزگار بھی ہوں میں زحمتِ روزگار بھی ہوں
اگر چمن کو مری ضرورت پڑی تو میں جاں نثار بھی ہوں
انھیں تو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ میں استوار بھی ہوں
[illegible] نہیں ناگوار بھی ہوں

نشاط عارفی

اردو کے نظم گو شاعر

نظم کے پیش خاکے

نظم ہماری زبان میں ایک مربوط اور مسلسل صنفِ سخن کا نام ہے۔ یہ ظاہری اور معنوی حیثیتوں سے غزل سے بالکل مختلف ایک مستقل صنفِ سخن ہے، جس کو جدید ادب میں روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اردو میں اس کا خاکہ عہد قدیم ہی سے پڑ چکا تھا۔ قدیم دکنی ادب کے نمونے تمام تر مثنویوں کی شکل میں ملتے ہیں، خاور نامہ، یوسف زلیخا، چندر بدن مہیار، قصۂ بہرام و حسن بانو اس دور کی مشہور مثنویاں ہیں، ان مثنویوں سے متعلق تفصیلی معلومات پیش کرنا اردو مثنویوں کی تاریخ لکھنے والے کا کام ہے۔ لیکن ہمارے لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ ہم آج جس صنفِ سخن کو نظم کہتے ہیں، اس کا ایک دھندلا سا خاکہ ان مثنویوں کی شکل میں قدیم دکنی ادب میں تیار ہو چکا تھا۔

نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم کو جدید طرز اور نئے رنگ سے پیش کیا۔ نظیر نے اپنی نظموں کے موضوعوں کے لئے ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی معاشرت کا انتخاب کیا۔ الفاظ کا جتنا ذخیرہ نظیر کی نظموں میں ملتا ہے اتنا میر انیس کے علاوہ غالباً کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ نظیر کے اکثر و بیشتر الفاظ آج کل متروکات میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کے اسلوب ان کی زبان اور ان کی نظموں کے موضوعوں پر بہت سارے اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ نقاد کا کام ہے کہ ان کی تائید یا تردید کرتا رہے، لیکن ایک مورخ کی نظر میں نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے منظر کشی اور واقعہ نگاری کی طرف توجہ کی اور اس طرح اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک مستقل شاہراہِ سخن تیار کر لی۔

میر انیس

میر انیس نے منظر کشی اور جذبات نگاری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن خود میر انیس نے نظم کی ایک خاص صنف کو اپنی شاعری کا محور بنا لیا تھا۔ اس لئے ان کی شاعری تاریخی حیثیت سے اردو مرثیے اور اردو کی ڈرامائی شاعری سے متعلق ہو جاتی ہے۔ بہر حال میر انیس کی منظر نگاری اور جذبات نگاری کو جدید نظم کے پیش خاکے کا اہم جزو سمجھنا چاہیے۔

عہد حالی

انیس کے بعد نظم کے پیش خاکے "مختلف حیثیتوں سے مختلف شاعروں کے ہاں تیار ہوتے رہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے جس وقت انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں کی بناء ڈالی ہوگی تو ان کا وجدانِ شعری غیر شعوری طور پر ان پیش خاکوں سے متاثر رہا ہوگا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں میر حسن کی مثنوی کے دلچسپ مرقعے میر انیس کے مرثیوں کے مناظر اور ان کی جذبات نگاری یہ سب ان کے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔ اور ان کے ذہن میں ان اجزا کی مدد سے جدید نظم کی عمارت کی تعمیر ہو رہی ہو گی۔ مختصر یہ کہ آزاد کی تحریک نے جدید شاعری کے سب سے بڑے علمبردار اور اس عہد کے سب سے بڑے قومی شاعر حالی کے شعور کو بیدار کر دیا اور ہماری زبان میں ان دونوں بزرگوں کی کوششوں سے اس صنفِ سخن کی مستقل بنیاد پڑی جس کو ہم آج نظم سے تعبیر کرتے ہیں، حالی چونکہ سر سید کی اصلاحی تحریکوں سے بے حد متاثر تھے، یہ اصلاحی تحریکات ان کی شاعری کا ایک اہم جزو بن گئی۔ حالی کی نظمیں چونکہ ان کے دل سے نکلی ہیں وہ [illegible] کے تاروں کو چھیڑتی ہیں۔

قوم پر حالی کے پیام کا کیا اثر ہوا یہ ایک علاحدہ بحث ہے۔
لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نے
مسلمانوں کے اجتماعی شعور کو بیدار کر دیا۔ حالی کی شاعری
مسلمانوں کے تنزل کا ایک دردناک مرثیہ ہے۔

شبلی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء | حالی کی نظمیں اصلاحی مقاصد
کے لئے اس قدر موثر اور مقبول ثابت ہونے لگیں کہ
شبلی جیسے سنجیدہ عالم اور مورخ کو بھی اس کی طرف
توجہ کرنی پڑی، شبلی چونکہ فطرت سے شاعرانہ دل و دماغ
لے کر آئے تھے ان کو اپنی شاعری کے لئے کسی ذہنی
کاوش سے دوچار ہونا نہ پڑا۔ شبلی نے تاریخ اسلام کے
بعض دلچسپ اور سبق آموز واقعات نہایت کامیابی کے
ساتھ نظم کئے ہیں۔ ان کی مثنوی صبح امید تاریخی اور
ادبی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

اسماعیل میرٹھی ۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء | اسماعیل میرٹھی
دبستان حالی کے ایک ممتاز پیرو ہیں، انھوں نے بہت ہی
اخلاقی اور اصلاحی نظمیں کہی ہیں، یوں کہنے کو اسماعیل
بچوں کے شاعر تھے لیکن اسلوب کی شگفتگی اور سلاست
کے اعتبار سے ان کی نظمیں ہر مذاق اور ہر طبیعت پر
یکساں اثر رکھتی ہیں۔

اکبر الہ آبادی ۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء | اکبر ہماری زبان کے
سب سے بڑے طنز نگار satirist تھے۔
انھوں نے جس لطیف طنز کی زبان میں بناء ڈالی اس کے
آپ موجد اور آپ ہی منتہی تھے، ان کی شاعری ہماری
بڑھتی ہوئی مغربیت کے خلاف ایک احتجاج تھی، اکبر اپنے
دور کے واحد نمائندہ شاعر ہیں جن کے کلام میں ہم کو اس
عہد کے سارے ذہنی رجحانات نظر آتے ہیں [illegible]

اس عہد کی مغرب پرستی اور اس کے رد عمل دونوں ملتے
ہیں، مغربیت کے خلاف اکبر کے بھی جذبات زیادہ قوت کے
ساتھ اقبال کی نظموں میں جلوہ گر ہوئے۔ اس اعتبار سے
مشرق کے شاعر اعظم علامہ اقبال مرحوم کی شاعری اکبر کی
شاعری کی ہی صدائے بازگشت ہے۔

چکبست لکھنوی ۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۶ء | اس عہد کے ایک اور
ممتاز نظم گو شاعر چکبست لکھنوی ہیں۔
چکبست کی نظمیں منظر نگاری اور وطن پرستی کے جذبات
کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک ممتاز اور رفیع مقام
رکھتی ہیں، چکبست کی منظر کشی اور جذبات نگاری کے
اسلوب پر میر انیس کا نمایاں اثر ہے۔

شوق ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۵ء اور نظم طباطبائی ۱۸۵۳ء تا ۱۹۳۳ء | شوق اور
نظم بھی اس عہد کے نظم نگار شاعروں میں قابل ذکر ہیں،
شوق کی جذباتی نظمیں بے حد دلچسپ ہیں، نظم طباطبائی کی
شاعری قدیم اور جدید تحریکات کا سنگم ہے گرے کی مشہور
نظم گور غریباں ان کا غیر فانی کارنامہ ہے نظم طباطبائی
اور عبدالحلیم شرر مرحوم نے اردو میں قافیہ معرا (بلینک ورس)
کو رواج دینے کی کوشش کی تھی لیکن یہ مساعی غیر مشکور ثابت
ہوں۔

عظمت اللہ خاں ۱۸۸۷ء تا ۱۹۲۷ء | تقریباً اسی دور کے
ایک اور ممتاز شاعر عظمت اللہ خاں گذرے ہیں۔ انھوں نے
بڑی شاعرانہ طبیعت اور حسن کارانہ مذاق پایا تھا وہ ایک
خاص طرز کے موجد اور تنہا مالک تھے، ان کی نظموں پر ہندی
شاعری کا بڑا اثر تھا۔ ان کے الفاظ مترنم اور اسلوب بے حد
من موہن ہوتا تھا۔

[illegible] عظمت اللہ خاں اور جوش ملیح آبادی

سے بے حد متاثر تھے۔ سلیم نے شاعری اپنی عمر کے آخری حصے میں شروع کی ان کی نظموں میں جوش اور روانی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔

عہد اقبال | اقبال (۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء) اقبال کی عظیم الشان شخصیت ان کی زندگی ہی میں بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی۔ اور ان کی شاعری کا اثر شعوری یا غیر شعوری طور پر سارے ادب پر پڑ رہا تھا' اقبال بلاخوف تردید اردو کے بلکہ ساری ایشیائی زبانوں کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کی حیات اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ اقبال کی شاعری نے اردو کے ہر چھوٹے اور بڑے شاعر کو متاثر کیا ہے اور ہر شاعر نے کسی نہ کسی طرح ان کی فکر سے اکتساب کیا ہے اور ان کی شاعری کی تقلید کی ہے۔

جوش ملیح آبادی سنہ ۱۸۹۴ء | جوش غالباً موجودہ عہد کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول نظم گو شاعر ہیں' جوش و سرمستی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ جوش ملیح آبادی اپنے مسلک اور عقائد کے اعتبار سے اقبال سے بالکل مختلف ہیں لیکن ان کی طرز فکر اور ان کے اسلوب پر اقبال کا اثر ضرور ہے۔ جس سے شاید وہ خود باخبر نہیں ہیں۔ جوش نے نہایت آزاد اور بیباک شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی نظموں میں ایک بے اعتدالی اور بے آہنگی سی پائی جاتی ہے لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ جوش شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعر شبابیات بھی۔ انقلاب کے لیے ان کے پاس اقبال کی طرح کوئی مستقل فلسفہ یا پیغام نہیں ملتا جوش جس انقلاب کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس انقلاب کی تعبیر محض خون آشامیوں اور ہنگام آرائیوں میں ہوتی نظر آتی ہے' اقبال جس انقلاب کے متمنی ہیں وہ ایک وجدانی انقلاب ہے جس کا وہ ایک مکمل نصاب اپنے فلسفے میں پیش کرتے ہیں' اقبال شاعر بھی تھے اور مفکر بھی لیکن جوش شاعر اور صرف شاعر ہیں' یہی وجہ ہے کہ ان کی انقلابی شاعری سے زیادہ اہم ان کی جذباتی اور شبابیاتی شاعری ہے' اسی کو ان کی حیات ادبی کا غیر فانی سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

علی اختر | حیدرآباد دکن کے علی اختر عہد حاضر کے نظم گو شاعروں میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور سب سے بلند شاعرانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی نظمیں فکر عمیق کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کا ہر شعر ایک مستقل دعوت فکر ہوتا ہے ان کی نظمیں "میلارمے" (فرانسیسی شاعر) کی نظموں کی طرح عوام کے لیے چیستاں بن کر نہیں رہ جاتیں' ان کا کلام غیر شعوری طور پر ایک دلکش نغمہ بن کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اقبال کا صحیح اثر علی اختر سے زیادہ کسی شاعر نے قبول نہیں کیا۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا حسن ان کی فکر اور ان کے اسلوب کی ہمواری اور ہم آہنگی ہے' فارسی ترکیبوں کے استعمال کا سلیقۂ جمیل علی اختر سے زیادہ عہد حاضر کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا۔

سیماب اکبرآبادی | سیماب اکبرآبادی اس عہد کے ایک اور ممتاز صاحب طرز نظم گو شاعر ہیں' انھوں نے آگرہ اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ سیماب کے دبستان کے شاعروں میں شاعر لکھنوی منظر' اعجاز اور شاہد خاص طور سے

شبلی نعمانی

حافظ نذیر احمد

راشد الخیری

عبد الحلیم شرر
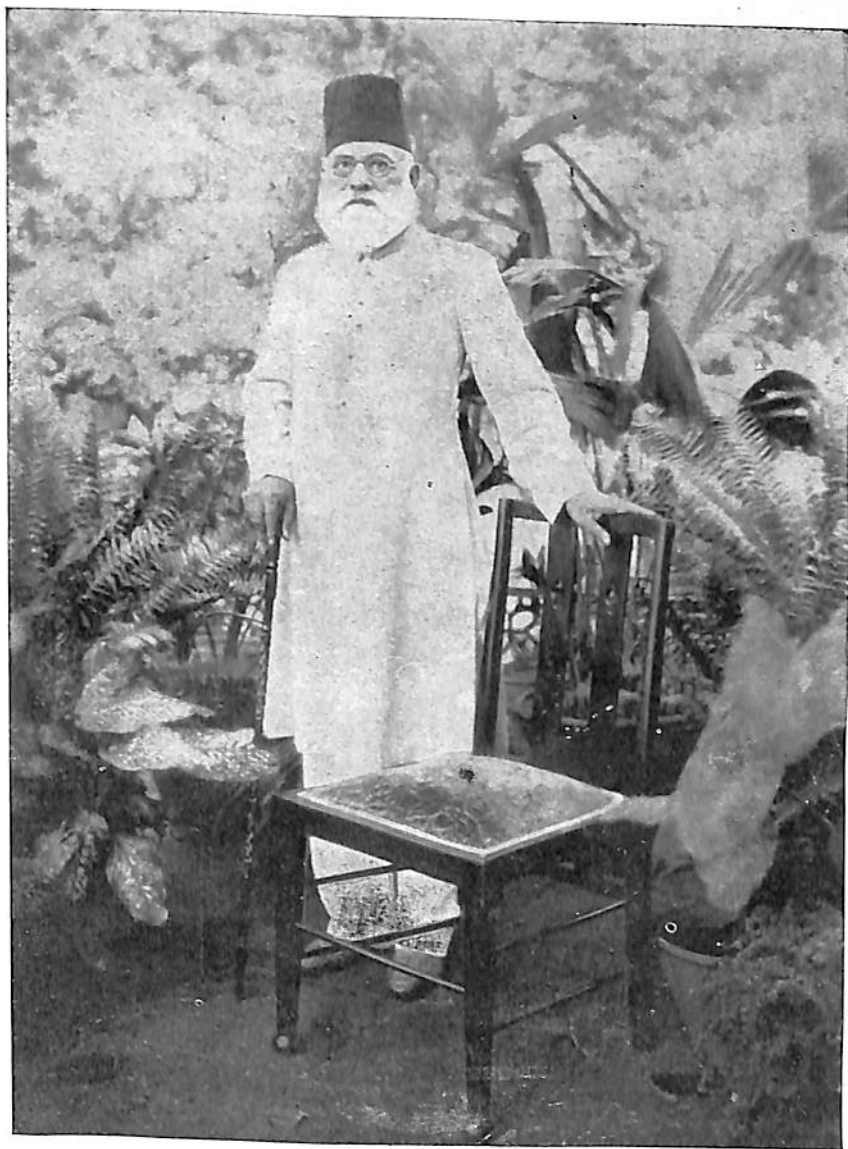
ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بی اے - ڈی لٹ

قابل ذکر ہیں۔

ماہر القادری ماہر القادری بھی اس دور کے ایک ممتاز اور خوش فکر نظم گو شاعر ہیں، اصلاحی اور شبابی دونوں قسم کی نظمیں ماہر کے کلام میں موجود ہیں، یہ نظمیں حسن خیال اور حسن بیان کا نہایت دلکش اور اچھوتا نمونہ ہیں۔

احسان بن دانش احسان بن دانش عہد حاضر کے سب سے بڑے انقلابی شاعر ہیں، ان کی انقلابی شاعری کوئی رسمی شاعری نہیں بلکہ ان کی اپنی بپتا ہے۔

ان کے علاوہ اختر شیرانی، روش صدیقی، حفیظ جالندھری عدم، مجاز، ابوالفخر سلام، مخدوم عثمانیہ، میکش عثمانیہ، ساز عثمانیہ، علی منظور، زیبا، وجد، جان نثار اختر، الطاف مشہدی، اثر صہبائی اور فطرت واسطی ہماری زبان کے مشہور نظم گو شاعر ہیں ان کا کلام اس عہد کا بیش بہا ادبی سرمایہ ہے۔ اردو شعر و ادب کے مستقبل کی تعمیر ان ہی ہاتھوں سے ہونے والی ہے۔

عمر مہاجر

یاد

(۱)

جب چاند ستارے ہنستے ہیں　　رنگین نظارے ہنستے ہیں
خاموش اندھیری راتوں میں　　معصوم شرارے ہنستے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۲)

جب سخت اندھیرا ہوتا ہے　　جب سارا عالم سوتا ہے
اور پریم کی ویران نگری میں　　دل چپ کے چپکے روتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۳)

جب نینن گنگا بہتی ہے　　اور پریم کہانی کہتی ہے
جب بگلے اڑتے رہتے ہیں　　اور ندیا بہتی رہتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۴)

جب پریم تپشا ہوتی ہے　　اور "شاما" گاگر روتی ہے
تاروں کی سندر چھاؤں میں　　جب پریم کی دنیا سوتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۵)

جب بادل شور مچاتا ہے　　الفت کے ترانے گاتا ہے
جب "ساون بھادوں" ملتے ہیں　　شہنائی میگھ بجاتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۶)

اک نور کا گھیرا ہوتا ہے　　رنگین سویرا ہوتا ہے
جب دیپک بجھنے لگتا ہے　　معدوم اندھیرا ہوتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۷)

جب چرخ پہ تارے ہوتے ہیں　　خاموش اشارے ہوتے ہیں
جب کلیاں ہنستی رہتی ہیں　　معصوم نظارے ہوتے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

انس کلیانوی
(نگر کرنول)

میرا سنگِ مزار

سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک مضمون میں نے لکھا تھا جس کا عنوان "ہماری اخیر خواب گاہ" تھا۔ جو رسالہ النساء میں چھپا اُس میں یہ بتایا تھا کہ ہم اپنے رہنے کے لئے تو عالی شان عمارتیں بناتے ہیں۔ اور ہمارے بعد ہمارے مزار پر جانور لوٹا کرتے ہیں ہندو اور مسلمانوں کے قبرستان نہایت بری حالت میں رہتے ہیں ہم کو چاہیے اپنی زندگی ہی اپنی اخیر خواب گاہ بنالیں وہاں چمن و باغ ہو جس کی جو حیثیت ہو اسی طرح کا انتظام پہلے سے کرنا چاہیے۔ اٹلی کا قبرستان نمائش گاہ بنا ہوا ہے۔ اور پانڈیچری کا بھی قبرستان قابل دید ہے ہم کو بھی چاہیے کہ ہم بھی اپنی اخیر خواب گاہ خوبصورت بنائیں وغیرہ وغیرہ۔

مضمون تو لکھا تھا مگر میں نے خود اس پر عمل نہیں کیا۔ البتہ جہاں ہمارا مزار بنایا جائے گا وہ زمین سوچ لی تھی مگر مقبرہ وغیرہ نہیں بنایا تھا۔ اب سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے لئے نہایت خوبصورت مقبرہ بنایا ہے اور مقبرے کے اندر تاریخیں جو ان کے انتقال پر لوگوں نے لکھی ہیں وہ آئینے کے چوکھٹوں میں لگوا کر آویزاں کردی ہیں۔ سرہانے مزار کے سنگِ مزار پر حضرت اقدس و اعلیٰ دام اقبالہ کی فرمودہ تاریخ "در جنت ہمایوں ہم رفت" کندہ کرادی ہے اس کے نیچے خان بہادر احمد علی خاں صاحب کی لکھی ہوئی ۱۳۴۲ھ ہجری تاریخ کندہ کی ہے۔

مرحوم کے مزار کے بازو میں میں نے اپنا مزار بھی کھدوا کر تیار رکھا ہے میں نے اپنا سنگِ مزار بھی کندہ کرنے اسی شخص کو دیدیا جس نے تمام مقبرے میں سنگِ مرمر کا فرش کیا ہے۔ میرے سنگِ مزار کی عبارت یہ ہے۔

یا رحیم

نصر من اللہ وفتح قریب

"مزار صغرا ہمایوں مرزا بنتِ حاجی کپتان ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب مرحوم سنہ پیدائش سنہ وفات"

ہر کس وسیلہ دار دو ما بے وسیلہ ایم
ما را وسیلہ نیست بجز ذات پاک تو

اس کے نیچے جگہ چھوڑ دی ہے مرے بعد جو کوئی تاریخ لکھے وہ اسی جگہ کندہ کی جائے گی۔

جب میں نے سنگِ مزار لکھنے دیا تو دوکان دار صاحب نے ہمدردی سے کہا ابھی جلدی کیا ہے خدا نہ کرے آپ کیوں اپنا سنگِ مزار کندہ کروائی ہیں" میں نے کہا آپ کو اس سے کیا آپ کندہ کردیجئے انھوں نے چار روز میں کندہ کر کے دینے کا وعدہ کیا اور آج پانچ ماہ ہوتے ہیں نہ دیا۔

دوکان دار صاحب جن کا نام صفدر علی صاحب ہے مجھے کہہ رہے ہیں آپ کا سنگِ مزار لوگ دیکھا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی اپنی زندگی میں سنگِ مزار بنالیں۔ آپ کے سنگِ مزار کی وجہ میرے بہت سے پتھر فروخت ہو رہے ہیں اس لئے میں ابھی آپ کا سنگِ مزار نہیں دوں گا" یہ سن کر مجھے ہنسی آئی کہ لو میرا سنگِ مزار اشتہار کا کام کر رہا ہے دوسروں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ میرا خیال آج سے نہیں ایک زمانے سے بھی ہے۔ میں نے مکہ معظمہ سے

دو کفنی سنہ ۱۹۰۶ء میں منگائے تھے۔ مری پھوپی صاحبہ مرحومہ اور خالہ صاحبہ مرحومہ جب کہ معظمہ جا رہی تھیں۔ ان کے ذریعہ منگائے تھے جو زم زم کے پانی سے دھوئے گئے تھے ایک تو مرحوم کے کام آیا ایک میرے انتظار میں رکھا ہے۔

مسز صغرا ہمایوں مرزا

حسرت

مہتاب کے جلووں سے منور ہیں فضائیں　　بے خود کئے دیتی ہیں سکوں ریز ہوائیں
جھرمٹ میں ستاروں کے قمر جھوم رہا ہے　　فطرت کی جبیں خواب سحر چوم رہا ہے

چھایا ہوا ہر ذرۂ عالم پہ سکوں ہے
بگڑا ہوا لیکن مرا اندازِ جنوں ہے

تڑپاتا ہے یہ درد میں ڈوبا ہوا منظر　　بے حال ہوا جاتا ہے حالِ دلِ مضطر
سہما ہوا دل رونگٹے تھرائے ہوئے ہیں　　احساس پہ طوفانِ الم چھائے ہوئے ہیں
ہنستا ہوا نظروں میں مری آتا ہے کوئی　　جذبات کے شانوں کو ہلا جاتا ہے کوئی
اشکوں میں تڑپتے ہوئے بیتاب شرارے　　ہر سانس نکلتا ہوا آہوں کے سہارے
کروٹ ہی بدلتا رہا میں نیند نہ آئی　　دشمن کو بھی اللہ نہ دے دردِ جدائی
اک جانِ حزیں اور یہ سختی ارے توبہ　　لٹتی ہوئی ارمانوں کی بستی ارے توبہ
بجھتی ہوئی یہ شمعِ جوانی کوئی دیکھے　　دل چیر کے حسرت کی کہانی کوئی دیکھے
سوگند تمھیں سوزِ محبت کے اثر کی　　سوگند تمھیں بڑھتے ہوئے دردِ جگر کی
آہوں کی قسم اشک کے طوفاں کی قسم ہے　　قسموں پہ مچلتے ہوئے پیماں کی قسم ہے

آؤ بھی کہ اب صبر کا یارا نہیں مجھ کو
تم بن کوئی جینے کا سہارا نہیں مجھ کو

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

خواتینِ دکن کی ادبی خدمات

ہر قوم کے تمدن میں "زبان" کا خاص درجہ ہوتا ہے، زبان کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اس میں ادبی ذخیرہ کثرت سے فراہم نہ ہو، ادبیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کی وسعت اور زبان کی ترقی ہوتی ہے، وہ قوم اور وہ ملک سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب کہلاتا ہے جس میں ادبیات کا کافی ذخیرہ ہو، یہ تصور کرنا چاہیے کہ "ادب" ایک کسوٹی ہے جس پر ہر زبان کو پرکھا جاتا ہے۔

"لٹریچر" یا ادبیات میں کئی چیزیں شامل ہیں مثلاً "شاعری" "مضمون نگاری" افسانے، ناول، ڈرامے اور خطوط وغیرہ، ان ہی عنوانوں کے تحت ہم یہاں کچھ صراحت کریں گے۔

شاعری

ادب کی ایک اہم شاخ شعر گوئی ہے، نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے، بہ نسبت نثر کے نظم زیادہ موثر ہوتی ہے۔

نظم کا احاطہ نہایت وسیع ہے، اگر نظم میں مذہب اور اخلاق کو بیان کیا جا سکتا ہے تو پھر اسی نظم کے قالب میں تاریخ اور سوانح بھی بیان کی جا سکتی ہے، نظم کے جامے میں فلسفہ اور تصوف کے نکات پیش کئے جا سکتے ہیں تو پند و نصیحت بھی بیان کی جا سکتی ہے، نظم میں رزم و بزم کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، مناظرِ قدرت کی نیرنگی اور خوش نمائی، فطرتی اشیاء کی ترجمانی نظم کی صورت میں بہتر سے بہتر طریقے سے ہوتی ہے، قوم اور ملک کو بیدار کرنے، جوش و ہمت دلانے، شاہراہِ ترقی پر قدم بڑھانے کے لئے نظم ہی موزوں خیال کی جاتی ہے، میدانِ جنگ میں بہادری و دلاوری کے جوہر دکھانے کی ترغیب نظم ہی سے وابستہ ہوتی ہے، اگر نظم کے ذریعہ ہنسایا جاتا ہے تو اسی میں مرثیہ اور نوحہ کہہ کر رلایا جاتا ہے، اگر کسی کی مدح اور ستائش کر کے آسمان پر چڑھایا جا سکتا ہے، تو کسی کی ہجو کہہ کر اس کو تحت الثریٰ پر پہونچایا جا سکتا ہے، غرض کہ شاعری یا نظم نگاری سے بیسیوں کام لئے جا سکتے ہیں۔

اردو شعر گوئی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے اس کی تفصیلی وضاحت اس مختصر مضمون میں دشوار ہے، البتہ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں ایک سو سے زیادہ خواتین شعر گوئی کی حیثیت سے پیش ہو سکتی ہیں، جن میں سے کئی خواتین شعر گوئی کے لحاظ سے بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کا کلام پسندیدہ اور شائستگی کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے، ان کی شاعری اکثر ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

ہماری شاعر خواتین کا کلام قدیم طرز کی شاعری تک محدود نہیں ہے، بلکہ جدید خیالات اور جدید طرز کی شاعری میں بھی وہ خاصہ حصہ لیا کرتی ہیں، اگر ان کے کلام میں قدیم طرز کی عشق و عاشقی، گل و بلبل، شاہد ساقی، کی داستانیں اپنی رنگین و شیریں بیانی، جدت آفرینی اور زبان کی لطافت کے لحاظ سے قابلِ ستائش ہوتی ہے، تو جدید طرز کی شاعری جو ملک اور قوم کو بیدار کرتی، مناظرِ قدرت اور نیچر کی

ترجمانی کرتی ہے، خیالات کی بلند پروازی اور جدت، زبان کی صفائی اور سادگی، اسلوبِ بیان کی ندرت اور نزاکت کے لحاظ سے قابلِ داد ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر میں جن خواتینِ دکن نے شاعر کی حیثیت سے نام و نمود پیدا کیا ہے اور جن کے کلام نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے، ان میں سے بعض کا مختصر تعارف اس موقع پر بے محل نہیں ہو سکتا

اس خصوص میں سب سے پہلے ملکۂ دکن حضرت دلہن بادشاہ بیگم کا اسمِ گرامی پیش ہوگا جو اعجاز تخلص کے ساتھ شعر کہتی ہیں، آپ دکن کی پہلی ملکہ ہیں جو اردو میں طبع آزمائی فرماتی ہیں۔

اس کے بعد بشیر النساء بیگم بشیرؔ، رابعہ بیگم رابعہ منظور فاطمہ بیگم سردارؔ، رحمت بیگم اسیرؔ، نوشابہ خاتون نوشابہ، لطیف النساء بیگم لطیفؔ وغیرہ کا نام لینا چاہیئے جو اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں،

بشیر کو نظم نگاری اور غزل گوئی کا بہت اچھا ملکہ ہے، ان کے کلام کا مجموعہ عنقریب شایع ہونے والا ہے، رابعہ بیگم کو فطرتی اشیا کی ترجمانی کا خاصا سلیقہ ہے، ان کی نظمیں قابلِ قدر ہوتی ہیں، اسیرؔ اور سردار کو غزل گوئی وغیرہ میں اچھی مہارت ہے، ان کے کلام میں زبان کی لطافت اور رنگینی کے جوہر پائے جاتے ہیں، نوشابہ خاتون جامعۂ عثمانیہ کی پہلی بی اے خاتون ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "موجِ تخیل" کے نام سے شایع ہو چکا ہے، نوشابہ خاتون کا کلام سوز و گداز کے لحاظ سے قابلِ ستایش ہوتا ہے،

لطیف النساء بیگم نے بچوں کے لئے نظم لکھنے کی اچھی

مشق کر لی ہے۔

ان کے علاوہ بیسیوں خواتین ہیں جن کی شاعری قابلِ داد اور لایقِ ستایش ہوتی ہے، ان کے نام بھی طوالت کا موجب ہوں گے۔

مضمون نگاری

ادب کا ایک شعبہ مضمون نگاری ہے، جو ساری ادبی کوششوں کا نچوڑ ہوتا ہے، نثر کے ذریعہ سنجیدہ اور متین مسائل سمجھائے جا سکتے ہیں، تحقیقات اور انکشافات کو واضح طور پر ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے،

مضمون نگاری کے بیسیوں اقسام اور بیسیوں موضوع ہیں، ادب کی جو گراں بہا اور بیش قیمت خدمت مضمون نگاری کے ذریعہ ہو سکتی ہے وہ ایک حقیقتِ نفس الامر ہے۔

خواتینِ دکن نے نثر نگاری کے ذریعہ اردو ادب کی جو خدمت انجام دی اور دے رہی ہیں اس کی صراحت طویل صفحات کی خواہاں ہے، اس موقع پر ہم صرف نثر نگار خواتین کے نام بھی پیش نہیں کر سکتے چہ جائے کہ ان کے کارناموں کی تفصیل کی جائے، البتہ بعض ممتاز نثر نگار خواتین کا نام لیا جا سکتا ہے جن کی ادبی خدمتیں فروگذاشت نہیں کی جا سکتیں۔

اس خصوص میں سب پہلے طیبہ بیگم مرحومہ کا نام لینا چاہیئے اگرچہ وہ آج زندہ نہیں ہیں مگر انھوں نے جو داغ بیل ڈالی تھی، جو بنیاد قائم کی تھی، وہ آج مستحکم ہو چکی ہے، اور بار آور ہو کر پھول پھل رہی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسواں کی جانب سے ان کے علمی اور بلند پایہ

مضامین کتابی صورت میں شایع ہونے والے ہیں۔

اس تفصیل میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا نام لینا ضروری ہے جن کی اب تک چودہ پندرہ کتابیں مختلف عنوان کے تحت شایع ہو چکی ہیں، اور مضامین جو مختلف رسالوں میں شایع ہوا کرتے ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، ان کی ادبی دلچسپی اور انہاک ہر آئینہ مستحق تقلید ہے۔

اس کے بعد جہاں بانو بیگم نقوی لطیف النساء بیگم اور سکینہ بیگم کے ناموں کی صراحت بھی ضروری ہے، جہاں بانو بیگم کے ادبی دلچسپ اور پر از معلومات مضامین دکن اور ہندوستان کے رسالوں میں تعریف کے ساتھ شایع ہوتے ہیں، رسالہ شہاب کے حصۂ نسوان کی اڈیٹر کی حیثیت سے آپ جو ادبی خدمت انجام دے رہی ہیں وہ مستحق ستایش ہے، اسی طرح سکینہ بیگم مدیرۂ "سب رس" اور ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کے داعی کی حیثیت سے جو ادبی کام کر رہی ہیں وہ ہر طرح تعریف و توصیف کے قابل ہے۔

حیدرآباد اور ہندوستان کے زنانہ اور مردانہ رسالوں اور اخبارات میں بیسیوں خواتین دکن کے مضامین جو مختلف موضوع پر ہوتے ہیں تعریف و ستایش کے ساتھ شایع ہوتے ہیں، ان مضامین کی زبان صاف، اسلوب بیان پسندیدہ اور طرز نگارش دلچسپ ہوتا ہے، دختران جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین جو نام و نمود مضمون نگاری کی حیثیت سے پیدا کر رہی ہیں، وہ ایک درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

ناول اور افسانے

نظم سے جس طرح انسانی دل پر اثر ہوتا ہے اسی طرح دلچسپ قصے کے پیرایے میں کسی تاریخی، اخلاقی یا معاشرتی پہلو کو بیان کرنا خاص طور پر موثر ہوتا ہے، خشک فلسفیانہ مضامین سے بڑھ کر افسانے زود اثر ہوتے ہیں، انسانی فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ ان کے دماغ کے لئے عمدہ عمدہ غذا میسر ہو، اور ان کی دلبستگی کے لئے ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے جن میں زیادہ تر ان کے ابنائے جنس کے واقعات اور حالات اس طرح بیان کئے گئے ہوں جو یا تو سچ معلوم ہوتے ہوں یا ایسے ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں۔

ناول ایک فوٹو یا آئینہ ہے جس سے زمانۂ گزشتہ کے حالات اور موجودہ زمانے کے واقعات اصلی رنگ و روغن میں نظر آتے ہیں، واقعات کے انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب سے پلاٹ بنتا ہے، اس میں حرکت، روانی اور جوش پایا جانا چاہیے۔

پلاٹ کی طرح کردار نگاری ہے، جن اشخاص کا اس میں ذکر ہوتا ہے، ان کی پوری تفصیل اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ انسان کی طرح چلتے پھرتے، کام کرتے، بولتے زندہ معلوم ہوں، قصے کے اشخاص کا تعلق جس زمانے اور جس مقام سے ہوتا ہے، اس زمانے اور مقام کی تمام خصوصیات سے ناول نگار کو واقف ہونا چاہیے تاکہ اس وقت کے رسم و رواج تمدن اور تہذیب کا پورا پورا حال اس ناول سے معلوم ہو سکے، غرض جو قصہ ناول یا افسانے میں بیان کیا جائے وہ ہر طرح اصلی معلوم ہو، اس کا کوئی پہلو عقل کے خلاف نہ ہو۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر جب ہم دکن کی

خواتین کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ناکامی نہیں ہوتی، اور ہم بہ مسرت کہہ سکتے ہیں کہ خواتینِ دکن نے اس قسم کی ادبی خدمت بھی انجام دی ہے۔

"انوری بیگم" اور "حشمت آرا" کے نام سے دو ناول ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو اصلاحِ معاشرت کے لئے لکھی گئی ہیں، ان میں حیدرآباد کے تمدن، تہذیب کی سچی اور اصلی تصویر کھینچی گئی ہے، حقوقِ نسواں، تعلیمِ نسواں، پرانے توہمات اور تعصبات، رسم و رواج، روزمرہ کے کام کاج، بیکار اور فرصت کے مشاغل وغیرہ امور بہت دلچسپ طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔

ان دونوں ناولوں کی مصنفہ مرحومہ طیبہ بیگم ہیں جن کا تذکرہ اس کے پہلے ہو چکا ہے، صغرا بیگم ہمایوں مرزا کے ناول سرگذشتِ ہاجرہ اور موہنی کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلچسپ اور مفید ہیں۔

مختصر افسانے

موجودہ زمانہ میں مختصر افسانوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے، اس قسم کا بڑا ذخیرہ ہر زبان کے ادبیات میں فراہم ہو گیا ہے۔ طول طویل ناول کے بجائے مختصر افسانے جو چند اوراق میں ضم ہو جاتے ہیں زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔

ناول اور افسانہ کے لئے جو امور ضروری ہیں وہی مختصر افسانوں کے لئے درکار ہیں۔ مختصر افسانے بیسیوں عنوان اور موضوع پر لکھے جاتے ہیں، اردو زبان میں اب اس قسم کا ادبی ذخیرہ کافی حد تک فراہم ہو گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کی صراحت ناگزیر ہے کہ بہترین افسانوں کی تعداد (جو ہر حیثیت سے قابلِ ستائش

اور لایق داد ہوں کم ہے، اور چند ہی افسانہ نگار کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مختصر افسانہ نگار کی حیثیت سے ہندوستان کی کئی خواتین متعارف کی جا سکتی ہیں جن میں مسز حجاب امتیاز علی کا نام اس عنوان میں سرِفہرست ہونا چاہئے، جو دنیائے اردو میں اپنے خزینۂ افسانہ نگاری کے باعث امتیاز رکھتی ہیں، مسز حجاب کی پیدائش اور ابتدائی پرورش حیدرآباد میں ہوئی اور پھر مدراس کی سرزمین میں انھوں نے افسانہ نگاری میں امتیاز حاصل کیا ہے۔

موجودہ زمانے میں کئی خواتین مختصر افسانے قلمبند کرتی ہیں، ان کے ترجمے اور طبع زاد دونوں افسانے ہوتے ہیں، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خواتینِ دکن کے افسانے ہر طور قابلِ ستائش ہیں اور ان میں کوئی خامی نہیں ہوتی، اس قسم کا دعویٰ کرنا ابھی قبل از وقت ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہو کہ کامیاب افسانے لکھنے کی ضرور کوشش کی جا رہی ہے، اور توقع ہے کہ آئندہ بہترین نتائج رونما ہو سکیں۔

دخترانِ جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین کے بیسیوں نام اس عنوان میں بیان کئے جا سکتے ہیں، خصوصاً جہاں بانو بیگم کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا، جن کے افسانوں کا مجموعہ "رفتارِ خیال" کے نام سے شایع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

ڈرامے

ادبیات کی ایک اہم شاخ ڈرامہ نگاری ہے، اس خصوص میں اردو زبان میں ایسا ذخیرہ بہت کم ہے، جس پر فخر کیا جا سکے، اچھے ڈراموں کی شدید ضرورت ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب پنجاب، دہلی اور حیدرآباد میں اس کی جانب توجہ کی گئی ہے۔

پنجاب اور دہلی کے قطع نظر حیدرآباد میں اس کی طرف خاص توجہ ہو چکی ہے، اب تک کئی ڈرامے لکھے گئے ہیں اور اسٹیج پر کامیاب طور پر ان کو بتایا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں مولوی فضل الرحمٰن صاحب بی اے ڈپٹی کنٹرولر لاسلکی کے دو ڈرامے خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں جو اپنی خوبیوں کے باعث عام مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

بعض حیدرآبادی خواتین نے بھی اس کی جانب توجہ کی ہے، اور دو چار مختصر ڈرامے لکھے ہیں، مگر یہ ڈرامے ایسے نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے، البتہ مس جیسی نندی کا نام ضرور لیا جا سکتا ہے، انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر جارج نندی کے ایک انگریزی ڈرامہ کو اردو کا لباس پہنایا ہے، اور بمبئی ٹاکیز نے کسی قدر ترمیم کے بعد "عزت" کے نام سے اس کو فلم میں پیش کیا ہے مس جیسی نے اس کے علاوہ بھی چند ڈرامے قلمبند کئے ہیں مگر ہنوز ان کو شایع نہیں کیا ہے۔

خطوط ادب کا ایک جزو خطوط بھی ہے، ہر زبان کے ادبیات میں اس کا بھی ذخیرہ ہوتا ہے اگرچہ آج تک عورتوں کے خطوط کا کوئی مجموعہ اردو زبان میں شایع نہیں ہوا ہے مگر بعض رسالوں میں ایسے خطوط شایع ہوئے ہیں جو ہمارے ادب کا بہترین نمونہ کہلا سکتے ہیں۔

جہاں بانو بیگم نقوی کا تعارف اس عنوان میں ضروری ہے، ان کے خطوط جو رسالہ شہاب میں اکثر شایع ہوئے ہیں ہمارے ادبیات میں گراں قدر اضافہ کا موجب ہوتے ہیں۔

آخر پر "ادارۂ ادبیات اردو" کے شعبۂ نسوان کا تذکرہ بھی نہایت ضروری ہے، جس کی صدر رابعہ بیگم، اور معتمد سکینہ بیگم، اور ارکان جہاں بانو بیگم، سارہ بیگم اور لطیف النساء بیگم ہیں، توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ادبی ادارہ اپنے پُر جوش اور مستعد کارکنوں کی دلچسپی کے باعث خواتینِ دکن میں نئے خیالات نئی امنگیں پیدا کرنے میں اپنی آپ نظیر ہوگا۔

ہمارے اس مضمون سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خواتینِ دکن بھی اردو ادب کی خدمت گزاری میں کسی اور ملک سے پیچھے نہیں ہیں، ان کے خدمات قابلِ قدر اور لایق تحسین ہیں، اور امید ہے کہ آنے والی نسل کے لئے اپنا اچھا نمونہ اور شاندار نقش چھوڑ جائیں۔

نصیر الدین ہاشمی

دکن کے چند کایستھ شعراء

جب انقلاباتِ روزگار نے شمال میں اردو کے لئے کوئی آسرا نہ رکھا، تو پھر یہ بیچاری اسی آغوش میں چلی آئی جہاں اس سے بہت زمانہ قبل اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی تھی۔ سرزمینِ دکن ہمیشہ اردو کے لئے سازگار رہی اور یہیں اس نے اپنے عہد کے خوبصورت ترین گل بوٹے نکالے چنانچہ یہ صحت بخش آب و ہوا اس کی خلط کے عین موافق تھی پھر اس کو سرسبز کرنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ اب یہاں سے قطب شاہوں کا وہ شفیق سایہ اٹھ چکا تھا، جس نے ایک عرصۂ دراز تک اس کو نظرِ بد سے بچائے رکھا۔ اس کی داشت و پرداخت جان سے زیادہ کی، اور صحیح معنوں میں پروان چڑھایا۔ لیکن ان کی بجائے اسے یہاں ایک ایسے خانوادۂ علم دوست کی بارگاہ ملی جو اردو نوازی میں قطب شاہوں سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اس نازوں کی پلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنی سرپرستی میں جگہ دی۔ اور اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ یہی وجہ ہوئی کہ تقریباً ایک صدی تک حیدرآباد کی مجلسیں عاشقانِ اردو کا جمگھٹ بنی رہیں۔ اور اس عرصے میں وہ محفلیں گرم ہوئیں جن کی یاد اودھ اور لال قلعہ کی صحبتوں سے پہلو زنی کرتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی۔ رتن ناتھ سرشار۔ نذیر احمد دہلوی۔ عبدالحلیم شرر۔ نواب محسن الملک۔ امیر مینائی۔ مرزا داغ اس شمع کی ضیا پاشیوں پر دور دور سے شیدا ہو کر آئے۔ دکن کی مہمان نواز زمین نے ان احباب کی یہاں بڑی قدر کی۔ دربار آصفی نے ان کی توقیر بڑھائی۔ اور زبردست اعزاز عطا کئے۔

اسی زمانہ میں خود اس مردم خیز ملک نے اپنے یہاں ایسے ایسے جید عالم اور بڑے بزرگ پیدا کئے جن کے فیض سے دکن فن و ادب کا مرجع بن گیا۔ شیر محمد خاں ایمان۔ مہاراجہ چندو لال شاداں۔ حافظ میر شمس الدین فیض۔ راجہ محبوب نواز ونت باقی۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل۔ میر احمد علیخاں عصر۔ حفیظ الدین ابو تراب علی زور۔ بہاری لال رمز۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد بچولال تمکین، اس دور کی چند ممتاز شخصیتیں ہیں۔

یہ زمانہ سچ پوچھئے تو دکن کے ادبی مذاق کا اصل محرک ہے۔ اس لئے کہ اس عہد میں یہ بزرگ ہستیاں مذہب اور قوم کی ظاہری کسوٹی پر نہیں جانچی گئیں۔ بلکہ ملک نے انہیں اپنے ذاتی جوہر کی بنا پر پرکھا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی اس زبان کے سنوارنے میں برابر کا حصہ لیا اور کبھی تنگ نظر یا مذہبی کدورت کو اپنے سینوں میں جگہ نہ دی۔

ان لوگوں میں طبقۂ کایستھ بہت نمایاں تھا۔ اور یہ اس کے لئے کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ اگر حقیقت کا اظہار بے جا تعلی نہیں ہے۔ تو نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمدن کے ہر دور میں اور ہر زمانہ میں جب امن آشتی نے ملکوں میں فن وادب کو تازہ کیا یہ قوم اپنی فطری قابلیت سے پیش پیش رہی۔ اور اپنی طبیعت کے جواہر خفتہ کو چمکایا۔

راجگان و سلاطین سلف کی طرح شاہان آصفیہ نے بھی اس فرقہ کی قابلیتوں کو پہچانا۔ اور ان کی خاص سرپرستی فرمائی۔ انہیں کسب معیشت سے جو ایک فن کار کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ مانع ترقی ہوتا ہے تقریباً آزاد کر دیا اور موقع بموقع ان کی قدر و منزلت میں کوتاہی نہ کی۔ اس کا راست نتیجہ ہوا کہ اس قلیل عرصے میں اس گروہ میں بعض

ایسے ادیب بلیغ اور شاعر نکتہ رس پیدا ہوئے جو دکنی ادب
میں ایک خاص پایہ رکھتے ہیں اور جنہیں اپنے زمانہ کے استادوں
میں شمار کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اردو گو شعرائے قدیم راجہ محبوب نواز ونت باقیؔ
رائے جوالا پرشاد فاضلؔ۔ راجہ سری پرشاد احقرؔ۔ رائے انبا پرشاد
ہنرؔ۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظمؔ۔ رائے شنکر پرشاد افضلؔ اور شعرائے
جدید میں رائے گردھن لعل آزادؔ۔ راجہ سنگھ راج بہادر عالیؔ۔
رائے محبوب راج محبوبؔ۔ رائے سنگور پرشاد رہبرؔ۔ رائے
رگھوبیر پرشاد شوقؔ۔ فارسی گو شعرا میں بچو لال تمکینؔ۔ راجہ باقیؔ
راجہ لچھمن لال ساقیؔ۔ رائے جوالا پرشاد فاضلؔ۔ انبا پرشاد حکمؔ
وغیرہ وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

ان اصحاب بزرگ کے علاوہ اور بھی ایسے بلند حیثیت
شاعر گزرے ہیں جنہیں ایک تو میں اپنی کوتاہ واقفیت دوسرے
عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہاں چھوڑ رہا ہوں اگر مصروفیتوں نے
دم لینے دیا، تو خیال ہے کہ ایک علحدہ تذکرہ کی صورت میں
اس یاد رفتگاں کو تازہ کیا جائے انشاء اللہ

(۱) **باقیؔ**۔ راجہ محبوب نواز ونت گردھاری پرشاد باقیؔ

راجہ باقی جو اپنے زمانے کے نہایت بلند پایہ شاعر
اور انشا پرداز گزرے ہیں، حضرت شمس الدین فیضؔ کے حلقہ تلامذہ
میں سے تھے۔ باقی کا خاندان دکن کے ان قدیم خاندانوں
میں سے ہے جو حضرت آصفجاہ نظام الملک کے ساتھ دہلی
اورنگ آباد آیا۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں مقیم رہنے
کے بعد جب رائے راجا رام ابن رائے دولت رائے کو
دربار آصفی سے چھتیس[۳۶] کارخانوں کی تنقیح و نگرانی کا کام
عطا ہوا، تو سنہ ۱۱۹۸ھ میں انہوں نے محلہ چندر کا پور عرف حسینی علم
میں ایک مکان خریدا اور مستقل سکونت کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ
اپنی کتاب "کلام متفرقات" میں اس کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از دہلی وارد دکن گردیدند چندے در شہر اورنگ آباد
بود و باش ورزیدہ پس ازاں اقامت پذیر بلدہ حیدرآباد شدند
رائے راجا رام بن رائے دولت رائے جد اعلیٰ راقم آثم
بخدمت استفتائے تحاویل خانسامانی کہ کار تنقیح سی و شش
کارخانجات سرکار آصفی میباشد در عہد نظام الملک
عز امتیاز میداشتند و در سنہ یک ہزار و یکصد و نود و ہشت
ہجری در محلہ حسینی علم عرف چندر کا پور یک قطعہ حویلی بجہت برائے
اقامت خود خرید نمودہ مقیم شدند"

اسی ڈیوڑھی میں وہ بتاریخ یکم رجب سنہ ۱۲۴۴ھ پیدا ہوئے
اس خاندان کے اکثر اراکین صاحب مناصب و خطابات
ہوئے ہیں۔ چنانچہ پیشگاہ نواب سکندر جاہ بہادر۔ نواب
ناصر الدولہ بہادر۔ نواب افضل الدولہ بہادر سے اس خاندان
کی مسلسل عزت افزائی ہوتی رہی خود راجہ باقی تا دم مرگ
خدمات جلیلہ اور مناصب اعلیٰ پر سرفراز رہے۔ باقی نے حضرت
محمد علی صاحب عاشقؔ سے فارسی پڑھی اردو فن شعر میں انہیں
حضرت شمس الدین فیضؔ سے تلمذ حاصل تھا جن خدمات پر باقی
فائز رہے اور اپنے فرائض جس خوش اسلوبی سے بجا لاتے
رہے انہیں سامنے رکھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر
مصروف انسان تھے۔ چنانچہ ان کی کثیر التعداد تصانیف
اور کلام کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے اور تعجب ہوتا ہے
کہ ایسے ہی حالات میں کیا ہم سے اس کا عشر عشیر بھی ہو سکتا ہے؟

ان کی تصانیف تیس[۳۰] سے زیادہ ہیں اور یہ فارسی
اردو۔ ہندی۔ تین زبانوں میں پھیلی ہوئی ہیں جب ان کتابوں
کے عنوان اور مضامین پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ باقی کو
علاوہ فن شاعری کے کس قدر علوم و فنون میں دخل تھا۔

فن شاعری۔ عروض و قافیہ۔ انشار۔ حساب۔ حکمت۔ لغت
خواص الاشیاء۔ فلکیات۔ سفرنامے۔ مذہبیات۔ بھجن۔ پوتی
پران۔ یہ چند عنوان ہیں جن پر باقی نے خامہ فرسائی کی ہے
اس کے علاوہ انہوں نے رباعیات خواجہ میر درد
کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اردو میں خواجہ صاحب کی رباعیوں
کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے کہ ان رباعیات
کو جو تصوف اور فلسفہ کے گراں بہا جواہر سے مالا مال ہیں۔
ایک ایسی زبان میں منتقل کرنا تھا جو فارسی کے مقابل میں ابھی
بچہ ہی تھی۔ پھر بھی اس ترجمہ کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے
کہ باقی اس باب میں کس قدر کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً مشتے نمونہ
از خروارے۔

درد
برجرم گر اعتراف خواہی کردن + دل را اے درد صاف خواہی کردن
یارب تو کریم و من گنہگار توام + دانم آخر معاف خواہی کردن

باقی
مجرم ہوں اعتراف کرتا ہوں صاف + کیا منہ ہے جو چاہوں میں اپنا انصاف
یارب تو کریم ہے گنہگار ہوں میں + تقصیر معاف ہو گی تقصیر معاف

درد
اے جلوہ بدید یار خواہد گردید + رازش ہمہ آشکار خواہد گردید
ما آئینہ ایم خود پرست است نگار + ناچار دوچار خواہد گردید

باقی
اک دن دیدار یار ہو جائے گا + راز اس کا خود آشکار ہو جائیگا
میں آئینہ ہوں نگار حسن پرست + ناچار کبھی دوچار ہو جائیگا

درد
ہر لحظہ دریں خانہ کہ من می آیم + گم کردہ رہ شناختن می آیم
چوں شعلہ کجا رسیدنم منظور است + پیوستہ برون خویشتن می آیم

باقی
معلوم نہیں گھر سے کہاں جاتا ہوں + بھولا ہوا راستہ ہے گھبراتا ہوں
شعلہ کی طرح کہیں یہ پہنچا ہوگا + یوں آپ سے باہر جو نکل جاتا ہوں

باقی کا کلام نہایت سلیس و سادہ ہے گو بعض وقت مناسبات
و رعایات لفظی پر جو اس عہد کے مذاق کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ زیادہ
زور دیتے ہیں۔ شعر میں ایک کے لئے چار چار مناسبتیں رکھنا،
دور دور کی بندشیں، ایہام و صنعت لفظی کی بھرمار اس زمانہ کی
خصوصیت تھی۔ باقی بھی اس رو سے بچ نہ سکے۔

چشم بلبل بجا دو مرے مرقد کا غلاف + جس میں سب جانیں کہ عاشق تھا کسی گل رو کا
لفظ بسمل جائے بسم اللہ تھا تیرا سبق + تو نے کتب ہی میں پہلے خوں کیا استاد کا
اس کی مژگاں کا تصور نہ کر اے دل نہار + کیوں تو بوتا ہے یہ اپنے لئے ناداں کانٹے
کس کی کہے ہے لب شیریں کی ہمسری کی سزا + جو نیشکر کے جدا بند بند کرتے ہیں

بعض وقت اسی گورکھ دھندے میں بھی وہ ایسے
در ہائے مضمون نکال لاتے ہیں کہ ان کی قادر الکلامی پر یقین ہو جاتا ہے

نیم جاں خنجر قاتل سے میں تڑپا جو ہم + بولی شمشیر نہ گھبرا ترے سر پر ہیں ہم

لیکن ان کے سرمایہ سخن پر اجمالاً نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا
کہ وہ اس دھارے میں ہمعصر شعرا کی طرح بہہ نہیں جاتے بلکہ
سلامت و شستگی کا دامن برابر تھامے رہتے ہیں۔

ملاحظہ ہو کس قدر صاف زبان ہے۔

کہہ رہا ہے دل شیدائے شراب + ہائے خم ہائے سبو ہائے شراب
میرے زخموں سے جو بہا ہا اُترا + بن گیا پنبۂ مینائے شراب

دریا سے موج موج سے دریا نہیں الگ + ہم سے جدا نہیں ہے خدا اور خدا سے ہم
عارض یار نہیں عکس فگن پانی میں + گل شاداب کا پھولا ہے چمن پانی میں

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

آپ نے لطف سے آنسو جو نہ پونچھے ہوتے + دیکھتے پھر یہ مرا دیدۂ تر کیا کرتا
پھر ہے میرے قتل کو ترچھی نظر + دیکھئے اے بندہ پرور دیکھئے

سلامت زبان دیکھئے۔

دل میں تو لگی ہے آگ اس کو + کیوں پانی سے گھر بہا رہے ہو

سنتا ہے تمہاری کون باؔقی + دیوانے ہو غل مچا رہے ہو

ماہ نو جھکتا ہے مجرے کے لئے + مہرباں نیچے سے اوپر دیکھئے

باؔقی نے ماہ صفر ۱۳۱۴ھ بعارضہ وجع مفاصل بلدہ میں انتقال کیا۔

(۲) رائے جوالا پرشاد فاضلؔ

رائے جوالا پرشاد فاضل سررشتہ داران سکھان راجہ موہن لال جاگیردار و خزانچی کے صاحبزادے ہیں۔ محلہ حسینی علم دیوڑھی راجہ موہن لال میں ۱۲۶۲ھ کے قریب پیدا ہوئے فارسی اور عربی کی تعلیم مولوی محمد علی عاشقؔ سے حاصل کی باوجود تحقیق کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شعر میں انہیں کس سے تلمذ تھا

رائے جوالا پرشاد فاضل کا خاندان دکن کے نہایت قدیم اور ممتاز گھرانوں میں سے شمار ہوتا ہے ان کے والد رائے موہن لال خزانچی بڑے با سطوت رئیس ہوئے ہیں۔ ان کے نانا راجہ سری پرشاد نواب ناصر الدولہ کے اتالیق اور معتمد بیشی تھے اس کے علاوہ سررشتہ سکھان بھی انہیں کے تفویض تھا۔

فاضل بچپن سے ہی نہایت طباع و ذہین تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے۔ اور لب و لہجہ میں عجمیوں سے ٹکر لیتے تھے سنا ہے کہ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور انہوں نے عربی میں حضرت غفران مکان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا لیکن ان کا کوئی شعر اس زبان میں میری نظروں سے اس لئے نہیں گزرا کہ ان کا تمام سرمایہ سخن امتداد زمانہ اور دیمک کے نذر ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ دو تین فارسی غزلیات۔ چند قصائد اور دو ایک اردو شعر اس بربادی سے بچ بچا کر مجھ تک پہنچ سکے ہیں وہ میرے یہاں محفوظ ہیں۔

فاضل کی عربی و فارسی کی قابلیت کا اس سے پتہ چلیگا کہ حیدرآباد کی کایستھ برادری میں وہ ضرب المثل ہو چکی ہے اور ابھی والدین اپنے لڑکوں کو ان کی مثال دیتے ہیں۔

یہ چند شعر ملاحظہ میں پیش کرتا ہوں لیکن ناظرین یہ جان لیں کہ یہ شعر منتخب نہیں ہیں بلکہ ان کے خرمن سخن کے وہ چند ریزے ہیں جو زمانہ کی تباہی سے بچ رہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک میں نے سنا ہے فاضل فارسی زیادہ کہنے کے عادی ہیں۔

مدام جلتا ہوں کوئی خبر نہیں لیتا + کسی غریب کی شمع سر مزار ہوں میں
مٹا دے مر کے جو ہر سری کدورت نے + چھپا ہوں گرد میں اپنی وہ شہسوار ہوں میں

جگہ کوئی در جاناں سے بہتر میں نہ سمجھا تھا + وہاں آ کر نہ دیکھا یہ مقدر میں نہ سمجھا تھا
دن جوانی کے گئے بجھ گیا اب دل فاضلؔ + پھر کر شمع کو ہم بھی تھے ہنسانے والے

فاضل نے ۱۳۳۴ف میں بعارضہ بخار بمقام جاگیر گھٹ اوپل انتقال کیا۔

(۳) راجہ ایسری پرشاد۔ احقرؔ

راجہ ایسری پرشاد احقرؔ راجہ باقی کے برادرزادے اور راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ کے عم زاد بھائی ہیں۔ احقرؔ بہت کم سن ہی تھے کہ ان کے والد رائے خوب چند کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے ان کی تعلیم و تربیت ان کے شفیق چچا راجہ باقیؔ کی زیر سرپرستی ہوئی۔

شعر و سخن کا مذاق اس خاندان میں ایک عرصہ سے موجود تھا۔ ان کے جد رائے چمن لال ایک زبردست انشاپرداز تھے۔ جنہوں نے فن انشاء پر مبسوط کتاب لکھی ہے راجہ لچھمن لال ساقیؔ ایک بڑے مورخ اور شاعر گزرے ہیں انہوں نے شائد سب سے پہلے رباعیات عمر خیام کا اردو میں ترجمہ کیا مزید براں تاریخ لچھمن لال کے بھی یہی مصنف ہیں۔

احقرؔ شاعری میں کھنو لال تابؔ لکھنوی سے تلمذ رکھتے تھے۔ لیکن راجہ باقیؔ کی فیض صحبت کا ان کے کلام پر اثر پڑا۔

راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت نے انہیں دفتر فوج باقاعدہ کی تنظیم پر مامور کیا تھا۔ نیز ان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک احقرؔ اسٹیٹ کا کاروبار دیکھتے رہے بدقسمتی سے جوانی میں ہی احقرؔ کو ایک پیچیدہ مرض لاحق ہو گیا چنانچہ اسی مرض موت کی تشخیص کے لئے مدراس گئے تھے کہ سنہ ۱۳۱۸ھ میں انہوں نے وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

نمونتاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جوشش دیدۂ گریاں کو نہیں جانتے کیا + نوح کے صدؔ طوفان کو نہیں جانتے کیا
کوئی کہتا ہے فلک اسکو کوئی ابر سیاہ + دودِ آہ دل سوزاں کو نہیں جانتے کیا
ابرو و عارض دلدار کا مفتوں نہیں کون + ماہ نو مہر درخشاں کو نہیں جانتے کیا
میں بھی اک بندۂ احقرؔ ہوں نمک خوار انکا + میر محبوب علی خاں کو نہیں جانتے کیا

افسوس کہ باوجود تلاش کے ان کا کلام بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

(۴) ہنرؔ رائے انبا پرشاد ہنرؔ

انبا پرشاد ہنرؔ بمقام بلدہ حیدرآباد سنہ ۱۲۷۵ف میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ کے حسب قاعدہ ان کی ابتدائی تعلیم خانگی مکتب میں ہوئی۔ لیکن نوعمر انبا پرشاد نے بہت جلد ہی اپنے ہم سبقوں میں امتیاز پیدا کر لیا۔ عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کی۔ اور خطاطی میں جو قدما کے یہاں ایک مستقل فن شمار ہوتا تھا اچھی مہارت پیدا کر لی۔ چنانچہ ہنرؔ کا دیوان جو خود انہوں نے اپنے قلم سے نہایت خوبصورت نستعلیق میں لکھا تھا حال حال تک محفوظ تھا۔ مگر افسوس کہ وہ کسی حادثہ کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ اس لئے ان کے دو چار شعر حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی دقت اٹھانی پڑی۔

کیوں نہ ہوا ان پہ حال روئے انور آئینہ + صاف کہدیتا ہے جو کہنا ہو منہ پر آئینہ
تھی ہی رخ کی صفائی جب نکل آتا خط + کور ہو جاتا ہے پیدا کر کے جوہر آئینہ
دیدنی ہے تمہارے روئے روشن کی نصیب + بن گیا ہے اپنے طالع کا سکندر آئینہ

ہنرؔ پایئگاہ آسماں جاہی میں سررشتہ دار افواج تھے نیز انہیں صرف خاص مبارک سے منصب بھی ملتا تھا سنا ہے شاعری میں انہیں نواب خیرات علیخاں سخیؔ سے تلمذ تھا۔

ہنرؔ نے ۶۲ سال کی عمر پائی اور سنہ ۱۳۳۵ف میں بعارضہ وجع مفاصل انتقال کیا۔

نظمؔ۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظمؔ سنہ ۱۲۷۴ف میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد بسلسلۂ ملازمت شمالی ہند سے مدراس آئے اور یہیں خاندان والاجاہ کی سلسلہ ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ چنانچہ ان کے جد رائے سندرلال مہتمم شادی خانہ نواب والاجاہ اور رئیس شہر تھے۔

جب اس خاندان کا ستارا ڈوب گیا۔ تو ان کے صاحبزادے رائے منی دھر حیدرآباد آئے۔ جہاں انہیں بارگاہ آصفیہ سے منصب عطا ہوا۔ نظمؔ پیشکاری سرکار عالی میں خدمت مددگاری پر مامور تھے اور یہاں ارباب اقتدار کی نظروں میں انہوں نے بحیثیت ایک متدین و منتظم عہدہ دار کے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا۔ چنانچہ بزمانۂ مدارالمہامی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جب صیغہ اصلاح مصارف قائم ہوا تو اس اہم صیغہ پر بطور خاص نظمؔ کا انتخاب عمل میں آیا۔

نظمؔ ایک نہایت ہی خوش اخلاق اور ہمدرد انسان تھے چنانچہ وہ ان معدودے چند افراد میں تھے جنہوں نے اپنی جوانی میں اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا اور مرتے دم تک اس پر اڑے رہے۔ ایک عرصہ تک وہ بزم تہذیب کے معتمد کی حیثیت سے علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر آل انڈیا ٹمپرنس لیگ

کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے حیدرآباد کے کایستھوں کی بہت کچھ خدمت کی۔

نہ صرف نظم میں ان کا مذاق بلند تھا بلکہ نثر پر بھی انہیں خاص قدرت حاصل تھی۔ اس عہد کا مشہور ادبی پرچہ "دبدبۂ آصفی" جو حضرت صوفی شاد کی زیر نگرانی اور ایک عرصہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار کے زیر ادارت نکلا کرتا تھا، انہیں کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ اور وہ خود اس رسالہ کے لئے برابر مضامین لکھا کرتے۔ نظم کا کلام شمالی ہند کے اکثر رسالوں مثلاً مذاقِ سخن۔ بہار اودھ وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ شاعری میں انہیں حضرت کھنولال نائب سے تلمذ حاصل تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شمس الدین فیض سے بھی غائبانہ عقیدت تھی اس لئے کہ ان کے یادگاری مشاعروں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور ان کی مدح میں اکثر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے۔

لامکاں ہے اگر مکانِ فیض	عرش اعظم ہے آستانِ فیض
وہی دیکھا جو کہہ گئے حضرت	لب اعجاز تھی زبانِ فیض
اب بھی ہیں فیض یاب اہل دکن	ایسی بافیض تھی زبانِ فیض
کیوں نہ ان کی غزل ہو سلک گہر	کہ تھا گنج گہر دہانِ فیض
اٹھ گیا لطفِ شاعری اے نظم	رہ گئی لب پہ داستانِ فیض

نمونۂ کلام یہ ہے

دل لگا کر سب سے کہتے پھر رہے ہو ہم لٹ گئے + نظم یہی ہیں بھلا کوئی طریقے پیار کے
درد و غم رنج و الم نالہ و فریاد و فغاں + رات دن ان سے رہا کرتی ہے صحبت میری
خیر اتنا تو کیا جذبۂ الفت نے اثر + کہ مقر تو ہیں وہ سب سے سر تربانے کے

آزاد و رائے گرسرن لال آزاد۔

آزاد کے آباؤ اجداد غدر کے بعد بلدہ حیدرآباد آئے اور دیگر خاندانوں کی طرح یہیں کے ہو رہے ان کے والد رائے راج بلی اوج بڑے اچھے شاعر اور صاحب مذاق گزرے ہیں۔ انہوں نے آزاد کی تربیت کا خاص خیال رکھا اردو فارسی کی تعلیم قابل اساتذہ سے دلوائی۔ آزاد کے جد کا تخلص توکل تھا۔ اور ان کے چچا مہابلی انور ایک بڑے بلند مرتبہ شاعر گزرے ہیں۔ اس لئے شعر سخن کا مذاق انہیں ورثہ میں ملا۔ یہ سنہ ۱۳۱۰ھ میں بمقام بلدہ دیوڑھی راجہ راجان شیوراج دھرم ونت پیدا ہوئے اور اب بھی یہیں مقیم ہیں۔

آزاد بڑے خوش اخلاق۔ بذلہ سنج اور مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ رباعی خوب کہتے ہیں۔ چنانچہ عمر خیام کی رباعیوں کا ایک سلیس ترجمہ الخیام عنوان سے شائع کیا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کے مشاعروں میں برابر پابندی سے شریک رہتے ہیں۔ ان کی ایک مثنوی الشمس بھی جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے قابل دید ہے۔ عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

آغاز رواں گشتن ایں زریں طاس	انجام روانی مہ و خور کیا ہے
و انجام خرابی جنس نیک اساس	بربادی کائنات کا گر کیا ہے
دانستہ نمی شود بمعیار عقول	آتی نہیں کچھ عقل میں اپنے یہ بات
سنجیدہ نمی شود بمقیاس قیاس	جمتا نہیں ساز پر جو یہ سر کیا ہے

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

حشر میں حشر بپا ہوگا نیا اک آزاد + بے نقاب آج وہ محشر میں چلے آتے ہیں
واعظا الجھ نہ مجھ سے کدھر کو خیال ہے + رندوں کی بات تجھکو سمجھنی محال ہے
فریب نظر یہ مکان و زماں ہے + طلسمات ہو کارخانہ ہمارا

مثنوی الشمس جو ابھی ابھی چھپی ہے اپنی سلاست بیان کی وجہ سے قابل دید ہے۔ اس میں آزاد نے ایک سائنٹفک یا نیم سائنٹفک مضمون کو نظم میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

عاؔلی راجہ نرسنگھ راج بہادر عاؔلی

راجہ نرسنگھ راج بہادر عاؔلی راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقی کے فرزند اکبر ہیں۔ وہ بمقام بلدہ سنہ ۱۳۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے برگزیدہ والد کی طرح سلسلۂ خدا ناں بارگاہ اَصفی میں منسلک ہیں۔ راجہ باقی کو ہمیشہ اپنی اولاد کا غم رہا۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی بھر صدموں سے متاثر رہے۔ حسن اتفاق کہ بنارس کے ایک خدارسیدہ بزرگ سوامی بھاسکر آنندسرسوتی نے عاؔلی کے لئے دعا کی اور باقی کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس لڑکے کی رسم بسم اللہ اور شادی بنارس میں ہی ان کے پاس کی جائے۔ چنانچہ یہ دونوں رسمیں وہیں ادا ہوئیں۔

جب والد کا سایہ سر سے اٹھا تو عالی نہایت کم سن تھے اور ان نو عمر کاندھوں پر بڑی ذمہ داریاں تھیں چھوٹے بھائی محبوب راج کا ابھی بچپن تھا۔ اسٹیٹ نااہل کارکنوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ اس لئے اس افراتفری میں عاؔلی نے جو کچھ بھی تعلیم حاصل کی اور اپنے برادر صغیر کی تربیت کا جس قدر بھی خیال رکھا وہ انھیں کی ہمت اور حوصلہ کا کام تھا۔

بحیثیتِ شاعر عاؔلی صاحبِ مذاق خوش فکر ہیں۔ شاعری انہیں ورثہ میں ملی ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے جو بات لکھتے ہیں سیدھی اور صاف کلام میں لگاوٹ بناوٹ کو دخل نہیں دیتے۔

زندہ ہوش میں مگر کیسی ٭ کر رہے ہیں شعور کی باتیں
بت خدا بن گئے معاذ اللہ ٭ نہیں اچھی غرور کی باتیں

میں نہا دھو کے ہوا پاک ہر اک عصیاں سے
اشکِ خجلت جو مرے دیدۂ تر سے نکلا

کون کہتا ہے کہ تو خوگر بیداد نہیں
مجھ میں پہلی سی مگر طاقتِ فریاد نہیں

رفتہ رفتہ باعثِ تسکیں ہوئیں بیتابیاں
دردِ دل اتنا بڑھا بڑھ کر مداوا ہوگیا

رباعی ملاحظہ ہو۔

پوشیدہ ہے گو جلوہ عیاں تیرا ہے
کثرت ہو کہ وحدت ہو نشاں تیرا ہے
کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن
کس کے لب پر نہیں بیاں تیرا ہے۔

کلام میں تصوف کا نقش زیادہ واضح ہے اور اس کو مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد جیسے صوفی کی فیض صحبت اور استاد جلیل کے ذاتی اثر نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ اصناف سخن میں زیادہ تر غزل اور رباعی ہیں لیکن سب میں ان کا مخصوص رنگ برابر قائم ہے۔

محبوب ۔ رائے محبوب راج محبوب

رائے محبوب راج محبوب راجہ محبوب نواز ونت باقی کے چھوٹے فرزند اور راجہ نرسنگھ راج عالی کے برادر خورد ہیں۔ وہ ایک نہایت جامہ زیب اور وجیہہ انسان تھے طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی۔ چنانچہ حلقۂ احباب میں اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی کی وجہ سے وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد انہیں انتہا سے زیادہ دوست رکھتے اور ایک منٹ کے لئے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔

محبوب سنہ ۱۳۱۲ھ میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ پدر بزرگوار راجہ باقی نے اپنے مالک مجازی کے حسب ارشاد

منشاء ان کا نام محبوب راج رکھا۔ وہ بچپن سے نہایت طباع
و ذہین تھے۔ اس لئے انہوں نے بہت جلد مکتبی تعلیم سے
فراغت پالی۔ اس کے بعد ان کو مدرسہ عالیہ میں داخل
کیا گیا۔ جہاں انہیں گوناگوں حالات کی وجہ سے میٹرک کے
بعد ہی تعلیم ختم کر دینی پڑی۔

محبوب کے کلام کی خصوصیت ان کی زبان ہے
وہ نہایت سلیس و شستہ لکھتے ہیں۔ بحریں چھوٹی چھوٹی اور
بندشیں چست ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی اچھا
داستان گو عشق و محبت کی کہانی نہایت موثر اور چبھتی ہوئی
زبان میں سنا رہا ہے۔

آفت ہیں بلائیں فتنہ گر کی ؛ کچھ خیر نہیں دل و جگر کی
تھا عشق کا مرحلہ نہ آساں ؛ سر دے کے مہم یہ ہم نے سر کی
اللہ رے درازیٔ شب ہجر ؛ ملتی ہی نہیں خبر سحر کی

سنبھالو مے کشو اب شیشہ و جام ؛ گھٹا چھائی ہے ساون کی جھڑی ہے
گلے مل لو کہ سوز غم کے ہاتھوں ؛ چراغ زندگی بس دو گھڑی ہے
قدم کیوں کر اٹھیں کوچے سے تیرے ؛ یہاں تو حسن کی مٹی گڑی ہے

مضامین اور ندرت بیان دیکھئے۔

جاں بلب شوق شہادت میں بیٹھے ہم ؛ تیغ قاتل کی مسیحا ہو گئی
خواب میں آتے ہو پھر رہتے ہو نگاہ شوق میں ؛ کیا پردہ ہے کہ چھپتے ہو نکل کر سامنے

ستم کا دیکھ کر انداز ہوتی ہے خوشی ہم کو
کہ ہم بھی چاہنے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں

انہیں استاد فصاحت جنگ بہادر جلیل سے تلمذ حاصل

تھا۔ افسوس کہ نوجوان شاعر کی عمر نے وفا نہ کی اور
وہ ۱۳۵۰ھ میں بعارضہ نمونیہ عین ہنگام شباب میں اس
دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔

رہبر حکیم رائے ست گرو پرشاد رہبر

حکیم ست گرو پرشاد رہبر رائے بنکٹ پرشاد صاحب
مرحوم منصبدار و سررشتہ دار افواج نظم جمعیت سرکار عالی
کے فرزند ہیں آپ بتاریخ ۶ صفر ۱۳۱۷ف بروز جمعہ بلدہ حیدرآباد
میں پیدا ہوئے۔ رہبر بچپن ہی سے شاعری کی جانب مائل تھے
طبیعت رسا اور فطرت رنگین پائی تھی اور چونکہ نہایت تیز اور
طباع واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا جوہر بہت نوعمری
ہی میں چمک گیا۔

حسن اتفاق کہ ان کی تعلیم علامہ عبدالرزاق نیشاپوری
جیسے جید عالم کے یہاں ہوئی، جو فارسی اور عربی میں اپنے
عصر کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ اردو ان کی
مادری زبان تھی۔ اور شعر و سخن ان کے خاندان کا خاص مذاق
تھا۔ اس لئے نوعمری سے ہی اس ماحول نے شاعرانہ مزاج
کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

السنہ اور ادب سے ایک گونہ فراغت ملی تو
انہیں مفید الانام ہائی اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ جہاں انہوں نے
انٹرنس تک اپنی تعلیم ختم کی اور چونکہ حکمت سے بھی طبعی
لگاؤ تھا۔ اس لئے مدرسہ طبیہ سرکار عالی میں شریک ہو کر اس
فن کی تکمیل کر لی۔ فن شاعری میں انہوں نے استاد عصر حضرت
سید علی احمد زیرک سے تلمذ حاصل کیا۔

رہبر کایستھوں کے ایک قدیم اور معزز گھرانے سے
تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آباو اجداد والا جاہان مدراس کے
عہد میں خطابات جلیلہ پر فائز اور صاحب خطابات و مناصب

ہوئے ہیں۔ حیدر آباد آنے کے بعد بھی یہاں ان لوگوں کو سرفرازیوں اور اعزاز خاص سے نوازا گیا۔ یہی گزشتہ خاندانی تمکنت کی بُو باس جو رہبر کے دماغ میں اب تک بسی ہوئی ہے انھیں اہل دولت و امارت کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی سے دور رکھتی ہے اور یہی احساس خودداری ہے جو انھیں کسی کے آگے بے محل جھکنے سے روکتا ہے۔

طبیعت نہایت غیور اور تنہائی پسند ہے۔ علاوہ منصبدار ہونے کے انھیں میز خانۂ مبارک میں منسلک خدمت ہونے کا بھی شرف حاصل ہے غزل زیادہ کہتے ہیں گو دیگر اصناف کی بھی ان کے سرمایۂ سخن میں کمی نہیں۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ اس نوجوان شاعر نکتہ رس کے کلام کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ دیکھئے اگر موقع ملے تو اس فرض کو بجا لاؤنگا۔ رہبر کی زبان اس قدر صاف اور سلیس ہے کہ بے اختیار منہہ سے واہ نکل جاتی ہے۔

کب خوف ہجر یار نہ تھا وصل یار میں ؛ کس دن خزاں کی یاد نہ آئی بہار میں
پرہیز میکشی ہے ہو فصل بہار میں ؛ یہ احتمال رحمت پروردگار میں
کانٹوں میں ہے خلش نہ گلوں میں ہے رنگ و بو ؛ کیسی ہوا چلی چمن روزگار میں
دم گھٹ نہ جائے ضعف جنوں کچھ تو رحم کر ؛ ثابت ابھی ہے اپنا گریباں بہار میں

حرم تیرا گھر بتکدہ تیرا مسکن ؛ ہے تفریق شیخ و برہمن میں کیسی

زحمت اٹھاؤ کیوں نظر قہر ڈال کے ؛ رکھدوں میں آپ اپنا کلیجہ نکال کے
اے شوق فروشی عشاق مژدہ باد ؛ بیٹھے ہیں وہ تنے ہوئے خنجر نکال کے

مضمون آفرینی ملاحظہ ہو

توڑ دا اسے ذوق آزادی میرا تار نفس ؛ روح کو اس قید سے آزاد کر لیتا ہوں میں
کھینچ کے آجاتے ہیں وہ جذب تصور کے نثار ؛ ایک دنیا سے خیال آباد کر لیتا ہوں میں
یاس اور امید دونوں کا کھلونا ہے یہ دل ؛ شاد کر لیتا ہوں میں ناشاد کر لیتا ہوں میں

رُباعی میں اُن کا اپنا رنگ مخصوص ہے۔

دنیا میں بُری رہ نہ برادر چلنا ؛ ہشیار خبردار سنبھل کر چلنا
رہنا ہے اگر بزم طرب میں رہبر ؛ شیشہ کی طرح سر کو جھکا کر چلنا

شوق۔ رائے رگھبیر پرشاد شوق

رگھوبیر پرشاد شوق۔ بی۔ اے عثمانیہ بتاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں بلدہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادر بزرگوار رائے ست گرو پرشاد رہبر کی طرح فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے خاندانی استاد علامہ عبدالرزاق نیشاپوری سے حاصل کی۔

سنہ ۱۳۲۸ف میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کا امتحان فلسفہ لے کر کامیاب کیا۔ اور دفتر پولیس بلدہ میں ملازم ہو گئے۔ انھیں عروض اور فن شعر کی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم ست گرو پرشاد رہبر سے ملی۔ اور شعر و سخن کا مذاق بھی انہیں کی فیض صحبت سے چمکا۔

کرشمے بھی تیرے اے سوز الفت کیا نرالے ہیں
کسی جا شمع بننا اور کہیں پروانہ ہو جانا

ظاہر ہیں ہم نہاں میں عیاں ہر نہاں میں آپ
مسکن گزیں بتائیے ہیں کس مکاں میں آپ
آنکھیں ہوں گر تو گھر میں ہے لیلے جناب قیس
کیا ڈھونڈتے ہیں نجد کی ریگ رواں میں آپ

یوں جو ہر ایک سے الجھتی ہے۔ کس کے دامن کا خار ہے دنیا

بدقسمتی سے عرصہ ۶ سال ہوا کہ بعارضہ خلل دماغ علیل ہیں۔ ورنہ نہ جانے دکن کے اس نوجوان شاعر سے فن شعر کی کس قدر خدمت ہوتی۔ — مہندر راج سکسینہ

اُردو ادب اور قومی شاعری

غدر کے بعد اردو شاعروں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا
جس نے سوچا کہ اب "حسن و عشق" کی منزلیں حد سے
گذر چکی ہیں۔ مغربی سیلاب اور زمانے کا انقلاب اب اس کا
مقتضی نہیں کہ وہی پرانا راگ الاپا جائے لہٰذا شاعری
کو قوم اور وطن کی بیداری کا ایک ذریعہ بنانا چاہئے چنانچہ
حذف اور اضافے کئے گئے اور اس شاعری کو جدید شاعری
سے تعبیر کیا جانے لگا۔ اس جدید شاعری کا آغاز قومی شاعری
سے ہوا۔ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا کس
زمانے سے ہوی مگر یہ کہنا بیجا نہیں کہ اس کا سنگ بنیاد حالی
کے ہاتھوں رکھا گیا۔ حالی پہلے پہل تو اُسی ڈگر پہ چلے جس پر
شیفتہ، مجروح وغیرہ چل چکے تھے لیکن انہیں تو ایک جدید
اسکول کا بانی ہونا تھا۔ اس وقت اردو شاعری نے ایک
نئی کروٹ لی اور یہیں سے اس کا RENAISSANCE
یعنی دورِ نہضت شروع ہوا۔ اسلامی سلطنت کی دیا خاموش
ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی زندگی اور سیاسیات میں ایک
انقلاب کی ضرورت تھی۔ حالی نے مسدس لکھی اور اپنے
قوم کی زندگی میں حیات کی گرمی اور حرکت پیدا کی۔ شمع سے
شمع جلتی ہے۔ حالی کی 'برکھارُت' اور 'حُبِ وطن' نے اکبرؔ
اور چکبستؔ، اقبالؔ اور جوشؔ جیسے شاعر پیدا کئے۔

اکبر نے اپنے بے شمار مزاحیہ قطعوں اور نظموں سے
مغربی تہذیب کی برائیوں اور خرابیوں سے آگاہ کیا۔
چکبست نے ہندوستان کی بہار رفتہ اور عظمتِ قدیم کا
ذکر کرکے عوام کے دلوں میں حس اور قوت پیکار پیدا کی۔
یہ وہ وقت تھا جب کہ ہندوستان پستی و گمراہی کی
ضلالت میں گھرا ہوا تھا۔ ایک ایسے بڑے قومی شاعر کی
ضرورت محسوس کر رہا تھا جو صحیح جادۂ اعتدال کی طرف
رہنمائی کرے۔ چنانچہ قدرت نے اس کے لئے اقبال
کا انتخاب کیا جس نے ہم کو نئی تہذیب کے اثرات بد سے
آگاہ کرکے ایک شاندار مستقبل کے لئے آمادہ کیا۔ ہمارے
دلوں میں ہماری ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کی
کوشش کی۔ اسلاف کے کارنامے سنا کر ہمارے سرد
اور منجمد خون میں روانی پیدا کی۔

اقبال کی قومی شاعری کو تین عنوانات کے تحت
رکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ وطنی ۲۔ اسلامی ۳۔ بین قومی

اقبال اور وطنیت:۔ اقبال نے جب آنکھ کھولی
اس وقت ہندوستان مغربی طرزِ تمدن اور مغربی افکار سے
آشنا ہوتا جا رہا تھا۔ بہتیرے ناعاقبت اندیش اس رو میں
بہہ گئے اور مغرب کی اندھی تقلید میں اپنا مشرقی ناموس
کھو دیا۔ یہ ماحول تھا جو اقبال کی شاعری پر اثر انداز ہوا اور
اقبال کو وطنیت کی رَو میں بہا لے گیا۔ بانگِ درا کا صفحہ
صفحہ اسی ماحول کا پرتو ہے "بانگِ درا" کھولتے ہی پہلی
نظم جس پر نظر پڑتی ہے ہمالیہ ہے۔ ہندوستان کا
بچہ بچہ اسے جانتا اور فخر کرتا ہے۔ یہ نظم قطع نظر بلندیِ تخیل
اور جدتِ تشبیہات کے ایک اچھوتا پیغام دلوں تک پہنچاتی
ہے اور اس کے لفظ لفظ سے 'حُبِ وطن' کی بو آتی ہے
پھر جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی مہک بڑھتی جاتی
ہے۔ چند صفحوں کے بعد "صدائے درد" کے عنوان سے
ایک چھوٹی نظم ہے۔ شاعر شدتِ دردِ دل سے چیخ اٹھتا
ہے اور اپنے ملک کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں
اختلاطِ موجۂ و ساحل سے گھبراتا ہوں

پھر ایک اور نظم تصویر درد ہے جس میں شاعر نے دل کھول کر اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

چند ہی ورق الٹنے کے بعد ترانہ ہندی آتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس نظم کو وہ مقبولیت حاصل ہے جو شاید ہی کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو اور قومی گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہے۔ اس کا ایک ایک شعر حبِ وطن میں رنگا ہوا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی "نیا شوالہ" ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس کے ہر شعر میں حب وطن کی آگ بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایک ایسے نئے شوالے کی تعمیر کی طرف اشارہ ہے جہاں پرستارانِ وطن کا سر جھک جائے۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اور پھر یہیں سے عالمگیر محبت اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو۔ نئے شوالے کے ساتھ ہی اقبال کی وطنی شاعری ختم ہو گئی۔ بعد میں یہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا گیا اور آخر میں عجمی خم اور حجازی بادہ ہی رہ گئی۔

اقبال اور اسلامیات:۔ قوموں میں ایک نہ ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے افراد اپنے آپ کو منصب انسانیت سے گرا کر ضلالت و گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی ایک ایسا دور آیا کہ ان کی انسانیت اپنے مرکز اصلی سے ہٹ کر اوہام و خرافات کی اندھیری اور پیچ بہ پیچ وادیوں میں ادھر ادھر بھٹکنے لگی۔ اقبال نے اسے محسوس کیا اور اپنی شاعری کا رخ جس کا آغاز وطنیت سے ہوا تھا اسلام کی طرف پھیر دیا۔ مسلمانوں میں ایک نئی روح ڈال دی اور ایک ایسا صور پھونکا کہ اکثر اٹھ بیٹھے اور جو نہ اٹھے وہ کم از کم چونک تو ضرور پڑے جس کا احساس انہیں خود بھی ہوا اور وہ پکار اٹھا۔

عجم از نغمہ ام آتش بجاں است ؛ صدائے من درائے کاروان است

اقبال کے کلام کا بڑا ذخیرہ اسلامیات کے متعلق ہے۔ اقبال نے اسلامی شاعر کی حیثیت سے مذہب و ملت کی بڑی خدمات انجام دیں۔ اس صنف کی ابتدائی نظمیں بے حد پرجوش اور ولولہ انگیز ہیں۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" اسی وصف کی مخصوص نظمیں ہیں۔

یورپی قوموں نے قومیت کی ساری بنیاد وطن پر رکھی جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ خود غرضی اور جنگ و جدال نے انسانوں سے
سکھ اور شانتی کو چھین لیا۔ اقبال نے بتایا کہ افراد قوم اور انسانی
سیرت کی صحیح تحدید صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان
جغرافی حدود سے پرے نکلجائے یعنی انہوں نے بتا دیا کہ
ملتِ اسلامیہ کی بنیاد وطن پر رکھنا درست نہیں۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند ؎ بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

مردمے اندر جہاں افسانہ شد ؎ آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند ؎ آدمیت گم شد و اقوام ماند

کوئی قوم جب تنزل اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے
تو اس کے عملی قویٰ شل ہو جاتے ہیں اور وہ ساتھ ہی ساتھ اپنی
تمام خصوصیتوں اور روایتوں کو ذلیل سمجھنے لگتی ہے۔ اقبال نے
اسلام کی بلندو برتری کی ایسی تشریح کی کہ غیر تو غیر خود اپنے
بھی حیران رہ گئے کہ واقعی ہمارا اسلام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے
اور ہمارا یہ رتبہ ہے۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو ؎ فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور ؎ کہ شاہینِ شہ لولاک ہے تو

بعض وقت اقبال کے اندر ایک ایسے سخت قسم کا
فرقہ وارانہ رجحان (Communalistic Tendency)
پیدا ہو جاتا ہے جو بڑھتے بڑھتے جہاد
فی سبیل اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بانگ درا
کی نظمیں "بلالؓ" "ایک حاجی مدینے کے راستے میں" اور ضرب
کلیم کی "جہاد" "اسلام" "مسلمانوں کا زوال" اور "ہندی اسلام"
پیش کی جا سکتی ہیں۔

نظم "اذان" کے دو شعر ملاحظہ ہوں کتنے اثر آفریں
ہیں۔ یہ نظم اقبال نے قرطبہ (اسپین) میں لکھی تھی۔

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
ہوائے قرطبہ شائد یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

اقبال اور بین قومی تاثرات:- اقبال نے ان
مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق نہ تو ان کے وطن سے
ہے اور نہ ان کے مذہب اسلام سے۔ اس سلسلہ میں
انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ زیادہ تر "ضرب کلیم" میں پائی
جاتی ہیں مثلاً "نپولین کے مزار پر" اور "مسولینی" وغیرہ ہیں۔
بین۔ قومی سیاسیات پر اقبال نے جن افکار کا اظہار کیا ہے
ان میں شاعرانہ تخیل کے ساتھ انسانیت کا شرف بھی بدرجۂ اتم
موجود ہے "بالشویک روس" "ابی سینا" "مسولینی"
"سیاساتِ فرنگ" "جمعیت اقوام" اور "مشرق" قابل ذکر ہیں۔
مسولینی پر اقبال کی نظم بالِ جبریل میں بھی ہے۔ اور
ضرب کلیم میں بھی۔ موخر الذکر نظم "مسولینی" میں انھوں نے
مسولینی کی تعریف تو نہیں کی لیکن معترضین یورپ پر ایک
زبردست اعتراض ضرور کیا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
پردۂ تہذیب میں غارتگری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

اقبال نے دول یورپ کی پکار اور چیخ کی حقیقت خوب
سمجھی تھی وہ نفسیات یورپ کے ماہر تھے۔ خونریزی اور بدامنی
کو روکنے کی خاطر جمعیت اقوام قائم کی گئی اور دنیا نے یہ یقین کے

طور پر سمجھ لیا کہ اب امن ہی امن رہے گا۔ لیکن اقبال سیاست
افرنگ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے
اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

زمانہ جانتا ہے کہ اقبال کی پیشین گوئی حرف
بحرف کتنی درست ثابت ہوئی۔ واقعات نے بتا دیا کہ
ارباب سیاست کی عیاریوں کے سامنے اس کی کچھ نہیں
چل سکتی۔ آج ہماری یہ "امن کی دیوی" کس کس مپرسی
کی حالت میں دم توڑ رہی ہے۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

اقبال کی شاعری کا چراغ گل ہوتے ہوتے یہ قومی
شاعری عوام میں بھی آ چکی تھی۔ لہذا اس میں نئی شاخوں اور
نئی راہوں کا اضافہ ہوا۔ مفلس اور بے روزگاروں کی
زندگی پر تنقید اور تبصرے ہونے لگے۔ نظموں کے ذریعہ
مزدور کسان اور سرمایہ داروں کی کشاکش کا معمہ سلجھانے
اور بیان کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ طبقہ کسان اپنی
جہالت، بے مائگی کے سبب سوسائٹی میں خواہ کتنا ہی ذلیل
کیوں نہ ہو پھر بھی اس حقیقت سے گریز نہیں کہ اسی کی ذات پر
ہماری ساری طمانیت اور شادمانیٔ حیات کا دارومدار ہے
اقبال نے اس مقدس طبقہ کی طرف ہندوستان کی توجہ
منعطف کرائی تھی۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوش، سیماب، احسان دانش نے بھی اپنے قدم
بڑھائے۔ محل سے نکل کر جھونپڑوں میں چراغ جلائے۔
مفلسوں کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ کسان کی بدحالی پر دنیا کو
ہمدردی کے لئے مائل کرنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں
جوش کا قدم سب سے آگے ہے۔ جوش کی ایک نظم
کسان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جھٹ پٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
خون ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے جو بکاں آنکھوں کے نیچے بار بار

گھر کی نا امید دیوی کا شبابِ سوگوار
سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں ایک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے

اسی عنواں پر سیماب اکبرآبادی کے بھی چند اشعار دیکھئے۔ مزدور کی حالت کا نقشہ کس فطری انداز میں کھینچا گیا ہے

گرد چہرے پر پسینہ میں جبیں ڈوبی ہوئی۔
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بارگراں۔
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح چٹخنے کی صدا

جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا۔
ہانپتا، گرتا، لرزتا ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقع سارے کنبے کا خیال
ایک لمحہ بھی نہیں فکر معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام، ہے تاریک اس کی کائنات
دیکھ اسے قارونِ اعظم دیکھ اے سرمایہ دار
نامرادی کا مرقع بے کسی کا شاہکار
گو ہے تیرے ہی طرح انسان پر مقہور ہے۔
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

صرف کسان اور مزدور ہی نہیں بلکہ غریبوں کے وہ طبقے بھی جو باوجود بے انتہا کارآمد ہونے کے تب بے توجہی کے شکار تھے اور کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کو ہمارے وطن پرست شعراء نے نہایت دل کش پیرائے میں ملک کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض شعراء مثلاً احسان دانش کو اتنا انہماک ہو گیا ہے کہ انہوں نے ایسے ہی طبقے کو اپنا موضوع شاعری بنا لیا ہے۔ انکی ایک نظم "خانہ بدوش" کے کچھ اشعار دیکھئے۔

میداں کے صاف سینے پہ آبادیوں سے دور
ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
ان کا کسی کو شہر میں بسنا نہیں پسند، دشمن ہے گر زمیں تو مخالف ہے آسماں
تاریخ ہند کے یہ پریشان سے ورق، یہ بیاریں ضعیف تمدن کی داستاں
برباد ہیں ذلیل ہیں رسوا ہیں خوار ہیں، القصہ جنگلوں میں بھی ملتی نہیں اماں
جن کے مکاں پہ فتح کے پرچم تھے موج ریز
وہ پھر رہے ہیں سر پہ اٹھائے ہوئے مکاں

الطاف مشہدی کی ایک انقلابی نظم "قربانی" کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں

جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ملاقاتیں
فسوں نواز جوانی کی رازداں راتیں
گلے کو چومنے والی حسیں تریں باہیں
دیارِ دوست کی مخمور و دلنشیں راہیں
کسی کی ہوشربا و جنوں فروش نگاہ
ہماری پاک محبت کا اولین گناہ
وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کرتا ہوا
دیارِ ہند کو وقفِ بہار کرتا ہوا
خوشی سے جھومتا، گاتا، گرجتا آؤں گا
مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤں گا
جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن

علی احمد (عثمانیہ)

مشاہدے

کئی سال بعد راقم کو شمالی ہندوستان میں سفر کرنے
کا موقع ملا اُس چندروزہ سفر کی بعض باتیں یاد رہ گئیں
اور اس امید میں ان کو قلم بند کر رہا ہوں کہ وہ شاید
بعض لوگوں کی تفریحی مطالعہ کی مستحق ہوں، یا ان لوگوں کے
لئے کام کی باتیں ثابت ہوں جنہیں ادبیات اور تمدن
سے دلچسپی ہے۔

سب سے زیادہ جس چیز سے مجھے ناگوار حیرت
ہوئی وہ شمالی ہند کی مغرب زدگی اور انگریزیت پسندی ہے
چنانچہ خاص دوآبے میں جو نہ صرف ہندستانی تہذیب و
تمدن کا گہوارہ بلکہ اردو کا وطن ہے اور کئی ہندستانی زبانوں
اور تمدنی تحریکوں کا سرچشمہ ہے معمولی معمولی لوگ بلا وجہ
انگریزی لفظوں کا استعمال کرکے اپنی مغرب زدگی کا ثبوت
دیتے ہیں۔ خیال تھا کہ ادھر دس، بارہ برس سے ہندستانی
زبانوں کا عروج ہو رہا ہے کئی صوبوں میں کانگریسی حکومت
قائم ہوگئی ہے ممکن ہے کہ حالات کچھ بہتر ہوگئے ہوں،
لوگوں کی معاشی اور رمالی حالت کے ساتھ (خیال ہوا کہ)
شائد زبان بھی سنبھل گئی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ تمدنی
اور زبانی نقطۂ نظر سے ہم میں احساسِ کمتری کے متعدد آثار
پائے جاتے ہیں، اور ہم اس ضبط کی وجہ سے اپنی ذاتی
تذلیل کر رہے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو اپنی آنکھوں
دیکھی اور کانوں سنی باتیں لکھ رہا ہوں اور میرا مقصد اظہار
حقیقت اور دعوتِ اصلاح ہے نہ کہ دل آزاری یا وعظ پسندی

تاج محل کے ایک [illegible] خادم کو [illegible] دوسرے
شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ :-

"وہ اس ٹری کے پرے ہے!"

ٹری؟؟؟؟ عجب!! یہ کیا؟؟........ درخت!!
جس ملک کے چھوٹے بڑے سب اسی خبط میں مبتلا
ہوں کہ بے وجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کرکے اپنی
ادھوری تعلیم کا رعب گانٹھیں تو پھر اُن کم سمجھ اَن پڑھوں
کا کیا قصور اگر انہوں نے بھی اپنی قابلیت جتانے کے
لئے دو چار انگریزی لفظ سیکھ رکھے ہوں۔؟

ایک "خان بہادر" کے ہاں مہمان تھا۔ ان کے ایک
ملاقاتی سوٹ پوش، گلوری چباتے ہوئے۔ موٹر سے
اترے، رسمی طور پر میرا بھی تعارف کرایا گیا۔ ان میں باتیں
ہونے لگیں۔ میں ایک خاموش سننے والے کی حیثیت سے
مجبوراً بیٹھا رہا۔ گھر کی بیماری اور عدم فرصت کا ذکر ہوا
ایک نے کہا :-

"میری وائف کو اِن دنوں بہت کام تھا اور وہ
آپ کے ہاں ملنے نہ آسکیں۔"

جواب ملا :-

میری وائف کو بھی ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔
نہ جانے.... میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف دکن کے مغرب زدہ
خبطیوں کا شیوہ ہے کہ بیوی کو بیوی کہتے انہیں شرم آتی ہے
..... وائف کہتے شرم نہیں آتی مگر اب معلوم ہوا کہ وندھیاچل
کے پرے بھی مغربیت کا اندھا جنون روزمرہ کی گفتگو کو
غارت کر رہا ہے۔

لاہور میں غضب کی سردی تھی مگر پنجابیوں کے

حسنِ سلوک اور ان کی مہمان نوازیوں نے دل میں اتنی گرمی اور جان میں اتنی تازگی پیدا کی کہ بیرونی سردی زیادہ اثر نہ کر سکی۔ مختلف طبقوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا وہاں والوں کے حسن سیرت کو دیکھ کر اپنوں کے متعلق جو مغالطہ تھا وہ دور ہوگیا۔ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں اور وزیر داخلہ خضر حیات دولتانہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کھدر پوش راجہ صاحب محمود آباد کے درشن نصیب ہوئے۔ پنجابیوں کی پگڑیاں بڑی بانکی ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی جسمانی صحت اور سڈول بدن پر یہ طرے اور بھی زیادہ بانکے معلوم ہوتے ہیں۔ حسن صحت، حسن صورت اور حسن سیرت کے اعتبار سے پنجابیوں میں متعدد خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اردو نوازی، اچھی طباعت، خوشنویسی، اعلیٰ کتابت اور عمدہ جلد سازی میں لاہور سے بڑھنا تو بڑی بات ہے کوئی اس سے ہم سری بھی نہیں کر سکتا۔ غالب کے دیوان کے جیسے عمدہ مصوّر اور خوش نما اڈیشن پنجاب نے شائع کئے ہیں، وہ نہ صرف اردو بلکہ سارے ہندستان کے لئے قابل فخر ہے۔

حیدرآبادی "تانگا" اور جھٹکا متوسط طبقے کی عام سواریاں ہیں جو آگرہ اور اودھ کے تانگوں اور اکوں سے زیادہ تکلیف دہ اور بدنما ہیں۔ قاضی پیٹھ سے ورنگل تک خاصہ ۔۔۔ میل کا فاصلہ ہے۔ مجبوراً اسی جھٹکے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے جلدی تھی، جھٹکا خراب تھا، راستہ بدتر تھا۔ ٹٹو کمزور تھا مگر انعام کی توقع اور پیسہ کی لالچ کسی طرح چابک کو تھمنے نہیں دے رہی تھی اور جھٹکا مقابلتہً تیز رفتار سے جا رہا تھا۔ چابک کی آواز، بھری سڑک پر پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور جھٹکے بان کی صدائیں خاصہ لطف دے رہی تھیں شہر کے قریب ایک دیسی صاحب بہادر سوٹ بوٹ پہنے چلے جا رہے تھے۔ جھٹکے والے نے ملائم لہجے میں کہا

"چلئے صاحب! ہٹئے جناب!"

تھوڑی دیر بعد ایک سفید پوش صاحب، کاندھے پر رومال ڈالے راستہ سے گزر رہے تھے۔ جھٹکے والے نے صاف آواز میں کہا۔

"چلو صاحب! ہٹو میاں!"

چوراہے کے قریب ایک شخص ننگے پیر، معمولی لباس پہنے، دکھائی دیا۔ جھٹکا گزرنے سے پہلے ہی وہ جا سکتا تھا مگر جھٹکے والے نے زور سے کہا۔

"سرکو جی! دیکھتے نہیں ہو؟"

ذرا آگے بڑھتے ہی ایک غریب کمل پوش نظر آیا وہ بھی راستے سے گزرنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر جھٹکے والا آپے سے باہر ہوگیا اور اس نے للکار کر کہا۔

"ہٹ بے! اندھے!!"

وہ بیچارہ سہم کر خاموش ہوگیا اور اس طرح آنکھ بچا کر نکل گیا گویا اس نے کوئی جرم کیا تھا اور سزا سے بچ گیا! ان کی مرعوبیت ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے اسی ایک مثال سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہماری معاشرت کس طرح مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ان مختلف طبقوں کے افراد کے ساتھ جھٹکے والے بھی کس طرح سلوک کیا کرتے ہیں۔

ہمیم بریجاں

ہندوستان کی زبان

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی !

ہندوستان جو گئے ایام میں جنت نشان کہلاتا تھا اب اس کو اگر غلامستان کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا۔ غلامستان محض اس لئے نہیں کہ اس ملک پر ایک مدت سے بدیسی لوگ حکمران ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہندوستانی کہلانے والوں کی ذہنیت کچھ اس قدر پست ہو گئی ہے کہ یہاں سوائے ذلت اور ادبار کے اب اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ایک جھگڑا ختم نہیں ہونے پاتا کہ محبانِ وطن اور قوم پرست بزرگ دوسرا کھڑا کر دیتے ہیں۔

اس ملک کی سب سے بڑی بد قسمتی تو یہ ہے کہ یہاں چپہ چپہ پر مختلف مذہب و ملت کے لوگ آباد ہیں۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ روزِ ازل سے غلامی، فرقہ بندی، اور قومی بغض و عناد نے اس ملک والوں کو یار و اغیار کی نگاہوں میں رسوا کر دیا ہے۔ اور رہی سہی کسر اس زبان کے سوال نے پوری کر دی ہے۔ خدا بخشے! شاعرِ مشرق نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو

مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

بہت ممکن تھا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں نہ کہیں اخوت نظر آتی نہ ہمدردی پائی جاتی نہ لوگوں میں میل ملاپ ہوتا ایک کی ڈگر دوسرے سے علیحدہ ہی رہتی۔ لیکن قدرت کو چونکہ کچھ بھلے دن بھی دکھانے تھے اس لئے اس نے ہندوستان والوں کو آپس میں شیر و شکر کرنے کے لئے ایک ایسی زبان پیدا کر دی جس کی طفیل یہاں کچھ یک رنگی سی نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ کچھ روزمرہ کی ضروریات بھی اس امر کی مقتضی تھیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے جو سب کے لئے آسان اور قابلِ قبول ہو۔ تو جناب! یہ مشکل اردو زبان نے حل کر دی۔ اردو زبان کی نشو و نما ہندو اور مسلمان دونوں کے ہاتھ سے ہوئی، اور دونوں نے مل کر اسے عروج پہنچایا اور آج بلادِ مشرق میں اردو کو وہی حیثیت حاصل ہے جو مغربی ممالک میں فرانسیسی زبان کو۔ اردو زبان کی افادیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر دور میں ہندو اور مسلمان ادبا اور شعرا اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے ہیں اور آج بھی جب کہ زبان کا جھگڑا ہندو قوم کے رہنماؤں کی تنگ نظری کی بدولت ایک ناگوار کشیدگی کی صورت اختیار کر رہا ہے اردو زبان کے ہندو ادبا اور شعرا اس کی خدمت سے غافل نہیں۔

خیال تو کیجئے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف الخیال لوگ آباد ہوں، جہاں فرقے فرقے کا مذہب علیحدہ ہو، رسم و رواج بھی الگ الگ ہوں، جن کی تہذیب اور تمدن میں زمین اور آسمان کا فرق ہو، جو اپنے قومی اور سیاسی مفاد کے لئے علیحدہ علیحدہ اکھاڑے بنا رہے ہوں، لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے ملک کی اکثریت ایک زبان بولنے یا سمجھنے والی ہو تو اس سے زیادہ اس زبان کی ہمہ گیری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ افسوس گئے گزرے زمانے میں لے دے کر ایک زبان ہی تو ایسی چیز ہمارے پاس ہے جس سے ہمارا آپس میں کچھ میل جول نظر آ رہا ہے [illegible] یارانِ وطن استعمال

کر رہے ہیں اس نے تو کبھی کے اس نازک رشتے کو بھی مٹا دیا ہوتا۔ اور لطف یہ ہے کہ اردو زبان کو مٹانے والے وہی محترم ہستیاں ہیں جو ہندوستان کی آزادی کی علم بردار بنی پھرتی ہیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی خواہاں ہیں۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مجھے اس وقت یہ بتلانا مقصود نہیں کہ اردو زبان بنی کیسے۔ مجھے تو کچھ اس کے متعلق عرض کرنا ہے کہ اردو زبان پر اعتراض کرنے والے کون بزرگ ہیں اور اس کی تہہ میں کونسا جذبہ کارفرما ہے۔

اردو زبان پر اعتراض کرنے والے صرف ہمارے ہندو دوست ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مذہب کی آڑ لے کر اردو پر برس رہے ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں رام راجیہ قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انہی کے اکثر بھائی بندان کی اس قسم کی تفرقہ انگیز چالوں سے ان سے متنفر نظر آنے لگے ہیں۔ ہندوؤں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم نے اردو کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ بنگالی زبان کا اردو کے بعد ہندوستان میں دوسرا درجہ ہے۔ بنگالی میں علم و ادب کا بھی ایک گراں قدر ذخیرہ موجود ہے بنگال والوں نے بڑے نامور ادیب، شاعر اور باکمال آدمی پیدا کئے ہیں لیکن اردو کے خلاف آج تک اس قوم نے کبھی کسی قسم کی ناپاک کوشش نہیں کی بلکہ اکثر بزرگ اس کوشش میں ہیں کہ بنگال میں بھی اردو زبان کا رواج عام ہو جائے۔ جس طرح اردو کئی ایک زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے اسی طرح بنگالی زبان میں فارسی اور عربی کے بہت الفاظ ملتے ہیں جنھیں بنگالیوں نے اپنا لیا ہے۔ جیسے روز کی بجائے "روج"۔ کباب کی بجائے "کاباب"۔ جانور کی بجائے "جنور"۔ یا کاریگر کا "کاری گور" یا مزدور کا "موجور" یا ہفتہ کی بجائے "ہوپتا"۔ اسی طرح عربی کے الفاظ دیکھ لیجئے کس طرح بنگالی بن گئے ہیں۔ ناقص کا "ناکس"۔ غسل کا "گسل" توقع کا "توکو" ضبط کا "جبت" مضبوط "مجبوت" حضور کا "ہجور" وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مرہٹی، گجراتی یا تلنگی بولنے والوں کی طرف سے بھی کبھی اس قسم کا مطالبہ یا خواہش نہیں کی گئی۔ یہ سودا صرف ہمارے ہندو دوستوں کے سر میں سمایا ہے گو اس فرقے کے اکثر سمجھدار بزرگ اس تحریک کے خلاف نہیں ہیں اور آواز محض گاندھی صاحب کے تقدس کی خاطر اس کے خلاف بلند نہیں کرتے۔

اردو کے خلاف کٹر خیال کے ہندو تو ایک مدت سے اونگی بونگی بول رہے تھے لیکن جب سے کانگرس برسر اقتدار آئی ہے اس روز سے ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے کا مرض بہت ترقی کر گیا ہے۔ یہ سب کانگرس کے اقتدار کی برکات ہیں جو آج اس ملک میں واردھا اور ودیا مندر ایسی ناپاک اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔ ان اسکیموں کا صرف ایک مطلب ہے یعنی مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کو نیست و نابود کیا جائے۔ ہم تو عید کا چاند مانگ رہے تھے کہ

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں!

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے پنجۂ جنوں کو آخر ناخن عطا کر ہی دیئے۔ اور اسی وحشت نے کہیں سرسوتی کی پوجا کہیں بندے ماترم کا گیت کہیں کچھ اور کہیں کچھ فتنے برپا کر دیئے۔ کانگرس نے حکومت سنبھالتے ہی جو پر پرزے نکالے تھے انہیں دیکھ دیکھ کر زبان پر بار بار یہ آتا تھا کہ ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

تو جناب! یہ ان لوگوں کے لئے ایک سبق ہے جنھیں ملک کی بہتری کانگرس کے اقتدار میں نظر آ رہی ہے۔ اور پھر لطف تو یہ ہے کہ اردو ہندی کا سوال پیدا کرنے والے وہی محترم لوگ ہیں جو کانگرس کے کرتا دھرتا کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں وہی اردو ایسی عالمگیر زبان کے خلاف محض اس لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ ایک تو بقول جناب گاندھی یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ دوسرے پنڈت مالویہ صاحب کو یہ خوف دامنگیر ہو رہا ہے کہ اردو زبان پڑھنے لکھنے سے ہندو دھرم کا ناش ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کی آڑ لے کر اپنی قوم میں اردو کی مخالفت کا بیج بو دیا۔ افسوس ؎

اور ہے تیرا شعار آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

"ہندی" کو راشٹر بھاشا کا درجہ دینے والے ذرا گریبان میں منھ ڈال کر تو دیکھیں کہ "ہندی" کی ملک میں حیثیت کیا ہے۔ اردو کے مشہور رسالہ ساقی (دہلی) میں "سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچھر" کے عنوان سے جناب سید ابوالقاسم صاحب سرور کے نام سے گذشتہ دو تین مہینوں سے ایک بہت دلچسپ اور پُراز معلومات مضمون شائع ہو رہا ہے۔ ساقی بابت نومبر میں سرور صاحب نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے جو اعداد و شمار (جو غالباً کسی مغربی محقق کے ممنونِ منت ہیں) دیئے ہیں اس سے "ہندی" کی زبوں حالی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نام زبان	بولنے والوں کی تعداد	
۱۔ اردو	آٹھ کروڑ پچاس لاکھ (یہ اندازہ بالکل غلط ہے)	
۲۔ بنگالی	تین کروڑ نوے لاکھ	
۳۔ مرہٹی	ایک کروڑ ستر لاکھ	
۴۔ تلنگی	ایک کروڑ ستر لاکھ	
۵۔ پنجابی	ایک کروڑ ساٹھ لاکھ	یہ غلط ہے۔ پنجاب میں کم و بیش پونے دو کروڑ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔
۶۔ ٹامل	ایک کروڑ تین لاکھ	
۷۔ گجراتی	پچانوے لاکھ	
۸۔ اوڑیا	ستر لاکھ	
۹۔ کنڑی	پچاس لاکھ	
۱۰۔ ملیالم	پچاس لاکھ	
۱۱۔ سندھی	چالیس لاکھ	
۱۲۔ ہندی	تیس لاکھ	

لیکن بُرا ہو اس مذہبی تعصب کا جس کے ہوتے ہوئے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کانگرس کی اپنی چھان بین سے بھی اردو کی مقبولیت آشکارا ہوتی ہے۔ کانگرسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں اردو بولنے والے اٹھارہ کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ حالانکہ یہ اسی طرح غلط ہے جس طرح کانگرسی اور مہا سبھائی پروپیگنڈا کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی آبادی صرف آٹھ کروڑ بتلائی جا رہی ہے۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ نصف صدی سے یہ دروغ بیانی جاری ہے۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی گیارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ہندوستان کی کل آبادی کم و بیش چھتیس ۳۶ کروڑ ہے اور آج اس ملک میں ۲۴ اور ۲۵ کروڑ آدمی اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

اور سنئے! اس ملک میں ۱۲۹۷۱ اخبارات اور رسائل شایع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۴۱۰ ہندی کے ہیں اور ۱۸۱۳ اردو زبان میں نکلتے ہیں۔ یہ تو رہی ہندوستان کی حالت اب ذرا بیرون ہند بھی اردو کی مقبولیت کا اندازہ کیجئے۔

افغانستان، ایران } ۷۰ لاکھ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔

گلگت، بلخ اور ختن } پچاس لاکھ اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

عرب اور عدن .... پچانوے لاکھ
یورپ اور امریکہ .... بیس لاکھ
جاپان اور سنگاپور .... پانچ لاکھ
دیگر اسلامی علاقے .... پندرہ لاکھ

اب ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر ذرا "ہندی" کے علم برداروں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ کیوں بھیا! ہندی کا ڈھونگ رچانے کے کیا معنی! خیر! یہ تو رہیں دور کی باتیں۔ ابھی تھوڑے روز ہوئے آل انڈیا بمبئی ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے ریڈیو سننے والوں سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ کس زبان میں پروگرام پسند کریں گے۔ اس کا نتیجہ جو سرکاری طور پر شایع کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

بمبئی:- اردو یعنی ہندوستانی ۲۵۶۷ - انگریزی ۲۵۳۲ - گجراتی ۱۷۴۲ - مرہٹی ۱۵۳۹ - ہندی ×

اس کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں ریڈیو پروگرام تیار کیا جائے تو آپ کس زبان میں ریڈیو سننا پسند کریں گے۔ اس کا جواب سنئے!

اردو (ہندوستانی) ۳۶۵۰ - انگریزی ۱۷۴۷ - گجراتی ۹۲۰ - مرہٹی ۸۳۵ - ہندی ×

پھر کلکتہ، دہلی اور مدراس کے ریڈیو سننے والوں سے بھی یہی پوچھا گیا ان صوبوں سے زبان کے متعلق جو جواب ملا

اس سے اردو کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

کلکتہ:- اردو ۳۵۵۹ - انگریزی ۱۷۵۴ - بنگال ۳۹۹ - ہندی ×

دہلی:- اردو ۳۸۴۸ - انگریزی ۱۷۳۶ - ہندی ×

مدراس:- اردو ۳۵۲۵ - انگریزی ۱۷۸۱ - تامل ۳۹۴ - تلنگی ۲۱۹ - ہندی ×

ان اعداد وشمار سے یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اردو زبان کو ملیا میٹ کرنے کا جنون صرف ہندوؤں میں پایا جاتا ہے۔ دوسری اقوام ہندوؤں کی ہم نوا نہیں اردو زبان کے خلاف صوبۂ متحدہ میں جس کاوش سے کوشش ہو رہی ہے اس کی مثال دوسری جگہ شاید نہ ملے۔ کانگرس والوں سے کچھ شکوہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ خالص ہندو قوم کی نمائندہ ہے۔ لیکن افسوس تو مسلمانوں پر ہے جو یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے ؎

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشان است

حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

ابھی پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن دہلی والوں نے جو اردو کی گت بنائی ہے اور جس جس طرح اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی وہ کسی سے کچھ چھپی ہوئی نہیں۔ سنتے تو یہ تھے براڈکاسٹنگ کا محکمہ بھی سرکاری محکمہ ہے۔ لیکن دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر نے تو قولاً اور فعلاً یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ خالص کانگرسی محکمہ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے جو خبریں نشر ہوتی ہیں۔ اس میں ہندی کے اور ایسے ایسے من گھڑت الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جنھیں سن کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے بات چیت کر رہے ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ

"ایکا" (اتفاق) "ہتھیار بند جھاز"۔ "دھڑادھڑ"۔ "چناؤ"۔ "پچھمی فرنٹ"۔ "سندیسہ"۔ "راج دھانی"۔ پورب۔ پچھم۔ اتر۔ دکن۔ "اڑان" (پرواز) "سناہی والا مال"۔ "موقع چھانٹنا"۔ "ڈبکی کشتی"۔ "صلح کے بیان کی سواگت"۔ "ڈپلومیٹک حلقوں کی بات چیت"۔ "مانگیں" (مطالبہ) "لیکھت"۔ "لکھت پڑہت"۔ "میرٹھ میں شانتی ہوگئی"۔ "پرکھنت کا دنت"۔ "لڑائی بند کرنے کی مانگ" "بہتری ثابت کرنے والے" وغیرہ وغیرہ الفاظ اگر رام راجیہ کے دور میں ہندو جاتی کی حکومت استعمال کرتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ابھی تو دہلی دور والا معاملہ ہے۔ ہندو دوستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اور اردو کے بہی خواہ اس قسم کی "غیر مہذب زبان" کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اگر اسی کا نام "ہندوستانی" ہے تو پھر یہ ہندوؤں کو ہی مبارک ہو۔ لطف تو یہ ہے کہ گاندھی صاحب کو "اردو" نام بھی ناپسند ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر صلح اور اہنسا کے دیوتا کو ہمسایہ قوم سے بغض نہ ہو تو اور کس کو ہو۔ آپ نے زبان کا نام "ہندوستانی" تجویز فرمایا ہے۔ لیکن جناب گاندھی کو کوئی اتنا تو بتلادے کہ "ہندوستانی" تو انگریزوں کا دیا ہوا نام ہے۔ آپ تو انگریز کی ہر چیز سے متنفر ہیں یہ نام کیوں پسند آگیا آپ کو۔

اردو زبان کے خلاف جو یہ نفرت انگیز اور اختلاف پرور تحریک جاری ہے اس کی تہہ میں صرف سیاسی جذبہ کارفرما ہے۔ انگریزوں نے کسی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے کانگرس کو ذرا ڈھیل دے دی تھی جس سے اس کی رسی اور بھی دراز ہوگئی۔ اور گھر بیٹھے یہ لوگ رام راجیہ کے خواب دیکھنے لگے۔ اور جناب آج ہندوستان میں رام راج قائم ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ اسلامی تہذیب اور تمدن پر کس کس طرح کلہاڑا چلایا جاتا ہے۔

اردو ایسی عالمگیر اور شگفتہ زبان جس میں ہر پڑھے لکھے آدمی کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے لفظی نزاکت، لطافت، رنگینی اور دلکشی حاصل ہو سکے، اس کے خلاف پروپگنڈا کرنا اپنی ذہنیت کی پستی کا پروپگنڈا کرنا ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ فارسی ایک بے حد دلاویز اور دلکش زبان ہے لیکن اردو کی شگفتگی اور دلکشی اسے بھی مات کر گئی ہے۔ ہندوؤں کا یہ کہنا کہ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے ایسا ہی لغو اور بے معنی ہے جیسے بنارس کے ایک پنڈت نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا۔

"مہاراجہ بکرماجیت اور بابر بادشاہ میں کئی معرکے ہوئے لیکن جیت ہمیشہ مہاراجہ بکرماجیت کی ہی رہی"

پنڈت مدن موہن مالویہ کی کوششوں سے نو صرف ہندو ریاستوں سے اردو زبان اور اردو رسم الخط کو دیس نکالا ملا تھا۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کے حامی جناب گاندھی کے تقدس نے یہ آگ اب ہر جگہ لگا دی ہے اور آپ اپنے دامن کی ہوا سے اسے تیز سے تیز تر کئے جا رہے ہیں۔ رہی سہی کسر تھی وہ گاندھی صاحب نے ناگپور میں یہ کہہ کر پوری کر دی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

میرے خیال میں وہ سب لوگ جو اردو ہندی کی آویزش کے ذمہ دار ہیں مصلح قوم اور محب وطن کہلانے کے مستحق نہیں۔ زبان سے ملک و ملت کی شان نظر آتی ہے۔ آپس میں اخوت اور اتحاد کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اس لئے جو قوم یا جو فرقہ یا جو شخص اس مقدس رشتہ کی جڑ کاٹنے والا ہو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ کسی ملک کی آزادی کے لئے اس کی زبان کا ایک ہونا بھی ضروری ہے۔ اور زبان کا اختلاف غلامی کی دلیل۔

اردو زبان پر یاران وطن کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان "عقل کے پتلوں" نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ عام بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور ادبی زبان اور عام بول چال میں کوئی احمق ہی ہوگا جو خواہ مخواہ عربی اور فارسی کے غیر ضروری الفاظ استعمال کرے۔ لیکن جہاں ادبی شگفتگی مدنظر ہو وہاں ان الفاظ کا استعمال کرنا بھی ضروری ہوگا۔ پھر ہر لکھنے والے کی اپنی اپنی طرز ہوتی ہے۔ کوئی سادہ الفاظ استعمال کرکے زبان میں چاشنی اور لطافت پیدا کرتا ہے کوئی عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ سے اپنی تحریر کو مزین کرتا ہے۔

لیکن ہندی کو تو یہ بات بھی حاصل نہیں۔ اور حاصل ہو بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ بقول جناب گاندھی ہندی وہ زبان ہے جو کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اس پر یہ دعویٰ کہ ہندی ہی ہندوستان کی راشٹر بھاشا کہلا سکتی ہے۔ جس قدر مضحکہ خیز ہے سب پر عیاں ہے۔

ہندوستان کی زبان کو ہم "ہندوستانی" تب کہہ سکتے تھے جب کہ تمام ملک میں ایک ہی قوم و ملت کے لوگ آباد ہوتے۔ پھر آج تک یہ بھی تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ "ہندوستانی" کیا ہوگی کیسی ہوگی۔ ڈاکٹر تارا چند۔ بابو راجندر پرشاد اور علامہ کیفی نے ہندوستانی کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے جو تقریریں نشر کی تھیں۔ اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ جدید ہندوستانی "اردو اور ہندی کے بیچ کا راستہ" لے گی۔ لیکن ان تینوں بزرگوں نے اس بیچ کا راستہ لینے والی زبان کی مثال تو ایک بھی نہ دی۔ جس سے اس جدید ہندوستانی کا کچھ اندازہ ہو سکتا۔ ہاں! ہندو قوم جو زبان چاہتی ہے اس کی مثال میں مسٹر سپورانند کی وہ تقریر پیش کی جا سکتی ہے جو انھوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں کی تھی اور جسے مسلمان تو رہے درکنار اسی فیصدی ہندو بھی نہ سمجھ سکے تھے۔

یارانِ وطن کی اردو زبان کے خلاف سرگرمیاں تو اب شاید حشر تک بھی ختم نہ ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ کب تک خاموش رہیں گے۔ اردو کی حمایت اور ترویج کے لئے انجمنوں کا قیام ہے تو ایک نیک فال، لیکن کچھ کام بھی تو ہونا چاہیے۔ اردو زبان کے حامیوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اردو کے خلاف ہر تحریک کو کچلنے کے لئے سینہ سپر رہیں۔ خواہ یہ تحریک جناب گاندھی کی طرف سے ہو یا کسی کانگرسی جماعت کی طرف سے۔ افراد کا جمود قوم کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور آج اردو زبان کے ہوا خواہوں کا یہی جمود اردو زبان کے حق میں زہر قاتل ثابت ہو رہا ہے۔ یہ مصلحتوں کا وقت نہیں بلکہ اب اردو زبان کی لاج اور آبرو کا سوال ہے۔ اور اس لاج اور آبرو کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ عمل کی ضرورت ہے۔ باتوں کا وقت ہو چکا۔ آپ نے اردو کی ترویج کے لئے انجمنیں تو قائم کریں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کی انجمنوں نے عملی کام بھی کچھ کیا۔ ع

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

ایم اسلم

مدراس میں اردو (مجلد) اس کتاب میں مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

صفحات (۲۰۰) قیمت مجلد ... عہ

کیفِ جاوید

حجاب آلودہ جلوے تھے شباب انگیز روماں تھا
مری نظروں کی دولت تھی کہ حسنِ کار نیزداں تھا

چمن کا ذرہ ذرہ لے رہا تھا ایک انگڑائی
ترے جلوے کی رعنائی میں گم سارا گلستاں تھا

نگاہِ درد پرور کی خلش کیا خاک کم ہوتی
تری رنگینیاں تھیں اور مرا معصوم ایماں تھا

میں ہر قیمت پہ لے سکتا ہوں وہ جاں آفریں لمحے
کہ جب پہلے پہل مل کر کوئی مجھ سے پشیماں تھا

چمن کا پتہ پتہ بن گیا تصویر ناکامی
ترے جانے سے پژمردہ گلستاں کا گلستاں تھا

روپہلی چاندنی میں وہ مرے پہلو میں بیٹھی تھیں
مرے اس چاند سے لیکن فلک کا چاند لرزاں تھا

وہ اپنے حسن سے بڑھ کر مری چاہت پہ نازاں تھیں
مری نظریں اور اپنی کامراں میں خود بھی حیراں تھا

صنوبر کے حسیں سائے لبِ جو گود میں کوئی
مگر اب یاد کرتا ہوں تو اک خوابِ پریشاں تھا

کوئی خوابیدہ تھا قیصری مری آغوشِ رنگیں میں
فلک بھر چاندنی تھی یا گلستاں کا گلستاں تھا

قیصری (رام پوری)

"ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" ادارہ ادبیاتِ اردو کی اولین کتاب ہے جو آج سے پانچ سال پہلے شایع ہوئی۔ یہ کتاب مولانا سلیمان ندوی کی رائے میں جدید قسم کی بہترین سوانح عمری ہے۔ اصغر گونڈوی مرحوم اس کو ۱۹۳۴ء کی بہترین اردو کتاب سمجھتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ اردو کے ہر شاعر کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے اور حضرت نیاز فتح پوری کا ارشاد ہے کہ مشرق اور مغرب کی ادبیات کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ ایک خاص چیز ہے۔

اس دوران میں اردو شعر پر ورڈسورتھ کے اثرات ایک حد تک نمایاں ہو گئے۔ موضوع، اسلوب اور زبان کی سادگی کا جو راگ مغربی شاعری اور خاص طور پر ورڈز ورتھ سے متاثر ہو کر مولانا حالی نے الاپنا شروع کیا تھا اس کے اثرات میں اضافہ ہو جا رہا ہے۔

عنقریب ورڈسورتھ اور اس کی شاعری کا دوسرا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ شایع ہونے والا ہے۔ اس میں میکش صاحب کی بعض نظمیں بھی شامل ہوں گی۔ ان نظموں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اردو شعر کی ساری خوبیوں کو برقرار رکھ کر ورڈسورتھ کی ترجمانی کی گئی ہے

ادب اور ذوق

(ایک مغربی صاحبِ ذوق کی مفید تصنیف کا پہلا باب ترجمے کی صورت میں پیش ہے۔ اس کے پڑھنے سے ادب والوں اور "بے ادبوں" دونوں کے دل پر شاید کچھ اثر ہو)

سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ راستے سے ایک غلط فہمی دور کر دی جائے۔ اگر عموماً نہیں تو اکثر حضرات ادبی ذوق کو ایک نفیس تحصیل اور اکتساب سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے حاصل کرنے سے وہ اپنے آپ کو مکمل کر لیں گے اور ایک صحیح سوسائٹی کے رکن بننے کے اہل ہو جائیں گے۔ وہ دراصل ادب سے ناواقفیت رکھتے ہیں اور اپنی ناواقفیت سے اس طرح شرمندہ بھی ہیں جس طرح وہ کسی اعلیٰ اور مہذب تقریب میں آدابِ مجلس سے اپنی لاعلمی کی بناء پر مجبور رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح ناقابل اور مشوش پاتے ہیں جس طرح کسی سواری نہ جاننے والے شخص کو یکایک گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے کہا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کے لئے دنیا میں بعض چیزوں کو جاننا یا ان کے متعلق معلومات رکھنا ضروری ہے اور ان میں سے ایک ادب ہے۔ انھوں نے شائستگی کے ساتھ لباس پہننا سیکھ لیا ہے وہ ہر موقع پر شائستگی اور تہذیب کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ وہ زندگی کے روزآنہ اور ضروری مسائل سے کماحقہ واقف ہیں۔ محنت اور کوشش سے وہ اپنے اوقاتِ فرصت میں کچھ تحصیل و اکتساب بھی کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ امر بھی اُن کے لئے حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب سے واقفیت کو ہر باعزت اور خوددار انسان کا ذاتی سرمایہ اور لازمہ قرار دیں۔ مصوری ضروری نہیں۔ موسیقی ضروری نہیں۔ لیکن ادب سے تعلق رکھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ ادب ایک دلفریب ترغیب اور دل بہلائی ہے۔ گویا ادبی ذوق کے دو مقاصد ہوئے۔ ایک صحیح تہذیب کا صداقت نامہ بننا، دوسرے ایک خانگی مشغلہ ثابت ہونا۔ ریاضیات کے ایک نوجوان پروفیسر نے، جو ریاضیات اور کھیل کا ماہر، شطرنج میں خطرناک، وایولین بجانے میں مشاق تھا، ایک دفعہ کتاب سے متعلق میری گفتگو سن کے کہا "جی ہاں، مجھے بھی ادب کی تحصیل کرنی چاہیے"۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ "میں اسے حاصل کرنا بھول گیا تھا۔ میں نے دوسری چیزوں پر توچھاپہ مارا ہے، اب ادب کی طرف بھی کچھ توجہ کروں گا"۔

یہ رجحان یا وہ خیال جو اس کے مماثل ہو، سراسر غلط ہے۔ اس شخص کے لئے جو واقعی ادب کو سمجھ سکتا ہے، اور یہ جان سکتا ہے کہ ادب کا مقصد اور عمل کیا ہے، اس قسم کے رجحانات محض مضحکہ خیز ہیں۔ علاوہ ازیں ادبی ذوق کی تکمیل میں ان سے نقصان بھی پہنچتا ہے۔ جو لوگ ادبی ذوق کو صرف ایک تحصیل و اکتساب سمجھتے، اور ادب کو ایک تفریح اور ترغیب قرار دیتے ہیں، وہ نہ اکتساب میں کامیاب ہوں گے اور نہ اس نیم اکتسابیت سے کوئی تفریح کا کام لے سکیں گے۔ یہ ایک اور بات ہے کہ یہ ترغیب دوسری ترغیبات سے زیادہ مکمل ہے اور یہ تحصیل و اکتساب مہذب انسانیت کی عام دیوانگی کو موثر بنانے میں دوسرے قسم کی تحصیلات سے بہت زیادہ قوی اور دلکش ہے۔ ادب، ایک اضافہ، یا ایک ضروری لاحقہ نہیں بلکہ حیاتِ کامل کی اصل اور روح ہے۔ میں اس موقع پر فصیح و بلیغ اور جذبات انگیز جملے قطعاً استعمال نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی خطبے اور مبالغے سے کام لینا چاہتا ہوں۔ تاہم، میں حق بجانب ہوں گا، اگر میں کہوں کہ جس انسان کا ادب کی آزادی کا سامنا نہ ہو، وہ درحقیقت اپنے خوابِ غفلت سے جاگا ہی نہیں ہے۔ وہ ابھی پیدا ہی نہیں

ہوا ہے۔ وہ پوری طور پر دیکھ نہیں سکتا، سن نہیں سکتا، محسوس نہیں کر سکتا۔ وہ صرف کھانا کھا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو جو ادب کے صحیح عمل اور منشا سے واقف ہیں، اور انھوں نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے، اس سے زیادہ اور کوئی امر تکلیف نہیں دے سکتا کہ وہ ہزاروں افراد کو اس ترغیب میں مبتلا دیکھیں کہ وہ زندہ ہیں، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ زندگی سے صرف اتنا قریب ہیں جتنا موسم سرما میں ایک ریچھ ہوتا ہے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ادب کیا چیز ہے؟۔ نہیں، کاش میں ایسا کر سکتا مگر میں نہیں کر سکتا، نہ کوئی اور کر سکتا ہے۔ اس راز پر صرف ہلکی سی روشنی ڈالی جا سکتی ہے، یا کچھ اشارے کئے جا سکتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں میں بھی صرف اس کی طرف اشارہ کرونگا۔ اس کے لئے میں آپ کو آپ کی زندگی کے کسی واقعے کی طرف واپس لے جاؤں گا یا مستقبل کی طرف بڑھا دوں گا۔

آپ کو وہ شام یاد ہے جب کہ آپ اپنے ایک بے تکلف اور جانی دوست کے ساتھ تفریح کر رہے تھے۔ آپ کا وہ دوست آپ کا رازدار تھا، آپ اُس سے کوئی بات چھپا نہ سکتے تھے۔ اس شام کو آپ اس سے ایک ایسی بات چھپانا چاہتے تھے جو آپکے دل و دماغ پر پورا قبضہ کئے ہوئے تھی۔ لیکن خدا جانے کونسی قوت تھی جو آپ کو اس کی طرف کھینچے جا رہی تھی۔ آپ پر ایک والہانہ جوش سوار تھا۔ چونکہ آپ کا دوست ہمدرد بھی تھا اور فرزانہ بھی، وہ ایک باعزت خواہش اور ذوقِ جستجو کے ساتھ آپ کی خوشامد بھی کر رہا تھا اس لئے آپ اس واقعے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے گئے۔ جیسے جیسے زیادہ اعتماد اور راز داری کا جذبہ پیدا ہوتا گیا، آپ اصل واقعہ کے قریب ہوتے گئے، حتیٰ کہ آپ نے ایک تہلکہ آمیز سرگوشی کے ساتھ کہہ ہی دیا "میرے دوست، وہ لڑکی حسن کا معجزہ ہے"! اس لمحے اور ساعت میں آپ ادب کی سلطنت میں موجود تھے۔

مجھے اس کی تشریح کرنے دیجئے۔ یہ سچ ہے کہ لفظ "معجزہ" کے عام مفہوم کے اعتبار سے وہ لڑکی حسن کا معجزہ تو نہ تھی۔ آپ کے وفادار دوست نے کبھی اسے اتنا حسین نہیں سمجھا اور نہ ان چالیس ہزار نظارہ بازوں نے سمجھا تھا جو اسے دیکھا کرتے تھے۔ وہ صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کے لئے شہر ٹرائے جلایا نہیں گیا تھا۔ ایک لڑکی کو معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر آپ ایک لڑکی کو معجزہ کہیں گے تو دنیا کی ہر معمولی چیز کو بھی اسی نام سے یاد کیا جا سکے گا۔ لیکن ٹھیک ہے، آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ آپ کو ایسا کرنا چاہیے۔ کائنات کے بے انتہا معجزات میں سے آپ کو صرف ایک کا احساس ہوا تھا۔ اس وقت آپ اپنی ایجاد اور انکشاف سے معمور تھے اس انکشاف کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے آپ میں ایک قدرتی ولولہ موجود تھا۔ آپ کو کسی چیز کے زبردست حسن کا قوی احساس ہو گیا تھا اور آپ اس جذبے کو اپنا بنانے پر مجبور تھے۔ آپ کسی چیز کے متعلق جذبات اور خواہشات سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ سارے بنی نوع انسان سے ہٹ کر اس ایک ہستی کی طرف کھنچ آئے تھے۔ اب آپ اپنے جذبے اور اظہار کا وہ اثر ملاحظہ فرمائیں جو آپ کے دوست پر ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی ایک معجزہ نہیں ہے۔ کوئی اور شخص اسے مجبور کر سکتا تھا کہ اس معجزے پر ایمان لائے۔ لیکن آپ نے اپنے نظارے کی طاقت اور ایمان داری سے اور اپنے دوست کو اپنے نظارے میں شریک کرنے کے جوش اور ولولے سے، بہت دیر تک اس غریب

یہ محسوس کرنے اور سمجھنے پر مجبور کیا کہ لڑکی میں کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ اب تک اس کے اعجازِ حسن کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔

اس منزل پر آپ ادب پیدا کر رہے تھے۔ آپ زندہ تھے۔ دنیا کے کھنڈرے سے حسن اور اعجوبیت کی طرف آپ کی آنکھوں پر پٹی نہیں تھی، آپ کے کان بہرے نہ تھے۔ آپ کے اندر ایک ایسی قوت تھی جو آپ کو اپنے جذبے کے اظہار پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ آپ کے لئے کافی نہ تھا کہ آپ اسے دیکھیں یا سنیں۔ آپ کے لئے ضروری تھا کہ دوسرے بھی اسے دیکھیں اور سنیں۔ دوسروں کو جگانا لازم تھا، اور آپ نے جگایا۔ یہ ممکن ہے۔ گو مجھے یقین کامل نہیں ہے۔ کہ دوسرے ہی روز یا دوسرے مہینے آپ کا وفادار دوست کسی اور لڑکی کو دیکھے اور فوراً محسوس کرے کہ وہ بھی معجزۂ حُسن ہے۔ یہ ادب کا اثر ہے!

ادب کے بنانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے کائنات کے اعجاز نیرنگ وحیرت کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اور ان میں سب سے بڑے معمار وہ ہیں جن کا مطمح نظر بہت زیادہ وسیع اور جن کا احساس بہت زیادہ شدید ہے۔ آپ کی تیز نگاہی کا ایک ٹکڑا ممکن ہے اتفاقی ہو اور عارضی بھی، لیکن ان کی زندگی ایک طویل نیرنگ، ایک مسلسل حسرت ہے جو ہمیشہ اس امر سے انکار کرتی رہی کہ دنیا ایک اُداس جگہ ہے۔ اگر آپ بھی یہ سمجھنے اور معلوم کرلینے کے قابل ہوں کہ دنیا ایک اُداس جگہ نہیں ہے تو کیا آپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی؟ اگر آپ کو بھنواروں اور غاروں سے نکال کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھڑا کر دیا جائے تاکہ آپ زندگی کے صحیح لذت اور کیف سے لطف اندوز ہوں، اور آپ کی اس خوبصورت شیروانی کے نیچے ایک سچا دھڑکنے والا دل پیدا ہو تو کیا آپ اسے کوئی بات نہ سمجھیں گے؟ ادب کے معمار آپ کو ان چیزوں کا حریف اور مدِمقابل بنا دیتے ہیں!

ادبی مطالعے کا مقصد یہ نہیں کہ اوقاتِ فرصت بہلائے جائیں۔ اس کا مقصد اپنے آپ کو جگانا، زندہ کرنا، ہمدردی، مسرت اور فہم و ادراک، اخذ و جذب کی صلاحیتوں کو زیادہ قوی بنانا ہے۔ اس کا منشا صرف ایک گھنٹے کو متاثر کرنا نہیں بلکہ چوبیس گھنٹوں کو متاثر کرنا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات کا رخ اور نوعیت ہی بدل دے۔ ادب کا سمجھنا اور اسے پسند کرنا دنیا کو سمجھنے اور پسند کرنے کے مرادف ہے۔ اس کی سوا اس میں کوئی اور معنی نہیں ہیں۔ اس میں زندگی کے بے جوڑ اور علیحدہ ٹکڑوں کو جوڑنا نہیں بلکہ پوری زندگی کو ایک مربوط اور جامع نقشے میں دیکھنا ہے۔ ادب کی روح ربط اور اتحاد ہے۔ ادب قندیل اور ستارے کو ملاتا ہے اور تصور اور عکس کے جادو سے یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک بڑی چیز کا حسن درحقیقت ایک چھوٹی چیز میں ہے۔ وہ اس امر پر اکتفا نہیں کرتا کہ حسن کا انکشاف کیا جائے یا ساری چیزوں کو ایک ہی مرکزِ خیال پر لایا جائے، بلکہ وہ علت و معلول، سبب اور نتیجہ کے قانون کا پتہ چلا کر ایک قسم کی اخلاقی فہم و ادراک پیدا کرتا اور اسے ہم پر مسلط کرتا ہے۔ اس کی تشفی اور تسکین دو قسم کی ہوتی ہے۔ وہ ایک غیر مشکوک دلکشی کو بے نقاب کرتا ہے، دوسرے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہماری قسمت بھی کائنات کے ساتھ ہے۔ یہ ایک انکشاف کرنے والے شخص کی زبردست پکار ہے جو ہمدردیاں بانٹتی اور ایک ہی اشارے میں ہمدردیاں حاصل بھی کرنا چاہتی ہے۔

کسی شاعر کے دیوانوں کے قدیم نسخے ٹٹولنے، کسی ڈرامہ نگار کے مضمون کے ماخذ معلوم کرنے، یا علم عروض کی تاریخ لکھنے، یا ان

امور کے انکار و اقرار کے دلائل ڈھونڈنے میں کہ نظام الملک طوسی یا حسن بن صباح عالی فکر اور بدمعاش انسان تھے، اس امر کا امکان ہے کہ لوگ اصل ادب اور اس کی روح کو بھول جائیں اور یہ نہ معلوم کر سکیں کہ اس کا مقصد کیا ہے، اور یہ کس کے لئے ہے؛ مجھے پھر یہ یاد دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب درحقیقت صحیح زندگی کا ذریعہ ہے، اور ادبی ذوق کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس ذریعے کو اپنی اعلیٰ تر زندگی کے لئے کتنی خوبی سے استعمال کر سکتے ہیں؟ جو لوگ زندہ نہیں رہنا چاہتے، جن کو محسوس کرنے سے زیادہ دل بہلائی کی خواہش ہے، وہ براہ کرم ادب کو خیرباد کہہ دیں۔ یہی ان کی عقلمندی ہوگی۔ بقول ایک عمدہ شاعر کے پاکیزہ مصرعے کے "میٹھے ہوئے سند ہولے کھایا کریں"۔ "ایک معمولی جھاڑی کا نظارہ" "جو جلال ایزدی سے معمور ہو" شاید ان کو حواس باختہ بنا دے گا!

محمد عبد القیوم خان باقی

دُعا

آپ بھی بے حجاب ہو مجھ کو بھی بے حجاب کر
جامِ مئے حیات کو چشمۂ آفتاب کر

ڈوب رہی ہے نبضِ دل سانس کہیں الٹ نہ جائے
سینۂ آب و خاک کو عرصۂ انقلاب کر

میری دعائے نیم شب اور یہ سوز و تاب و تب
میرے چمن میں جلوۂ سلسلۂ سحاب کر

عشق ہے محوِ آب و رنگ عقل ہے محوِ خار و سنگ
حسنِ ازل کا واسطہ حسن کو بے نقاب کر

منزلِ بے خودی میں یہ مرحلۂ خبر کہاں!
حسن جوابِ حسن ہے عشق کو لاجواب کر

تشنہ ہے روحِ زندگی گل ہے چراغِ بندگی
مجھ کو پیامِ تازہ دے مجھ کو عطا کتاب کر

درد ہے رازِ کائنات، یہ جو نہیں تو کچھ نہیں
عشرتِ رنگ پر نہ جا، درد کا انتخاب کر

میری حیات کا جمال تیرے شباب کا خیال
ہستیٔ ناتمام کو نقشِ گرِ شباب کر

کاوشؔ خستہ دل ہوں میں صاحبِ رنگ و بو ہے تو
غنچۂ ناشگفتہ کو پھول بنا، گلاب کر!

کاوشؔ

گُل بُوٹے

کسی کے ہر اپریل اور مئی کے گرم تقاضوں سے
تنگ آکر پورے ایک جُگ کے بعد پچھلی گرمیوں میں بنگلور
کے لئے ہم نے رختِ سفر باندھا؛ اس تقریب میں ہماری
بیچاری پانچ سال کی نئی فورڈ " پر بھی آفت آئی وہ بھی
ہمارے ساتھ چلنے پر مجبور ہوئی۔ اپریل کے آخری ہفتہ
میں ہمارا " کاروان " کچھ موٹر میں اور کچھ ریل میں صبح
سویرے بنگلور چل پڑا، شہر سے کوئی چونسٹھ میل
موٹر میں چلنے کے بعد ہم محبوب نگر پہنچے یہاں ہم سب
نے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ناشتہ کیا اور پہلے اسٹیشن ماسٹر
سے ملنے۔ کرنول کے قریب جو ندیاں آڑے آتی ہیں ان
کو پار کرنے کے لئے ہم نے چار روز پہلے ہی ریلوے
ٹرک اپنی موٹر کے لئے محفوظ کرالیا تھا، اسٹیشن ماسٹر سے
مل کر ہم نے اپنی موٹر کو ٹرک میں بٹھادیا، سب کے ٹکٹ
کرنول تک کے خرید لئے اور پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار
میں ٹہلنے لگے

ساڑھے نو بجکر کچھ منٹ پر ٹرین آئی، ہم سب اپنے
اپنے ڈبوں میں سوار ہوگئے، اور دھوئیں کی گاڑی ہمیں اڑاتی
ہوئی کرنول چلی، ہمارے ڈبے میں ہمارے سوا دو اور مسافر تھے،
ایک صاحب اوپر کی برتھ پر لیٹے ہوئے کوئی موٹی سی کتاب
بہت غور سے پڑھ رہے تھے اور کچھ گنگنا بھی رہے تھے،
دوسرے صاحب نیچے کی سیٹ پر ٹائمز آف انڈیا دیکھ
رہے تھے، ہم اپنی تنہائی کو بری طرح محسوس کر رہے
تھے، اتنے میں اوپر والے صاحب دھم سے نیچے کود ے

اور " اسلام علیکم " کہہ کر ہمارے بازو بیٹھ گئے۔ اب جو ہماری
نظر ان کی کتاب پر پڑی تو اس پر سنہری حرفوں میں " دیوانِ حافظ "
لکھا دیکھا، اس دیوان کو ان کے ہاتھ میں دیکھ کر ان کی وقعت
ہماری نظروں میں بہت بڑھ گئی، ہم نے موصوف سے
سوال کیا۔

" پچا حافظ سے آپ کو خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے؟"
فرمایا " جی ہاں! میں ان کے دیوان کا ترجمہ منظوم
انگریزی میں کر رہا ہوں "!!

انگریزی میں دیوانِ حافظ کا " منظوم " ترجمہ سنکر
ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور موصوف کی لیاقت کی
دھاک ہم پر خوب بیٹھ گئی، ہم یہ چاہتے ہی تھے کہ اس
منظوم ترجمے کے سننے کی سعادت ہمیں نصیب ہو کہ اتنے
میں موصوف نے ہم سے پوچھا۔

" کیا کوئی غزل کا فی البدیہہ منظوم ترجمہ سناؤں؟"
ہم نے عرض کیا " چشمِ ما روشن دلِ ما شاد! نیکی
اور پوچھ پوچھ! ضرور ارشاد ہو "!!!

فرمایا " حافظ کی غزل کا انگریزی میں منظوم ترجمہ
کرنا بچوں کا کھیل نہیں! بہت مشکل کام ہے!! اس کے
لئے بڑی قابلیت کی ضرورت ہے "!

ہم نے کہا " اس میں کیا شک! پہلے تو ترجمہ کرنا ہی
کچھ آسان کام نہیں ہے اور پھر حافظ کا انگریزی میں اور
پھر منظوم ترجمہ!! واقعی یہ کارے دارد این ....
از تو آید و مرداں چنیں کنند "!!!

مسکرا کر جواب دیا " کوئی پچیس برس کی مشق کے بعد
یہ کام مجھ کو اب آسان معلوم ہوتا ہے، پہلے میں نے
اردو غزلوں کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کرنا شروع کیا،

اس پر کافی عبور حاصل کرنے کے بعد اب فارسی کا شروع کیا ہے، یہ ترجمہ اگر کسی انگریزی داں ایرانی کو سناؤں تو واللہ پھڑک اٹھے، دیکھئے حافظ مرحوم کی روح کو ایک الحمد اور تین قل ہو اللہ پڑھکر بخشتا ہوں اور پھر "شاخ نبات" کی قسم دیکر کتاب کھولتا ہوں اور جو غزل نکلے اوس کا ترجمہ فی البدیہ سناتا ہوں۔"

چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور بسم اللہ کہکر کتاب کھولی، غزل نکلی۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اس شعر کا آپ نے انگریزی میں جو منظوم ترجمہ کیا ہے وہ سچ مچ ایک "شاہکار" ہے، ملاحظہ ہو!

The last gousuf will come back to Kan-an swallow-not sorrow.

The cottage of sorrow will become a flower garden one day swallow not sorrow

اس "فی البدیہ" ترجمہ کو سن کر ہم نے اپنے پر قابو رکھنے کی جو کوشش کی تو ہمارے جسم میں کچھ عجیب "ارتعاش" پیدا ہوا ہم نے اپنے پیٹ کو اچھی طرح پکڑ لیا کہ کہیں جوش مسرت سے پھٹ نہ پڑے معلوم نہیں "کنار آب رکن آباد" گلگشت کرنیوالے حضرت حافظ کی روح پر کیا گزرتی اگر وہ انگریزی داں ہوتی! ہم نے پلٹ کر ٹائمز آف انڈیا پڑھنے والے ہمسفر کی طرف جو دیکھا تو ان کا چہرہ کو اخبار کے ورقوں سے ڈھکا ہوا اور ان کے بھاری بھرکم جسم کو کچھ عجیب وضع سے ہلتا ہوا پایا۔ اس اثنا میں موصوف

نے دوسرے شعر کا ترجمہ بھی کر ڈالا، ارشاد ہوا۔

"این دل غم دیدہ حالش بہ شود دل بد مکن
وین سر شوریدہ باز آید بسامان غم مخور"

The condition of this sor-row seen heart will be-come better, dont make the heart bad. This noisy head will come back with luggage, swallow not sorrow

اس ترجمہ میں "کیچ" کی ہم دل ہی دل میں داد دے رہے تھے کہ تیسرا شعر ارشاد ہوا۔

"در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خار مغیلاں غم مخور"

If you wish to strike foot in jangle in fondness for Kaba. If Babool thorns take you to task swallow not sorrow

ارشاد ہوا "اس منظوم ترجمہ کو قافیہ سے بے نیاز رکھا گیا ہے Swallow not Sorrow اس کی ردیف ہے، قافیہ لگانے کی کوشش کیگئی تھی مگر یہ دیکھکر کہ شعر وزن سے گر جاتا ہے صرف ردیف ہی پر قناعت کیگئی۔"

غرضکہ موصوف نے پوری غزل کا ترجمہ چند منٹوں میں اسی طرح "بڑی روانی" سے کر ڈالا اور ہماری رائے پوچھی! ہم ششدر رہ گئے اور "لسان الغیب" ہماری زبان سے بے ساختہ بول اٹھے "جزاک اللہ فی الدارین خیرا" سچ تو یہ ہے

کہ آپ نے انگریزی اور فارسی شاعری دونوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس ترجمہ کا نسخہ انشاءاللہ کسی دن لندن کے عجائب خانہ میں پہنچ جائیگا"!

تو آپ کی رائے ہے کہ اس ترجمہ کی کاپیاں چھپوالی جائیں؟

ہم نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" اس ترجمہ کی تو کم سے کم دس ہزار کاپیاں چھپوالینی چاہیے"۔

اس وقت ٹائمز آف انڈیا والے ہمارے ساتھی نے اپنا چہرہ اخبار کے ورقوں سے جو باہر نکالا تو ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں کچھ سرخ ہوگئی ہیں اور ان میں پانی کھیل رہا ہے! غالباً وہ اپنی بے بضاعتی پر آنسو بہا رہے تھے کہ ان میں ایسا منظوم ترجمہ کرنے کی لیاقت نہیں تھی! یہ معلوم کرکے ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ قابل مترجم صاحب بھی گرمیاں گزارنے بنگلور جارہے ہیں، بنگلور میں آپ نے اور ترجمہ سنانے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنا بنگلور کا پتہ ہمیں دیا اور ہم سے وعدہ لیا کہ کسی دن اون کا ترجمہ سننے ضرور آئیں، چنانچہ بنگلور میں کئی مرتبہ ہم نے ان کا ترجمہ بڑے مزے لیکر سنا، انشاءاللہ کبھی ناظرین سب رس کے ملاحظہ میں اس ترجمے کے چند نمونے پیش کرینگے۔

سب رس زندہ صحبت باقی

آج ہم ان وقتوں کا ذکر کرتے ہیں جبکہ ایک بزرگوار اپنے "آخری" امتحان میں رونق افروز تھے، اردو کا پرچہ بڑی پھرتی سے لکھ رہے تھے کیونکہ "پدری زبان جو ٹھہری"!!! ایک گھنٹہ پہلے ہی آپ نے پرچے گارڈ کے حوالہ کردئے اور امتحان کے ہال سے نکل کر ادھر ادھر گلگشت کرنے لگے آخر بڑے انتظار کے بعد ایک ساتھی باہر آئے، دونوں میں پرچہ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی، آپ نے کہا۔

آج کا پرچہ بھی کچھ تھا! مجھ کو تو سو میں سو نمبروں کی امید ہے!! ساتھی نے اپنا پرچہ دیکھکر کہا "مجھ کو پچاس نمبروں سے زیادہ کی امید نہیں ہے کیونکہ بعض اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے، کہئے آپ نے اس شعر کا مطلب کیا لکھا؟ ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ۔ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں"

ارشاد ہوا "تم بھی عجب احمق ہو! ارے اتنے آسان شعر کا مطلب تمھاری سمجھ میں نہ آیا!! سنو! شاعر کہتا ہے، لوگ مضامین کی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں کہ گویا ندی نالوں کو رسّوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں"!!!

ایک صاحب نے اپنی سنہ ۱۹۲۰ء کی بڑی سیڈان "ڈاج" موٹر کار برائے فروخت ہوتی ہے" کا ایک چھوٹا سا بورڈ سامنے کے آئینہ پر لٹکایا ہے اور موٹر کو صحن میں ایک درخت کے نیچے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھ چھوڑا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو "سکنڈ ہینڈ" کار کی ضرورت تھی، ایک واقف کار کی حیثیت سے ہم ان کی ہمرکابی کی عزت حاصل کرنے پر مجبور کئے گئے اور چلے موٹر دیکھنے کوئی تین بجے ہوں گے کہ ہم دونو در دولت پر پہنچے۔ وہاں ایک "مرد معقول" سے آمنا سامنا ہوا۔ لوٹا سا قد، گندمی دھوپ چھاؤں رنگ، چمڑا ہڈیوں پر مڑا ہوا، گال سے زیادہ کن ٹپیاں پچکی ہوئیں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑے بڑے کان، چونچ دار ناک، بچی ڈاڑھی، موٹا ہفت پیوند پاجامہ، باریک ململ کا نسبتاً ڈھیلا ڈھالا کرتہ، اس پر پرانا چمڑے کا چور بازاری بلٹ، سر پر ایک پھندے دار پرانی جو کسی زمانے میں غالباً سالو کے رنگ کی ہوگی بہت ڈھیلی شاگرد پیشہ کی پگڑی۔ ان حضرت سے معلوم ہوا کہ "کار صاحب کی نہیں"!!

ہم نے موٹر دیکھنے کی اجازت چاہی، جواب ملا
"ٹھہرو! سرکار آتیں"!!
اتنے میں آواز آئی "کیا ہے مدار صاب کون ہے"؟
"مدار صاب گویا ہوئے "سرکار دو جنے موٹر دیکھتے بولتیں"!
ارشاد ہوا "اچھا دیکھو بولو"!

ہماری پریشانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے یہ محسوس کیا کہ "مدار صاب" کے سرکار بغیر دکھائی دے وہیں کہیں سے بول رہے ہیں حسب الحکم ہم موٹر کے پاس لائے گئے، موٹر کیا تھی "تہاید" سرد و گرم روزگار چشیدہ، گویا اپنے وقت کی "مدار صاب" تھی اندر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں، ایک گل موچھ، ڈاڑھی جیٹ "دو گوشتہ" "سرکار" برآمد ہیں۔ لٹھے کا تکمہ دار کرتہ پہنے ہوئے ہیں، سر بال صفا ہے اور ہاتھوں میں لو اسپیر دنو اسپیر کے کئی چھلے ہیں۔

اب یہ عقدہ کھلا کہ سرکار ہی "سہر دشمن غیب" تھے۔ "مدار صاب" نے بالکل سچ کہا تھا کہ "سرکار خاصہ پر ہیں"! موٹر میں ایک تپائی تھی، کچھ تپائی پر اور کچھ گدے پر رکابیاں، کٹورے بکھرے پڑے تھے۔ باریک چانول ابلے ہوئے مشقاب بھر، خمیری روٹیوں کا اونڑا، تلا ہوا چرب مسالہ دار تقریباً سیر بھر گوشت، دو چار لال بھبو کے سالن، بالائی، شکر — یہ تھا وہ "لیٹ لنچ" جو سرکار اڑا رہے تھے اور خوب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ قریب ہی پاندان تھا۔ ناس کی ڈبیہ تھی، ہاتھ کا نیلیا رومال تھا اور کچھ ہٹ کر ایک پست قد، حبیسم، آتش بہ سر پیچوان سرکار کی جنبش لب پر لو لینے تیار رکھا تھا۔

جوں ہی سرکار نے ہمیں دیکھا ارشاد ہوا "سلام والیکم" اور اس طرح کہ "والیکم" "سکا" "کم" باہر نہ نکل سکا، اس وجہ سے کہ سرکار کے "دولقمہ" نے ان کو بیچ ہی میں دبوچ لیا

ہم نے وعلیکم السلام عرض کرتے ہوئے موٹر کو چلا کر دیکھنے کی اجازت چاہی، کسی قدر گرجتے ہوئے فرمایا "کیا میری موٹر چلتی نین سمجھ رین؟ ذرا ٹھہرو! ڈریور ممبئی کو گیا ہے، آنے دیو چلا کر بتاتوں!!

اس "ذرا ٹھہرو" کی تکلیف ہمارے لئے ناقابل برداشت تھی، اس لئے ہم نے لب چباتے ہوئے عرض کیا "اجازت ہو تو ہم خود چلا کر دیکھ لیتے ہیں"
بپھرتے ہوئے فرمایا "نیئں جی او سیکنڈ ہانڈ بولو اچھی چلتی ہے"
یہ سنکر ہم لاجواب ہوگئے اور اس ملاقات کو جلد ختم کرنے کی نیت سے لجلجاتے ہوئے قیمت دریافت کی۔
ارشاد ہوا "بیچوں گا تو نیئں پن کیا قیمت کو بیچوں گا سوا بی نین بول سکتا"

ہم نے پھر حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہوئے آداب عرض کیا اور لوٹنے لگے۔ "مدار صاب" چند قدم ہمارے ساتھ آئے اور احتیاطاً ادھر ادھر دیکھکر آہستہ سے کہا۔
"بڑی بیگم صاب کی کندی کر کو آئیں۔ ابی گرم ہین، پھر کو آؤ"!

"باغبان"

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ۱۱۰ صفحات قیمت ۱عہ، غزنین کی فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ۔
سلطان محمود کی ادبی سرپرستیاں اور اس کے دربار کے شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ فارسی زبان پر ان شعراء کی کاوشوں کا اثر وغیرہ

جون آف آرک کی زندگی کے چار دور
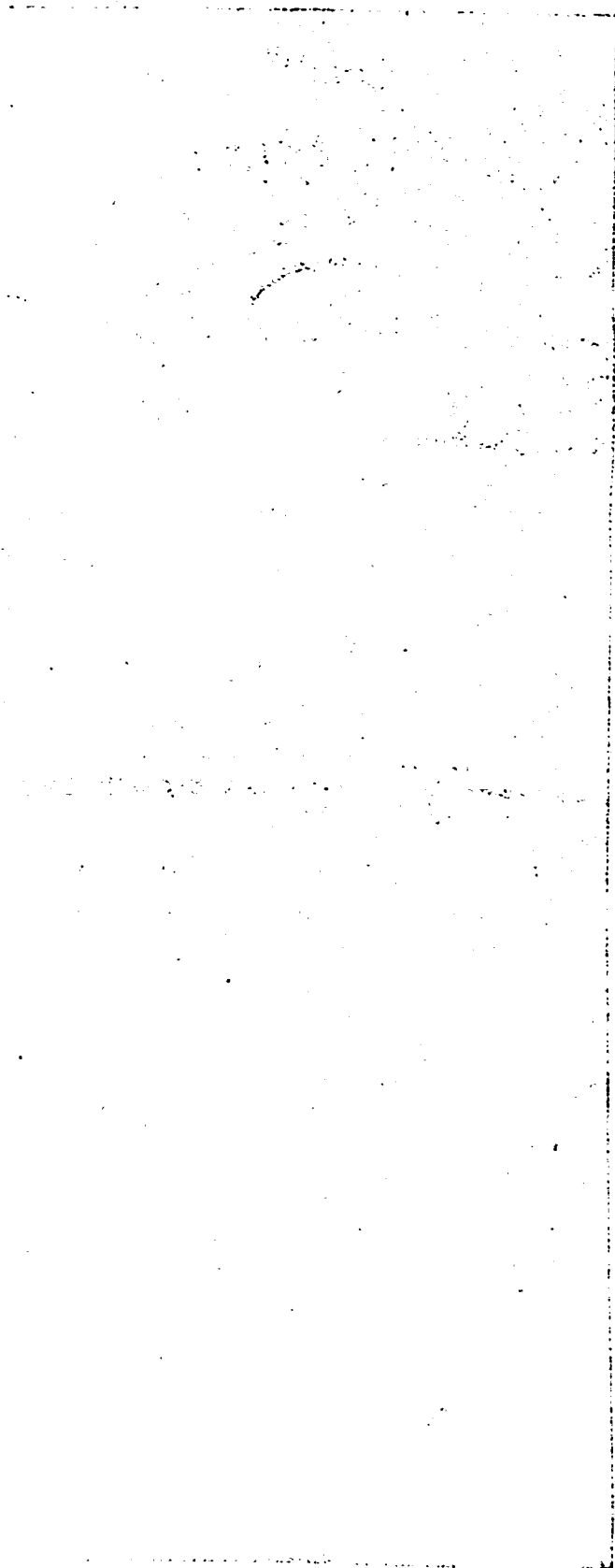
جون آف آرک

(فرانس کی اس مشہور دوشیزہ کے حالاتِ زندگی پر ادارہ کی طرف سے ایک دلچسپ کتاب لکھی جا رہی ہے جس کے تعارف کے طور پر یہ مضمون درج ہے۔)

مشرق اپنی مردہ پرستی کی وجہ سے بدنام ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ بہت کم خوش نصیب صاحبِ کمال ایسے گذرے ہیں جن کی قدر ان کی زندگی میں کی گئی۔ لیکن یہ کمزوری صرف ایشیائی ممالک تک محدود نہیں۔ یورپ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں گو ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ذیل میں فرانس کی ایک باعصمت دوشیزہ کی کہانی لکھی جاتی ہے جو بقول "راسکوپ تھیبر" اپنی زندگی میں ایک بدکار سفلی روح اور انسانیت کے لئے باعثِ ننگ سمجھی جاتی تھی لیکن مرنے کے بعد صاحبِ کشف وکمال اور مقدس ہستی سمجھی گئی اور اس کی پوجا کی جانے لگی۔

آج سے تقریباً پانسو سال پہلے متعدد لڑائیوں کے بعد فرانس پر انگلستان کی سیادت قائم ہوگئی۔ تخت کا جائز وارث فرار ہو کر پائٹیئرز چلا گیا اور اس کی ماں نے سفارش کر کے تخت وتاج انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

فرانس کی ابتری اور بربادی انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن ایک گڈریے کی لڑکی نے جس کا نام جون تھا چند ہی سال میں فرانس کو پھر آزادی دلا دی۔

فاتح اعظم نپولین کے وطن کی خاک سے یوں تو بہت سی بڑی ہستیاں اٹھیں اور فرانسیسی ناول نویس افسانہ نگاروں نے بہتیرے مکمل اور نصب العینی تخیلی کردار پیدا کئے۔ لیکن کوئی تاریخی یا افسانوی شخصیت جون کی بلندی پر نہیں پہنچ سکی۔

جون آف آرک کے واقعات شروع سے آخر تک کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ آج مادیت کے چرچے کی وجہ سے بہت کم لوگ ان پر یقین کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جون آف آرک ایک روز اپنے گاؤں میں گلہ بانی کر رہی تھی کہ ایک غیبی آواز اس کے کان تک پہنچی جو یہ تھی "جا، فرانس کو آزاد کرا اور روئن میں شہزادہ ڈافن کو تاج پہنا"

اس آسمانی حکم کے سنتے ہی یہ لڑکی اپنے باپ کے پاس پہنچی اور اس کو سارا واقعہ سنایا۔ باپ نے مسکرا کر کہا "پاگل ہوگئی ہے"۔ وہ خاموش ہوگئی۔ لیکن خدائی آواز روزانہ سوتے جاگتے اس کے کانوں میں پڑتی رہی یہاں تک کہ لوگ مذاق اڑاتے اور اسے پاگل بناتے ہی رہے لیکن وہ ایک درباری رئیس کے توسط سے ڈافن تک پہنچ گئی۔ ڈافن کو جون آف آرک کے دعووں کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس نے پہلا امتحان اس طرح لیا کہ اپنی جگہ ایک اور شخص کو دے کر خود درباریوں میں جا بیٹھا۔ لیکن شہزادہ اور اہل دربار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جون جس نے کبھی شہزادے کو نہیں دیکھا تھا سیدھا اسی کے پاس پہنچ گئی اور اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ اور بھی آزمائشیں ہوئیں جس کے بعد فوج کی کمان جون کے حوالے کی گئی۔

جون نے چاند سلطانہ کی طرح مردانہ اور سپاہیانہ لباس پہن لیا۔ ہتھیار لگائے اور شہزادے کے دئے ہوئے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر نکلی۔ دشمنوں سے جہاں جہاں مقابلہ ہوا اس نے انہیں شکست دی۔ ایک لڑائی میں تیر سے زخمی

ہو کر دیوار پر سے نیچے گری لیکن اس حالت میں بھی فوج کو برابر بڑھا دیتی اور سپاہیوں کے دل بڑھاتی رہی۔ دوست دشمن سب حیران تھے۔ خود جون کے ساتھی اسے ساحرہ سمجھ کر ڈرنے لگے تھے۔ مقابلے جاری رہے اور کامیابیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ انگریزوں کے پیر اکھڑ گئے۔

خدائی احکام کی تعمیل کے یہ اہم مدارج طے ہو چکے۔ اب صرف تخت نشینی باقی تھی۔ جون نے شہزادے سے کہا کہ وہ "روئن" چل کر تاج و تخت سنبھالے لیکن شہزادہ ڈرا ہوا تھا۔ بہ قول شخصے اس کا باپ پاگل اور ماں دغاباز تھی۔ جون کے بارے میں دنیا بھر کے شبہات اس کے دل میں تھے۔

بالآخر شہزادہ راضی ہو گیا اور اس کو ساتھ لے کر جون آف آرک "روئن" پہونچی۔ تاج ڈافن کے سر پر رکھا اور یہ کہہ کر کہ آسمانی احکام کے مطابق اس کے فرائض پورے ہو چکے ہیں، اپنے گاؤں کو واپس جانے کی اجازت چاہی۔ کاش اس کی اجازت جون کو مل جاتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ ڈافن نے جون کے عزیزوں کو جاگیر و منصب سے سرفراز اور جون کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔

جون کے بارے میں لوگوں کے شبہات بڑھتے گئے انھوں نے علی الاعلان کہنا شروع کیا کہ جون ساحرہ ہے اور اس نے سفلی ارواح کی مدد سے فوق الانسان مہمیں سر کی ہیں۔ صداقت کے آفتاب پر کذب اور افترا کے کالے کالے بادل چھانے لگے یہاں تک کہ تاریکی پھیل گئی۔ علما اور ہادیان مذہب نے بھی عوام کی ہاں میں ہاں ملائی یہاں تک کہ فرانس نے ــــ جون کے وطن نے ... اس سرزمین نے جس کے لئے جون نے اپنی جان کو خطرات میں ڈال دیا تھا اور جس کی محبت کا خون جون کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا ــــ اپنے اس محسن کو سولہ ہزار پاونڈ قیمت لے کر انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

جون کی زندگی کے ڈرامے کا تیسرا ایکٹ سینکن حزینوں سے بھی کہیں زیادہ دردناک ہے کہا جاتا ہے کہ عدالت اندھی ہوتی ہے اس قول کا اطلاق سب سے زیادہ اس عدالت پر ہوتا ہے جس میں جون پر مقدمہ چلایا گیا۔ بڑے بڑے ماہرین قانون اور انسان دشمنوں نے قسم قسم کے سوالات کر کے اور جرح کے ذریعہ جون کو پھانسنا چاہا لیکن حقیقت ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمی رہی۔ توہم پرست اور کمزور اعتقاد کے لوگوں نے اس کو سحر سامری سمجھا۔ آخر کار خود عدالت کے منشی کا بیان ہے کہ جون کے بیانات میں مجرمانہ تحریف کی گئی۔ دنیا کی اس عظیم الشان ہستی کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی۔

بڑے آدمیوں کی موت بھی بڑی ہی ہوتی ہے جون کو سولی نہیں دی گئی۔ اسے زہر نہیں کھلایا گیا۔ اس کا سر نہیں کاٹا۔ اس لئے کہ جو گناہ فرانس کو آزاد کر کے اس نے کئے تھے ان کی سزا دینے کے لئے یہ سارے عام طریقے غیر مناسب سمجھے گئے۔

شہر روئین کے ایک پبلک مقام پر جون کے لئے چتا تیار ہوئی۔ اور آن کی آن میں فرانس کی یہ موہنی مورت بھڑکتے ہوئے شعلوں میں چھپ گئی۔ ہزاروں آدمی کھڑے دیکھ رہے تھے اور دیکھتے رہے یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے

شعلے بیٹھ گئے اور آگ راکھ بن کر چاروں طرف اڑنے لگی۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور خوشی خوشی گھر لوٹے کہ ایک بدکار کاہنہ کا خاتمہ ہوگیا۔

لیکن یہ لوگ غلطی پر تھے۔ ان شعلوں نے جون کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کی عظمت اور تقدس میں ہمیشہ کے لئے چار چاند لگا دیئے۔ حقیقت کے چہرے سے کذب و افترا اور توہمات کے پردے جلد جلد اٹھنے لگے اور جون کی عظمت کی کرنیں سارے فرانس میں پھیلنے لگیں۔ جون آف آرک سینٹ جون کہلانے لگی۔ فرانسیسی اس کے نام پر جان دیتے ہیں۔ جون آف آرک فرانس کے غیر فانی ادیبوں، مصوروں اور مورت سازوں کا موضوع بن گئی۔ آج بھی پیرس کی شاہراہ پر جون آف آرک کا مجسمہ فرانسیسیوں کو یاد دلاتا ہے کہ آزادی پانی اور ہوا کی طرح تمام قوموں کا فطری حق ہے۔

میر حسن

اردو

اے جمالِ پیکرِ ہندوستان
تیرا عالم میں رہے اونچا نشاں

اے کہ پالا ہے بزرگوں نے تجھے
آفتیں سہہ کر اٹھا کر سختیاں

مر گئے پر تجھ کو زندہ کر گئے!
داستاں تیری ہے کتنی خونچکاں

پھر یہ کیسے ہم سے دیکھا جائیگا
کوندتی ہوں تیرے سر پر بجلیاں

لوحِ ہستی سے مٹانے کی تری
دشمنوں میں ہوتی ہیں سرگوشیاں

کوئی یہ پیغام پہنچا دے انہیں
کوششیں بے سود، محنت رائیگاں

تجھ کو حاصل ہوگئی اقبال سے
سربلندی، اور عمرِ جاوداں!

تو نہ ڈر مطلق کہ حق ہے تیرے ساتھ
ہیں ترے فرزند بھی لاکھوں جواں

جن کا دل سیماب، جن میں جوش ہے
بازوؤں میں زور، جیسے پہلواں

اختروں کی طرح تابندہ تمام!
جن سے روشن ہیں زمین و آسماں

آنچ آئے تجھ پہ یہ ممکن نہیں
تیرے دم کے ساتھ ہے ہم سب کی جاں

شور عابدی (گلبرگہ)

اردو کی نئی کتابیں

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبہ تنقید و تبصرہ کے پہلے جلسہ کی قرارداد مورخہ ۶ ر بہمن ۱۳۴۸ف کے مطابق کہ ہندستان کی جدید اردو مطبوعات کی فن وار فہرست ہر مہینہ رسالہ "سب رس" میں درج ہوا کرے" ماہ جنوری ۱۹۳۹ء سے اس فہرست کی اشاعت پابندی سے ہو رہی ہے "سب رس" کی صرف دو تین اشاعتوں میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہ فہرست درج نہ ہوسکی۔

اس فہرست کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین سب رس کو مختلف مضامین کی مطبوعات میں سے اپنے ذوق کی کتابیں انتخاب کرنے کا پہلا موقع ملے، اس کے علاوہ مصنفین، مولفین اور ناشرین کو بھی اس فہرست کی اشاعت سے استفادہ کا موقع ملتا ہے، وہ اس طرح کہ ان کی تصنیف تالیف اور مطبوعات کی نشر و اشاعت ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں جہاں "سب رس" کی رسائی ہوتی ہے بلا کسی معاوضہ کے ہوا کرتی ہے۔

زیر نظر فہرست میں کوشش کی گئی ہے کہ آخر ستمبر ۱۹۳۹ء تک کی جملہ اردو کتابوں کی تعداد فن وار درج ہو، چونکہ آخر سہ ماہی ۱۹۳۹ء کی مطبوعات کی فہرست اس وجہ سے لکھی نہ جا سکی کہ اس نمبر کی کتابت ماہ نومبر ہی میں شروع کر دی گئی۔ اس لئے آخر سہ ماہی ۱۹۳۸ء کی مطبوعات بھی اس فہرست میں شریک کر لی گئی ہیں تاکہ پورے ایک سال کے اعداد و شمار سے ناظرین کو واقفیت ہو، اس فہرست کی ترتیب میں ہندوستان بھر کے اردو رسالوں، مختلف کتب خانوں اور چھاپے خانوں کی فہرستوں اور مقامی کتب فروشوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

آخر سہ ماہی ۱۹۳۸ء سے آخر نو ماہی ۱۹۳۹ء تک سوانح، افسانہ، ڈراما، شاعری، فلسفہ، تاریخ، ادب، طب، سیاست، قانون، مذہب، اخلاقیات، ریاضیات، نفسیات، نسوانی ادب و خانہ داری وغیرہ پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے

سوانح ۷۳، افسانہ ۱۰۲، ڈراما ۱۵، شاعری ۱۲۶، فلسفہ ۳، تاریخ ۸۶، ادب ۱۹۷، طب ۴۸، سیاست ۲۵، قانون ۲۴، مذہب ۱۵۷، اخلاقیات ۱۴، ریاضیات ۶۹، سفرنامہ ۳، نفسیات ۱۴، نسوانی ادب و خانہ داری ۲۵، لغات ۴، صنعت و حرفت ۴، معاشیات ۲، تعلیم ۲، متفرق ۹۳،

اس طرح ایک سال میں جملہ ۱۰۶۷ اردو کی کتابیں شائع ہوئیں، ادب، مذہب اور شاعری پر سب سے زیادہ کتابیں طبع ہوئیں ان کے بعد افسانہ تاریخ اور سوانح کا نمبر رہا، ریاضیات پر بھی کافی کتابیں نکلیں، ان میں سے جو اہم کتابیں شایع ہوئی ہیں ان کی تفصیل فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سوانح

(۱) حیات عثمانی (سلطان العلوم اعلیٰ حضرت آصف جاہ ہفتم کے حالات) از شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی ۴۰۸ صفحات قیمت صہ

(۲) ہٹلر اعظم (ہر ہٹلر کی سوانح عمری) از پروفیسر چندر شیکھر شاستری ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد سے

(۳) اشرف السوانح (اشرف علی صاحب تھانوی کی سوانح عمری) ۴۹۸ صفحات

(۴) تذکرہ وقار (نواب وقار الملک مرحوم کی سوانح) ۳۸۸
صفحات قیمت عہ/
(۵) محمد علی جناح (جناح کے حالات) از عبدالعزیز صاحب
(۲۵۶) صفحات۔
(۶) سخنوران دکن (عہد عثمانی کے شعرا کا تذکرہ) از سید
تمکین صاحب عابدی ۴۸۴ صفحات قیمت سے
(۷) اتاترک۔ باتصویر (مصطفےٰ کمال مرحوم کی سوانح عمری)
از محمد مرزا صاحب آزاد ۳۰۰ صفحات قیمت عا
(۸) روح غالب۔ باتصویر (غالب کی سوانح عمری) از ڈاکٹر
سید محی الدین صاحب زور ۲۴۰ صفحات قیمت عہ/
(۹) مشاہیر ہند (چند مشہور لوگوں کے حالات) از سید
بادشاہ حسین صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت عصہ
(۱۰) حیات وکلیات اسمٰعیل باتصویر (محمد اسمٰعیل صاحب کی
سوانح عمری معہ مجموعہ کلام) دوسرا ایڈیشن مرتبہ محمد اسلم صاحب
سیفی ۷۸۰ صفحات قیمت للعہ
(۱۱) سرسید (سوانح عمری) مرتبہ انصار الحق صاحب ۴۶ صفحات
قیمت ۵/
(۱۲) عہد حاضر کے بڑے لوگ حصہ اول و دوم باتصویر
(مشہور سیاسی رہنماؤں کے حالات) ۲۵۶ صفحات قیمت عصہ
(۱۳) سیرت سید احمد شہید (سید احمد صاحب بریلوی کی سوانح
عمری) از سید ابوالحسن علی صاحب ۴۶۴ صفحات قیمت عا
(۱۴) آب حیات کے لطیفے (آزاد مرحوم کے حالات)
از آغا محمد اشرف صاحب ۱۴۴ صفحات قیمت عہ
(۱۵) رحمۃ للعلمین جلد اول (آنحضرت کے حالات) از
قاضی محمد سلیمان صاحب ۴۶۴ صفحات قیمت عا
(۱۶) مشاہیر پولیس (پنجاب پولیس کے چند افسروں کے کارنامے)

از مرزا فرید الدین بیگ صاحب ۳۹۱ صفحات
(۱۷) رئیس قادیان حصہ اول (مرزا غلام احمد صاحب قادیانی
کے حالات) ۲۱۴ صفحات
(۱۸) شہید مکسوینی (آئرش محب وطن کی سوانح عمری) ۱۲۲ صفحات
(۱۹) سیرت اقبال از محمد طاہر صاحب فاروقی ۳۰۹ صفحات
قیمت ہے
(۲۰) حیات اقبال (مرتبہ تاج کمپنی لاہور) ۱۵۲ صفحات قیمت عہ
(۲۱) میری جد و جہد (ہٹلر کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ)
۲۶۵ صفحات قیمت عا
(۲۲) حضرت امام حسینؓ کی مختصر سوانح عمری) از ظفر حسن صاحب
۲۳۲ صفحات
(۲۳) کمال اتاترک (محمد توفیق کی ترکی کتاب کا ترجمہ) ۲۸۸ صفحات
قیمت عا
(۲۴) واقعات اظفری (مترجمہ محمد حسین صاحب محوی لکچرار اردو
مدراس یونیورسٹی۔ قیمت عہ/
(۲۵) رسول پاک (از عبدالواحد صاحب سندھی) ۱۶۵ صفحات
قیمت ۸/
(۲۶) میری کہانی میری زبانی (سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم
بیرسٹر کی خود نوشت سوانح) مرتبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ
۳۲۸ صفحات قیمت سے
(۲۷) شاہ نعمت اللہ ولی از ایم۔ اے حفیظ ۸۰ صفحات - ۱۴/
(۲۸) خود نوشت سرگذشت (مسولینی کے حالات) ۲۸۶ صفحات
قیمت عہ
(۲۹) تذکرہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (از مولوی فضل اللہ صاحب
۲۴۰ صفحات - قیمت عا
(۳۰) محمد علی جناح از احسان اللہ صاحب کرمانی ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۰/

(۳۱) لینن (مترجمہ ڈاکٹر محمد اشرف صاحب قیمت مجلد عہ
(۳۲) غالب با تصویر (غالب کی خودنوشت سوانح عمری)
مرتبہ چودھری غلام رسول صاحب مہر ...۴ صفحات قیمت ...
(۳۳) شعرائے پنجاب (پنجاب کے موجودہ شعرا کے حالات
معہ نمونہ کلام) مرتبہ ملک محمد باقر صاحب رضوانی ۳۰۶ صفحات
قیمت عہ
(۳۴) ہلال و صلیب (سلطان صلاح الدین کی سوانح) از ایم
اسلم صاحب ۲۵۰ صفحات قیمت عا
(۳۵) گلبدن بیگم (شہزادی گلبدن کی سوانح عمری) از سید
ابن حسن صاحب شارق ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲
(۳۶) مشاہیر عالم (سولہ مشاہیر کے حالات) از کے ۔ کے
حمید بیرسٹر ۳۳۲ صفحات قیمت عہ
(۳۷) وداع راشد (حیات راشد کا آخری باب) رزاق الخیری
۹۰ صفحات قیمت ۸

افسانے

۱۔ محبت کا فسانہ (از لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی۔
۲۴۴ صفحات قیمت عا
۲۔ ربیعہ (از خالدہ ادیب خانم مترجمہ عبدالرحیم صاحب
شبلی ۲۴۰ صفحات قیمت عہ۔
۳۔ پس پردہ (سات مختصر افسانے) از چندر بھوشن سنگھ
صاحب۔ ۱۲۸ صفحات قیمت عہ
۴۔ گئودان (ناول) از منشی پریم چند صاحب ۶۵۰
صفحات قیمت عا۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔
۵۔ میری کہانی! سنئے گا؟ از سید علی صاحب شاکر ۱۲۵
صفحات قیمت عہ

۶۔ انسپکٹر کی لڑکی (ناول) از ایم جیکب صاحب
۱۶۰ صفحات
۷۔ ماتا ہری۔ از خلیل احمد صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عہ
۸۔ لالہ رخ با تصویر۔ جدید ایڈیشن مترجمہ لطیف الدین احمد
صاحب۔ قیمت مجلد عا
۹۔ ساز ہستی (افسانہ) از عبدالاحد صاحب فحرون ۱۹۰
صفحات
۱۰۔ خدائی راج اور دوسرے افسانے۔ از علامہ
راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عہ
۱۱۔ افسانہ بابل از سردار محمد اقبال صاحب سیف ۱۶۰
صفحات قیمت ۱۲
۱۲۔ شب غم از میاں ایم۔ اسلم صاحب قیمت عہ
۱۳۔ پریت افسانے حصہ دوم از گربخش سنگھ صاحب
۲۵۵ صفحات۔
۱۴۔ ہاشمی دوشیزہ حصہ اول و دوم (عہد عباسی کا
تاریخی ناول) از محمد صادق حسین صاحب ۴۸۰ صفحات
۱۵۔ خودکشی کی انجمن (اسٹونس کے ناول سوئی سائڈ
کلب کا ترجمہ) از عبدالمجید خاں سالک ۲۰۴ صفحات
۱۶۔ زندگی کے کھیل (مختصر افسانے) از لطیف الدین
احمد صاحب ۱۶۰ صفحات قیمت عہ
۱۷۔ تسخیر استنبول (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب
۲۵۶ صفحات۔
۱۸۔ جنت اور جہنم (ناول) از کرشن چندر صاحب قیمت عا
۱۹۔ باسی پھول۔ (افسانے) از سید علی عباس صاحب حسینی
۳۰۰ صفحات۔ قیمت عہ
۲۰۔ طلسم خیال۔ (افسانے) از کرشن چند صاحب ۲۵۰

صفحات قیمت ۸/

۲۱۔ قطرات شبنم (افسانے اور ادبی مضامین) از لالہ گوردھن داس صاحب ۱۴۰ صفحات قیمت ۸/

۲۲۔ خون ملت (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب ۲۷۶ صفحات قیمت ۸/

۲۳۔ بیسویں صدی کی سیاہکاریاں (عبرت خیز افسانے) از ایس۔ ایس منور صاحب ۱۸۲ صفحات قیمت عمر

۲۴۔ سعی ناکام اور دیگر افسانے از امتہ الرفیق صاحبہ ۱۲۰ صفحات

۲۵۔ منزل۔ از علی سردار صاحب جعفری قیمت ۱۲/

۲۶۔ انوکھے افسانے (جاسوسی افسانے) از شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی ۲۰۰ صفحات

۲۷۔ کاشانہ نادر (ناول) از عطاء الرحمن صاحب عطا ۲۴۸ صفحات قیمت ۸/

۲۸۔ اندھی دنیا۔ (کہانیاں) از اختر انصاری صاحب ۱۵۸ صفحات قیمت عمر

۲۹۔ لندن کی ایک رات (افسانہ) از سید سجاد ظہیر صاحب ۱۵۲ صفحات قیمت عمر

۳۰۔ خواب فراموش (انگریزی ناول کا ترجمہ) ۲۵۰ صفحات قیمت عمر

۳۱۔ ماہ درخشاں (ناول) از بیگم مرزا احمد علی صاحب ۵۵۰ صفحات قیمت مجلد عاں

۳۲۔ قاتل (مختصر افسانے) از میاں محمد اسلم صاحب ۲۵۶ صفحات

۳۳۔ طلسم حیات (کہانیاں) از منظور حسین صاحب ماہر القادری ۲۰۴ صفحات قیمت مجلد عاں

۳۴۔ جواہرات (اخلاقی افسانے) از چودھری فضل حق صاحب ۳۲۲ صفحات

۳۵۔ پری اور دیگر افسانے) از راحت آرا بیگم صاحبہ ۱۲۸ صفحات

۳۶۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ (اخلاقی افسانے) از سید عباس علی صاحب حسینی قیمت عمر

۳۷۔ دغا کا پتلا ("دی ریڑن آف آرسین لوپن" کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۲۷۲ صفحات قیمت عاں

۳۸۔ خاموش حسن (ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ) ۳۲۲ صفحات قیمت عمر

۳۹۔ فریبی ڈاکو (جاسوسی ناول) از راجہ رام صاحب ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲/

۴۰۔ لعل مقدس (دی اکیوزڈ پرنسس کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۴۲۲ صفحات قیمت عاں

۴۱۔ سن کی دنیا (جدید طرز کے افسانے) از رشید صاحب قریشی ۱۶۰ صفحات قیمت مجلد عمر

۴۲۔ بحری طوفان (ناول) از نعیم اللہ صاحب کوثر ۴۰۰ صفحات

۴۳۔ مسلمان مجاہد (ناول) از خواجہ نذیر احمد صاحب ۸۰ صفحات

۴۴۔ معیار محبت اور دیگر افسانے (از سیاح سنائی صاحب جزبلٹ ۱۷۲ صفحات قیمت عمر

۴۵۔ سحر فرانس (مولیبان کے افسانوں کا ترجمہ) از طاہر قریشی صاحب ۳۲۵ صفحات قیمت ۸/

۴۶۔ انمول کہانیاں (بارہ انقلابی افسانے) از شوکت عثمانی صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲/

۴۷۔ کیلے کا چھلکا اور دیگر مضامین (مزاحیہ افسانے و مضامین) از سند باد جہازی صاحب ۱۶۷ صفحات قیمت عمر

۴۸۔ ایک کہانی۔ چہرہ دیوں کی زبانی) از نیاز۔ ل۔ احمد علی عباس وغیرہ

۲۰۷ صفحات قیمت ۶/

۴۹ - چوپال (دیہاتی افسانے) از احمد ندیم صاحب قاسمی ۳۰۴ صفحات قیمت عہ

۵۰ - محبت کی چھاؤں (افسانے) از مرزا ظفر الحسن بی۔ اے ۱۳۲ صفحات قیمت عہ

۵۱ - ڈاچی (افسانے) از اپندر ناتھ اشک ۲۰۸ صفحات قیمت عہ

۵۲ - صدائے جرس (افسانے) از والدہ سراج الدین ظفر ۳۰۰ صفحات قیمت عہ

۵۳ - افسانہ پدمنی (از رانی پدمنی کے فسانہ کی مورخانہ تحقیق) از احتشام الدین ایم۔ اے ۱۵۰ صفحات قیمت عہ

ڈرامے

۱ - ریڈیو ڈرامے (آٹھ ڈراموں کا مجموعہ از فضل حق صاحب قریشی ۱۹۲ صفحات قیمت عہ

۲ - انارکلی (تیسرا ایڈیشن) از سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے ۱۹۸ صفحات قیمت عہ

۳ - تسلیم (المیہ ڈراما) از سید مظہر علی صاحب گیلانی ۱۹۸ صفحات قیمت ۶/

۴ - پہلا شراب کار (ٹالسٹائی کے ڈرامہ کا ترجمہ) از محمد یونس صاحب سلیم ۴۰ صفحات قیمت ۴/

۵ - بے انصافی کا انصاف (عدالتوں کی بے انصافیاں) از پنڈت دیو دت صاحب شرما ۳۱۰ صفحات قیمت عہ

شاعری

۱ - باغی (باغیانہ نظمیں) از جناب قریشی صاحب ... صفحات قیمت عہ

۲ - گلستان شرف (اردو و فارسی کلام کا مجموعہ) از سید ابو الفتح شرف الدین الحسینی صاحب شرف ۱۲۰ صفحات قیمت عہ

۳ - نورِ مشرق (نظمیں) از مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی۔ ۱۳۶ صفحات قیمت عہ

۴ - نیرنگ فطرت (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از پنڈت اندر جیت صاحب شرما ۱۷۲ صفحات قیمت عہ

۵ - افکار سلیم (وحید الدین صاحب سلیم کی نظمیں) مرتبہ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی ۳۱۸ صفحات۔ قیمت عا

۶ - دیوان بیدار (میر محمدی صاحب بیدار کا مجموعہ کلام) مرتبہ محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی قیمت عا

۷ - جنون و حکمت (رباعیات کا مجموعہ) از جناب جوش ملیح آبادی قیمت ے

۸ - آہنگ (نظمیں) از اسرار الحق صاحب مجاز ۱۰۴ صفحات قیمت عہ

۹ - الخیام (عمر خیام کی رباعیوں کا اردو ترجمہ) از رائے گورسرن لال صاحب آزاد قیمت ۱۲/

۱۰ - میخانہ الہام (مجموعہ کلام) از جناب شاد عظیم آبادی قیمت ۸/

۱۱ - ارمغانِ حجاز (علامہ اقبال کا آخری کلام) قیمت ۸/

۱۲ - نغمۂ حرم (نظمیں) از اختر صاحب شیرانی قیمت ۴/

۱۳ - آہ کے سو شعر از ڈاکٹر سید محمد صفدر صاحب آہ قیمت ۸/

۱۴ - ترجمان الغیب (حافظ کی چھ سو غزلوں کا منظوم ترجمہ) از محمد احتشام الدین ایم اے ۳۴۲ صفحات قیمت ۱۲/

۱۵ - آہنگ رزم (رزمیہ نظمیں) از جناب وفا رانبالوی ۹۴ صفحات قیمت ۸/

۱۶ - تصویر کشمیر (نظمیں) از جناب حفیظ جالندھری۔ قیمت ۸/

۱۷ - خون ... (نعتیہ کلام) از ... یونس صاحب خلیل ۱۷۶ صفحات قیمت عہ

۱۸- نغمۂ نور (غزلیں اور نظمیں) از جناب بہزاد لکھنوی ۲۰۰ صفحات
قیمت عمر

۱۹- بادۂ فطرت (مجموعۂ کلام) از میر زیدی صاحب ۲۸۸
صفحات قیمت ۱۲ر

۲۰- حدیثِ حسن (نظمیں) از شمیم احمد صاحب فطرت قیمت عمر

۲۱- اربعہ عناصر (رباعیات) از حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر
۲۰۸ صفحات قیمت عمر

۲۲- حرف و حکایات (نظمیں) از جناب جوش ملیح آبادی
۲۴۸ صفحات قیمت عال

۲۳- قندیل نور (مرثیوں کا مجموعہ) از جناب نور لدھیانوی
۱۸۴ صفحات

۲۴- دیوانِ ثاقب (از مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی
۵۵۰ صفحات قیمت عال

۲۵- تصویرِ احساس (مجموعہ کلام) از الطاف مشہدی صاحب
قیمت عال

۲۶- ارمغانِ جذب حصہ دوم (رباعیات) از راگھو ندر راؤ صاحب
جذب ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۲۷- کلیاتِ بحری (قدیم دکھنی شاعر) مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب
۳۱۲ صفحات قیمت سے

۲۸- ریاضِ حیدر (مرثیوں کا مجموعہ) از حیدر عباس صاحب
رضوی ۲۰۰ صفحات

۲۹- نغمۂ نانک (مجموعۂ کلام) از نانک چند صاحب نانک
لکھنوی ۲۵۲ صفحات

۳۰- تمثیلی مشاعرہ (مشہور قدیم شعراء کا کلام ڈرامائی طرز میں)
از پنڈت کیفی صاحب ۱۰۰ صفحات قیمت عمر

۳۱- سرودِ جاوید (مثنوی سحر البیان پر تبصرہ) از شمس الحسن صاحب
شمس ۲۰۴ صفحات

۳۲- جوہرِ تخلیق (شاہنامہ کی ایک جنگ کا منظوم ترجمہ) از سید
محمد علی صاحب چشم ۹۸ صفحات قیمت ۸ر

۳۳- شہنشاہ نامۂ اسلام (آنحضرتؐ اور خلفا کے غزوات)
۲۱۵ صفحات

۳۴- تنقیدی مضامین (شعرا کے کلام پر تنقید) از ایم۔ ایم۔
ہاشمی صاحب و فیاض حسین صاحب زیدی۔

۳۵- سریلی بانسری (مجموعہ کلام) از سید انور حسین صاحب آرزو
۲۰۰ صفحات قیمت عال

۳۶- چراغاں (مجموعہ کلام) از جناب احسان دانش ۲۳۲
صفحات قیمت عہ

۳۷- آتشِ خاموش (مجموعہ کلام ،، ،، ۲۰۰ صفحات قیمت عمر

۳۸- نفیرِ فطرت ،، ،، ،، ۲۰۰ صفحات قیمت عمر

۳۹- جادۂ نو (قطعات) ،، ،، قیمت ۸ر

۴۰- نوائے کارگر (مجموعہ کلام) ،، ،، ۳۶۸ صفحات قیمت عال

۴۱- تفصیلِ غالب (دیوانِ غالب کی شرح) از جناب احسان
دانش قیمت عمر

۴۲- خضرِ عروض (علمِ عروض کی الجھنوں کا حل) از جناب احسان
دانش قیمت ۸ر

۴۳- فرحتِ دل (منتخب اشعار) از خان بہادر عبداللہ خاں
۲۷۱ صفحات قیمت عہ

۴۴- معارفِ جمیل (مجموعہ کلام) از حکیم آزاد انصاری ۲۵۶
صفحات قیمت عہ

۴۵- گلِ نغمہ (نظموں کا مجموعہ) از ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم
قیمت عال

۴۶- جذباتِ بسمل با تصویر (مجموعہ کلام) از منشی سکھ دیو پرشاد

بسمل قیمت

۴۷ - پیام روح باتصویر (مجموعہ کلام) از حامد اللہ افسر قیمت

۴۸ - شعرائے عثمانیہ (مرقع سخن کی چوتھی جلد) مرتبہ سید معین الدین قریشی و عبدالقیوم خاں باقی ۲۴۳ صفحات قیمت

۴۹ - عرفانیات فانی (کلیات) از شوکت علی خاں فانی قیمت

۵۰ - خوننابۂ دل (مجموعہ کلام) از شعیب احمد ندرت میرٹھی قیمت

۵۱ - خمخانہ (مجموعہ کلام) از گورسرن لال آزاد ۲۱۲ صفحات قیمت

۵۲ - متاع اقبال (اقبال کی شاعری پر تبصرہ) از ابوظفر عبدالواحد قیمت

۵۳ - قلقلہ (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) از حاجی لق لق قیمت

۵۴ - برق و باراں (انقلابی نظمیں) از شمیم کرمانی قیمت

۵۵ - کائنات دل (نظمیں) از منور لکھنوی ۳۵۰ صفحات

۵۶ - اقبال اور اس کا پیغام (شاعری پر تبصرہ) از ڈاکٹر تصدق حسین خالد قیمت

۵۷ - یاد چکبست (چکبست اور ان کی شاعری پر مضامین) از پنڈت آنند نرائن ملا ۱۷۱ صفحات

فلسفہ

(۱) فہم انسانی (ہیوم کی مشہور کتاب کا ترجمہ) ۴۹۱ صفحات

۲ - خواب کی دنیا (خواب کی ماہیت اور اس کا فلسفہ) از عبدالمالک صاحب ۱۹۰ صفحات قیمت

۳ - فلسفۂ حسن از مست رام صاحب ۱۹۶ صفحات

۴ - حیات کیا ہے (حیات کی ابتدا، اور اس کے ارتقا پر تبصرہ) قیمت

تاریخ

۱ - (دہلی کی دو سو برس کی تاریخ) از سید حسن صاحب برنی ۱۵۴ صفحات

۲ - تاریخ مدینہ منورہ از غلام دستگیر صاحب نامی ۱۸۴ صفحات

۳ - نور المبین (فرقہ اسماعیلیہ کے ائمہ کے تاریخی حالات) از علی محمد خاں صاحب ۸۰ صفحات قیمت

۴ - دنیا کی کہانی (تاریخی تقاریر کا مجموعہ) از پروفیسر محمد مجیب صاحب ۲۲۷ صفحات قیمت

۵ - مسلمانوں کا روشن مستقبل (تین سو برس کی تاریخ) از سید طفیل احمد صاحب علیگ ۶۰۸ صفحات قیمت

۶ - تاریخ گولکنڈہ باتصویر (مشہور تاریخی قلعہ گولکنڈہ کے حالات) از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ۴۱۲ صفحات قیمت

۷ - شجرۂ آصفیہ (شجرۂ خاندان آصفی) از حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ۹۵ صفحات معہ متعدد شجرے قیمت

۸ - مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ (اسلامی سیاسیات کی تاریخ) از عبدالوحید خانصاحب ۲۵۴ صفحات

۹ - تاریخ نظم و نثر از آغا محمد باقر صاحب ۲۱۶ صفحات

۱۰ - مرقع ملتان از سید محمد اولاد علی صاحب گیلانی ۱۶۲ صفحات

۱۱ - مدراس میں اردو - از نصیر الدین صاحب ہاشمی ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد

۱۲ - تاریخ ائمہ (انبیائے کرام و ائمہ طاہرین کے حالات) از سید علی حیدر صاحب ۴۵۰ صفحات قیمت

۱۳ - تاریخ اسلامی ہند از جناب نیاز فتحپوری ۲۴۲ صفحات قیمت

۱۴ - تاریخ ملت (ایام جاہلیت سے خلافت راشدہ تک کی تاریخ) از مسلم صاحب دہلوی ۳۲۸ صفحات

۱۵۔ برطانوی ہند کی تاریخ اور اس کے مورخین۔ از ڈاکٹر برشفاعت احمد خانصاحب ۱۰۳ صفحات

۱۶۔ انقلاب حبش (حبش پر اطالیہ کے مظالم) از محمد اشرف خانصاحب۔ عطا قیمت ۱۲ر

ادب

۱۔ پیام اقبال (علامہ اقبال کے پیام پر مضامین) ۳۰۰ صفحات قیمت عا

۲۔ صحرانورد کے خطوط از مرزا ادیب صاحب ۵۰۰ صفحات قیمت عہ

۳۔ مضامین فراق از خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق ۱۶۰ صفحات قیمت عمہ

۴۔ مضامین رشید (مزاحیہ) از رشید احمد صاحب صدیقی ۲۲۲ صفحات قیمت عا

۵۔ مضامین فلک پیما از خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ۸۰۳ صفحات قیمت عاہ

۶۔ فلکش (مزاحیہ مضامین) از سید ابوطاہر داؤد صاحب ۲۵۶ صفحات قیمت عہ

۷۔ مطائبات (فکاہی مضامین) از چراغ حسن صاحب حسرت ۱۱۶ صفحات عمہ

۸۔ جوہر اقبال (مجموعہ مضامین) از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وغیرہ قیمت عہ

۹۔ بکھری ہوئی پتیاں (مجموعہ مضامین) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عمہ

۱۰۔ مقالات شبلی جلد ششم از مولانا شبلی نعمانی مرحوم ۲۰۲ صفحات

۱۱۔ مکاتیب مہدی (مہدی حسن صاحب کے خطوط) مرتبہ مہدی

بیگم صاحبہ ۲۰۳ صفحات قیمت ــــہ

۱۲۔ قطرات شبنم (مجموعہ مضامین) از گوردھن داس صاحب بی۔ اے ۱۴۴ صفحات

۱۳۔ تاریخ و تنقید (مضامین کا مجموعہ) از پروفیسر عابد حسن صاحب ۲۲۴ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ شمع راہ (خطبات) از پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب ۱۱۵ صفحات قیمت ۱۰ر

۱۵۔ نوجوان اور مفلسی (اصلاحی مضامین) از سید صابر حسین صاحب قیمت ۱۰ر

۱۶۔ ہندوستانی (ریڈیو تقاریر) از ڈاکٹر تاراچند صاحب وغیرہ قیمت ۱۲ر

۱۷۔ راز و نیاز۔ از سلطان احمد صاحب۔ جودی قیمت عمہ

۱۸۔ موتی (اقوال کا مجموعہ) از سید یوسف صاحب بخاری ۱۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۹۔ محاورات اردو۔ از حافظ عبدالکریم صاحب مفتون ۱۴۴ صفحات قیمت ۸ر

۲۰۔ اصلاح ادب (اردو زبان کی غلطیاں) از غلام حیدر صاحب

۲۱۔ نقوش سلیمانی (مضامین و تقاریر کا مجموعہ) از مولانا سلیمان صاحب ندوی ۴۷۶ صفحات قیمت عاہ

۲۲۔ مقالات ہاشمی۔ از نصیر الدین صاحب ہاشمی ۴۶۴ صفحات قیمت عاہ

۲۳۔ مجنوں کے خطوط از عطاء الرحمن صاحب عطا علیگ ۳۰۰ صفحات قیمت عا

۲۴۔ سہرا حلقہ (ایک خاتون کے خطوط) از ناظر صاحب کاکوری صفحات

طب

۱- کلیات ادویہ از حکیم کبیرالدین صاحب ۵۹۰ صفحات قیمت مجلد صہ

۲- تحفۂ نایاب (مجرب نسخے) از محمد عبدالرحیم صاحب جمیل ۵۴۴ صفحات قیمت

۳- شاہراہ تندرستی (صحت و امراض کا ترجمہ) از لالہ رنگ بہاری لال صاحب ۱۲۰ صفحات

۴- بچوں کی بیماریاں از ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عصہ

۵- طبیب نسواں معہ رہنمائے دایاں از حاجی اصغر علی صاحب ۱۹۲ صفحات

۶- اسرار جیلانی از حکیم غلام جیلانی صاحب ۴۰۰ صفحات

۷- پاکٹ ڈاکٹر (دوسرا ایڈیشن) از محمد عبدالرحمن صاحب ۳۱۰ صفحات

۸- کفیل صحت از محمد خلیل شاہ صاحب ۷۹ صفحات

۹- نیا علم شفا بخشی (نواں ایڈیشن) از لوئیس کوھنی ۵۲۶ صفحات

۱۰- گنجینۂ طبیب حصہ چہارم از حاجی اصغر علی صاحب ۲۹۶ صفحات

۱۱- گلزار رحمت از حکیم وزیر چند صاحب ۱۱۸ صفحات

۱۲- مشیر الصحت عرف دیہاتی چٹکلے (چند مجرب نسخے) از میر مصطفےٰ علی صاحب دوم تعلقدار نلگنڈہ

۱۳- گرہ شاستر (ضبط تولید اور زچہ و بچہ کی حفاظت) ۲۰۵ صفحات

۱۴- مرقع جمیل از محمد عبدالرحیم صاحب جمیل ۲۲۸ صفحات

۱۵- تہذیبی نسخے۔ (تہذیب نسواں کے نسخوں کا مجموعہ) ۱۲۸ صفحات

۱۶- ہومیو علاج (ہومیوپیتھی علاج کے متعلق) ۲۹۳ صفحات

۱۷- ضبط تولید و اصلاح نسل مرتبہ حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی ۳۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۸- خوراک۔ صحت (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۱۷۶ صفحات قیمت ۱۲ر

سیاسیات

۱- حکومت خود اختیاری اور ہندو مسلم مسئلہ کا حل از طفیل احمد صاحب ۲۵۲ صفحات

۲- ترکی جمہوریہ (ترکی کی سیاست) از ضمیر احمد صاحب ہاشمی ۴۳۶ صفحات

۳- کمیٹی دستوری اصلاحات کی رپورٹ (حیدرآباد کے دستوری اصلاحات) مرتبہ سید یوسف علی صاحب معتمد کمیٹی ۴۱۶ صفحات قیمت عہ

۴- تحریک ترقی مملکت آصفیہ از خواجہ حمید احمد صاحب ایم اے عثمانیہ ۱۳۳ صفحات قیمت ؎

۵- سیاسیات کی پہلی کتاب از محمد عاقل صاحب ایم اے ۶۰ صفحات ۵ر

۶- مسلمانان ہند کی سیاست وطنی از محمد امین صاحب زبیری ۲۱۹ صفحات قیمت ۱۰ر

۷- شیطان کا انتقام (دور حاضر کے سیاسی حالات) از محمد جلال الدین صاحب اشک ۹۰ صفحات قیمت عصہ

۸- جمعیتہ الاقوام پر ایک نظر (جمعیتہ الاقوام کے مقاصد اور عمل کا جائزہ) ۸۰ صفحات

۹- متاع حق (اسلامی سیاست) از سید امیر احمد صاحب ... صفحات قیمت

۱۰۔ جدید جغرافیہ پنجاب (پنجاب کی سیاست پر مزاحیہ تبصرہ) از سند باد جہازی قیمت عہ

قانون

۱۔ قانون اسٹامپ حصہ اول از گردھاری صاحب ساگر ۲۴۳ صفحات

۲۔ آئین حکومت ہند (دوسرا ایڈیشن) از عبدالمجید خاں صاحب سالک بی۔ اے۔ ۴۲۰ صفحات

۳۔ تحفہ نمبر ۳ (قانون وراثت) از رلیا رام صاحب ۱۹۲ صفحات۔

۴۔ میڈیکل جورس پروڈنس از محمد سلیمان صاحب قریشی ۱۱۰ صفحات۔

۵۔ معاشدار (عطیہ معاش کی وضاحت) از کاشی ناتھ راؤ صاحب وکیل نظام آباد قیمت عہ

دینیات

۱۔ مذاہب اور انسانیت (بارہ مختلف مذاہب کے اصول) از لالہ ہردیال صاحب ۲۸۸ صفحات قیمت عہ۱۲

۲۔ اظہار حقیقت از مجبور صاحب چشتی ۱۰۴ صفحات

۳۔ بچوں کے لئے رامائن از پروفیسر رام سروپ صاحب ۳۲۸ صفحات

۴۔ عرفان نانک (سکھوں کی دعا کا ترجمہ) از برج بلب سنگھ صاحب بیدی ۲۲۲ صفحات

۵۔ جیون چرتر (مذہبی ہدایات) از سوامی بھگوان سنگھ صاحب ۳۸۷ صفحات

۶۔ یدبیضا (اسلام اور مسلم سوسائٹی پر خطبات) از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری ۱۴۰ صفحات

۷۔ تاثیرات قادیان از ملک فضل حسین صاحب ۲۴۲ صفحات

۸۔ گیتا امرت (ماخوذ از بھگوت گیتا) از چودھری روشن لال صاحب ۲۳۸ صفحات قیمت ۶/

۹۔ فن تفسیر از مرزا عزیز صاحب قیصانی ۲۰۰ صفحات

۱۰۔ ہندوستانی اسلام (دو خاص مذاہب کی تاریخی حیثیت) از قاضی اظہار الدین صاحب ۵۰ صفحات قیمت ۶/

۱۱۔ مدح صحابہ اور تبرا (اقتباسات اخبار مدینہ) ۹۶ صفحات قیمت ۴/

۱۲۔ اسلامی نظام تعلیم از ریاست علی صاحب ندوی ۱۵۶ صفحات

۱۳۔ نغمۂ توحید از سری سچدانند سد گرو یوگی راج ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ پیام امین (کلام اللہ کی تدوین اور اس کی تعلیم) دوسرا ایڈیشن از محمد عبداللہ صاحب منہاس ۴۲۰ صفحات قیمت عہ

۱۵۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت از سعید احمد ایم۔ اے ۲۶۲ صفحات قیمت عا/

۱۶۔ مقدس قانون۔ از ناصر الدین رشید ترابی قیمت ۱۰/

۱۷۔ تنقیحات (اسلام اور مغربی تہذیب پر تبصرہ) از سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۴۰ صفحات قیمت ۱۲/

اخلاقیات

۱۔ انسان (انسان اور انسانیت کے متعلق) از کاشی ناتھ رام صاحب چاؤلہ ۳۰۰ صفحات قیمت ۸/

۲۔ محرک اخلاق (پانچواں ایڈیشن) از رحمت اللہ صاحب سبحانی

۴۰۰ صفحات

ریاضیات

۱۔ فہیم حساب حصہ دوم از ایم اے نذیر صاحب ۱۸۶ صفحات

۲۔ کرشنا میکنیکل گائیڈ از پنڈت کشن چند صاحب سردار ۳۲۰ صفحات

سفرنامہ

۱۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو۔ مرتبہ صرمتہ اللہ صاحب کرمانی ۱۵۰ صفحات

۲۔ سیر کشمیر۔ از کوراج بلونت سنگھ صاحب ۲۲۶ صفحات قیمت عہ

۳۔ اندرون ہند خالدہ ادیب خانم کی انگریزی کتاب ان سائڈ انڈیا کا اردو ترجمہ از سید ہاشمی قیمت سے

نفسیات

۱۔ مظاہر نفسیات از ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ۱۸۴ صفحات قیمت ۸/

نسوانی ادب و خانہ داری

۱۔ نذر دکن۔ (سب رس کے دکن نمبر کا ضمیمہ نسواں) مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۱۰۴ صفحات قیمت عہ

۲۔ بڑھاپے کی برکتیں اور عورت از خواجہ عبدالحمید صاحب دہلوی ۹۶ صفحات قیمت عصہ

۳۔ علم خانہ داری از محترمہ ممتاز شاہنواز صاحبہ ۷۰ صفحات قیمت عصہ

۴۔ گلزار درخشاں (دستکاری کے متعلق) از آر۔ کے درخشاں صاحبہ قیمت عصہ

۵۔ ہندوستانی کشیدہ کاری از مس امتہ اللہ قیمت عصہ

۶۔ مراۃ العروس (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۴۲ صفحات قیمت ۱۲/

۷۔ بنات النعش (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۰ صفحات قیمت ۱۲/

۸۔ توبۃ النصوح (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۲۷ صفحات قیمت ۱۲/

۹۔ مسلمان عورت کے حقوق از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۱۲/

۱۰۔ ساجن موہنی (تسخیر شوہر کے طریقے) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۴/

۱۱۔ من کی بتیا (اصلاح معاشرت) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ۔ ایم۔ اے ۸۸ صفحات قیمت ۸/

۱۲۔ محکومیت نسواں (حقوق نسواں) از معین الدین صاحب انصاری قیمت عصہ

۱۳۔ مکمل باورچی خانہ از فہمیدہ خاتون صاحبہ۔ فرحت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲/

۱۴۔ سوتیلی ماں۔ از رابعہ بیگم صاحبہ شعبہ نسوان ادارہ ادبیات اردو۔ ۵۶ صفحات قیمت ۴/

لغات

۱۔ فرہنگ عامرہ۔ (عربی۔ فارسی اور ترکی کی لغات کا فرہنگ) از محمد عبداللہ خاں صاحب قریشی ۵۸۲ صفحات قیمت عالہ

۲۔ مبادی اللغات (اردو لغت) از فیض محمد صاحب ۹۱ صفحات

صنعت و حرفت

۱۔ روپئے بنانے کی مشین (صابن سازی فوٹوگرافی وغیرہ)

از ایم۔ آر انند ۱۱۲ صفحات

۲۔ انڈین ماسٹر آف کرافٹ (باتصویر لباس کی کتر بیونت) قیمت عا

۳۔ وصلی کی دستکاری از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۶ صفحات قیمت ۸/

۴۔ لکڑی کا باریک کام از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۸ صفحات قیمت ۸/

۵۔ صنعت وحرفت کے قیمتی راز از مہانندجی قیمت عصہ

۶۔ ہندوستان کی صنعت وتجارت از منت اللہ صاحب رحمانی ۱۲۳ صفحات

معاشیات

۱۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو۔ از ڈاکٹر زین الدین احمد صاحب ۱۵۵ صفحات قیمت ۸/

۲۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا از محمد عاقل صاحب ۱۱۲ صفحات

تعلیم

۱۔ رہنمائے اساتذہ از للیارام صاحب ۲۵۶ صفحات

۲۔ بنیادی قومی تعلیم کا نصاب از ذاکر حسین صاحب ۲۴۰ صفحات قیمت عہ

۳۔ اردو مضمون نویسی از پروفیسر نانک پرشاد صاحب بی۔ اے قیمت ۸/

متفرق

۱۔ کرشمۂ روحانی از محمد شریف صاحب ۹۶ صفحات

۲۔ تلوار (متعلق شمشیر زنی) از کپتان اعجاز علی صاحب شہرت قیمت ۶/

۳۔ لذت شادی۔ از بی چندر صاحب بکل ۱۶۰ صفحات

۴۔ کالا علم۔ (طلسمات پر ایک مصری کتاب کا ترجمہ) ۲۱۶ صفحات۔

۵۔ ترکاری۔ از جی۔ ایم ملک صاحب ۴۰ صفحات

۶۔ معلم پٹوار از آغا نثار احمد صاحب ۲۴۴ صفحات

۷۔ چوپائے اور انسان از موہن لال صاحب ۷۶ صفحات

۸۔ انسداد گداگری از سلطان احمد صاحب قیمت عہ

۹۔ اسلامی سپہ گری از عبدالکریم صاحب قیمت عصہ

۱۰۔ سکھی کسان از عبدالحمید صاحب تحصیلدار آرمور نظام آباد ۱۹۳ صفحات عا

۱۱۔ برہمچریہ (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۹۶ صفحات قیمت ۹/

۱۲۔ گرہست جیون ″ ″ ۵۰ صفحات قیمت ۱۲/

۱۳۔ یورپ کے تاثرات (ترکیبی اہل قلم کے تاثرات) مرتبہ بدر شکیب بی۔ اے ۹۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ مغربی تصانیف کے اردو تراجم از میر حسن ایم اے ۴۳ صفحات قیمت ۴/

۱۵۔ نئے مسائل (فکر وعمل کی نئی راہیں) از محمد محبوب الدین بی۔ اے قیمت ۸/

مرزا سیف علی خاں

ضلع

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا)

ضلع سے میری مراد ضلع عثمان آباد، ضلع بیڑ یا ہندوستان کے کسی خاص ضلع سے نہیں ہے بلکہ ضلع سے میرا مقصد اس صنعت سے ہے جسے گھٹیا درجہ کے شعراء اپنے شعروں میں اور بڑھیا درجہ کے خوش مذاق اصحاب ظرافت پیدا کرنے کے لئے عام طور پر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔

اس صنعت کا دوسرا نام رعایتِ لفظی ہے اور عام طور پر اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن کو دوسرے الفاظ کے ساتھ محض ایک لفظی تعلق ہوتا ہے مگر ان کے معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کا شعر ہے کہ

سن کے چرچا غیر نے جا کے چھچھوندر چھوڑ دی گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ہوا

یہاں چھچھوندر چھوڑنے کے معنی شگوفہ چھوڑنے کے ہیں اور ٹوٹے کے معنی نقصان کے ہیں مگر چھچھوندر اور ٹوٹا آتش بازی کے نام بھی ہیں اس لئے، گھر جلا، چھچھوندر اور ٹوٹا ضلع کے الفاظ ہیں اور ان میں ایک دوسرے سے مناسبت ہے

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کا نام لیا جائے، وہ ایک سالم لفظ سے ظاہر ہو جائے جیسے کہ یہ ایک مشہور لطیفہ ہے کہ

جج بھی کانا تھا اور ملزم بھی کانا تھا۔ ملزم نے جج کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور! ہم خستوں پر چشمِ عنایت چاہیے۔ جج نے کہا کہ ہم سب کو ایک آنکھ دیکھتے ہیں۔ ملزم نے کہا کہ یہ تو حضور کی عین منصفی ہے

اس کی دوسری قسم میں الفاظ اس قدر کھینچ تان کر بٹھائے جاتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں مثلاً امانت کا یہ مشہور شعر ہے کہ

ایسی نہ بات آپ زباں سے نکالئے ہم کو ہو زہر غیر کو مصری کی ڈلی ہو

یہاں دوسرے مصرع میں نہ بات کا لفظ، زبان سے نکالتے وقت نبات ہو جاتا ہے۔ جس کے معنی مصری کے ہیں اور زہر، مصری، نبات، یہ سب ضلع کے لفظ ہیں۔

آپ نے وہ شعر تو سن لیا جس میں زبردستی کھینچ تان کر ضلع باندھا گیا تھا اب ایک چھوٹی سی اسی نمونے کی گفتگو بھی سن لیجئے۔

ایک صاحب اُسترہ خریدنے گئے۔ دوکاندار نے قیمت زیادہ بتائی۔ خریدار نے کہا کہ میاں تم تو مونڈھتے ہو (یعنی دوکان دار کو حجام بنایا)، دکاندار نے تڑسے جواب دیا کہ حضور ہم اس طرح سے مونڈھتے ہیں اور آپ اُس طرح سے مونڈھتے ہیں (یہاں "اُس طرح" سے تلفظ کرتے وقت اُسترے سے ہو جاتا ہے)

ابتداء میں شعراء نے اس دل لبھانے والی صنعت کو اس خوبی سے برتا کہ ہر شخص اس پر لٹو ہو گیا

چند روز کے بعد بازار میں چل نکلی اور ایسی چلی کہ ہر شخص اس کا سودائی بن گیا۔ اس لئے بعض شعرا نے تو اس قدر گریز کی کہ اس کو حدود شاعری سے ہی خارج کر دیا اور بعض نے اس قدر وسعت دی کہ کشورِ شعر سخن کا رکنِ اعظم بنالیا۔

غالب کی مشہور و معروف غزل کا مصرع ہے کہ "ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاتو" اکثر ضلع بازوں کا خیال ہے کہ یہاں ہیہات، پاتو کی مناسبت سے ضلع کے طور پر بٹھایا گیا ہے۔

مگر ان کے بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں ضلع جگت کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ چنانچہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز کوئی صاحب ان سے ملنے آئے۔ کلام کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کا یہ شعر مجھے دور دراز سے کھینچ کر لایا ہے پھر یہ شعر پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی   میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ یہ شعر غالب کا نہیں تھا اور اسد کی رعایت سے شیر کو کہاں خاطر میں لاتے تھے اس لئے اسنا! مسکرائے اور کہا کہ جناب جس بزرگ کا یہ شعر ہے ان پر بقول ان کے رحمت خدا کی اور یہ میرا شعر ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔

غالب سے پیشتر بھی اکثر شعرا نے ضلع بولنے والوں پر چوٹیں کیں ہیں۔ چنانچہ سودا فرماتے ہیں۔ کہ

پکڑی جو لٹورے نے کہیں کھیتی سے چڑیا   سمجھا کہ نہیں باز کوئی مجھ سا کلاں گیر
استاد کی ان کے ہے انھوں کو یہ نصیحت   لفظی نہ تناسب ہو تو کچھ مت کرو تحریر
اتنا تو تلازم رکھو الفاظ کا ملحوظ   بے پنجہ و ناخن نہ لکھو دودھ کو تم شیر
جب تک کہ نہ منظوم ہو پاسنگ و ترازو   باندھو نہ کبھی شعر میں تم لفظ شکم سیر

یہاں پنجہ، ناخن، شیر، پاسنگ، ترازو، اور شکم سیر یہ سب ضلع کے الفاظ جنہیں اعتراض کے پردے میں لکھ کر استاد نے خود اپنا ذوقِ سلیم بھی بتا دیا ہے۔

بہر حال اس سلے وے کے باوجود اس وقت ہزاروں غزلیں، ہزاروں قصیدے اور ہزاروں مثنویاں اس صنعت میں بھری پڑی ہیں اور پھر ضلع بازوں نے تو وہ دریا بہائے ہیں کہ شعرا کے کارناموں پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔

جس طرح اکثر لوگ بیت بازی اور دوسرے مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اسی طرح بعض اصحاب ضلع بازی میں اپنا وقت گزارتے رہتے ہیں جہاں دو آدمی مل کر بیٹھے اور ضلع شروع ہو گیا۔ مثلاً کسی صاحب نے حقہ پیتے پیتے سرکایا اور یار لوگوں نے حقہ پر ضلع شروع کر دیا۔ اب حقہ سے متعلق جتنی چیزیں ہیں دماغ سے اترنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حقہ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں۔

اپنا کوئی ہمدم ہے ... [illegible] ... گل ... گر شگفت پندہ ہر دم تازہ

رہتا ہے۔ دل کی کلی کھلی رہتی ہے۔ گڑ گڑ ہی اور شکر شکر ہی ہے۔ اگر کوئی میرے منہ کو آئے تو منہ نائی میں دے دوں۔ ہمارا خدا ضامن ہے۔ وہ عالی دودماں ہے۔ چلمن سے لگے بیٹھے رہو۔ وہ منہ نیچا کئے ہوئے باہر سٹک گئے۔ جس کو پیا چاہے وہ سہاگن ہے۔ سانچ کو کیا آنچ ہے۔ سخن تازہ فرمائیے۔ جواب تلخ۔ سوختہ جاں۔ زنجیر پا۔ خشک و تر ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید۔ بے کلی سر پہ توا باندھ کر آؤ۔ دھواں لیگ۔ اللہ سے لو لگائے رہو۔ فقیر کا کمبل وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر ان الفاظ میں نہ تو کوئی ظرافت معلوم ہوتی ہے اور نہ اس قدر دم کہ ظرافت کا عنصر اور تفنن طبع کا ذریعہ بن سکیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر برمحل اور برموقع کسی گفتگو کے سلسلہ میں ضلع کے الفاظ بٹھا دئیے جائیں تو پھر اٹھائے نہیں اٹھتے بلکہ تلازمہ کی آڑ میں جو چاہو کہہ جاؤ بقول شخصے سات خون معاف ہیں۔

نمونے کے طور پر ہم آپ کو چند قصے سناتے ہیں، جن میں ضلع کا چٹخارہ دے کر ظرافت پیدا کی گئی ہے وہ آپ بھی سنئے اور لطف اٹھائیے۔

ایک صاحب کسی چرب زبان جوتے والے کی دکان پر پہنچے۔ دکاندار نے کہا کہ کیا حکم ہوتا ہے۔ خریدار نے کہا کہ ایک جوڑے کی ضرورت ہے۔ دکاندار نے کہا کہ حضور تو نری کا چاہتے ہونگے۔ خریدار نے کہا کہ مجھے وصلی کا درکار ہے۔ ذرا خوش رنگ اور مضبوط تلے کا ہو۔ دکاندار نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ پھر چند جوتوں کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ دیکھئے وہ جوتے جو آپ کے سامنے پڑے ہیں، خوش رنگ بھی ہیں مضبوط بھی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو بہت سستے پڑیں گے۔ خریدار نے قیمت دریافت کی تو کچھ زیادہ بتائی۔ اس پر خریدار نے کہا کہ آج کل تو آپ لوگ بے حساب کھانے لگے ہیں۔ اول تو صرف چار آنے جوتا کھاتے تھے مگر اب تو یہ کیفیت کہ آپ ایک ایک روپیہ جوتا کھاتے ہیں اور پھر بھی آپ کا پیٹ نہیں بھرتا۔

دکاندار نے کہا حضور! ہم اپنے جوتے زبردستی کسی کے سر تھوڑی مارتے ہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے۔ اگر پسند ہو تو یہ حاضر ہیں ورنہ جہاں آپ کو سستے پڑیں وہاں جاکر آپ بخوشی لے سکتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک اور گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔

ایک حجام کا لڑکا کسی بڑے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ایک روز خفا ہو کر اس نے منتظم دفتر پر جرمانہ ٹھوک دیا۔ منتظم صاحب جوش میں بھرے ہوئے ان کے گھر پہنچے اور کہا کہ سرکار نے تو الٹے استرے سے میرا سر مونڈھ دیا۔ افسر صاحب نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ منتظم صاحب نے کہا کہ اب اور کیا سوچوں، صاف صاف کہتا ہوں پوست کندہ کہتا ہوں اگر بال برابر بھی فرق ہو تو آپ میری ڈاڑھی مونچھیں حقے کے پانی سے مونڈھ دیجئے گا۔

اس طرح ایک عرب کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بارش کے موسم میں کسی ظریف کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ رستے میں ظریف نے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ جواب دیا کہ مطر۔ پوچھا کنیت؟ اس نے کہا کہ ابوالفیض پھر ظریف نے پوچھا کہ

تمہارے باپ کا کیا نام ہے اس نے جواب دیا کہ ابو الغیث پھر پوچھا کہ تمہاری ماں کا کیا نام ہے۔ اس نے جواب دیا کہ سحاب پوچھا کنیت۔ جواب دیا کہ ام البحر ظریف یہ سن کر رک گیا اور کہا کہ ذرا ٹھیر جا۔ میں ابھی ایک کشتی لے آتا ہوں۔ ورنہ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا۔ ظریف کے منہہ سے یہ فقرہ سن کر وہ ترنم سے پانی پانی ہوگیا
کسی ظریف کا قصہ مشہور ہے کہ وہ کسی درویش کے ہاں مہمان ٹھیرا۔ درویش کا مکان بہت پرانا تھا اور چھت میں سے چٹ چٹ کی آوازیں آتی تھیں۔ ظریف نے گھبرا کر پوچھا کہ خیر تو ہے، قبلہ یہ کیا ماجرا ہے؟ درویش نے کہا کہ ڈرو مت۔ میرے گھر کی کڑیاں ذکر و تسبیح کرتی رہتی ہیں ظریف نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ اسی ذکر و اذکار میں کہیں ان کو حالتِ وجد نہ پیدا ہو جائے اور وہ رقص کرکے سجدے میں نہ آپڑیں تو پھر اس وقت اس گنہگار کا کیا حشر ہوگا۔
ایک صاحب نے اپنے بچے کا ختنہ کیا اور احباب کو دعوت دی مکان چھوٹا تھا اس لئے دعوت کا انتظام ایک خواجہ سرا کے مکان میں کیا۔ استاد ذوق بھی مدعو تھے کھانا کھا کر صحن میں آ بیٹھے۔ اتنے میں میزبان پان لئے ہوئے آئے۔ حکیم آغا جان عیش نے کہا کہ آج تو دست مبارک سے گلوری کھلانا واجب ہے۔ ذوق نے کہا کہ ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ان کی ظرافت کے نکتے کو کہاں تک پایئے۔ ختنے کی ضیافت اور خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ ذوق نے کہا کہ ظرافت یہ ظرافت یہ کہ کھلایا بھی تو خصی پلاؤ
شاہ نصیر کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے لکھنو کے کسی معرکے کے مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا

خال پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی روح فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

کسی صاحب نے ایک شعر پر کہا کہ سبحان اللہ، استاد کیا مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے دوسرے شعر پر کہا کہ حضور یہ مکھی تو ٹھیک نہیں بیٹھی۔ غزل ختم ہونے کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جنھیں چاشنیٔ سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اٹھائیں گے ہاں جنھیں حسد کے صفرے کا زور ہے ان کا جی بھی متلائے گا اور ردیں بھی ہوں گی۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی تمدن" بھی عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائے گی۔
تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت ... روپے

ہماری زبان

جنم اس نے ہندوستاں میں لیا — اسی ملکِ جنت نشاں میں لیا
اسی کی ہواؤں میں پھولی پھلی — مگر تھی ازل سے بڑی منچلی

نگاہوں کی بے باک دل کی جواں
نزاکت کی پتلی لطافت کی کاں

امیروں کی آنکھوں کا تارا بنی — غریبوں کے دل کا سہارا بنی
رہی امتیازات سے بے نیاز — ہر اک دل ہر اک بزم میں سرفراز
ہوا اس کی شہرت کا پرچم بلند — نگاہوں میں سب کی ہوئی ارجمند
عرب سے فصاحت کا آیا خراج — اور اس میں لطافت کا تھا امتزاج

جو فارس سے آئی رباب اور چنگ
تو ہندی نے بھی نذر کی جلترنگ

تبسم پہ اس کے ستاروں کو ناز — ترنم پہ اس کے ہزاروں کو ناز
یہ پاکیزگی - یہ توازن - یہ شان — یہ اس کا سنورنا یہ اس کی اٹھان
ہر اک کی نگاہوں میں جچتی گئی — دلوں میں لہو بن کے رچتی گئی
اٹھی تھی جو اس محترم خاک سے — لگی چشمکیں کرنے افلاک سے
لئے رنگ قوس قزح سے کبھی — کبھی پہنچ کہکشاں تک گئی
ستاروں سے ان کی چمک چھین لی — قمر سے غمِ دل کی تسکین لی

فلک سے ملی وسعتِ بے کنار
ہوا حسن خورشید از خود نثار

ہر اک جلوہ پیشِ نظر ہے یہاں — ہر اک دلفریبی کا گھر ہے یہاں
ہر اک حسن اس بزم میں باریاب — ہر اک ذرہ اس بزم میں آفتاب

زمیں زاد ہے آسماں جاہ ہے
وطن کی ترقی کی شاہ راہ ہے

ہر اک علم کو اس کا ہے اعتراف — کہ اردو کا دامن ہے کانٹوں سے صاف
نہ الجھن نہ مشکل نہ بے مائیگی — یہ وسعت - یہ ایجاز یہ سادگی
نہ مشرق نہ مغرب کی ہے کوئی قید — کہ دونوں ہیں اس کی نگاہوں کے صید

زمانے کی ہر خوبصورت زباں اسے پیش کرتی ہے کچھ ارمغاں
ہر اک حلقہ میں سب کو آئی پسند ہر اک دور میں یہ رہی سربلند
ہر اک ملک میں اس کا سکہ رواں کہ دنیا سمجھتی ہے اردو زباں
میسر ہوا اس کو رنگ قبول
کہ ہیں اس میں ہر ایک گلشن کے پھول

ہمیں کیوں نہ اردو سے ہو اتنا پیار ساعت نے پایا اسے خوشگوار
رتن ناتھ سرشار اس کے اسیر پرستار اس کے انیسؔ و دبیرؔ
امیر اور حکمت کی ترجماں نسیم اور غالب کی پیاری زباں
ہمارے تمدن کی بانی ہے یہ
حقیقت میں ہندوستانی ہے یہ

یہی آشتی کی ہے آئینہ دار اسی پر ترقی کا ہے انحصار
اسے ہاتھ سے جانے دینگے نہ ہم اسے کوئی غم کھانے دینگے نہ ہم
بزرگوں کا پیارا نشاں ہے یہی
ہماری مقدس زباں ہے یہی

عبدالعزیز فطرت
(راولپنڈی)

گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میکشؔ مدیر سب رس کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے ۔
جناب میکشؔ حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے ۔
عالیجناب ڈاکٹر زورؔ صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے ۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔
میکشؔ کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ
کتاب کی تقسیم کئی حصوں پر ہے مثلاً حرکت و حیات، سکون و اضطراب
ماضی و حال، حال و قال، عقیدت و یقین، شباب و شعر وغیرہ بعض بعض
نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے ۔
"صدق" لکھنو بابت یکم جنوری ۱۹۳۹ء صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت
نفیس، کاغذ اعلیٰ قسم کا جلد پر سنہری نام
(قیمت عہ)

پرانی اور نئی باتیں

(تمدن اور شعر و ادب پر ایک نگاہ)

سنسار کی ریت اور دنیا کا دستور ہے کہ پرانی باتوں کو لوگ بھول جاتے ہیں اور وہی بھولی باتیں جب دہرائی جاتی ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بالکل نئی اور اچھوتی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ تاریخ اپنے کو ہمیشہ دہراتی رہتی ہے۔ لیکن ہم اس کے دہرانے کو محسوس نہیں کرتے۔ دنیا کے انقلابات اور واقعات کا حال، سینما کے پردے سے ملتا جلتا ہے، دیکھی ہوئی تصویریں تھوڑے الٹ پھیر کے ساتھ نمودار ہوتی رہتی ہیں، اور فریب خوردہ نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کوئی جدید فلم دکھایا جا رہا ہے۔ حوادث و انقلابات کے ان مناظر کو دیکھ کر، ایک مشہور فلسفی بے اختیار پکار اٹھا کہ :۔

"دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں۔!"

تمدن و تہذیب کو لئے ہوئے نقوش جب ابھرتے ہیں، تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ کسی جدید تہذیب کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔ دنیا پرانے ملبہ سے نئی عمارتیں بنا کر اکڑنے لگتی ہے۔ آج دنیا تہذیب و علم کی جن "جدید شاہراہوں" پر ناز کر رہی ہے، وہ سب گزشتہ تہذیبوں کے روندے ہوئے راستے ہیں۔ آج ہم محکمۂ آبرسانی کے حسنِ انتظام پر فخر کرتے ہیں، مگر آج سے کئی ہزار سال قبل، یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس نے بابل کے شہر میں ابلتے ہوئے فوارے اور ڈھلکتے ہوئے آبشار دیکھے تھے۔ جن لوگوں نے بیدر (دکن) کے قلعہ کو دیکھا ہے وہ اس زمانے کے "واٹر ورکس" کے حسن انتظام کا ضرور اعتراف کرینگے۔

سینما کو دورِ جدید کی ایجاد بتایا جاتا ہے مگر ڈریپر کی مشہور کتاب (Conflict between Religion & Science) "معرکۂ مذہب و سائنس" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں متحرک تصویروں کا رواج تھا، اور حسین و جمیل رقاصاؤں کے نغمہ و رقص کے ساتھ ساتھ، متحرک تصویریں ذوقِ نظارہ کو تسکین بخشتی تھیں۔ محکمۂ اکتشافاتِ اثری کی کوششوں کی بدولت، قدیم نوادر منظر عام پر آ کر، تہذیب و تمدن کی کڑیوں کو ملا رہے ہیں۔ اور دنیا کو اپنے حافظہ کی کمزوری کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اگر آپ کسی چیز کو بھول جاتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ چیز کبھی تھی ہی نہیں آپ کی بھول چوک سے "ہوئی بات"، "انہونی" نہیں ہو سکتی۔ عدم علم شئے سے وجود شئے کی نفی نہیں ہوتی۔

فکر و خیال کی یکسانی

تمدن و تہذیب اور علم و ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تمدن و تہذیب کی طرح علم و ادب کے نقوش بھی مٹتے اور ابھرتے رہتے ہیں۔ قدیم افکار نئے سانچوں میں ڈھلتے جاتے ہیں اور وہی نغمے جو فضا میں گونج چکے ہیں، مختلف ڈھولوں اور سروں میں اس انداز میں گائے جاتے ہیں، جیسے یہ پہلے پہل سامعہ نواز ہوئے ہیں۔ فکر و خیال کی جو شراب روم و یونان کے میکدوں میں کھینچی تھی، وہی شراب بھارت ورش کی بھٹیوں پر جوش کھاتی ہوئی نظر آتی ہے، ایک وہ آنچ کی البتہ کسر رہ گئی ہے، مگر اس سے

شراب کی اصلیت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ روم کی رزمیہ شاعری، فردوسی کے شاہنامے سے ٹکراتی ہے، اور ہومر اور ورجل کے نغموں کی گونج ایران میں سنائی دیتی ہے۔ اگر دنیا کے قدیم لٹریچر کا تاریخ واری تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت پہلے کہی ہوئی باتیں، کس کس انداز میں دہرائی گئی ہیں، اور "توارد" اپنے اندر کس قدر عمومیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان قوم و نسل کے امتیاز و اختلاف کے باوجود، فکر و تصور کے مرکز پر آکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ گرد و پیش اور ماحول سے متاثر ہو کر، محسوسات کے اظہار میں ضرور فرق ہوتا ہے، مگر فکر و خیال کی تان ایک ہی حقیقت پر آکر ٹوٹتی ہے۔ عرب کی لیلیٰ، ایران کی شیریں، ہندوستان کی شکنتلا اور مصر کی قلوپطرہ پر شاعروں اور ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اصطلاحات کے فرق کے سوا، بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں۔ ایک ہی نغمہ مختلف دھنوں میں زبانوں سے نکلا ہے، اور ایک ہی شراب مختلف پیمانوں میں ڈھلی ہے۔

پرانے چراغ ہماری موجودہ "اردو غزل" جو ہمارا سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔ اس کی داغ بیل بھی بہت پہلے پڑ چکی ہے۔ اور نہ صرف فکر و خیال بلکہ الفاظ اور ترکیب کے اعتبار سے بھی ہمارے پیش رو غزل گو شعرا، شعر و ادب کی وادیوں کو ہموار کر کے، فکر و خیال کے چراغ جلا گئے ہیں۔ ہم ان ہی چراغوں کی روشنی میں منزل سے گزر رہے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم کو اس اجالے کا پورے طور پر احساس نہیں ہوتا، مگر اجالا تو اپنی جگہ پر ہمیشہ قائم و ثابت ہے۔ ان ہی پرانے چراغوں کے آس پاس ہم بھی کچھ شمعیں روشن کر رہے ہیں، اور آنے والی نسلیں اپنے کو ہم سے زیادہ روشنی میں پائینگی۔

"ولی دکنی کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں، حالانکہ آج سے دو سو سال قبل اس نے کہا تھا"

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے
بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغ گل

خیال و فکر کی قدرت کے علاوہ، الفاظ کے استعمال سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ شعر ہمارے ہی دور کے کسی شاعر کا کہا ہوا ہے۔

میر محمد تقی میرؔ کے اس شعر کا جواب

اس نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے
اڑ گئے آئینہ کے توتے سے

مشکل ہی سے پیش کیا جا سکے گا۔ ہم کو آج اپنی نظموں پر بہت ناز ہے، مگر میرؔ کے اس شعر کے لطف کو کوئی نظم پھیکا نہیں کر سکتی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ روح القدس، شاعروں کی تائید کرتا ہے، تو میرؔ کا یہ شعر اس تائید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

خواجہ میر دردؔ کے اس شعر کو پڑھ کر

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں
گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

موجودہ زمانہ کی بیسیوں غزلوں کو اگر چاک کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔
مصحفی نے اب سے بہت پہلے جو کہا تھا:۔

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھیرے گا

بہت سے ہمارے شعروں کو اسی کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیے۔
داغ کا یہ شعر:۔

لذتِ سیر وگر چشم تماشا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

انقلابی شاعروں کے لئے آج بھی دلیلِ راہ بن سکتا ہے اور "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے بہت زیادہ قوت اس شعر میں پائی جاتی ہے۔
امیر مینائی کے اس شعر پر:۔

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے، خوشی کے جھولوں میں

آج بھی روح جھومنے لگتی ہے۔ اس دور کے بہترین مصور کا قلم باغ و بہار کو تو دکھا سکتا ہے۔ مگر بہار کو خوشی کے جھولوں میں کس طرح جھلائے گا۔!

میں نے غالب کے اشعار کو قصداً پیش نہیں کیا، اور وہ اس لئے کہ اس کے فکر وخیال کی روح تو ہماری شاعری کے پیکر میں دوڑ رہی ہے، اور کوئی شاعر محسوس یا غیر محسوس طور پر غالب کی شاعری کے تاثرات سے نہیں بچ سکتا۔

ماہر القادری

من کی دنیا حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عموماً اور جناب پروفیسر سروری صاحب کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔

ہر افسانہ رعنائی اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہونگے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہونگے صفحات [illegible] قیمت مجلد [illegible]

اردو شاعری

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ شاعری ہے کیا چیز۔ مختلف لوگوں نے مختلف طور پر شاعری کی تعریف
کی ہے۔ یہاں پر ان تمام تعریفوں کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ شاعری کی تعریف سادے
لفظوں میں یہ ہو سکتی ہے کہ نثر تو ذہنی اور جذباتی تصورات کے سیدھے سادے اظہار کا نام ہے اور
شاعری ایسے اظہار کا ایک طریقہ ہے جو کلام موزوں بن جاوے۔ مگر پھر بھی شاعری کا اصلی نقشہ اس تصویر
میں نہیں ملتا۔ یہ خوب سمجھ لیجئے کہ شاعری کا میدانِ عمل وہی ہے جو ایک نثار کا ہے رزم ہو یا بزم، جذبۂ قومیت ہو یا
جوشِ مذہبی، ذہنی تخیلات ہوں یا مشاہداتِ کائنات ہر چیز میں جس حد تک نثر کا دخل ہے اسی حد تک شاعری کا بھی ہے
سوال یہ ہے کہ پھر اظہار کے یہ دو مختلف انداز و بیان کیوں وجود میں آئے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ جہاں
صنفِ نثر موثر نہ ہو وہاں دوسری صنف یعنی شاعری سے کام لیا جائے۔ دیکھئے شیکسپیر، ہومر، ورجل اور گوئٹے
کے ہم عصر صدہا نثار تھے مگر ان کی قوم کے تمدن میں جس انقلاب کی ضرورت تھی وہ ان سے نہ ہو سکا۔ اس کام
کو ان شعراء نے انجام دیا۔ انصاف اور رحم کے نقشے یا انسانی کیریکٹر اور تاثرات کے خاکے جس طرح شیکسپیر نے
اپنے ڈراموں میں کھینچے ہیں یا قومی جذبے کے متعلق اسکاٹ نے جو نظمیں لکھی ہیں، یا قدرتی مناظر کا ورڈسورتھ
نے جو نقشہ کھینچا ہے، ان کا بیان ایک نثار کتنی ہی خوش اسلوبی سے نثر میں کیوں نہ کرے ان شعراء کی طرح
اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ جس طرح موسیقی شعر کی خوبیوں پر سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے اسی طرح نثر شعر کے سانچے
میں ڈھل کر خیالات کے اثرات کو دوبالا کر دیتی ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ نظم و نثر کا یہ فرق، قافیہ اور ردیف کی وجہ سے ہوتا ہے خدا جانے کتنے اثرات کا مجموعہ ہے
جن سے مل کر شاعری نثر سے بالکل جدا اور اس سے بہت بلند تر اور ایک اچھوتی چیز بن جاتی ہے۔ اس کے
معنی یہ ہوئے کہ شاعری ایک ایسی قوت ہے جس کا اظہار جذبات کے ہر شعبے پر اثر پذیر ہے خواہ وہ ارتقائے
ذہنی ہو خواہ مصوری جذباتِ جمالیت خواہ جوشِ ملی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان شعبوں پر شاعری کا نثر کے مقابلے
میں کئی گنا زیادہ اثر ہے۔

مذکورۂ بالا معیار کی روشنی میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم شاعری کے اس مفہوم کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ آیا
ہم اردو شاعری سے یہ کام لے رہے ہیں یا نہیں۔ اور آیا ہماری شاعری ہمارے انسانی اور قومی ارتقاء کی
ترجمان ہے یا نہیں۔ گزشتہ صدی کے دورِ شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ہم نے
شاعری کے اعجاز سے کہاں تک کام لیا ہے۔ تعمیری جذبے سے بے نیاز، روح پرور نغموں سے خالی، مفروضی
نقطۂ نظر سے ناکارہ، اور موضوعی حیثیت سے بھی مصنوعی اور دقیانوسی۔ یہ ہے پرانی داستان ہماری شاعری کی
بدقسمتی سے ہمارے شعراء کا بیشتر حصہ صرف تغزل کی طرف رہا جو بجز اظہارِ حذبات کا مرکز بنا رہا۔

اس میں ایک طرف تو سوقیت غالب رہی اور دوسرے جانب جو مجسمہ اظہار تغزل کو تیار کیا گیا وہ ایک عجیب الخلقت ابوالہول سے کم نہیں یعنی نہ وہ مرد ہے نہ عورت نہ فی الحقیقت کوئی ایسی چیز ہے جو صحیح تصویر بن سکے۔ اس کے سر کے بال کمر تک لمبے، مانگ سیندور بھری ہوئی جس کو خط آرہ کشی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ موباف سرخ و زرد کھنگھور، پیشانی پر افشاں، رخسار پر خال گویا پھول کی پتی پر مگس یا ایمان کے خرمن میں کفر کا ایک دانہ، پاؤں میں پازیب و خلخال کا جنجال جن کی جھنکار محشر خیز، ہاتھوں میں مہندی گویا عاشق کے خون کا رنگ، لب و دندان پر مسی کی دھڑی اور پاؤں کی سرخی قدیم سنگار کے تصور کو بھی شرماتی ہیں۔ انگیا۔ چولی۔ محرم۔ نقاب۔ سیب ذقن۔ انار پستان یہ تو نسوانی علامات ہیں مگر ساتھ ہی معشوق سبزۂ خط سے ریش دار بھی ہوتا ہے۔ ظلم و جور۔ اعتبار کے ساتھ سر بازار آوارہ گردی، تیغ آزمائی تبر افگنی، قتل و غارت گری وغیرہ اس کی صنف قوی سے ہونے کا ثبوت ہے۔ حلیہ اس معشوق عجیب کا یہ ہے کہ صراحی کی طرح لمبی گردن، لکھنو کی ککڑیوں سے نازک کلائیاں، کمر بالکل معدوم یا بال کی طرح باریک، لب کوزۂ قند و نبات، دنداں سلک مروارید ناک شمع کافوری، آنکھیں نرگس بیمار، پلکیں تیر و نشتر، بھویں شمشیر و خنجر، رخسار آفتاب جبین ماہتاب، زلف بل کھائی ہوئی ناگن، گیسو مار سیاہ، ہونٹ خط سبزہ زار غرض کہ اپنائی شاعری کے اس خیالی معشوق کو مثالی جامہ پہنا کر کسی بزم مشاعرہ میں پیش کر دیا جائے تو ہمارے عشق زدہ کمزور دل شعراء چیخ مار کر بیہوش ہو جائیں اور جری و بہادر لوگ زندہ دل ہنستے ہنستے لوٹ جائیں، اور معشوق صاحب کی وہ گت بنائیں کہ پھر وہ اپنے عاشق شعراء کے خواب و خیال میں بھی آنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ دنیا اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ آج ہر چیز کے لئے عین الیقین کی ضرورت ہے مگر ہمارے شعراء اپنے حسن و عشق کے تخیل میں واقعیت اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ تمام تشبیہات و تلمیحات اور حسن و عشق کے فرضی لوازمات ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے ماحول اور محسوسات کو مطلقاً تعلق نہیں۔ اگر کہیں مناظر کی جھلک بھی نظر آتی ہے تو ایسی جن سے ہماری نگاہیں آج تک محروم ہیں اور ناآشنا۔ غیر ملکی مناظر کے لئے جن سے ہمیں مسرت حاصل نہیں ہو سکتی اپنے ملکی و ماحولی مناظر کی طرف اب تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا ۔ اردو غزل میں اس کی ہمیشہ سے اجازت دی گئی ہے کہ ایک ہی غزل میں متفرق خیالات ہوں لیکن اب یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے کہ ایک ہی غزل میں متضاد خیالات بھرے جاتے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے جو ہماری غزلیں غیر فطری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک ہی سانس میں دو متضاد جذبے کیسے ہو سکتے ہیں۔ میرا مطلب تغزل کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہے اور اصلی تغزل انسان کے صحیح جذبات کا صحیح آئینہ ہوتا ہے اور جہاں ... کی ... استقامت اور استقلال

پر زلزلہ لانا دشوار ہے لیکن ہمارے شعراء افراط تفریط کے شکار ہوئے اور محض تغزل اور وہ بھی غیر فطری تغزل کو انہوں نے اپنا نصب العین بنا رکھا اور دوسرے اصنافِ سخن سے بالکل غافل رہے۔

ابتدا میں تو کچھ توجہ قصیدوں اور مثنویوں کی طرف رہی لیکن ان اصناف سے جو اصلی کام لینا چاہیے تھا وہ نہیں لیا گیا۔ اور نظموں کی طرف تو کسی نے خیال ہی نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو مناظر قدرت کی تصویر کشی سے متفید ہوئے نہ جذباتِ ملی و ملکی قوم میں یہ پیدا کر سکے۔ میں جانتا ہوں کہ زبان کے ابتدائی دور میں اس کی صفائی و روانی پر توجہ غالب رہتی ہے۔ اسی طرح ہماری زبان میں بھی ہوا۔ گر تخیل کا معیار بلند نہ ہوا۔ لیکن اس دور کے بعد دنیائے شاعری کے افق پر ایک روشن ستارہ نجم الدولہ دبیر الملک غالب دہلوی کی صورت میں طلوع ہوا جس نے اپنی شاعری کی بنیاد فلسفۂ حیات اور رموز زندگی کی مستحکم زمین پر قائم کی۔ خیالات کی بلندی جذبات کی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ اس نے ان حقائق کی تصویر کھینچی جو انسانیت کا مرکز نگاہ بننے کے قابل تھے دو اور شعراء انیس و دبیر اصلی معنوں میں شاعر کہلانے کے مستحق ہو سکتے تھے مگر افسوس کہ انہوں نے اپنی فکر طبع کو محدود رکھا۔ منظر کشی، واقعہ نگاری اور جذبات کی تصویریں اتارنے میں یہ دونوں شعراء نے داد سخن دی لیکن ان کے یہاں بھی فطرت سے وہ ہم آہنگی اور قرب عنقا ہے جو ورڈسورتھ (Wordsworth) شیلی (Shelley) یا بائرن (Byron) کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

غالب کی روش پر چلنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوئی لیکن وہ ایک ایسی شاہراہ پیدا کر گئے تھے جو معدوم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس ترقی یافتہ دور میں سنجیدہ طبقے نے اس شاہ راہ پر گامزنی کی کوشش فرمائی اور اس نے اب خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس طبقے کے شعراء نے جذبات، حسن و عشق اور فلسفۂ حیات کی حقیقت آگیں تصویر دکھلانے میں جو سعی فرمائی اس نے تغزل میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے ان میں سے خاص طور پر فانی۔ جگر اور حسرت ہیں۔ بے معنی تغزل سے ہٹانے میں پہلی سعی جس شاعر کی وہ مولانا حالی ہیں۔ قومی ادبار کی تصویر ان کے سامنے تھی قومی درد ان میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ وہ ابل پڑا اور اس نے ان سے مسدس ایسی نایاب چیز لکھائی۔ نیز اسی طرح کی اور نظمیں جن کو پڑھ کر قومی جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور عمل کا احساس ہوتا ہے پھر چکبست نے ایسے دلچسپ پیرایے میں قومی ترانے گائے کہ اس نے قومیت ملکیت، اور وطنیت کا جوشِ جنوں پیدا کر دیا۔ فلسفۂ زندگی کو طنزیات کے تحت میں لاکر بیان کرنے میں اکبر الہ آبادی نے جو کمال دکھایا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن ان کا مسلک " زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز " نہ تھا اس لئے قوم کی ذہنی ارتقا میں ان کی شاعری ایک سنگِ گراں ثابت ہوئی۔

حالی کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ آسمانِ شاعری پر علامہ اقبال نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے ایک ایسا پیغام ہم کو پہنچایا جس نے ہماری نظر حقیقتِ انسانی پر پڑی اور ہم سب

ایک خاص جذبے سے متاثر ہو گئے۔ اور اب شعراء کا رجحان تکمیل تغزل کی طرف ہوا اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی۔ اخلاقی۔ قومی۔ سیاسی نظموں اور نیچرل شاعری کی طرف خاص طور سے توجہ بڑھی جس کا ثبوت ادبی جرائد متواتر پیش کر رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر حضرت جوش ملیح آبادی۔ پنڈت انند نرائن ملا۔ ہادی مچھلی شہری۔ حفیظ جالندھری۔ احسان دانش۔ اختر شیرانی وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان حالات سے امید ہوتی ہے کہ اردو شاعری ایک ہمہ گیر اور مکمل شاعری کی حیثیت حاصل کرے گی۔

شاعروں اور شاعری کے بڑے بڑے کارنامے صفحات تاریخ پر موجود ہیں۔ دنیا کے بہت سے عظیم انقلاب شاعری کے رہین منت ہیں اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ ابھی ہمارا ذہن شعریت سے خالی نہیں ہے اور ہم اس صنفِ سخن سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں۔ آج تو ان ممالک میں جہاں صنعتی اور حرفتی ارتقا حادی ہو گئے ہیں، وہاں شعراء رفتہ رفتہ عنقا ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت یورپ میں یہ صورت ہے کہ بلند پایہ ادیب۔ محقق۔ سیاست داں اور صحیفہ نگار تو وافر تعداد میں موجود ہیں مگر شکسپیر۔ ملٹن۔ ورجل۔ ہومر اور ڈانٹے نیا تمدن نہیں پیدا کر سکا۔ اس لئے ہمارے شعراء کو اس حقیقت سے آشنا ہو جانا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت کو غنیمت سمجھیں اور حقیقی شاعری کا جذبہ ملک میں پیدا کریں۔ جوش جوانی اور عیش پرستی کا ذکر اس قوم کے لئے زیبا ہے جس کو عیش و راحت کی زندگی میسر ہو۔ لیکن جو قوم ایسی ہو کہ اس کے بیشتر افراد کو ایک وقت شکم سیری میسر نہیں اور مصائب اور آفات کے ہجوم سے محزون و مغموم ہیں اس کے شعراء کو یہ کیونکر زیب دے سکتا ہے، کہ خیالی تعشق اور رندی اور بدمستی کے راگ الاپتے رہیں۔

ملک و ملت زبانِ حال سے فریادی ہیں کہ ہم کو زندگی کے اصلی مقصد کی تلاش ہے۔ اقتصادی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، اور تمدنی و معاشرتی آزادی کی ضرورت ہے لہذا ان امور کے حصول کے لئے تمام قومی طبقات کے ساتھ طبقۂ شعراء کو بھی میدانِ جد و جہد میں اگر اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔

نجم الدین احمد جعفری
(الہ آباد)

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست اس کتاب کو مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اصل میں ایک تحقیقی مقالہ ہے جس کو مولوی علی محسن صاحب نے اپنے ام اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کا مطالعہ اہل اردو کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

تعداد صفحات (۲۰۴) قیمت عالی

اظہارِ مسرت

دکن کی شاہزادیوں کی خیر و عافیت کے ساتھ واپسی پر دکن کی مختلف انجمنوں کی طرف سے جو مبارکباد کا جلسہ بتاریخ ۱۴ دسمبر ۱۹۳۹ء منعقد ہوا تھا اس میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے بھی اس کی صدرِ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ نے پھول پہنائے اور اس شعبہ کی اراکین نے جو نظمیں پڑھیں وہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

بہارِ تازہ ز مغرب بہ ایں دیار آمد
نبیرۂ شہہ عثمانِ کامگار آمد

مفخّمے کہ فخامت ز روئے او پیداست
بہ بر گرفتہ چساں تیشہ شاہوار آمد

زما پیام رساند کسے بہ شاہِ دکن
برار بہ تازہ بہ شہزادۂ برار آمد

۲

تعالیٰ اللہ! دعائیں اپنی یہ تاثیر لائی ہیں
نہ تھی تشویش کم بھی جنگِ موجودہ تباہی کی
مساجد، خانقاہوں، شاہراہوں اور مکانوں سے
مقامِ جنگ سے جب تار وحشتناک آتے تھے
کسی اخبار میں گر "واپسی" عنوان نظر آتا
کبھی جب نشرگہ سے تازہ کچھ اعلان ہوتا تھا
دعائیں مانگنے کو اجتماعِ عام ہوتا تھا
نکلنے بھی نہ پاتی خاکِ سجدہ تک جبینوں سے
امید و بیم کی یہ کشمکش ہر دم ستاتی تھی
سفینہ اپنی تقدیروں کا گردابِ بلا میں تھا
بفضلِ رحمتِ پروردگار آخر وہ دن آیا
خدا کا شکر ہے جاتی رہیں بےتابیاں اپنی
ریاضِ آصفی میں شادمانی کے ثمر آئے
کرم پویاں پویاں مفخّم در کنار آمد

بخیر و عافیت شہزادیاں یورپ سے آئی ہیں
ہمیں تو فکر رہتی تھی فقط ارکانِ شاہی کی
نکلتی تھی دعائے واپسی لاکھوں زبانوں سے
ستارے آسمانِ سلطنت کے جھلملاتے تھے
گماں فی الفور اپنا شاہزادوں کی طرف جاتا
دلوں میں جاں نثاروں کے بپا طوفان ہوتا تھا
ہر اک فرطِ خضوع سے لرزہ براندام ہوتا تھا
کہ اٹھ کر پوچھتے تھے کیفیت اخبار بینوں سے
نہ دل کو چین ملتا تھا، نہ شب کو نیند آتی تھی
قبیلۂ آصفِ سابع کا اک جوکھم فضا میں تھا
رعایائے دکن نے "مژدۂ آمد" ابھی سن پایا
ہجومِ شوق سے لبریز ہے اب داستاں اپنی
بخیر و عافیت سرکار کے لختِ جگر آئے
درِ شہوار با شہزادۂ ملکِ برار آمد

جلالِ ترکمانی از معظم جاہ پیدا شد
فرِ نیلوفری بشکر برنگِ تو ہویدا شد

بشیر النساء بیگم بشیر

اظہارِ جذبات

تھیں نظر سے جو نہاں اپنی شاہزادیاں
منہ پہ تھیں ہر ایک کے اڑ رہی ہوائیاں
دل تھے صرفِ رنج و غم ہاتھ سوئے آسماں
تھی دعا ہر ایک کی اے خدائے انس و جاں

— ۲ —

خیریت سے آئیں وہ خیریت سے آئیں وہ
دل کی اجڑی بستیاں ، آکے پھر بسائیں وہ
اپنے دم سے ملک کو گلستاں بنائیں وہ
کیف اور سرور کی ندیاں بہائیں وہ

— ۳ —

بدلیاں دعاؤں کی جب فلک پہ چھا گئیں
جوش میں رحیم کی رحمتیں بھی آ گئیں
کام حق کی بخششیں اس طرح بنا گئیں
شکر رب العالمین شکر رب العالمین

— ۴ —

پھر دکن کی سرزمیں نازشِ ارم بنی
خیریت سے آئے وہ لو تھی جن کی لگ رہی
لب پہ جن کا نام تھا دل میں جن کی یاد تھی
جو دکن کے ناز ہیں شان اپنی جنس کی

— ۵ —

برکتِ ورود نے کر دیا ہے غم غلط
ہر دکن کے فرد سے یادِ درد و ہم غلط
لوحِ دل سے ہو گئے معنیٔ الم غلط
گردشِ جہان کی فکرِ بیش و کم غلط

— ۶ —

پھر وہی چہل پہل پھر وہی ہے چہچہے
پھر وہی ہنسی خوشی پھر وہی ہیں قہقہے
جوش یہ سرور کا کم نہ ہو خدا کرے
دورِ انبساط یہ
یا خدا مدام رہے

لطیف النساء بیگم

ریلوں کی اردو

ہماری بدترین کمزوریوں میں ہماری غفلت، لاپروائی، پست ذہنیت اور احساسِ کمتری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غیروں کے ہاتھوں اپنی تہذیب اور زبان کی بربادی گوارا کر رہے ہیں۔ اس بربادی کے اتنے ثبوت دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ تباہی کی یہ نشانیاں دو آبے میں نظر آ رہی ہیں اور اس تباہ کاری کو وہی اہلِ زبان گوارا کر رہے ہیں جن کی زبان شستہ اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ مجھے بھی علم ہے کہ ریلوں پر ہمارا زور نہیں، آئینی اعتبار سے ریلوے کے کاروبار میں ہمارا عمل دخل نہیں، مگر یہ بھی جب جانتا ہوں کہ ریلوے بورڈوں میں جتنے ہندوستانی افراد ہیں (چاہے وہ حکومت کے نمائندہ ہوں یا تجارتی اداروں کی طرف سے نمائندگی کر رہے ہوں) اگر وہ متحدہ طور پر ہندوستانی زبانوں کی تحقیر کی مخالفت کریں تو اس خرابی کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے۔

مجھے خیال تھا کہ کانگریسی راج قایم ہونے کے بعد تحریری زبان سنبھل جائے گی، سرکاری محکمے زبان کی فصاحت اور پاکیزگی نہیں تو کم از کم صحت کا خیال ضرور کریں گے مگر نہیں وہی پرانا ڈھرا قایم تھا، پرانی بدتمیزیاں موجود تھیں، پرانی زبان گشتی جاری تھی بعض گاڑیوں کے نئے نئے ڈبوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، ہر چیز کی ظاہرہ حالت سے پتہ چلتا تھا کہ ابھی ابھی یہ ڈبے بنے ہیں، ہر چیز نئی تھی، جابجا ضروری اعلانوں کی تحریریں بھی نئی تھیں صرف —— زبان پرانی تھی! وہی زبان جو صاحب بہادر استعمال کرتے ہیں، چنانچہ ایک اعلان تھا کہ۔

"مسافروں کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے کہ جب گاڑی چلتی رہے تب گاڑی کے دروازے کو نہ کھول رکھیں یا اپنے جسم کے کسی حصے کو کھڑکی یا دروازے کے باہر نہ رکھیں کیونکہ یہ دونوں عادتیں خطرناک ہیں"

خط کشیدہ لفظوں پر غور کیجیے۔ اس سے زیادہ مہمل عبارت اور کیا ہو سکے گی؟ وہ بھی اس ریلوے کی جو اردو اور ہندی کے گہواروں میں ڈولتی ہے، اردو کے سرچشموں سے سیراب ہو رہی ہے، دوآبے کی دولت سے مالا مال ہو رہی ہے اور بیچ بیچ دہلی کی زبان کی ٹکسال لال قلعہ میں سے گذرتی ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو یا معلوم بھی رہا ہو تو بھول گئے ہوں کہ دہلی سے غازی آباد کو جو ریل جاتی ہے وہ شاہانِ دہلی کی قیام گاہ، اکبر کے بنائے ہوئے قلعے اور بہادر شاہ ظفر کی آماج گاہ میں سے گزرتی ہوئی جاتی ہے اور اس ریل کی تعمیر کے وقت محض سہولت اور —— کفایت کی خاطر لال قلعے کی دیواروں کو توڑ تاڑ کر برابر کیا گیا اور رہتی دنیا کے سامنے اپنی بربریت اور غارت پسندی کا ثبوت دیا گیا! غرض، لال قلعہ ٹوٹا، اس میں سے ریل گزری، انگریزی مطلق العنانی کا بھی خاتمہ ہوا مگر ریلوں کی زبان نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی! کیا کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ اس قسم کے مہمل جملے کا کہ

"اپنے جسم کے کسی حصے کو باہر نہ رکھیں!"

مطلب ہے؟ اس قسم کے بے معنی اور لغو اعلانوں کا کیا فائدہ؟ کیا اردو کے شیدائی، ہندی کے رسیا، ہندوستانی کے حامی

سب رس

باقی نہیں کہ ریلوے کی زبان کشی کے خلاف جہاد کریں اور ان کے دماغ کو ٹھکانے لگائیں؟؟ اگر خود حکومت کو صحیح زبان کا
احساس نہیں تو ریلوے کے ممبر، ریلوے بورڈوں کے ارکان، مجلسِ مقننہ کے اردو نواز اصحاب کیا کر رہے ہیں؟
یہ ایک ہی اعلان نہیں جسے نظر انداز کیا جاتا۔ اس قسم کے ہزاروں اعلان انگریزی ٹپہ خانوں، تار گھروں،
سرکاری دفتروں اور ریل کے ڈبوں میں نظر آتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اردو کی ستیاناسی اسی صوبے میں کی جائے جو اردو کا وطن
ہو اور ـــــ اہل زبان خاموش بیٹھے رہیں؟! الہ آباد میں "ہندوستانی اکیڈمی" اعظم گڑھ میں "دار المصنفین" قرول باغ
میں "اردو اکاڈمی" ہو،

"ہندی پرچارنی سبھا" کا مسکن بنارس ہو اور انجمن ترقی اردو کا صدر مرکز دہلی میں ہو، پھر بھی اس صوبے میں زبان کی
توہین آمیز اور حقارت انگیز عبارتیں گوارا کی جائیں!؟۔ ایک طرف تو سرکاری اور قومی یونیورسٹیوں اور کالجوں، مدرسوں
اور پاٹھ شالاؤں، مکتبوں اور درس گاہوں میں صحیح زبان سکھائی جا رہی ہے، اردو کے استادوں اور اردو کے پروفیسروں پر
ملک و قوم کا ہزارہا روپیہ صرف ہو رہا ہے اور دوسری طرف سرکار کے محکموں میں، سرکاری ریلوں میں اردو کی ناقدری ہی
نہیں اردو کا ستیاناس اور غارتگری ہو رہی ہے اور ہم آپ خاموش بیٹھے فلسفہ بگھار رہے ہیں!!

جعفر حسن

نغمۂ اردو

اظہارِ مطالب کی جو تو جان ہے اردو
ہر ایک ترا دل سے ثنا خوان ہے اردو

جس بزم میں کرتی نہیں تو نغمہ سرائی
کچھ شک نہیں وہ بزم بھی سنسان ہے اردو

رکتی ہی ترقی تری؟ ہوں لاکھ مخالف
دشمن بھی ترا تجھ سے پریشان ہے اردو

کب شستہ و صاف ایسی کوئی اور زبان ہے
کہنے میں سمجھنے میں بھی آسان ہے اردو

کیا تجھ پہ کوئی اور زباں کی ہو حکومت
تو مشترکہ قوم کی پہچان ہے اردو

بن جائے گی کچھ روز میں شیرازۂ اقوام
وسعت میں تری اس کا بھی امکان ہے اردو

سرمایہ نہ کیوں علم و ادب کا ہو۔ کہ تیرا
سلطانِ علوم آج نگہبان ہے اردو

اک روز تو ہو جائے زباں سارے جہاں کی
بس دل میں تمنّا ہے یہی [illegible] اردو

میر حسن علیخان تمکین

اُردو کے خاموش خدمت گذار

موجودہ زمانے میں "روشناسِ خلق" وہی ہستیاں ہیں جن کو سیاست یا کسی دوسری معرکتہ الآرا تحریک سے قریبی تعلق ہو شعراء اور بعض سربرآوردہ مصنفین بھی رسالوں، تذکروں اور سوانح کے طفیل سے اپنی زندگی اور کام کو عوام تک پہنچا دیتے ہیں اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے تذکروں کو بھی شوق اور تعظیم سے پڑھا جاتا ہے۔ اور ان کی زندگی لوگوں کے لئے شمعِ ہدایت ثابت ہوتی رہی ہے۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ ان قابلِ قدر ہستیوں کا بھول کر بھی خیال نہیں کرتا جن کو قوموں کی تعمیر میں بہت بڑا دخل ہے۔ جن کی مخلصانہ کوشش ہماری نسلوں کے ذوقِ عمل و تحصیلِ علم کو اکساتی ہیں۔ اور ایسے افرادِ قوم کی ذہنی نشوونما ان کے ذمہ ہوتی ہے جن سے قوموں کی قسمتیں وابستہ ہوتی ہیں دنیا کا کوئی شخص استاد کی گرانمایہ خدمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے ایسے سوتے ابلتے ہیں جن سے انسانیت کی کھیتی ہری ہوتی ہے۔ یہی وہ انسان نما خضر ہیں جو ہزاروں بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لگاتے ہیں اور نئی نئی شاہراہیں کھولتے ہیں افسوس ہے کہ یہی لوگ زمانے کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ محمد علی جناح اور گاندھی جی کے استاد کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے اور انھوں نے ان کی زندگی اور طبیعت و اخلاق کے بنانے میں کیا حصہ لیا تھا؟ ہاں ایکٹرسوں اور ایکٹروں کی زندگیوں کے ایک چھوڑ کئی ایڈیشن نکل سکتے ہیں۔ ان کی حیات کے ہر دور سے لوگ واقف رہیں گے۔ کب فلاں نے فلاں سے ملاقات کی۔ فلاں کی زندگی میں تبدیلی کب پیدا ہوئی۔ غرض کہ ممکنہ معلومات سے ہر شخص واقف ہونا چاہتا ہے۔

میتھو آرنلڈ نے سچے ہیرو کے لقب کو صرف استاد کے لئے مختص قرار دیا ہے اس کے نزدیک اساتذہ صرف اکیلے ہی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں رہتے بلکہ ایک کاروان کی بھی رہنمائی کرتے ہیں اور تاوقتیکہ ان سب اہلِ کاروان کو منزلِ مقصود پر پہنچا نہیں دیتے ان کی محنت ٹھکانے نہیں لگتی۔ اساتذۂ اُردو جس گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں وہ خود ہماری پستی اور ناقدر شناسی کی دلیل ہے۔ ان اساتذہ کی صحیح عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ ان ہی کی کوششوں اور تربیت سے ہر قسم کی علمی و ادبی صلاحیت کے جوہر کھلتے ہیں۔ استاد ہی کی صحیح تربیت کسی کو شاعر، کسی کو افسانہ نگار اور کسی کو خادمِ قوم بننے کا موقع دیتی ہے۔ اس مضمون کے شائع کرنے سے یہ مقصد نہیں کہ صرف اساتذۂ اُردو ہی کے سر ساری عظمتوں کا سہرا ہے بلکہ اس کا یہ مقصد ہے کہ ان خاموش خدمت گذاروں کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جائے یہ میری پہلی کوشش ہے اگر اس میں مجھے کامیابی ہو جائے، اور اُردو کے موجودہ استادوں سے میں اُردو دنیا کو متعارف کرا سکا تو میں کوشش کروں گا کہ ایسے اصحاب کے حالات بھی جمع کروں جو اُردو کی تعلیم دیتے ہوئے اپنی زندگیاں ختم کر چکے ہیں

اُردو زبان کی مقبولیت اور وسعت روز افزوں ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اس زبان کو بہت بڑی سرپرستی حاصل ہو گئی ہے اس جامعہ میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اور وہ تمام مغربی علوم و فنون جو غیر زبانوں میں مقید تھے اب آزاد ہیں اس لئے اُردو کے استاد بھی اِس دور میں پہلے سے زیادہ توجہ، روشناسی اور قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔

اُردو کے اِن بہی خواہوں اور سرپرستوں کی گنتی انگلیوں پر کی جا سکتی ہے اور ان میں سے اکثر کسی نہ کسی ادارۂ

درس و تدریس سے متعلق ہیں میں نے اسے اپنا سب سے مقدس اور پہلا فریضہ سمجھا کہ ان قابل احترام ہستیوں سے قارئین سب رس کو متعارف کراؤں۔ اس خیال کا ذکر میں نے محترمی و استادی ڈاکٹر زور صاحب سے کیا۔ جنھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور ممکنہ امداد کے بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔ میں نے ہندستان کی مختلف جامعات کے اردو کے اساتذہ صاحبان سے خط و کتابت شروع کردی اور ان کے حالاتِ زندگی، کام اور دیگر معلومات کا ایک تفصیلی خاکہ مانگا۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب نے ہر خط پر میری استدعا پر توجہ کرنے کے لئے شخصی اثر اور تعلق سے کام لیتے ہوئے سفارش کی لیکن اکثر اساتذہ صاحبان نے روایتی "عدم توجہی" اور "لاجوابی" سے کام لیا۔ بعض نے نہایت ہی مختصر حالاتِ زندگی کے روانہ کرنے پر اکتفا کی۔ بعض نے تصویر بھیجانے سے معذوری ظاہر کی۔ اور اکثروں نے "میرے حالات زندگی کچھ قابل ذکر نہیں" ۔ "ایک زمانے سے تصویر نہیں کھنچوائی اس لئے معذور ہوں" "میں ایک خاموش کارکن ہوں" لکھ کر مجھے مایوس کردیا۔ دوبارہ اس سلسلے میں یاددہانی کی گئی تو کچھ زیادہ توجہ سے کام لیا گیا۔ اور اس کے لئے میں سب سے پہلے ڈاکٹر زور کا اور پھر جملہ اساتذہ صاحبین کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ دوسروں کے نزدیک "خاموش کارگزاری" اور "عزلت گزینی" چاہے جس نظر سے بھی دیکھی جائے بحیثیت اردو ادب کے ایک مخلص طالب علم اور سوانح نگار کے میں اس کو ایک ادبی "رجعت پسندی" سے تعبیر کروں گا۔ اس مضمون میں اگر یہ مکمل ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ایسی ایسی گمنام ہستیاں آپ کے پیش نظر رہیں گی جن کی زندگی کا ایک ایک باب ہدایت اور رہنمائی کا دفتر لئے ہوئے ہے۔

ان بہی خواہانِ اردو کی زندگیاں جن منزلوں سے گزریں، جو جو مراحل ان مستقل مزاج اصحاب کو برداشت کرنے پڑے، اور جس کس مپرسی اور عزلت گزینی کی حالت میں انھوں نے اپنی زبان اور ادب کی خدمت کی ان سب کو نظروں میں رکھتے ہوئے کون ہے جو خاموش خدمت گذاری اور مستقل مزاجی کا درس نہیں لے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مضمون جملہ اساتذہ صاحبانِ اردو کی زندگیوں پر روشنی نہ ڈال سکے گا۔ بہرحال اسے ایک ابتدائی کوشش سمجھئے۔ موقع ملے تو ایک مستقل تذکرہ اس موضوع پر ترتیب دیا جاسکے گا۔ اس وقت جن اصحاب کے حالات مہیا ہوسکے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ایل ٹی۔ (لکھنو)

۲۔ سید ضامن علی صاحب ایم اے (الہ آباد)

۳۔ ڈاکٹر ایم حفیظ سید صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ ایل ٹی (الہ آباد)

۴۔ مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم۔ اے (اسمعیل کالج جوگیشوری۔ بمبئی)

۵۔ مولنا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے۔ مولوی فاضل۔ ادیب فاضل۔ دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)

۶۔ پروفیسر حامد حسن صاحب قادری (آگرہ یونیورسٹی)

۷۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ال ال بی (کلیہ فنون جامعہ عثمانیہ)

۸۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے (کلیہ بلدہ۔ جامعہ عثمانیہ)

(۱) مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب۔ ایم اے۔ ایل ٹی۔ (لکھنو یونیورسٹی)

آپ نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں اس میں مول نہ تھا تو پریشان حالی بھی نہ تھی۔ قسمت نے آپ کو ایسے زمانے میں پیدا کیا

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ
۱۵ اگست ۳۹ء

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی
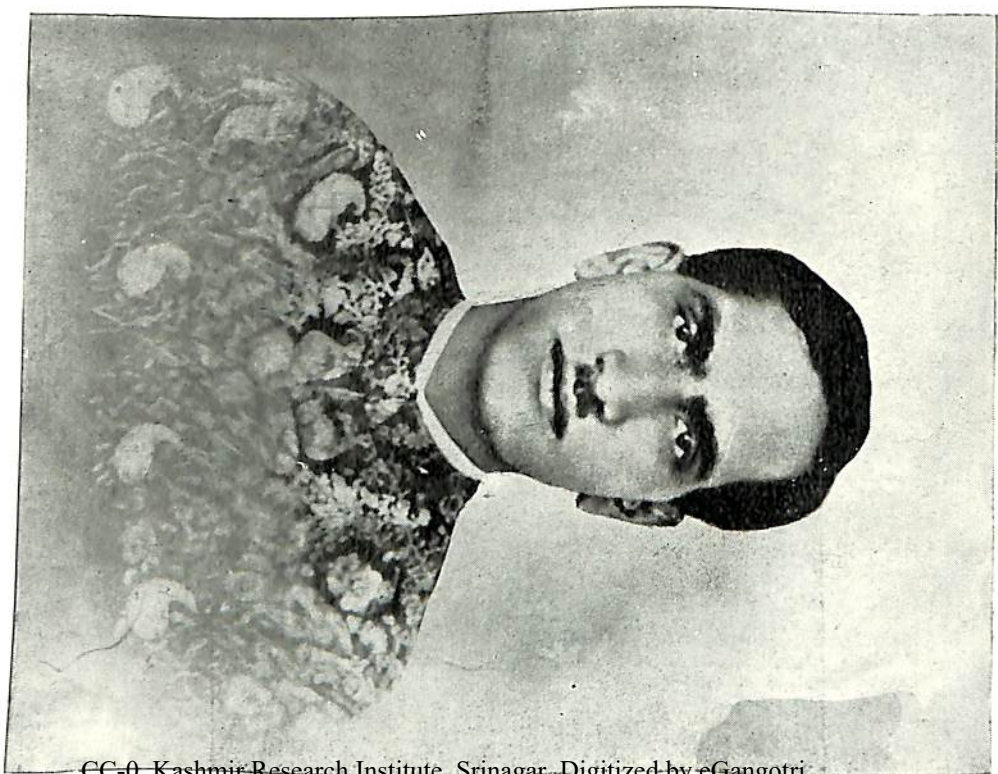
اسمٰعیل میرٹھی - اکبر الٰہ آبادی
نظم طبا طبائی - شوق قدوائی

پروفیسر ڈاکٹر حفیظ سید

جب کہ عزت و وقار کا کاروان آپ کے برگزیدہ اور اولوالعزم بزرگوں کے ساتھ کوچ کر چکا تھا۔ آپ گردِ کارواں سے کاروان کی عظمتوں کا اندازہ کرنے کے لئے پیدا ہوئے۔ میراث میں وہ خاندانی ثروت و دولت نہ ملی البتہ چند سرکاری کاغذ زمانے کی دست برد سے محفوظ تھے یہی اس خاندان کی گزشتہ ترقی اور عروج کی یادگار تھے۔ وہ لوگ بھی نہ رہے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس خاندان کو ترقی کی منزلیں طے کرتے دیکھا۔ ان کاغذات میں آپ کے دادا کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبدالمطلب کی ایک جاگیر کی تفصیل درج ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ ولد سید محمود "بندہائے چوکی خاص" میں سے تھے۔ اور دو صدی ذات کے منصب پر فائز تھے۔ سید عزیز علی کی ایک بڑی جاگیر نواح گورکھپور میں تھی۔

آپ کے والد سید مرتضیٰ حسن مرحوم، ایک عالم بزرگ اور حاذق طبیب تھے۔ اُن کا وطن، اودھ کے ضلع اُناؤ میں قصبۂ بنوتنی تھا۔ حصولِ علم کے لئے کشاں کشاں لکھنو گئے۔ جہاں سے بہرائچ پہنچے۔ مسعود حسن صاحب رضوی کا مقام پیدائش بہرائچ اور تاریخ ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ ہے۔ آپ کے والد کا خیال تھا کہ آپ طب اور علوم اسلامی میں دستگاہ حاصل کریں۔ لیکن اُردو نے آپ کو اپنی خدمت کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ آپ کی عمر ابھی دس ہی برس کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مایوسیوں اور مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، سرپرست کی موت نے سارے حوصلے پست کر دئے۔ عزیز و اقارب ایسے ہمدرد نہ تھے کہ آپ کی آئندہ فلاح و بہبود کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا، اور وہ آپ کے تعلیمی مصارف کے کفیل ہوتے، ایک بیوہ ماں کی اشک شوئیوں اور تسلیوں نے علم کے شوق کو آنسوؤں کی زد میں بہہ جانے سے روکا اور حصول علم کی آگ کو افسردگی کی راکھ میں بجھنے نہ دیا۔ اور برابر آپ کی ہمت بندھاتی رہیں۔ آپ کی تعلیمی زندگی اصل میں آپ کی والدۂ محترمہ کی بدولت پروان چڑھی۔

آپ کی ذاتی استعداد اور دماغی صلاحیت کو بھی آپ کی تعلیمی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسکول کے ہر امتحان میں اول آتے، اور سال بہ سال ترقی پاتے۔ آٹھویں درجے میں پہنچے تو دردِ سر کا عارضہ لاحق ہو گیا اور اب تک یہ دردِ سر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سال میں ایک آدھ دفعہ ضرور سر اٹھاتا ہے سر کے درد کے ساتھ تبخیرِ معدہ کی شکایت بھی پیدا ہو گئی۔ تو آپ کو سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے میں سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑا، بعض بہی خواہوں نے مشورہ بھی دیا کہ جان ہے تو تعلیم بھی ہے۔ مگر جو قدم تعلیم کی راہ میں آگے بڑھے وہ رکے اور نہ پیچھے ہٹے۔ آپ نے اس بیماری کی حالت میں بھی تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۱۷ء میں کیننگ کالج لکھنو سے بی اے کا امتحان کامیاب کر لیا۔ بی اے کے بعد ام اے کا داخلہ لیا۔ ایک سال ادبیات انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا۔ لیکن امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اسی سال آپ پر ہیضے کے مہلک حملے ہوئے۔ زندگی تھی بچ گئے۔ اور اس دفعہ آپ کے شوقِ تعلیمی کو بیماری کے آگے سرد ہونا پڑا۔

اسی اثناء میں صوبۂ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں ایک جگہ نکالی گئی۔ کام یہ تھا کہ صوبہ میں جتنی کتابیں بھی شائع ہوں ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ ہر سہ ماہی میں صوبے کے سرکاری اخبار (یو۔ پی۔ گورنمنٹ گزٹ) میں شائع کی جائے۔ اور عوام کے رجحان کا اندازہ کرنے کے لئے تبصرے لکھے جائیں۔ جس سے رپورٹ کے لئے مواد فراہم ہو سکے۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں آپ کا تقرر اس خدمت پر ہو گیا، اور آپ لکھنو چھوڑ کر الہ آباد چلے گئے۔ اس ملازمت کی بدولت آپ کی نظر سے ہر تازہ کتاب گزرتی، اور مطالعہ کا جو شوق آپ کی فطرت میں تھا اس کی پوری بھڑاس نکلتی۔ ڈیڑھ دو سال کے قلیل عرصے میں آپ کی

نظر سے تقریباً دس ہزار کتابیں گزریں۔ اسی ملازمت نے آپ کی معلومات کو وسیع اور تصنیف و تالیف کے جذبہ کو بیدار کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ٹیچرس ٹریننگ کالج الہ آباد سے آپنے ایل ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی کے جونیر لکچرار کی حیثیت سے آپ کا تقرر بہ یافت ۲۲۵ تا ۲۵۰ ہوا۔

اگسٹ ۱۹۲۷ء میں اُردو کے لکچرار کی حیثیت سے آپ کارگزار ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء میں فارسی ام اے کا امتحان اس امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا کہ آپ کو یونیورسٹی نے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ آپ کی فارسی قابلیت بھی مسلم ہے ۱۹۳۳ء میں آپ نے ایرانی زبان کی تحصیل و تکمیل کے ارادے سے ایران کا سفر بھی کیا۔

۱۹۳۰ء سے برابر ان دونوں اہم زبانوں کے پروفیسر ہیں اور دونوں شعبوں کی صدارت آپ ہی کے تفویض ہے۔ آپ کی موجودہ تنخواہ ساڑھے آٹھ سو ماہوار ہے۔ آپ کو قدیم اور نادر کتب کے جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔ ادبیات سے جو گہرا لگاؤ آپ کی طبیعت کو ہے وہ اُردو کی توسیع و اضافہ کا ضامن ہے۔ لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھان چھان کر اور بڑی عرق ریزی کے بعد آپنے اپنے کتب خانے میں نادر کتابوں کا کافی ذخیرہ فراہم کرلیا۔ قدیم تذکرے اور خطوط، کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی تصانیف جتنی آپ کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ ان کی تعداد چالیس بیالیس کے قریب ہے۔

شاعری آپ کے لئے اگرچہ "ذریعہ عزت" نہیں، پھر بھی جذبات کے اظہار کی خاطر اس کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ آپ کے اشعار جذباتی اور بالکل فطری ہوتے ہیں۔ خاص کر بچوں کے لئے آپ جو نظمیں لکھتے ہیں وہ بہت مفید ہیں اور اردو ادب کی کمی کو پورا کرتے ہیں خرابی صحت نے آپ کے علمی انہماک میں بہت کچھ رخنہ ڈالا۔ پھر بھی آپ کی قلمی کاوشیں کافی تعداد میں منظر عام پر آچکی ہیں۔

آپ کی ایک تصنیف "ہماری شاعری" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ دوسری ادبی کوششیں یہ ہیں جو اُردو کے لئے ایک قابل قدر اضافہ ہیں "امتحان وفا، فرہنگ امثال، فیض میر، مجالس رنگین، دبستان اُردو روح انیس، نظام اُردو، جواہر سخن جلد دوم۔ ان کے علاوہ کئی ایک تنقیدی مضامین مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں آپ کے زیر تصنیف "تاریخ مرثیہ" ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہوگی۔ آپ نے اس کتاب کی تکمیل کے لئے بڑی کاوش سے مرثیوں اور مرثیہ نگاروں کے حالات جمع کئے ہیں۔ ان میں تقریباً تین سو مرثیہ نگاروں کے کہے ہوئے مرثیے شامل ہیں آپ کی دیگر علمی و ادبی مصروفیتیں بھی قابل ذکر ہیں آپ "ہندوستانی اکیڈیمی" کے ممبر ہیں اور اکیڈیمی کے سہ ماہی رسالہ "ہندستانی" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی۔ کئی سال تک انجمن اُردو کے سکریٹری رہے اور انجمن کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں ایک ادبی جلسہ اور ایک ادبی نمائش کی آپ نے جن مختلف علمی و ادبی انجمنوں میں مقالے پڑھے ان کے نام یہ ہیں۔ آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس، آل انڈیا شاعر کانفرنس مسلم اکیڈیمی وغیرہ۔ مسلم اکیڈیمی لکھنؤ کے سکریٹری، نائب صدر اور صدر بھی رہ چکے ہیں۔

جناب مسعود حسن صاحب رضوی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مسلمہ ماہر اور ادیب ہیں آپ کی ذات سے اُردو کو بالخصوص ایک بیش بہا امداد اور ترقی کی توقع ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب موصوف کی بیشتر مصروفیتیں اسی کے لئے وقف ہیں۔ ہندوستان کی وہ تمام انجمنیں جنھیں اُردو کی ترویج و توسیع سے دلچسپی ہے آپ کی خدمات کو حاصل کرنا اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے لازمی سمجھتی ہیں۔ آپ کی ہردلعزیزی، علمی تبحر، اخلاق کی برگزیدگی۔ ایسی خصوصیات ہیں جو آپ کو ایک ایسے درجے پر پہنچا دیتی ہیں جہاں پہنچنا ہر ادیب کا مقصد ہوتا ہے۔

(۲) کیپٹن سید ضامن علی صاحب ام اے (الہ آباد یونیورسٹی)

سید ضامن علی صاحب ۱۸۹۴ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق خاندان گرویز سے ہے یہ خاندان اپنی عزت و وقار کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے اکثر افراد ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اس خاندان نے علم و ادب کے بہی خواہ بھی پیدا کئے۔ آپ کے جد امجد سید نوروز علی صاحب فارسی کے اسکالر اور ہندی کے زبردست شاعر تھے اور شاہان اودھ کے عہد میں ناظم سلطنت جیسے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے۔ ضامن علی صاحب کا ننھیال اور ددھیال علم و فضل اور جاہ و منصب دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔ آپ کے ماموں میر علی عباد صاحب سیناؔن ایک اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے آپ کے والد سید واجد علی صاحب بھی اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔

سید ضامن علی صاحب کی آنکھیں ایسے ماحول میں کھلیں، جس میں علم و ادب کے تذکروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ کا مکتب آپ کا گھر ہی تھا۔ بچپن کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ علامہ سید جواد صاحب اور مولانا شیخ فدا حسین سے شرفِ تلمذ رہا۔ علوم شرقیہ کی تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ البتہ انگریزی تعلیم کے آغاز کے بعد سے آپ کو مختلف مقامات سے امتحانات پاس کرنے پڑے آپ نے آگرہ سے انٹرمیڈیٹ اور الہ آباد سے بی اے اور ام اے کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۱۶ء میں گریجویٹ ہونے کے بعد ہی الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے اور کچھ دنوں بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے بھی نامزد کئے گئے لیکن علم و ادب کی خدمت کے شوق نے آپ کو اس کام سے بیزار کر دیا اور آپ نے ایونگ کرسچن کالج میں فارسی کا پروفیسر بننا پسند کیا۔ اور کم و بیش چھے سال تک اس کالج میں اپنا فرض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی پروفیسر جناب ناصری مرحوم جب بجنور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے گئے تو یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی۔ اور جب اس یونیورسٹی میں پہلے پہل شعبۂ اُردو کھولا گیا تو آپ ہی اس کے صدر مقرر کئے گئے آپ کی علمی قابلیت، طریقۂ تعلیم اور حسن خلق کا ہر شخص معترف ہے اور آپ نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے اہم فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں

آپ کی دماغی صلاحیتوں کو شاعرانہ ماحول ملا علم و ادب آپ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ آپ بچپن ہی سے اس آب حیات کے پیاسے تھے اور اپنی تمام کوششوں کو حصول اور خدمتِ علم کے لئے وقف کر چکے تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے آپ کی شاعری حضرت نسیاؔں کے فیضِ صحبت کی مرہونِ منت ہے۔ یونیورسٹی کے لکچروں کے علاوہ آپ اُردو کی خدمت کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں اُردو زبان اور ادب پر آپ نے ایک زبردست اور عالمانہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ جو ہندوستانی اکیڈیمی اور سرد سے کمیٹی کی رپورٹ پر پیش کیا گیا۔ تاریخ زبان اور اُردو ادب پر اس مقالے کے پڑھنے سے کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔

قصائد، سلام، رباعی، مرثیے بھی آپ کی طبع موزوں اور فکر رسا کا نتیجہ ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ہندستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے ایک تاریخی مقالہ "واقعات کربلا" پر اورنٹیل کانفرنس میں پڑھا۔ علم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مقالہ قابل قدر چیز ہے۔ اور وہی لوگ آپ کی کاوش اور محنت کی داد دے سکیں گے۔ اس مقالہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک کئی بار طبع ہو چکا ہے۔

مرثیہ نگاری آپ کا مرغوب موضوع ہے۔ آپ نے اس کی تحقیق و تاریخ کی ترتیب کا کام شروع کر دیا ہے۔ بہت جلد اس صنف پر سیر حاصل مواد منظر عام پر آجائے گا۔ آپ کی دوسری تصانیف "سیر کشمیر اور گوہر سیلون" ہیں۔ ان کتابوں میں سیر کشمیر اور سیلون کے حالات درج ہیں۔

آپ اُردو ادب سے تعلق رکھنے والی کئی انجمنوں کے صدر اور ممبر ہیں۔ آپ اکثر تعلیمی بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے ممتحن بھی ہوتے رہے ہیں اور کئی سال تک انڈین سیول سروس کے بھی ممتحن رہ چکے ہیں۔ آپ کو فوجی تعلیم سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ ایک ادب کے پروفیسر کے لئے یہ دلچسپی یقیناً شاذ کا حکم رکھتی ہے۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کی یو۔ ٹی۔ سی کے کمانڈنگ افسر کی حیثیت سے اپنا کچھ وقت دیتے ہیں اور گورنمنٹ نے آپکو کیپٹن کا عہدہ دیا ہے۔

آپ کی گرانمایہ خدمات اُردو کے لئے ایک بیش بہا اضافے کی ضامن ہیں خدا کرے کہ آپ کی غیر مطبوعہ کتابیں جلد شائع ہو کر منظر عام پر آ سکیں۔

(۳) ڈاکٹر ایم حفیظ سیّد صاحب۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ ال ٹی۔ (الہ آباد یونیورسٹی)

میرے پہلے عریضے کے جواب میں صاحب موصوف نے لکھا "مجھے افسوس ہے کہ میرے یہاں اپنی کوئی تصویر موجود نہیں اور نہ فی الحال تصویر کھنچوانے کا ارادہ ہے۔ میرے حالات نہایت مختصر ہیں۔ میں چودہ برس سے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو بی اے اور ام اے کی جماعتوں کو پڑھاتا ہوں۔ اس اختصار نے مجھے مایوس سا کر دیا اس صورت میں آپ کے مفصل حالات زندگی اور کام سے اُردو دنیا کو متعارف کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، جانتا تھا کہ صاحب موصوف "گمنامی کی زندگی کو شہرت اور ناموری پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن دوسری دفعہ پھر اسی سلسلے میں یاد دہانی کی۔ بارے جواب خط کے ساتھ تصویر بھی وصول ہوئی۔ حالات اور کام "کافی" کے بجائے صرف "مختصر" رہ گئے۔ جس کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔

آپ کے والد کا نام نظر حسن اور وطن ضلع غازی پور ہے۔ ضلع کے زمینداروں میں ان کا شمار تھا۔ شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے خود بھی ایک "خوب کہنے والے" شاعر تھے۔ نظر تخلص کرتے تھے۔ ایک مثنوی "جلوۂ طور" انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ انگریزی تعلیم دیر میں شروع کی۔ لکھنو اور الہ آباد کے اسکول اور کالجوں میں بی اے کی تعلیم پائی بی اے کی ڈگری لینے کے بعد آپ نے الہ آباد ٹریننگ کالج سے ال ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کر لی۔ دس سال تک مختلف مدارس اور کالجوں میں ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل رہے۔ ۱۹۲۵ء سے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کی لکچراری پر مامور ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی اور ۱۹۳۴ء میں ڈی لٹ کی ڈگری جامعۂ ماپل لئے سے حاصل کی۔

آپ نے حصولِ علم اور تحقیقاتی کام کے لئے بہت دور دراز سفر کئے۔ ڈی لٹ کی ڈگری فرانس کی ایک قدیم یونیورسٹی "ماپل لے" سے حاصل کی۔ آپ کو فلسفہ و تصوف سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ درس و تدریس میں آپ کا تجربہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ لندن سے ٹیچرس ڈپلوما حاصل کیا۔ الہ آباد کے ال ٹی ہیں۔ اور عمر کا بیشتر حصہ محکمہ تعلیمات کی خدمت میں صرف کر چکے ہیں۔

آپ کی ادبی کاوشیں، مقالوں، مضمونوں اور کتابوں کی صورت میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آپ نے صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ انگریزی میں بھی اپنے علمی شغف اور تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سکھ سہیلا، از برہان الدین شاہ جانم۔

منفعت الایمان۔ از برہان الدین شاہ جانم۔

قاضی محمود بحری یہ کتاب (A mystic poet of ... century) کے عنوان سے مستقل طور پر انگریزی میں بھی لکھی گئی ہے

کلیاتِ قاضی محمود بحری ۔ مع مقدمہ تشریح اور فرہنگ ۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا نہایت معرکتہ الآرا اور اہم کارنامہ ہے جس میں دکنی سلطنتوں کے آخری دور کے شاعر بحری کے کلام کو بڑی تحقیق کے ساتھ شایع کیا گیا ہے ۔ یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ قدیم اُردو کے قلمی نسخوں کو پڑھنا اور متروک الفاظ کو سمجھنا بڑے بڑے عالموں کے لئے بھی مشکل ہے ۔ اس کلیات کی اشاعت نے ڈاکٹر سید صاحب کو اُردو کے بلند پایہ محققوں کی صف میں ممتاز جگہ دے دی ہے ۔

"دکن کی اُردو شاعری" ۔ (یہ مضمون نگار میں چھپا تھا) "بنگالی شعرائے اُردو" ۔ "یورپین شعرائے اُردو" (زمانہ کانپور)
"غالب کے کلام کا مطالعہ" (الہ آباد یونیورسٹی میگزین)

اسی طرح حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، دیوان جہاں وغیرہ پر آپ کے مضامین شایع ہوئے ۔ فرانسیسی میں آپ نے ایک کتاب "آپٹی میزم ان انڈین تھاٹ" (ہندوستانی تخیل میں رجائیت) شایع کی ہے ۔

آپ کئی انجمنوں کے معتمد اور ممبر ہیں ۔ کئی کمیٹیوں کے سرگرم کارکن اور مختلف "Boards" مجالس کے ممبر بھی ہیں ۔ الہ آباد آگرہ اور یوپی کی اکثر تعلیماتی کمیٹیوں کے مشیر اور ممبر ہیں ۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر آپ کا شمار شمالی ہند کے سر برآوردہ ماہرین تعلیم میں ہو سکتا ہے آپ نے ہندوستان اور دیگر مقامات کا سفر کیا ۔ صوبجات بمبئی، متوسط اور یوپی کے مختلف مدارس کا معائنہ کیا اور وہاں کے اصول تعلیم کے متعلق معلومات حاصل کیں ۔ اُردو زبان اور ادب کے علاوہ فلسفہ اور فن تعلیم پر بھی آپ کے پچاسوں مضامین اکثر انگریزی اُردو رسائل میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ۔ آپ کی ذات اُردو اور سررشتۂ تعلیم کے لئے بے حد غنیمت ہے ۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اور مضامین اُردو زبان کی اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں ۔ مشاہیر اُردو ادب، جن کے جواہر پاروں کو صرف سطحی نظروں سے جانچا جاتا تھا، آپ نے ایک ایسے انداز میں روشناس کرایا ہے جس سے ان کی عظمتوں پر ہر پہلو سے روشنی پڑتی ہے ۔ اور وہ منور گوشے جن پر کورذوقی نے پردے ڈال رکھے تھے روشن نظر آتے ہیں ۔ آپ نے شاہ برہان الدین جانم، قاضی محمود بحری محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، غالب اور دوسرے شعرا اور مصنفین کا جس غائر نظری سے مطالعہ کیا ہے، اور اس کے بعد جس انداز سے ان پر اپنے خیالات اور ان کے محاسن کو پیش کیا ہے، اس سے آپ کی تنقیدی صلاحیتوں اور قوت اخذ و تحقیق کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ دکن سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے ۔ شمالی ہند میں دکن کے قدیم شاعروں کو روشناس کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے قدیم زبان کو سمجھنا اور اس پر کام کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے ۔

(۱۱) مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے ۔ (اسمٰعیل کالج جوگیشوری بمبئی)

ولادت ۶ رجون ۱۹۰۱ء ۔ مقام ولادت ارموری ۔ ضلع چاندہ ۔ آپ کے والد ڈاکٹر سید محمد مبین صاحب ارموری کے سرکاری ڈاکٹر تھے ۔ آپ زیدی واسطی سید ہیں اور سادات بارہا سے خاندانی تعلق رکھتے ہیں جو فرخ سیر کے زمانے سے وسینہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار میں سکونت پذیر رہے ۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مرہٹی سے ہوئی چنانچہ اس زبان میں ورناکلر فائنل کے امتحان میں کامیاب ہوئے ۔ اس کے بعد قرآن شریف، اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم پائی ۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کو دارالعلوم ندوہ بھیج دیا گیا ۔ آپ ندوہ میں چار سال تک رہے ۔ اس دوران میں آپ اپنی جماعت میں ہر سال اول آتے رہے ۔ اور ایک ممتاز حیثیت کے مالک رہے ۔ آپ مولانا شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں

سب رس
مولٰنا نے آپ کی ادبی وعلمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں خاص توجہ سے کام لیا۔ مولٰنا جس وقت سیرۃ لکھ رہے تھے آپ ان سے "بلاغ المرام" کا درس لیا کرتے تھے۔

آپ کی انگریزی تعلیم ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئی ہے۔ میٹرک اور ایف اے کے امتحانات درجۂ اول میں کامیاب کئے اور وظائف سرکاری کے مستحق قرار پائے۔ بی اے میں زیر تعلیم تھے کہ ترک موالات کی وبا اٹھی اور آپ کو سلسلۂ تعلیم قطع کرنا پڑا۔ آپ ۱۹۲۰ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ چلے گئے۔ وہاں آپ کی مصروفیتیں زیادہ تر علمی و تحقیقی رہیں۔ اس دوران میں ترک موالات کا ہنگامہ کچھ کم ہوا۔ آپ نے پھر تعلیم کی طرف توجہ کی اور بی اے میں شرکت کی۔ ۱۹۲۴ء میں بی اے کا امتحان آنرز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اور یونیورسٹی کے جملہ طلباء میں اول رہے۔ یونیورسٹی نے وظیفہ عطا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں ام اے فارسی و عربی بھی درجہ اول میں پاس کیا اور سب میں اول رہے۔ اس صلے میں یونیورسٹی نے طلائی تمغہ اور دو سو روپے کی کتابیں دیں۔

سلسلۂ تعلیم کو ختم کرنے کے بعد آپ علمی خدمت میں منہمک ہو گئے اور دار المصنفین کا کام کرتے رہے۔ اور اپنی بیش بہا خدمات سے اُردو اور دار المصنفین کو مستفیض کیا۔ ساتھ ہی مختلف رسائل کو مضامین بھی روانہ کرنے لگے۔ آپ ۱۹۳۰ء میں گجرات کالج احمد آباد میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ اُردو کے سچے بہی خواہ اور خدمت گذار ہیں۔ صوبہ کی انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری ہیں۔ آج کل آپ ایک نہایت ہی گرانمایہ اور اہم کتاب کے لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت نام ہی سے ظاہر ہے یعنی "گجرات میں اُردو" اور یہ صاحب موصوف کی دس سالہ تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہو گی۔ ۱۹۳۱ء سے آپ اسمٰعیل کالج جوگیشوری کے اُردو کے استاد ہیں۔ رقعات عالمگیری کی دوسری جلدوں کی ترتیب کا کام بھی آپ کے پیش نظر ہے دوسری علمی مصروفیتوں کے ذکر میں آپ یونیورسٹی کے اُردو بورڈ کے رکن، اور اردو ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر ہیں۔

نجیب اشرف صاحب ندوی کا نام اُردو کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کی کتابیں اور مضامین اہمیت اور معلومات کے اعتبار سے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اور آپ ہندستان کے اچھے محققین اور ادیبوں کی صف میں اپنے لئے جگہ پاتے ہیں۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ جو منظر عام پر آچکا ہے رقعات عالمگیر اور ان کا معرکتہ الآرا مقدمہ ہے جس کی ترتیب و تالیف نے آپ کو ایک بلند پایہ محقق ثابت کر دیا۔

(۵) مولٰنا محمد طاہر صاحب فاروقی ام اے۔ مولوی فاضل، ادیب فاضل، دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)

مولٰنا السنۃ اربعہ (عربی، فارسی، اُردو، انگریزی) کے مستند اور متبحر عالم ہیں۔ اور ساتھ ہی ہومیوپیتھک کے امتحان۔ ایچ ایل، ایم، ایس کے سند یافتہ اور گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ ہندوستان کی مختلف جامعات سے آپ نے امتیازی کامیابی حاصل کی لکھنؤ سے دبیر کامل، الہ آباد سے منشی کامل اور مولوی فاضل پنجاب سے مولوی عالم اور ادیب فاضل کی اسناد حاصل کیں اور تقریباً پندرہ سال سے اردو اور فارسی زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ پانچ چھے سال سے آگرہ کالج میں صدر شعبۂ اُردو فارسی ہیں۔

آپ کے اکثر مضامین رسائل میں طبع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے طلبہ کے لئے متعدد نصابی کتب لکھیں۔ ان کے علاوہ چند قابل ذکر تصانیف یہ ہیں:-

(۱) سیرت مولٰنا محمد علی۔ مولٰنا کی وفات کے بعد ۱۹۳۱ء میں سب سے پہلے فاروقی صاحب ہی نے یہ مختصر لیکن جامع سیرت لکھی

اس کتاب میں مصنف نے بعض ایسے حالات بھی لکھے ہیں جو خاندانی ذرائع سے حاصل کئے گئے۔ فاروقی صاحب کو مولنا سے ایک خاص تعلق، اپنے والد کی طرف سے تھا۔ مولنا اور فاروقی صاحب کے والد محمد محسن مرحوم بڑے گہرے دوست تھے۔ اور اسی دوستانہ کی وجہ سے فاروقی صاحب کو بعض ایسی معلومات بہم پہونچیں جو دوسروں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اسلوب بیان نہایت عمدہ اور محققانہ شان لئے ہوئے ہے۔ مولنا کی سیرت پر ایک تشفی بخش اور کامل ریویو کیا گیا ہے۔ ہندستان میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

سرکار دو عالم۔ حضور سرور کائنات صلعم کی مختصر سیرت پاک ہے جامعہ ملیہ دہلی نے بھی اپنی کتاب کے لئے یہی نام انتخاب کیا ہے لیکن فاروقی صاحب کی کتاب بہت پہلے طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کی زندگی کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے طرز بیان نہایت موزوں اور موضوع کے شایانِ شان ہے۔

ادبیات ایران نو۔ ایران کی جدید شاعری کو ہندستان میں روشناس کرنے کے لئے پروفیسر فاروقی نے شعرائے ایران کے نظم و نثر کے مختلف نمونے جمع کر کے پیش کئے ہیں اور موجودہ ایران کی ذہنی کش مکش اور رجحان کو ایک مبسوط مقدمہ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب پر مختلف جامعات کے پروفیسر صاحبان نے بڑی اچھی تنقیدیں کی ہیں۔

سیرت اقبال یہ کتاب فاروقی صاحب کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن فاروقی صاحب نے اقبال کے کلام کو صحیح معنوں میں سمجھا ہے۔ اور آپ کی کتاب کو "اقبالیات" میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

مولنا فاروقی بزم اقبال آگرہ کے بانی بھی ہیں۔ اسی بزم کی سرپرستی میں دو شاندار جلسے "یوم اقبال" اور "یوم اردو" کے ترتیب دئے گئے۔ اس بزم کے پیش نظر دو مقاصد ہیں ایک تو یہ کہ زبان اُردو کی خدمت اور دوسرا پیغام اقبال کی اشاعت۔

جامعۂ اُردو۔ مولنا فاروقی کی تحریک سے بزم اقبال کی سرپرستی میں آگرہ میں ایک اُردو یونیورسٹی کا انعقاد عمل میں لایا گیا ہے جس کو سر محمد یعقوب ممبر کونسل ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ خواجہ غلام السیدین کی سرپرستی حاصل ہے۔ فاروقی صاحب اس کے رجسٹرار ہیں۔ جامعہ مذکورہ کی نگرانی میں تین امتحانوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل۔ اس تحریک کا اولین مقصد ترویج و خدمت اُردو ہے۔ فاروقی صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کو مشکور اور کامیاب دیکھنے کی آرزو ہر بہی خواہِ اُردو کے دل میں ہونی چاہئے۔

(۶) پروفیسر حامد حسن صاحب قادری۔ (آگرہ)

میرے خط کے جواب میں، جس میں میں نے صاحب موصوف سے تصویر، حالات زندگی اور کام کا خاکہ روانہ کرنے کی درخواست کی تھی آپ نے تحریر فرمایا ہے "آپ مجھ سے مری تصویر اور حالات مانگتے ہیں۔ میں تصویر کے جواب میں نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ

"مجھ کو دیکھو میری تصویر میں کیا رکھا ہے" نہ یہ کہ

"ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا"

تصویر کھینچوانے سے مجھے پرہیز نہیں۔ لیکن دوا کے طور پر گوارا کر لیتا ہوں اب کئی سال سے کوئی تصویر نہیں کھینچی۔ اس لئے بھیجنے سے معذور ہوں مجھے نہ صرف تصویر کی عدم وصولی کا بلکہ آپ نے حالات زندگی بیان کرنے کی بجائے اختصار سے کام لیا ہے اس کا بھی ذکر کر دینا چاہئے۔ میں

قارئین سب رس کو صرف اسی حد تک متعارف کرواسکتا ہوں کہ آپ کی زندگی نہایت پرسکون گزری ہے اور آپ ایک مقدس خاندان کے نام لیوا ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب بابا فرید گنج شکر سے ملتا ہے۔ تقریباً چالیس سال سے شعر و سخن اور مضمون نگاری کا شغل ہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ کوئی بارہ سال سے جاری ہے۔ سینٹ جانس کالج آگرہ کی اردو اور فارسی تعلیم آپ ہی کے تفویض ہے۔

آپ کی علم دوستی اور لیاقت کا ہر اردو داں معترف ہے۔ ہندستان کے اکثر و بیشتر رسائل آپ کے مضامین، نظموں اور غزلوں سے مزین رہتے ہیں۔ تالیف و تصنیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب ساتویں جماعت میں تعلیم پا رہے تھے، ایک انگریزی ناول کا خلاصہ مرتب کیا۔ جسے اخبار پھول نے چھپوایا۔ اور سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک تین چھوٹی کتابیں گلدستۂ اخلاق، رفیق تنہائی اور حسنین لکھیں سنہ ۱۹۰۶ء سے آپ نے میدانِ صحافت میں باقاعدہ قدم رکھا۔ آپ کی نظمیں اور مضامین زمانہ، مخزن، علی گڑھ منتھلی وغیرہ جیسے مقتدر رسائل میں طبع ہونا شروع ہوئے اور علمی طبقہ میں آپ ایک اچھے شاعر اور کامیاب انشا پرداز سمجھے جانے لگے۔

آپ نے سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک بچوں کا ایک پرچہ "اخبار سعید" نکالا اور اسی اخبار کے سلسلہ میں "بچوں کا کتب خانہ" جاری کیا اور بچوں کے لئے متعدد اخلاقی کتابیں لکھیں۔ آپ کی مختلف چھوٹی اور بڑی تصنیفات ایک کثیر تعداد میں ہیں۔ جن میں سے اکثر مختلف صوبوں اور محکموں کے نصاب میں جاری اور رائج ہیں۔ بالخصوص شعبۂ تعلیم سے متعلق اور طلبہ کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے بعض بہت قیمتی اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں یہاں میں آپ کی چند مشہور تصانیف و تراجم کا نام دے دینا ضروری سمجھتا ہوں (۱) باغبان۔ یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی مشہور تصنیف "گارڈنر" کا ترجمہ ہے جو مکملن کمپنی کی فرمائش پر کیا گیا، ترجمہ رفتہ و شستہ اردو میں ہے (۲) الکھل اور زندگی۔ یہ کتاب بھی مکملن کمپنی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ (۳) فطرت اطفال۔ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے طبع کیا۔ (۴) کمال داغ۔ داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب ایک مبسوط ناقدانہ اور بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ ہے۔ (۵) تاریخ مرثیہ گوئی۔ اپنی کتاب میں مختصراً مرثیہ کی ابتدا اور عروج کے حالات بیان کئے ہیں اور مرثیہ سے متعلق جملہ معلومات بہم پہنچا لی گئی ہیں۔ (۶) تاریخ و تنقید ادبیات اردو۔ شعر و ادب اردو کے متعلق تاریخی و تنقیدی مضامین اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ مزید براں ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں "اردو، ہندی، ہندستانی" کے مسئلہ پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور کتاب "داستان تاریخ اردو" کے نام سے زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں اردو کی مکمل تاریخ مل سکتی ہے اور بعض گم نام ہستیاں جنھیں دوسرے تذکروں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ منظر عام پر آجاتی ہیں۔ اور مصنف کو بعض ذرائع سے ایسے نایاب نسخے بھی ملے ہیں جنھیں اردو سے بہت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً فضلی کی "کربل کتھا"

آپ کی مرتبہ دوسری اور بہت سی کتابیں ہیں۔ جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں، اکثر آپ کے علمی و ادبی مضامین کے مجموعے۔ ناول اور تنقیدی و تاریخی تحریریں شامل ہیں۔ ان مرتبہ کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱) مرأت سخن۔ (۲) دفتر تواریخ (۳) صید و صبا (۴) تذکرۂ ہمایوں وغیرہ۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اردو کے لئے ایک اضافہ ہیں تقریباً ہر موضوع پر آپ نے قلم اٹھایا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے بڑی کاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور یہی خصوصیات آپ کو اپنے دوسرے ہمسروں سے ممتاز بناتی ہیں، زمانہ ایسے باہمت اور لائق اصحاب کے لئے مواقع مہیا کرے تو اردو ادب کی کم مائیگی کا بہت کچھ ازالہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی علمی انہماک میں بسر ہوئی

پروفیسر سید محمد

پروفیسر عبدالقادر سروری

محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

بچپن ہی سے تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تک کئی قابل قدر کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

(۷) عبدالقادر صاحب سروری ام اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

حیدرآباد کی علمی بیداری، جامعہ عثمانیہ کے چند ہونہار فرزندوں کی مساعیٔ جمیلہ کی مرہونِ منت ہے۔ انھیں ادیبوں اور انشا پردازوں کی کوششوں نے دکن کو علم و ادب کا مرکز اور ایک خاص اہمیت کا مالک بنا دیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا شمار بھی انہیں ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے حیدرآباد کی علمی دنیا میں انقلاب کی روح پھونکی جن کی تالیفات اور تصانیف نے ایک ایسے دور کی ابتدا کی جو بجا طور پر اردو کا "دورِ نشاط" کہلایا جا سکتا ہے۔ صاحب موصوف نے تنقید، ترتیب، اور انشا پردازی کے لئے نئے اصولوں اور انوکھے اسلوب اختیار کئے اور تشنگانِ علم و ادب کے لئے نئے نئے راستے کھول دئے۔ حیدرآباد کے اکثر ادیب اور انشا پرداز کسی نہ کسی طرح آپ کی تحریروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

سروری صاحب کی شہرت حیدرآباد تک ہی محدود نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں آپ کی تصانیف قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال مجھے علی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ وہاں میرے ایک دوست زیر تعلیم تھے۔ ان کے توسط سے مجھے وہاں کی علمی فضا میں کچھ دن گزارنے کا موقع ملا۔ پروفیسر صاحب موصوف کے شاگرد ہونے کی سعادت نے مجھے جس "لطفِ خاص" کا مستحق قرار دیا، اس سے میں آپ کی عظمتوں کا اور بھی معترف ہوا۔ سروری صاحب کی گرانمایہ تصنیف "جدید اردو شاعری" نے آپ کو اکثر یونیورسٹیوں میں ایک فاضل ادیب کی حیثیت سے روشناس کیا ہے۔ علی گڑھ میں اسی کتاب کو "نصابی کتب" کا درجہ حاصل ہے۔ وہیں مجھے اس حقیقت کا بھی احساس ہوا کہ حیدرآباد علمی حیثیت سے چاہے کتنا ہی آگے ہو محسن شناسی اور قدردانی کے میدان میں اس نے قدم نہیں اٹھائے۔ سروری صاحب علم و ادب کی خدمت میں اپنی پوری صلاحیتوں کو وقف کئے ہوئے ہیں اور صلہ و تحسین کا خیال کئے بغیر خدمتِ علم و ادب میں مصروف ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۳۲۱ھ میں حیدرآباد دکن کے محلہ سلطان شاہی میں ہوئی۔ یہ مشہور قطب شاہی محلہ حیدرآباد کے اکثر علماء و فضلا کا مسکن رہ چکا ہے۔ یہیں کے ادبی ماحول میں آپ کی ذہنی صلاحیتوں نے ایک خاص رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ آپ کے والد ماجد حاجی محمد سرور قادری، معاشدار اور بڑے پابند اوقات بزرگ ہیں۔

آپ کے جد امجد حضرت سرور سلطان کشمیر سے تشریف لائے تھے انہیں بزرگ کی نسبت سے آپ سروری کہلاتے ہیں۔ حضرت سرور سلطان ایک باخدا بزرگ تھے۔ حیدرآباد آکر نوبت پہاڑ پر چلہ نشین ہوئے اور ارادتمندوں اور اہل غرض کو اپنی روحانی برکات سے مالا مال کرتے رہے۔ آپ کی رحلت کے بعد آپ کا مزار اسی پہاڑ پر بنایا گیا اور آج تک آپ کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ انھیں بزرگوں کے سائے میں پروان چڑھتے ہوئے سروری صاحب نے میدان علم میں قدم رکھا۔ آپ کے والد انگریزی تعلیم کے مخالف تھے وہ آپ کو مشرقی علوم و فنون کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ لیکن قسمت نے آپ کو اردو کی خدمت کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ آپ نے ہر قسم کی قربانی قبول کی۔ اور ایک ایسی منزل میں قدم رکھا جہاں دشواریاں سدراہ تھیں۔ اور سب سے بڑی مصیبت سرپرستوں کی توجہ سے محرومی تھی۔ اس پر بھی آپ نے جدید علوم کی تحصیل کو اپنا مقصد بنایا۔ ایک ادیب کی زندگی کو جن "روایتی" مصایب سے دوچار ہونا پڑتا ہے آپ کی قسمت میں بھی تھیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوتی ہے "زماں خاں شہید" کے گنبد میں ایک "مولوی صاحب" درس دیا کرتے تھے۔ آپ نے ان کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ پھر آپ "مدرسہ منصب داران" میں اور یہاں سے نکل کر "دھرم ونت ونیکو لرہائی اسکول" میں شریک ہوئے۔ ان مدارس میں آپ کا شمار ذہین اور محنتی طلبہ میں ہوتا تھا ادبی سرگرمی کا آغاز انہیں ابتدائی منزلوں میں ہو چکا تھا اور جس قلیل عرصے میں آپ نے منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کی وہ انہیں ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے سٹی کالج حیدرآباد کا قدیم اور مشہور کالج ہے حیدرآباد کا کوئی ادیب ایسا نہیں جسے اس کالج کی فیض رسانیوں نے ممنون نہ کیا ہو "مفید الانام" کے بعد آپ مدرسہ فوقانیہ بلدہ میں شریک ہوگئے۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ حاصل کیا۔ اُردو، فارسی آپ کے اختیاری مضامین رہے۔ مولٰنا وحید الدین سلیم کی شاگردی میں آپ کے علمی جوہر اجاگر ہونے لگے۔ آپ مولٰنا کے چہیتے شاگرد تھے۔ مولٰنا کی جوہر شناسی نے آپ کی ہر قسم کی رہنمائی کی اور جب رخصت پر تشریف لے جارہے تھے تو مولٰنا نے اُردو کی مددگار پروفیسری کے لئے آپ ہی کی سفارش کی۔ اسی سفارش اور ذاتی قابلیت کی بناء پر آپ موجودہ عہدے پر مامور ہوگئے۔

سروری صاحب ام اے۔ ایل ایل بی ہیں۔ ان دونوں امتحانوں میں امتیازی درجہ سے کامیابی حاصل کی۔ ام اے میں ساری یونیورسٹی میں دوم اور ال ال بی میں درجہ اول اور بعض مضامین میں اول رہے۔ قانون کے امتحان کی کامیابی کا اثر آپ کی ادبی مصروفیتوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اکثر جدید مطبوعات کے "مقدمے" آپ نے لکھے ہیں "مقدمے" لکھنے میں سروری صاحب کو خاص کمال حاصل ہوگیا ہے۔ آپ کی علمی مصروفیت قابل تقلید ہے۔ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرلے کے بعد آپ کا بیشتر وقت مطالعہ اور تالیف وتصنیف میں گزرتا ہے۔ کالج میں بھی آپ اسی طرح مصروف رہتے ہیں۔ آپ جو کچھ لکھتے ہیں احتیاط اور کاوش سے لکھتے ہیں اس کے باوجود آپ کی تحریر میں روانی بے ساختگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ جو قابل تعریف ہے۔ سروری صاحب کی کتابیں مختلف موضوع پر مشتمل ہے۔ آپ کے مرغوب موضوع، تنقید، افسانہ نگاری تاریخ اور مثنوی ہیں۔

"جدید اردو شاعری" کا ذکر اوپر آچکا ہے یہ کتاب آپ کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ اس کتاب پر ہندستان کے مختلف مقتدر جرائد نے بلند پایہ تنقیدیں کی ہیں اور یہ اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ جدید اُردو شاعری کے متعلق یہ سب سے پہلی اور مستند تنقیدی کتاب ہے۔ اس کے پڑھنے سے موجودہ زمانے کے شاعرانہ رجحانات کا عمدگی سے پتہ چلتا ہے۔ اور اردو شاعری کی مکمل تاریخ سے واقف ہوسکتے ہیں۔ اس کے لکھنے میں بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں

سروری صاحب ہندستان کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں آپ کے افسانے سنجیدہ ظرافت کے نمونے ہوتے ہیں اکثر رسائل آپ کے افسانوں کو چھاپنا اپنی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ نفسیاتی جزو بھی آپ کے افسانوں میں شریک رہتا ہے، اور جس خوبی سے آپ ان مسائل کو سلجھاتے اور پیش کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے آپ کے افسانوں کا مجموعہ زیر طبع ہے۔ اور اسی فن سے متعلق آپ کی دو کتابیں "دنیائے افسانہ" اور "کردار اور افسانہ" شایع ہو چکی ہیں۔ نیز آپ نے ایک سلسلہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جاری کیا تھا۔ آپ رسالہ "مکتبہ مجلہ" کے ایڈیٹر بھی کئی سال تک رہ چکے ہیں۔ دوسری ادبی کوششیں یہ ہیں:-
"حیدرآباد کی تعلیمی ترقی" یہ کتاب اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔ آپ نے کئی مشہور قدیم کتابوں کو مرتب بھی کیا ہے

جن میں قابلِ ذکر، مثنوی پھول بن، از ابن نشاطی - کلیات سراج اورنگ آبادی - مثنوی قصۂ بے نظیر، از صنعتی بیجاپوری -
ان کتابوں کے سلسلے میں آپ نے خاص تحقیقی کام کیا ہے - اور ہر ایک پر مبسوط اور مفصل مقدمہ مع تشریح کے سپردِ قلم کیا ہے -

آپ ادارۂ ادبیات اُردو کے سرگرم اربابِ کار میں سے ہیں اور عالی جناب ڈاکٹر زور کے دستِ راست ہیں - ادارہ کے شعبۂ امتحانات و تنقید کے معتمد بھی ہیں -

آپ کی ذات سے اُردو کو بڑی بڑی امیدیں ہیں اور بالخصوص حیدرآباد کا ادبی ماحول آپ کے وجود کو بہت غنیمت سمجھتا ہے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ آپ نوجوان انشاپردازوں اور بالخصوص افسانہ نگاروں کی صحیح تربیت دماغی کرتے ہیں اور ان کے رجحان کے مطابق ان کو ایک راستے پر ڈال دیتے ہیں - اب تک کئی افراد آپ کی ان کوششوں سے متمتع ہوکر "افسانوی دنیا" میں شہرت حاصل کر چکے ہیں -

(۸) سید محمد صاحب ایم اے (عثمانیہ)

سید محمد صاحب ۱۹۰۶ء میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے - ابتداً مدرسہ مفید الانام میں شریک ہوئے - اس مدرسے سے مڈل کا امتحان بدرجہ اول کامیاب کیا اور سٹی ہائی اسکول میں شرکت کی ۱۹۲۲ء میں ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کیا اور جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ بدرجۂ اعلیٰ کامیاب کیا اور اُردو میں صد فی صد نمبر لئے - ۱۹۲۶ء میں بی اے اور ۱۹۲۸ء میں ام اے کی ڈگری حاصل کی - مولانا سلیم کے زمرۂ تلامذہ میں آپ کو خاص امتیاز حاصل رہا - اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اُردو میں اول آتے رہے -

آپ کا تعلیمی دور بے حد شاندار رہا - خصوصاً اُردو میں جو امتیازات آپ کو شروع ہی سے حاصل رہے وہ شاہد ہیں کہ آپ کو اُردو سے خاص اور فطری لگاؤ ہے - زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کو تحریر و تقریر کے مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا اور ہر مقابلہ میں آپ اول آتے -

سٹی کالج کے ادبی ماحول کو آپ ہی کی ذات سے زندگی حاصل ہے - کئی نوجوان آپ کی تربیت کے زیر اثر ادبی دنیا میں روشناس ہیں - حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں میں سید محمد صاحب کا درجہ بہت بلند ہے - آپ نے اپنی گرانمایہ تصانیف کے ذریعہ ایک مقتدر ادیب اور محقق کی شہرت حاصل کر لی ہے - آپ کی سب سے پہلی تصنیف "اربابِ نثرِ اردو" ہے یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اُردو نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے - ہر مصنف کے متعلق نہایت تحقیق کے ساتھ مواد جمع کر کے سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا گیا ہے - اس کتاب کو علمی حلقے میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ کئی جامعات کے اُردو کے اعلیٰ امتحانات میں شریک نصاب کی گئی ہے اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں -

سید محمد صاحب ۱۹۲۸ء سے سٹی کالج کے اُردو کے لکچرار ہیں - اس دوران میں آپ نے طلبہ میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور پھر ان کی ادبی رہنمائی کرنے میں خاص محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے اور اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ سٹی کالج اب بھی اپنی "مردم خیزی" کی شہرت کو برقرار رکھ سکا - صاحب موصوف کا بیشتر وقت علمی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے - آپ کئی انجمنوں کے سرگرم کارکن ہیں - مجلہ طیلسانین کے رکنِ ادارت اور معتمد ہیں اور آپ کے اکثر مضامین و مقالے ملک میں شایع ہوا کرتے ہیں

ترجمہ کرنے میں بھی آپ کو خاص مہارت حاصل ہے، آپ کئی کتابوں کے مولف ہیں۔

گلشن گفتار ۔ خواجہ خاں حمید کا تذکرہ جو اُردو کا اولین تذکرہ ہے۔

مثنویات میر ۔ (امیر تقی میر کی مثنویات جواب تک متفرق اور غلط سلط طور پر ملتی تھیں)

ایمان سخن ۔ شیر محمد خاں ایمان کے کلام کا انتخاب ۔

یادگار ولی ۔ بابائے ریختہ کے جشن یادگار کا مجموعہ

قواعد فارسی ۔ راست اصول تعلیم پر فارسی کی ابتدائی قواعد ۔

مرقع اُردو ۔ اردوئے جدید کے نظم و نثر کا انتخاب

ان کتابوں کو بڑے سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے ۔ اور ہر ایک کے ساتھ ایک تنقیدی مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے ۔ جس سے کتاب کی اہمیت میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے ۔

مثنویات میر ۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب اردو میں داخل ہے ۔ قواعد فارسی اور دوسری کتابیں اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں ۔ سید صاحب کو قدیم اردو سے بھی گہری دلچسپی ہے ۔ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے آپ معتمد ہیں ۔ حال ہی میں آپ کی مرتبہ دو نایاب کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ ملک الشعرا نصرتی کی مثنوی گلشن عشق اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا نایاب دیوان ۔

سید صاحب کی تحریریں تنقیدی شان ہوتی ہے ۔ طرز نگارش سادہ اور سلیس ہوتی ہے اور آپ کے قدرت بیان کی شاہد ۔ حیدرآباد کے موجودہ دور میں اُردو ادب کے سچے خدمت گذار اور بہی خواہ ڈھونڈے جائیں تو جناب ڈاکٹر زورؔ ۔ عبدالقادر سروری اور جناب سید محمد صاحب پر ہی نظریں اٹھتی ہیں ۔ اور دکن میں یہی "ارباب نثر اُردو" کہلانے کے مستحق ہیں۔

رشید قریشی

سب رس

کا

"فضائی ادب" نمبر

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں شایع ہوگا

اس نمبر میں نشر گاہ حیدرآباد کی نشر شدہ تقاریر کا معیاری انتخاب شایع کیا جا رہا ہے۔

ملک کے مشاہیر کی اپنے خاص موضوعوں پر دلچسپ اور عام فہم تقریریں

اپنے تنوع اور معیار کے لحاظ سے یہ نمبر قابل دید ہوگا۔

نصرتی کا سنہ وفات

بیجاپور کے قدیم اردو شاعروں ملا نصرتی کو غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ تمام اصنافِ سخن میں یکساں کمال حاصل تھا اور وہ اپنے تمام ہمعصر شاعروں میں اپنی دل پذیر طرزِ نگارش اور بلند فکری کی وجہ سے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت رکھتا ہے۔ اس کی رزمیہ مثنوی علی نامہ خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے اور اردو ادب میں اپنی طرز کی ایک لاجواب شاہکار ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو شخصیتیں بہت زیادہ مشہور ہوتی ہیں۔ ان کے حالات و واقعات زندگی کے متعلق طرح طرح کے اختلافات مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں نظر آتے ہیں اور عجیب بے سروپا باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ نصرتی کا بھی یہی حال ہے۔ کسی نے اس کو برہمن بتایا ہے اور کسی نے بیجاپور کی بجائے کرناٹک کو اس کا وطن قرار دیا ہے۔ اس کی تصانیف اور ان کی تاریخوں نیز اس کے سنہ وفات کے بارے میں بھی کئی اختلاف موجود ہیں۔

غزلوں اور متفرق کلام کے علاوہ اس کی تین مثنویاں مستقل ہیں۔ ایک گلشنِ عشق[1]، دوسری علی نامہ اور تیسری تاریخ اسکندری ان میں سے پہلی مثنوی گلشنِ عشق کا سنہ تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے اور اس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔

علی نامے کی تاریخ تصنیف مولف اردوئے قدیم نے ۱۰۷۱ھ بتائی ہے اور وہ اس بنا پر ہے کہ اس مثنوی میں پنالے کے قلعہ کی فتح کا ذکر ہے اور خود نصرتی نے اس فتح کا جو مادۂ تاریخ نکالا ہے اس سے ۱۰۷۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف تذکرۂ شعرائے دکن کے مولف نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ بتایا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں علی نامے کے نسخے کو دیکھنے کے بعد آخر الذکر تاریخ سے اتفاق کیا ہے اور اپنے رائے کی تائید میں عجائب خانہ برطانیہ کے قدیم اور معتبر نسخے میں جو شعر تاریخی درج ہے وہ بھی نقل کر دیا ہے۔

لکھا سو یو جس وقت تکرار اس ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھ برس

تاریخ اسکندری کا سنہ تصنیف مولوی عبدالحق صاحب کے مملوکہ نسخے کے بموجب ۱۰۸۳ھ ہے۔ بظاہر یہ نصرتی کے آخری مستقل تصنیف ہے۔ اسی سنہ کے اوائل میں اس کے مربی علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور اس کا کمسن بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا جو ۱۰۹۷ھ میں فتح بیجاپور کے بعد عالمگیر کے حکم سے قید کر دیا گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنی کتاب نصرتی میں لکھتے ہیں۔

"نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔ فتوحات نے اپنے تذکرۂ ریاض حسینی میں لکھا ہے کہ جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں

---

[1] مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات کی طرف سے گلشنِ عشق اور علی نامہ دونوں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اول الذکر کو راقم نے اور موخر الذکر کو مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ترتیب دیا ہے۔

نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب ملک الشعرائے ہند سے سرفراز فرمایا۔ مولوی عبدالجبار مرحوم نے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کا سنہ وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ اطلاع انھیں کہاں سے حاصل ہوئی۔ اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو فتوت کا بیان صحیح نہیں ہو سکتا عالمگیر نے بیجا پور کو ۱۰۹۷ھ میں فتح کیا تھا"۔

یہ صحیح ہے کہ تذکرہ شعرائے دکن کے مولف نے ۱۰۹۵ھ کو سنہ وفات قرار دینے کی نسبت اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا لیکن خطاب ملک الشعرا پانے کے بارے میں ان کا بیان فتوت سے بالکل ایک ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"علی نامہ ختم کرنے کے بعد نصرتی کو علی عادل شاہ نے خلعت اور ملک الشعرائی کا خطاب عطا فرمایا تھا" عام طور پر اردو تذکرے نصرتی کے ذکر سے خالی ہیں اور فتوت کے سوا کسی اور روایت سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب نے دکن کی مفتوحہ سرزمین کے دکنی گو شاعر کی اس طرح قدر افزائی کی ہوگی۔ اورنگ زیب کی افتاد طبیعت، فاتحانہ شان اور ادب و دیگر فنون لطیفہ کے ساتھ اس کی طبعی بے پروائی کو دیکھتے ہوئے فتوت کا یہ بیان مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ علی نامہ جیسی بلند پایہ رزمیہ مثنوی لکھنے پر جس میں رزم و بزم کے بے نظیر مرقعوں کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی کی مدح میں ایسے بلیغ قصیدے بھی ہیں جو فارسی کے اعلیٰ درجے کے قصائد کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں، بہادر اور ادب پرور بادشاہ نے نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا ہو۔

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں گلشن عشق کے ایک قلمی نسخے پر نصرتی کی وفات کے متعلق یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

ضرب شمشیر سوں یہ دنیا چھوڑ	جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آ ملائک نے	یوں کہے نصرتی شہید اہے

"نصرتی شہید اہے" سے ۱۰۸۵ برآمد ہوتے ہیں۔ اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۰۹۳ھ ہے اور یہ بہت ہی قدیم نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے نصرتی کی آخری مثنوی ۱۰۸۵ھ کی لکھی ہوئی ہے اور فتوت کا روایت بھی غور طلب معلوم ہوتی ہے۔ نصرتی کے متفرق کلام مثلاً رباعیات وغیرہ سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ انقراض دولت بیجاپور کے بعد زندہ رہا ہوگا اس سے بحالات موجودہ اس قطعے کی بنا پر اس کا سنہ وفات ۱۰۸۵ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قطعے سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ نصرتی پر کسی نے تلوار سے حملہ کیا تھا اور وہ اس صدمے سے شہید ہوا۔

سید محمد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

ڈاکٹر زور

"میں نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر زور کی کسی برائی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ محض اس لئے کہ مجھے ان میں برائی کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ناقدین اسے عقیدت سے تعبیر نہ کریں اور میں یہ سوچتا رہا کہ کوئی بات ایسی مل جائے جس کے ذریعے سے ان کی کسی برائی کو ظاہر کرنے کا موقع ملے۔ مضمون مکمل ہوگیا لیکن "عیب جوئی" کی ناکام کوشش نکتہ چینیوں کا منہ بند کرنے کے لئے اس "گناہ بے لذت" کے ارتکاب سے قاصر رہی۔ جب مضمون "سب رس" میں چھپنے کے لئے "نگرانی" کی زد میں آیا تو انھوں نے "اپنی نگرانی" سے "جائز" فائدہ اٹھاکر اسے چھاپنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن مادرِ جامعہ جانتی ہے کہ میں ایک "گستاخ شاگرد" رہا ہوں۔

میری گستاخی بعض اوقات، حد تعینات کی پروا نہیں کرتی۔ اُن کی "خو" اور میری "وضع" میں ایک تصادم ہوا اور جس کا نتیجہ ظاہر ہے یعنی "نگران کار" سے بچ کر "مدیر" کا یہ مضمون "سب رس" کے صفحات پر ایک کی نیکی اور دوسرے کا جرم بن کر نمایاں ہوگیا۔ ناقدین خوش ہوں کہ میں نے ڈاکٹر زور کی ایک برائی ظاہر کردی اور ڈاکٹر زور معاف فرمائیں کہ میں نے اپنی گستاخی کا اظہار کردیا۔"

میکش

ایک زمانے سے خیال تھا کہ ڈاکٹر زور پر مضمون لکھوں۔ اس لئے کہ اس غلط نواز اور ظاہر پرست ملک میں جب تک اپنے محسنوں کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی ہم صحت بخش مستقبل کی تعمیر نہ کرسکیں گے۔ کورانہ "شخصیت پرستی" بلاشبہ ایک کمزوری ہے۔ لیکن کسی نصب العینی انسان کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا بہرحال ضروری ہے۔ کھیت نہر سے پانی لے کر پانی نہیں اگاتا بلکہ اس پانی سے ایک لہلہاتی ہوئی فصل تیار کرتا ہے۔ "انفرادیت" کو کھوئے بغیر بھی انفرادیت میں بلندی پیدا کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں ہمیشہ بڑی ہستیوں ہی سے عظمت کا سبق لیتی رہی ہیں۔ میری نظر میں ڈاکٹر زور کے نام سے دکنی مستقبل کے لئے بھی ایک "نصب العینی ہستی" ملی ہے۔ جس کی روح میں لطافت اور دل میں جذبۂ عمل ہے، جو ماضی سے کچھ حاصل کر رہی ہے اور مستقبل کو کچھ دے رہی ہے، جس نے مشکلات پر قابو حاصل کرکے ایک ماحول پیدا کیا، اور جو آگے بڑھتے ہوئے ایک وسیع تر ماحول تیار کر رہا ہے۔ ہماری جدید نسلیں، اگر ان میں زندہ رہنے کی تڑپ ہے تو، اس نصب العینی ہستی کو ضرور سامنے رکھیں گی۔

میں ڈاکٹر زور کو صرف نثر نگار کی حیثیت سے دیکھوں تو میرا یہ زاویۂ نگاہ سطحی ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اقبال کو کوئی صرف شاعر کہہ دے، اقبال کو خراجِ تحسین ادا کرنے والا صرف اس کے شعروں پر جھوم کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنی روح میں، اپنی فکر میں، اور اپنی زندگی میں ایک انقلاب محسوس کرتا ہے۔ شعر نہیں بلکہ شعر کے ذریعے سے جو انقلاب پیدا ہوا وہی اقبال کی شاعری کی پیغمبرانہ کامیابی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر زور کی نثر نگاری نہیں بلکہ ان کی وہ تحریر جس نے دائرۂ عمل پیدا کیا، ان کی وہ گفتگو جو ہمیشہ پیام عمل دیتی رہی ہے، اور ان کی بے پناہ مصروفیتیں، اور دوسروں کو مصروف رکھنے کی کوششیں اصل میں ایک مضمون کا عنوان بننے کے قابل ہیں اس لئے کہ [illegible] عمل پیدا کرنے میں انہی کا حصہ رہا ہے۔

۲

ڈاکٹر زور پر ایک لکھنے والا یوں بھی لکھ سکتا ہے کہ "آپ حضرت شاہ عالم شہید کے پوتے قاری حافظ مولوی سید غلام محمد شاہ قادری صاحب کے فرزند اور خانوادۂ حضرت سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان رفاعی کے چشم و چراغ ہیں۔ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کو پیدا ہوئے۔ تعلیم عربی و فارسی سے دار العلوم میں شروع ہوئی۔ اور بعد کو سٹی کالج میں شریک ہوئے۔ اکیس سال کی عمر میں (۱۹۲۵ء) میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے مضامین فارسی اور اردو میں اول آئے۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے ام اے کی ڈگری لی اور اس دفعہ بھی اول آئے۔ ان امتیازی کامیابیوں کے پیش نظر حکومت نے یورپی وظیفہ دیا۔ چنانچہ اگسٹ ۱۹۲۷ء میں یورپ روانہ ہوئے۔ وہاں آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات کی۔ ۱۹۲۸ء میں پی ایچ ڈی ہوئے۔ اردو کے آغاز اور ارتقا پر ایک مقالہ لکھا۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور یونیورسٹی کالج (لندن) میں صوتیات کی تعلیم حاصل کی ۱۹۳۰ء میں تجرباتی صوتیات کا تحقیقاتی کام پیرس کے مشہور ادارۂ صوتیات "ے انستی تیوت دی فونیتک" میں ختم کیا۔ جو پیرس ہی سے انگریزی میں "ہندوستانی صوتیات" کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ اس زمانے میں ہند آریائی لسانیات اور خاص کر پہلوی اور جیسی زبانوں کے درس "سوربون یونیورسٹی پیرس" میں حاصل کئے۔ ۱۹۳۱ء میں یورپ سے واپس ہوئے اور جامعہ عثمانیہ میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور اب تک یہی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۳

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ "ڈاکٹر زور نے سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۵ء میں "روح تنقید" لکھی جب کہ وہ بی اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ "روح تنقید" فن تنقید پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد سے ان کی کئی کتابیں شایع ہوئیں۔ مثلاً

(۱) تنقیدی مقالات۔ اس کتاب میں اصول تنقید نگاری کی وضاحت کے لئے اردو کے بہترین ادیبوں اور کارناموں کی بلند پایہ تنقیدیں درج ہیں۔ یہ کتاب کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔

(۲) اردو کے اسالیب بیان۔ یہ اصل میں اردو نثر نگاری کی تاریخ ہے جس میں آغاز سے عہد حاضر تک کے بلند پایہ اور معیاری انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسلوب کی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

(۳) اردو شہ پارے۔ اردو کے آغاز سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب کے متعلق جدید ترین تحقیقات اور ادبی کارناموں کے اعلیٰ پایہ اور دلچسپ نمونے شامل ہیں جو یورپ اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کے کمیاب قلمی نسخوں سے منتخب کئے گئے ہیں۔

(۴) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ گزشتہ تیس سال سے اردو ادب میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا مفید و مکمل تذکرہ۔

(۵) سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ غزنین کے فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا دلچسپ تذکرہ جو معلومات آفریں ہے۔

(۶) ہندوستانی صوتیات (انگریزی)، اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جس کا تذکرہ کر چکا ہے۔

(۷) ہندوستانی لسانیات۔ اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح جس کے پہلے حصے میں علم لسان کے مقاصد، فوائد، تاریخ اور زبان کی اہمیت، ارتقا اور تشکیل سے متعلق اصولی معلومات ہیں اور دوسرے حصے میں اردو کے آغاز، ارتقاء، ادبی بولیوں اور اردو کی ہمہ گیری پر جدید ترین تحقیقات پیش کرکے اردو و ہندی کے جھگڑے اور اردو کے جدید رجحانوں اور ضرورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۸) فن انشاء پردازی۔ مضمون نگاری اور انشاء پردازی کے اصول اور فن تحریر میں تکمیل کے عملی طریقے بتائے گئے ہیں۔

(۹) طلسم تقدیر۔ زوال گولکنڈہ کے وقت کا ایک نیم تاریخی افسانہ ہے جو اتنا مقبول ہوا کہ دوسرا ایڈیشن بھی قریب الختم ہے۔

(۱۰) سیر گولکنڈہ۔ گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو دلچسپ افسانوں کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔

(۱۱) گولکنڈے کے ہیرے۔ سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ ہے۔

(۱۲) روح غالب۔ غالب کے خطوط کے ادبی حصے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شایع کئے گئے ہیں۔

(۱۳) سرگزشت غالب۔ غالب کی دلچسپ اور مستند و مجمل سوانح عمری جو اصل میں روح غالب کا ابتدائی حصہ ہے۔

(۱۴) گلزار ابراہیم۔ اردو کے مشہور تذکروں گلشن ہند اور گلزار ابراہیم کا مجموعہ۔ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

(۱۵) گارساں دتاسی مشہور محسن اردو کے حالات اور تصنیفات پر تبصرہ (مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی)

(۱۶) دیوان زادۂ حاتم۔ دہلی کے مشہور شاعر کا کلام اور حیات۔ (۱۷) متاع سخن۔ کلام عزیز کا انتخاب مع حالات۔

(۱۸) بادۂ سخن۔ کلام مائل کا انتخاب مع حالات۔ (۱۹) کیف سخن۔ کلام کیفی کا انتخاب مع حالات۔

(۲۰) فیض سخن۔ کلام فیض کا انتخاب مع حالات۔ (۲۱) مرقع سخن دو جلدیں۔ دکن کے بہتر شاعروں کا تذکرہ جس کی ترتیب نہایت اعلیٰ پایہ ہے اور جس میں مختلف اصحاب سے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھوا کر شامل کئے گئے ہیں۔

(۲۱) مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ بہار کے استاد سخن کے مکتوبات مع مقدمہ۔

ان کتابوں کے علاوہ کئی کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں اور سیکڑوں مضامین جو بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں، یورپ اور ہندوستان کے معیاری رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی نثر عام فہم اور سادہ ہوتی ہے جس میں روانی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں، جامعات کے نصابوں میں شریک ہیں، قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، اس لئے ان کے نثری نمونے پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ میں ان کے مکتوبات سے جو میرے نام ہیں بعض عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خط لکھتے وقت اس کو چھپوانے کا خیال پیش نظر نہیں رہتا اور اسی لئے خط میں کسی کے اصلی اسلوب کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

" اردو شاعری میں ہندوستانی عنصر" اچھا موضوع ہے اس پر مواد جمع کیجئے جتنا زیادہ مواد جمع ہو کتاب "

" اتنی ہی شاندار ہوگی اور آپ کا مطالعہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ کوشش کیجئے کہ دن کے بعض خاص اوقات روزانہ"

"محض مطالعہ کے لئے وقف رہیں۔ یہ عمر آپ کی استفادہ کی ہے۔ جتنا بھی ہو حاصل کیجیے۔ دینے کا وقت بعد میں آئے گا"
"اور ماشاء اللہ سے اب تک آپ نے جو کچھ لکھا ہے قابلِ فخر ہے اور خوش قسمت ہیں آپ کہ اس قدر جلد قدر دان بھی"
"پیدا ہو گئے ورنہ کتنے ایسے پھول ہوں گے جن کی بہار بے کسی اور ناقدردانی کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گئی اور آج دنیا"
"انھیں جانتی بھی نہیں۔ انسان ہمیشہ اپنے سے خراب حالت والوں کا مقابلہ کر کے اپنی حالت کو دیکھے تو کبھی مایوسی اور"
"ناکامی کا شکار نہ ہو اور جو لوگ آج آپ کو کامیاب اور سرخرو نظر آ رہے ہیں، آپ نہیں جانتے کہ ان میں کتنے ایسے"
"ہیں جن کو ابتدا میں بڑی بڑی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں! اور رشک و حسد اور مخالفتیں اور سختیاں اور رفضا کی"
"ناموافقتیں سب آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتی ہیں اگر انسان ذرا ہمت و استقلال اور صبر و شکر سے کام لے۔"
"اور مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ آپ میں یہ سب صفات موجود ہیں۔ آپ ضرور ایک روز"
"اردو ادب کے جگمگاتے ستارے بنیں گے اگر یہی ہمت و استقلال اور محنت و مطالعہ جاری رکھیں اور کبھی برخود"
"غلط نہ ہوں بلکہ خواہش مند رہیں کہ ع اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے"

"ہم سب کی اور ہماری کیا تمام ملک کی عرصۂ دراز کی خواہش، سب رس کی شکل میں پوری ہوئی ہے اور ہم اگر ذرا"
"اور توجہ اور محنت سے کام کریں تو یقین ہے کہ یہ کامیاب رہے گا۔ ہم کو ابھی سے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے"
"بلکہ موجودہ حالات سے سبق لے کر آئندہ کے لئے استحکام اور قوت پیدا کر لینی چاہیے۔ خاص کر آپ کے لئے یہ بڑی"
"آزمائش کا وقت ہے۔ اگر اس میں آپ کے قدم ڈگمگا جائیں تو یاد رکھئے آئندہ کے لئے بڑا خراب اثر پڑے گا اور"
"کوئی نیا اور اچھا کام شروع کرنے کی خواہش نہ ہو گی۔"
"آپ کی ذات سے ملک کی اور ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں اور ہم سب کی یہی کوشش ہے کہ آپ سرخرو رہیں۔"
"میں نے جو مشکلات اور موانعات پیش کئے ہیں وہ اس لئے پیش نہیں کئے کہ ان کو سن کر آپ پست ہمت ہو جائیں"
"اور ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں بلکہ اس لئے کہ آپ میں شدائد کے مقابلہ کی قوت پیدا ہو اور آپ موجودہ سے زیادہ سرگرمی"
"دکھائیں۔ ناامیدی اور پست ہمتی ان لوگوں سے ہمیشہ دور رہتی ہے جن کے سینے خلوص اور جذبۂ خدمت گزاری سے"
"معمور ہوں اور جن کے کام محض اپنے ملک کی بہبودی اور زبان کی فلاح پر مشتمل ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دل میں"
"خلوص اور بے غرضی کا سمندر موجیں مارتا رہتا ہے۔ آپ ہر اس کام میں اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے لئے"
"شریک ہو جاتے ہیں، جو ملک کے کسی پہلو سیاسی، علمی، ادبی کی تقویت کا باعث ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کا"
"جذبۂ عمل آپ کو مایوس ہونے دے، کام کرنے والوں اور مخلص خدمت گزاروں کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آتی"
"ہیں۔ ان کا راستہ اتنا صاف نہیں ہوتا جتنا ان غرضی بندوں کا ہوتا ہے جو محض نام و نمود یا ذاتی اغراض کی خاطر سرگرمی"
"دکھاتے ہیں اور دوسروں کو دھوکہ دے کر آپ ہی کی طرح اپنا اور دوسروں کے لئے کسی قسم کی شہرت یا قدر و منزلت دیتے"

" ہوتی ہے جب تک عروج ہے یا ان کا دہوکہ چل سکتا ہے وہ سرخرو رہتے ہیں۔ ایک زمانہ جلد یا دیر سے ایسا آتا ہے جب "
" اُن کی قلعی کھل جاتی ہے "

" ہمارا کام محض خلوص کی وجہ سے اور خدمتِ ملک کی خاطر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ ہم "
" بالکل مجبور نہ کردئے جائیں۔ ورنہ ہماری ساری قوتیں اس کام کو جاری رکھنے کے لئے وقف رہیں گی۔ ہمارے "
" اہل ملک ابھی پوری طرح سے بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم کو زیادہ توجہ اور محنت اور ایثار کی ضرورت ہے "
" میری دلی خواہش ہے کہ آپ ایک کامیاب مدیر، انشا پرداز اور شاعر بنیں اور ملک کے جمود اور غفلت کو دور کرنے "
" میں کامیاب ہوسکیں۔ میری بہترین توقعات آپ کے ساتھ ہیں۔"

" خط وصول ہوا۔ میری ہمشیرہ عزیزہ کی علالت اور وفات کا مجھ پر بے حد اثر ہے۔ میری عمر میں یہ پہلا موقع ہے کہ "
" اس قدر قریبی عزیز مجھ سے جدا ہوا ہے۔ بہر حال مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ "
" آپ اپنی صحت کا ضرور خیال رکھئے۔ صحت سب سے اہم ہے اور اسی صحت اور مشغولیت کی خاطر رسالہ بھی نکالا "
" گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے رسالہ کا سب کام آپ کے حسب منشا انجام پا رہا ہے "
" آپ کی تقریر اخبار میں چھپی تھی۔ بہت اچھی اور پختہ اور شائستہ ہے۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی "

کیا اس اسلوب تحریر میں ایک اردو ادب کو ترقی دینے والے اور اردو دانوں میں ادبی ذوق کو عام کرنے والے سرگرم عمل انسان کی روح نہیں بول رہی ہے ؟

— ۴ —

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ " ڈاکٹر زورؔ کی کتابوں اور ان کے ذوق عمل کے بارے میں ملک کے مشہور انشا پردازوں نے ان کے طالب علمی کے زمانے ہی سے اچھی رائیں دیں۔ چنانچہ پروفیسر وحید الدین سلیمؔ نے لکھا تھا کہ :-

" اگرچہ وہ بہ ظاہر چپ چاپ دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ اور ان کا دماغ علمی خیالات میں ہر وقت مصروف ہے "
" اردو و فارسی کے ادب سے ان کو خاص دلچسپی ہے۔ عجب نہیں کہ اگر ان کی یہی مشغولیت اور دماغی مستعدی رہی تو وہ "
" اردو انشا پردازوں کے دائرے میں خاص طور سے ممتاز خیال کئے جائیں اور دکن کو ان کی ذات پر ناز کرنے کا موقع "
" حاصل ہو۔

عبد الحلیم شررؔ لکھنوی نے لکھا تھا کہ :-

" روح تنقید آپ نے بڑی محنت اور قابلیت سے لکھی ہے۔ میں آپ کی اس کوشش کو بہت ہی قابل قدر تسلیم کرتا ہوں "
" اور اردو لٹریچر کی جانب سے آپ کا شکر گزار ہوں "

غلام بھیک صاحب نیرنگ نے لکھا تھا کہ :۔

"میں بڑے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب ادبیات میں ایک نہایت ضروری اور مفید اضافہ ہے۔"

پروفیسر سید اشرف شمسی مرحوم نے لکھا تھا کہ :۔

"ان کی اس عمدہ قابلیت کی ملک قدر کرے اور ان کو ممتاز افتخار حاصل ہو۔"

نیاز فتح پوری نے لکھا تھا کہ :۔

"جناب زور کا اردو پر احسانِ عظیم ہے کہ انھوں نے اس فن کے متعلق ایسی بیش بہا تصنیف پیش کی۔"

مولانا عمادی نے لکھا تھا کہ :۔

"اپنے موضوع پر اس صدی کی سب سے نمایاں کتاب کہی جاسکتی ہے۔"

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔"

غرض کہاں تک لکھئے۔ یورپ کے چند مشہور مستشرقین کی بھی ان کے بارے میں رائے دیکھئے کیونکہ بعض لوگ اپنوں سے زیادہ غیروں کی رائے کو مستند سمجھتے ہیں۔

پروفیسر لائیڈ جیمس صدر شعبۂ صوتیات نے لکھا کہ :۔

"مسٹر ایس جی ام قادری نے اس مدرسہ میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے سال انھوں نے عام صوتیات پر میرے"
"درسوں میں شرکت کی۔ انگریزی صوتیات کی عملی جماعتوں میں بہ حاضر رہے اور میری ذاتی نگرانی میں انھوں نے"
"اردو کی صوتیات پر کام کیا جس میں دکنی صوتیات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔"
"اس عرصہ میں یونیورسٹی کالج کی انگریزی صوتیات کی بعض جماعتوں میں بھی وہ شریک رہے اور میری"
"نگرانی میں انھوں نے اپنی زبان کا تجزیہ کیا۔ یہ کام جب تکمیل کو پہونچے گا تو علم زبان میں ایک گرانقدر اضافہ"
"ثابت ہوگا۔"

ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی ام اے۔ ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو و ہندی اور پروفیسر ولکنسن ناظم شعبۂ مشرقی برٹش میوزیم نے لکھا کہ :۔

"مسٹر قادری کا مقالہ ایک گرانقدر کارنامہ ہے۔ یہ بڑی حد تک اچھی ہے۔ یہ برٹش میوزیم، دفتر وزیر ہند، اڈنبرا یونیورسٹی"
"قومی کتب خانۂ پیرس کے کتب خانوں کے تحقیقاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں بہت سے ایسے ادیبوں کا تذکرہ"
"ہے جن سے آج تک دنیا واقف نہ تھی۔"

"نظم و نثر کے بہت سے ایسے کارناموں کا ذکر اس میں موجود ہے جو کسی اور ایسے تذکرے میں موجود نہ تھے"
"جو اس وقت تک شایع ہوا ہو موجودہ تذکروں کی غلطیاں اس میں درست کر دی گئی ہیں۔ مسٹر قادری اردو کے"
"مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے اردو لسانیات اندو آرین فیلالوجی پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس سے"

" انھیں بڑی بصیرت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے مقالے کے وہ حصے بہت دلچسپ ہیں جن میں اردو کی ابتدائی "
" شکلوں پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مقالہ علم میں ایک حقیقی اضافہ ہے خصوصاً اس کے وہ حصے جن میں دکنی اور شمالی "
" ہند کی زبان کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو دکنی صوتیات، ابتدائی دکنی ادب، پنجابی سے اردو کے تعلق "
" اور شمال میں اردو کے ابتدائی کارناموں سے متعلق ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ مصنف کئی اور گرانقدر تصنیفیں شایع کریں گے "

پروفیسر آر۔ ایل ٹرنر ناظم اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز نے لکھا کہ :-

" انڈو آرین زبانوں کی تقابلی گرامر پر میں نے جو لکچر دیے تھے اُن میں سید محی الدین قادری شریک رہے۔ میں نے "
" دیکھا کہ وہ ایک ذہین طالب علم ہیں اور انھیں اس موضوع سے بہت دلچسپی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ خاص طور پر "
" اُس وقت ہوا جب میں نے ان سے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے اس حصہ کی نسبت تبادلۂ خیال کیا جو انھوں نے "
" لسانیاتی پہلوؤں پر لکھا ہے۔ اس مطالعہ کی تیاری کے لئے ابتدائی سنسکرت کے درس کی جماعتوں میں بھی "
" شریک رہے اپنے پچھلے مطالعہ اور اس مطالعہ سے جو انھوں نے یہاں آنے کے بعد کیا اردو کی تقابلی تاریخی "
" تحقیقات کی بنیاد رکھ دی ہے جس کی بہت ضرورت تھی "۔

پروفیسر سیٹن سابق پرنسپل نظام کالج و نگران کار طلبہ حیدرآباد نے لکھا کہ :-

" وہ ہمارے انتہائی ذہین طالب علموں میں سے ہیں اور ان کا کیرکٹر ایسا ہے کہ کوئی شخص اس پر حرف نہیں رکھ سکتا "

—— ۵ ——

ایک مضمون اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے اب تک ملک کے مختلف اداروں کی تخلیق، تعمیر اور تکمیل میں اگر محبوبانہ حصہ لیا ہے۔ مجلۂ عثمانیہ، مجلۂ مکتبہ، ارتقاء اور مجلۂ طیلسانین کی اجرائی میں ان کی کوششوں کو نہیں بھلایا جاسکتا۔ مختلف چھوٹی بڑی انجمنوں کی سرپرستی اور صدارت کے علاوہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ " ادارۂ ادبیات اردو " کی تشکیل ہے۔ یہ ادارہ جیسا کہ اردو داں طبقہ جانتا ہے روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اس ادارہ کے لئے اپنی حیات عمل وقف کردی ہے۔ ان کی مسلسل دلچسپیوں اور مستقل سرگرمیوں کے باعث اس نے اب تک کئی معیاری کتابیں شایع کی ہیں اور اپنے اطراف اہل ملک کا ایک وسیع طبقہ پیدا کر دیا ہے جو ترقی اردو کے لئے بے غرض خدمات انجام دے رہا ہے " سب رس " اسی ادارہ کا ترجمان ہے۔ دکنی مخطوطات کی اشاعت کے لئے سٹی کالج کے یوم ولی کے بعد ایک مجلس مقرر کی گئی اس مجلس کے روح رواں بھی ڈاکٹر زور رہی ہیں۔ اس مجلس نے بھی بعض نایاب کتابیں شایع کردی ہیں اور کئی کتابیں زیر ترتیب اور زیر طبع ہیں۔ وہ انٹرنیشنل فونیٹک اسوسی ایشن کے واحد مسلمان رکن ہے جو ہندستان کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان کا یہی شغف اور ذوق ہے جس کے باعث وہ ہندوستان بھر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے باہر بھی کئی اداروں نے ان کے علم و عمل سے فائدہ اٹھایا، کئی عظیم الشان جلسوں کی انھوں نے صدارت کی انجمن ترقی اردو سے متعلق کئی مسائل کے حل میں مدد دینے کے لئے ان کو مدعو کیا گیا اور ان کی تصنیفات کئی ہندستانی جامعات کے نصاب میں داخل ہیں۔ الغرض حیدرآباد میں اور حیدرآباد کے باہر ان کی شہرت ان کی قوت عمل نے پیدا کی اور جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جارہا ہے وہ ترقی اردو میں زیادہ قوت کے ساتھ اپنی عملی صلاحیتوں کو صرف کررہے ہیں

— ۶ —

یہ چند پہلو تھے ڈاکٹر زور کی زندگی کے جن میں سے ہر ایک پر ایک طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنے اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں لکھا ہے، ان کی زندگی کا صرف یہی ایک پہلو ایسا ہے جو ان کی خدمات کو زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔ میں یہاں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ انھوں نے دکن کے اس صحت بخش تمدن کو جو جدید زمانے کے تیز رو دھارے پر بہا جا رہا ہے لوٹانے کی کوشش کی۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے دکن کی قدیم ادبیات کو دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ بتا دیا کہ دکن ترقی اردو میں کئی سو برس پہلے سے مصروف ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے اپنی تصنیفات اور تالیفات سے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا بلکہ میں صرف ان کے ذوق عمل اور خلوص خدمت پر یہاں زور دوں گا جس کی وجہ سے حیدرآباد میں مخلص خدمت گزاران اردو کی ایک قابل لحاظ جماعت پیدا ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر زور حیدرآباد کی ان چند ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے لبے حسوں کے ریگستان میں ایک چشمہ پیدا کیا۔ ایسا چشمہ جس کا پرسکون پانی سارے ریگستان کو ایک نخلستان میں بدل دیتا ہے۔ ان ایام کی یاد ابھی دلوں سے نہیں نکلی ہے جب دکن کے "بے زبانوں" کی راہ میں ملک بوس پہاڑ تھے۔ ان کی آواز سانس بن کر نکلتی تھی اور سانس بن کر سینے میں دفن ہو جاتی تھی۔ یہ حقیقت بھلا دی گئی تھی کہ دکن اور صرف دکن ہی وہ مقام ہے جس نے اردو کی مستقل سرپرستی کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ قطب شاہی زمانۂ حکومت میں اردو نثر و نظم کے زندۂ جاوید کارنامے ظہور پذیر ہوئے اور آج بھی جب کہ جامعۂ عثمانیہ کی حیات آفرین سرگرمیوں نے اردو کے قافلہ کو بہت آگے بڑھا دیا ہے، کوئی شخص مجرمانہ انداز میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دکن اردو سے غافل رہا۔

ڈاکٹر زور ملک کے ان گنتی کے فرزندوں میں ہیں جنھوں نے مرعوب ہوئے بغیر اپنی کتابیں شایع کیں۔ لکھتے وقت ان کے ہاتھ کانپے نہ قلم تھرایا بلکہ وہ ایک جرأت رندانہ کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنوں اور بیگانوں کو بتا دیا کہ اہل دکن "بے زبان" نہیں ہیں۔ خود اعتمادی کا یہی مستحکم احساس ہے جس سے ڈاکٹر زور نے جدید حیدرآباد کی خدمت زبان و ادب میں روح عمل پھونک دی اور اب جب کہ وہ دلوں سے مرعوبیت دور کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ترقی اردو کے لئے ان کی جد و جہد تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ حیدرآباد میں یوں تو بہت سے ایسے اصحاب ملیں گے جو انفرادی طور پر اردو کی پرخلوص خدمت کر رہے ہیں لیکن اس کی اشاعت اور ترقی کی منظم کوشش کا مرکز صرف ڈاکٹر زور کی ذات ہے۔

مبارکش

پیارے وطن کی پیاری

اُردو ہے سب کی پیاری، اُردو ہے سب کی پیاری — پیارے وطن کی پیاری، یعنی زباں ہماری
قومی یگانگت کا پیغام دینے والی — اک خوشگوار خدمت انجام دینے والی
اک یادگار ہے یہ بیتے ہوئے دنوں کی — الفت بھرے دنوں کی بھولے ہوئے دنوں کی
بچھڑے ہوئے دلوں کو آپس میں ہے ملاتی — پردے کو غیریت کے بالکل ہے یہ اٹھاتی
پھر رشتۂ اخوت اُردو ہی جوڑتی ہے — بھائی بنا کے "ہم[1]" کو اُردو ہی چھوڑتی ہے

ملکی زباں یہی ہے، قومی زباں یہی ہے
اپنا جہاں یہی ہے، ہندوستاں یہی ہے

اُردو میں کیا نہیں ہے کیا کیا نہ ہوگا اس میں — جلوہ نما نہیں کیا دنیا کی سب زبانیں؟
اُردو میں ہے نزاکت، اُردو میں ہے لطافت — اُردو میں ہے فصاحت، اُردو میں ہے بلاغت
اردو میں ہے روانی، اُردو میں ہے سلاست — اُردو میں ہے ملاحت، اُردو میں ہے حلاوت
اُردو میں ہے متانت، اُردو میں ہے طلاقت — اُردو میں ہے تقدس، اُردو میں ہے صداقت
اُردو میں وسعتیں ہیں ہندوستاں سے زیادہ — اُردو کی شہرتیں ہیں ہندوستان سے زیادہ
اُردو کی رفعتوں پر ہے سرنگوں فلک بھی — وہ خوبیاں ہیں اس کی ہوں تر زباں ملک بھی
اس پر بھی تم کو اُردو بھاتی نہیں ہے، حیرت! — شاید نہیں وطن کی دل میں تمھارے چاہت

پیارے وطن کی ہر شئے جاں سے عزیز تر ہے
اُردو کے مٹنے کو پھر کیوں یہ شور و شر ہے؟

سُلیمان اریب

[1] ہندو مسلمان۔

ذکرِ میر

اردو کا ذکر ہو اور دنیا میر تقی میر کو بھول جائے۔
ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ میر پر بہت سے مقالے نکل چکے
ہیں۔ یونہیں سہی۔ مگر آج ہم میر کا ہی ذکر کرینگے۔ خواہ
موجِ خون سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے۔ شیلے کہتا ہے
"ہمارے شیریں ترین نغمات وہ ہیں جو غم آگیں حسیات
کا اظہار کریں"۔ کتنا سچ کہتا ہے۔ واقعی ؎

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی
طپیدن دل مرغان رشتہ بر پا را

اسی جاذبیت و کشش نے آج میر کو قلمروئے سخن
کی صدارت پر متمکن کر دیا ہے۔ فرماں روایانِ ادب نے
میر کو اردو غزل گویوں کا سرتاج تسلیم کر لیا ہے۔ وہ ایک
عاشق کی زبان سے اس کی رودادِ قلب کا اظہار کرتے
ہیں۔ میر کے اندوہناک جذبات میں شدتِ غم، دل تنگی
اور مایوسی کا پیچ و تاب شامل ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر
یہ احساس ہوتا ہے کہ "خاموش انسانوں کے قلب میں
غموں کی کتنی پر اسرار گہرائیاں پوشیدہ ہیں"۔ ابونواس
نے سچ کہا تھا "قدرتِ خداوندی سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک
عالم ایک ہی شخص میں پیدا کردے"۔

یونان کی ایک بہت پرانی کہاوت ہے "مصوری
شاعری صامت ہے اور شاعری مصوری ناطق"۔ اگر شاعری
فی الحقیقت "مصوری ناطق" کو کہتے ہیں تو ہم میر کو
بھی ایک بہت بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہیں۔ اور یوں بھی
شاعر مصورِ فطرت تو ہے ہی۔

بیکن کا نظریہ ہے "شاعری دماغ کو بلند کرتی
ہے"۔ ڈاکٹر گراہم بیلی کی نظر میں اردو زبان کے بہترین
شعرا انیس، غالب اور میر ہیں۔

انسانی جذبات و احساسات ہی شاعری کی اصل
روح رواں ہیں اور اگر مل صاحب کی رائے سے اتفاق
کیا جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے۔

میر شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ لیکن ان کے رشتے
ناتے سے اس وقت ہم کو بحث نہیں۔ ہم ایک طائرانہ نگاہ
ان کے زندگی کے انوکھے حالات پر ڈالتے ہیں۔ اب اس
نگاہ میں ہمیں جو کچھ بھی مل جائے اس کو قلم بند کر دیا جائیگا،
ان کے میر تخلص کرنے پر ان کے والد بزرگوار نے انھیں
منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے
لیکن ان کے سید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ ان کی
مسکینی و غربت، صبر و قناعت، تقویٰ و طہارت ایک
محضر پیش کرتے ہیں اور یہ اوصاف خود ایک شہادت ہیں
میر کی سیادت کے۔ رہا زمانے کا۔ اس نے کس کو چھوڑا
ہے۔ کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود
کیوں کہتے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

آزاد کہتے ہیں "ہر چند کہ تخلص ان کا میر تھا۔ مگر
گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب بن کر چمکے۔ قدر دانی نے
ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا۔

اورنام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑا دیا۔ ہندوستان میں یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفے کے طور پر شہر سے شہر لے جاتے تھے۔"

میر اپنی نازک مزاجی اور بد دماغی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ باوجود فلاکت و نحوست کے جو اہل کمال کا سرمایۂ زندگی ہے ان کے دماغ ہی نہ ملتے۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ وضعداری کو نباہنے کا فن انھیں خوب یاد تھا۔

دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امراء و شرفاء کی محفلوں میں ادب ان کی جگہ خالی رکھتا تھا مگر بقول آزاد "خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔" ناقدری نے ان کا دل توڑ دیا اور اسی اجڑے ہوئے دل کو لیے ہوئے یہ دلی کو خیرباد کہتے ہیں۔ وہی دلی جس پر انھوں نے کبھی اس طرح سر دھنا ہے :—

دلی کے جو تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اسی دلی کے کھنڈر ہو جانے پر یوں کفِ افسوس ملتے ہیں

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

اب یہاں سے میر لکھنو چلے ہیں۔ ذرا اس لطیفہ کو آزاد سے سنیے :—

"جب لکھنو چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے بات کی۔ انھوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک، گاڑی میں بیٹھیے۔ مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

لکھنو پہنچ کر ایک سرا میں اُترے۔ معلوم ہوا یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ صبر نہ آیا۔ جی مچل گیا۔ اسی وقت ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا پہنچے۔ اپنی وضع و قطع سے ایک قدیم ملّا سے آدمی دکھائی پڑتے تھے۔ ان کے عجیب و غریب سج دھج دیکھ کر حاضرین محفل میں ہنسی کے ساغر چلنے لگے۔ لوگ سرگوشیوں میں اپنے قہقہے چھپانے لگے۔ میر صاحب ایک تو غریب الوطنی کا الم لیے ہوئے تھے۔ دوسرے ناقدرئ زمانہ کے ہاتھوں دلگیر و دل گرفتہ۔ ایک طرف بیٹھ گئے۔ جب شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب نے ان کی طرف ٹکٹکی لگا دی۔ کسی نے وطن پوچھا۔ میر تو بھرے ہی بیٹھے تھے۔ فی البدیہہ یہ مشہور قطعہ سنا دیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سارے ہنسنے والے اس درد بھرے موثر کلام کو سن کر کھسیانے ہو گئے۔ صبح ہونے ہوتے سارے شہر میں

یہ خبر پھیل گئی کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ میر کی نازک مزاجی کے تو بہت سے قصے مشہور ہیں۔ جن میں سے بعض تو بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک دن نواب صاحب موصوف نے ان سے ایک غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو گئے تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے؟ میر نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی اور آج حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہوگی کہہ دیجیے گا۔

ایک دن نواب صاحب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو انھیں حوض کے کنارے رنگین مچھلیوں سے کھیلتا دیکھ کر ناک، بھوں سکیڑ لیا۔ نواب حسبِ معمول انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہا میر صاحب کچھ فرمائیے۔ انھوں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ نواب کھیلتے بھی جاتے تھے۔ سنتے بھی جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے۔ وہ کہتے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر سنا کر میر خاموش ہو گئے، اور بولے پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں میں مشغول ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کر لیگا۔ میر صاحب بھلا کہاں تاب لاسکتے تھے۔ ان کے دکھی من کے لیے یہ فقرہ ایک تازیانہ تھا۔ غزل جیب میں ڈال گھر کا راستہ لیا اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد بازار میں نظر آئے۔ نواب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی محبت نے کہلوا دیا "میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے"۔ میر صاحب نے ٹوک دیا۔ بازار میں باتیں کرنا آداب شرفاء نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور گھر بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں عمر بسر کی۔ سنو برس کی عمر پائی۔ امراد کی تعریف و توصیف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ توکل و قناعت انھیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یا پھر شاید خودبینی و خودپسندی جو انھیں لیے دیے رہتی تھی، وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔

میر کے دیوان میں یوں نام کو سنتر دو بہتر نشتر ہیں۔ لیکن بقول "آزاد" "یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس، یہ کہہ اٹھتا ہے کہ دیکھیے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے"۔

غزل گوئی میں میر جس مقام پر پہنچے ہیں وہاں تک اب کسی کی رسائی ناممکن ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک عجیب انداز دکھاتا ہے۔ آزاد کہتے ہیں "حقیقت میں یہ انداز انھوں نے میر سوز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انھوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا"۔

یہاں پر ان کے کلام کا ایک مختصر سا نمونہ دیا جاتا ہے:۔

عشق کا گھر ہے میر سے آباد — ایسے پھر خانماں خراب کہاں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ہنگامہ ہو رہا ہے اک شیخ و برہمن میں

کعبے جانے سے نہیں کچھ مجھ کو اتنا شوق ہے
چال وہ بتلا کہ ہیں دل میں کسو کے جا کروں

مثل عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہیں یاں

مجھ دیوانے کی مت ہلا زنجیر
کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

لاگ اگر دل کو نہیں، لطف نہیں جینے کا
اُلجھے سلجھے کسی کاکل کے گرفتار رہو

کہتا ہے کون میرؔ کو بے اختیار رُو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

اثر ہوتا ہماری گر دعا میں
لگ اٹھتی آگ سب ارض و سما میں

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پرتو بھی
آنکھ میں آئی ہے نہ دنیا کچھ

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

رشکِ یوسف ہے آہ وقتِ عزیز
عمر اک بار کاروانی ہے

سو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں
نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے

ہو گئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

دنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی
کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

ہیں چراغ صبح گاہی ہوں نسیم
مجھ سے اک دم کے لیے کیا دشمنی

نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ
جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے

کہاں تک لکھوں۔ ایسے بیسیوں نشتر ہیں۔ اب انھیں کے ایک شعر پر یہ داستان ختم کر دی جاتی ہے۔

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

جہاں بانو بیگم

غزل

ہوا معلوم جب سے۔ میرے دل میں آپ کا گھر ہے
یہ دل اُس دن سے اب تک دل نہیں ہے مجھ کو دلبر ہے

بس اب راضی خوشی سے اُس پہ مرمٹنا ہی بہتر ہے
یہ دنیا جس میں دنیا جی رہی ہے موت کا گھر ہے

ہوا کرتے ہیں ظلم و جور بھی دلکش حسینوں کے
جو سب کے واسطے ہے عیب اِن کے حق میں زیور ہے

میں بے دل اور وہ دل دار۔ میں بے آس وہ آسا
نبھے کیا خاک یاری۔ اِک مفلس، اک تو انگر ہے

گل اندامُوں سے مل کر دل پہ وہ چوٹیں اُٹھائی ہیں
کہ باغِ دہر کا ہر پھول میرے حق میں پتھر ہے

عدو نے بھی اُڑا لیں ہیں ادائیں دل دکھانے کی
ستمگر جو تری صحبت میں بیٹھا ہے ستمگر ہے

نہیں کوئی کسی کا دوست بازی گاہِ دنیا میں
یہاں ہر ایک اپنے داؤ پر ہے اپنے ڈھب پر ہے

بُرا کہتا ہے جب اس سے بُرا دیکھا نہیں جاتا
نصیحت گر اگر دشمن ہے بُرا ہے تو بہتر ہے

وہ دینے میں نہیں رُکتا ہے لیکن اور کیا مانگوں
ضرورت سے زیادہ ہے مجھے جو کچھ میسّر ہے

وہ مُردے جن کو اُس کے حکم پر جینا نہیں آتا
وہی کہتے ہیں ایسی زندگی سے موت بہتر ہے

نہیں بڑھتے ہیں اپنی حد سے زندے ہوں کہ مُردے ہوں
سب اُتنے پانو پھیلاتے ہیں جتنی اُن کی چادر ہے

یہ دو باتیں ہیں بس اے چارہ گر آگے تری مرضی
جو غم نکلے تو اچھا ہے جو دم نکلے تو بہتر ہے

وہ چاہے سننے والوں کے لیے بے جوڑ باتیں ہوں
پڑھانے والے نے جو کچھ پڑھایا مجھ کو ازبر ہے

نہیں کی میں نے مال و جان و ایماں کے لیے کوشش
تو اِن کے بدلے وہ مل جائے جو اِن سب سے بڑھ کر ہے

پلا ساقی کہ باقی عمر بے ہوشی میں کٹ جائے
یہ میرے سر کا چکّر اب مری قسمت کا چکّر ہے

طلسمِ شارعِ عامِ محبت کھُل نہیں سکتا
کہ ایسا صاف رستہ اور پھر ٹھوکر پہ ٹھوکر ہے

ہر اک چھالا ہے شاہد گرمیٔ سوزِ محبّت کا
کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی میری زباں پر ہے

میں اُس کو دیکھتا ہوں آئینہ کیا ہے سکندر کیا
جو آئینہ کا آئینہ سکندر کا سکندر ہے

نہ پوچھو ہائے بیمارانِ غم کی زندہ درگوری
اِسی پر جی رہے ہیں موت کا ایک دن مقرر ہے

ہیں کم سے کم زیادہ سے زیادہ عشق کے معنی
سمجھنے والوں کو اک لفظ بے سمجھوں کو دفتر ہے

شہیدانِ محبت زندۂ جاوید ہوتے ہیں
جو سب کے واسطے ہے گور اِن کے واسطے گھر ہے

صفؔی کو طفلِ مکتب جانتے ہیں اس لیے شاعر
کہ ہر اک شعر اس کا بچے بچے کی زباں پر ہے

صفؔی (اورنگ آبادی)

صاحبزادہ میکش کی کتابیں

گریہ و تبسم

"گریہ و تبسم" کے نوجوان مصنف صاحبزادہ میکش کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پاکیزہ ادبی ذوق سے اہلِ ملک بخوبی واقف ہیں۔ "گریہ و تبسم" کے متعلق چند رائیں جو یہاں نقل کی جا رہی ہیں، یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ اُردو و ادب کی دنیا میں اپنا ایک شاندار مستقبل رکھتے ہیں۔

"ادبی خدمت گزاروں کی شستہ و منتخب جماعت کے ایک رکن میکش صاحب بھی ہیں جو مدت سے اپنے میخانہ سے شعر و ادب کے جام بھر بھر کر تقسیم کر رہے ہیں گریہ و تبسم انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ بعض بعض نظموں پر بے اختیار کلامِ اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔" (مولٰنا عبد الماجد دریابادی)

"صاحبزادہ میکش کا شمار ان نوجوان شعراء میں ہے جو اپنے شاعرانہ وجدان کو محض ادبیات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جنہوں نے اپنے لیے خیال و بیان کے کچھ نئے میدان بھی پیدا کر لیے ہیں۔ نوجوان حیدرآباد کی شاعری میں جو ذوقِ جدید پیدا ہو رہا ہے، اسی کا نقیب گریہ و تبسم ہے۔"
(قاضی عبد الغفار)

"آپ کے اشعار غیر معمولی صداقت اور جذبۂ محبت سے مملو ہیں۔ ملک و مالک کے ساتھ سچی اور بے غرض وفاداری ان سے عیاں ہے۔ جب تک دل میں کسی چیز کی حقیقت نہ ہو زبان اور قلم سے ایسے احساسات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جیسی کہ آپ کے کلام سے ظاہر ہے۔"
(محمد عبد الرحمٰن خاں سابق صدر جامعہ عثمانیہ)

"شاگردوں کے ادبی انہماک اور ادبی خدمات سے خوشی ہوتی ہے اپنے کلام پر مبارکباد قبول کیجیے۔"
(مرزا حسین علی خاں وائس پرنسپل جامعہ عثمانیہ)

"میکش کی شاعری کے پیچھے اُردو شاعری کی وہ تمام تحریکات کام کر رہی ہیں جو میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی ہیں، ان کے کلام کی سادگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ دماغ سے نہیں بلکہ دل سے شاعری کرتے ہیں — موضوع اور نقاطِ نگاہ عصرِ حاضر سے ہم آہنگ اسالیب قدیم اساتذۂ سخن سے مشابہ، یہی ہے خاص انداز جس کو میکش ترقی دے رہے ہیں۔" (عبد القادر سروری)

"گریہ و تبسم جدید اُردو شاعری میں ایک اضافہ ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اگر اس نوجوان شاعر کی کما حقہٗ قدر کی گئی تو اُردو زبان مستقبلِ قریب میں ایک اچھے شاعر سے بہرہ مند ہوگی۔" (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

کاغذ کی ناؤ

صاحبزادہ میکش خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ چنانچہ اُن کے خزینۂ ڈراموں کا مجموعہ "کاغذ کی ناؤ" ثابت کرتا ہے کہ وہ ادب کے ترقی پسند عنصر پر بھی اپنی قوتِ نگارش صرف کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کی تیسری کتاب "کھوئے ہوؤں کی جستجو" عنقریب شائع ہوگی اس کتاب میں قطب شاہی حیدرآباد کے متعلق نیم تاریخی نظمیں ہونگی جن میں سے بعض "سب رس" کے دکن نمبر میں شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال نے

فرمایا تھا:۔ "میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو"

صاحبزادہ میکش کھوئے ہوؤں کی جستجو کو شاندار مستقبل کی تعمیر کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ماضی کا ہر لمحہ حال کی رو میں بہا دینے کے قابل نہیں ہے۔ بیتے ہوئے دنوں سے، آنے والے دنوں کے لیے بھی کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شاندار ماضی کبھی دفن نہیں ہو سکتا بلکہ وہ عظیم تر مستقبل کی بنیاد بنتا ہے۔ زیر طبع

الٹی گنگا صاحبزادہ میکش کی چوتھی کتاب ان کے مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہوگی۔ اس مجموعہ میں بھوت، بدگمانی اور الٹی گنگا جیسے ڈرامے شریک ہیں۔ ان ڈراموں میں مزاح کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"آواز کی دنیا" نے آواز میں زندگی کو سمٹا دیا ہے۔ موصولی آلے ابھی "صورت نمائی" کے قابل نہیں ہوئے ہیں، آواز کے ذریعے سے منظر کی تصویر پیش کرنا نشر نگار کا سب سے بڑا کمال ہے۔ صاحبزادہ میکش کے غنائیوں (Musical Features) نے جو نشر گاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں، ہندوستان کے ہر خطے سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ "نغموں کی وادی" ان کے نشر شدہ غنائیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس مجموعہ میں طوفان کی رات، اندھی بھکارن، پھولوں کی خواب گاہ، نغموں کی وادی اور دوسرے غنائیے شامل رہیں گے۔ (زیر طبع)

کنول آخر میں ہم صاحبزادہ میکش کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور گیتوں کے دوسرے مجموعے کا تذکرہ کریں گے جو زیر ترتیب ہے۔ اس مجموعے کی "دنیائے شباب و شعر" کا اندازہ ان مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

نظم ہندوستان کے دو بند:۔

دھوپ سے جھلسے ہوئے بچے پہ فاقوں کے ستم　　جس کی ننھی سی زباں سوکھی ہوئی اور آنکھ نم

جیسے کچی نیند سے نازک سے ہونٹوں پر ورم　　جیسے بینا، ننھے کے دل میں فکر بیش و کم

جیسے بے رس پھول، جیسے بند مٹھی کا بھرم

کیا اسی کو پالتی ہے، مادرِ ہندوستان

اک سسکتا سانس، اک ٹوٹا ہوا تارِ رباب　　جیسے گہری فکر میں پچھلے پہر کا ماہتاب

جیسے باسی پھول کی بو، جیسے پت جھڑ کا گلاب　　جیسے دن میں چاند تارے، جیسے دریا میں حباب

جیسے دیوانے کی جنت، جیسے مفلس کا شباب

کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں، اے ہندوستان

نظم "اقبال کے شعر" سے چند شعر:۔

ایمان کی تفسیر قلندر کا ترانہ　　سمجھے تو پلٹ آئے بلندی پہ زمانہ

بے تابیٔ فطرت کی سکوں بخش کہانی　　شعلوں سے بنائی ہوئی شبنم کی روانی

الہام میں تکمیلِ حقیقت کی ادائیں　　شاہین کی پرواز، مجاہد کی نوائیں

سوئی ہوئی قسمت کو جگاتا ہوا نغمہ　　ہر سانس کو ہنگامہ بناتا ہوا نغمہ

پت جھڑ کی طرف دیکھ کے ہنستا ہوا بادل　　سوکھی ہوئی کھیتی پہ برستا ہوا بادل

اک روح جو انسان کو انسان بنا دے

اک درد جو جذبات کو ایمان بنا دے

نظم "پرچھائیاں" (تین بند)

کس وقت سے ہوا ہے احساس زندگانی

لو، میں تمھیں سنا دوں اس وقت کی کہانی

ہلکی سی چاندنی میں لہرا کے رات رانی　　تاروں سے کہہ رہی تھی جب عشق کی کہانی

لے کر نئی امنگیں آئی نئی جوانی

نزدیک پا کے مجھ کو جب دور ہو رہی تھیں　　مہندی کی باڑ میں تم مستور ہو رہی تھیں

بچپن بنی ہوئی تھی معصوم نوجوانی

پرچھائیوں سے اپنی گھبرا کے آ گئیں تم　　سینے پہ ہاتھ رکھ کر دل میں سما گئیں تم

شرما رہی تھی مجھ سے سہمی ہوئی جوانی

اس رات سے ہوا ہے احساسِ زندگانی

اب یاد آ گئی نا! بھولی ہوئی کہانی

مہتمم "سب رس"

غزلیات

فکر و نظر

مشاہداتِ جمال اور کم نگر کے لئے
یہ انکشاف ہیں مخصوص دیدہ ور کے لئے

نہ پوچھ کب سے ہوں بیتاب اس نظر کے لئے
جو ہو سکے نہ جدا اس کے عمر بھر کے لئے

بڑھا نہ بانگِ فغاں، ضبطِ سوز کر، جل جا
نمود و رقص کا موقع نہیں شرر کے لئے

تری لطیف تجلّی نظر میں بھر بھر کر
بنا رہا ہوں نئے آئینے نظر کے لئے

فضا خموش، ستارے اداس، پھیکا چاند
یہ اہتمام شبِ عیشِ مختصر کے لئے

یہ چھُپ چھپا کے نظر بازیاں تو رسمی ہیں
روش نئی کوئی ایجاد کر نظر کے لئے

وہ نالہ کر جو لبِ حسن پر فغاں بن جائے
وہ آہ کیا جو بھٹکتی پھرے اثر کے لئے

ہے شوقِ دید کسی ڈھب سے دیکھ ہی لوں گا
لگا نہ قید کوئی میری چشمِ تر کے لئے

نمودِ لالہ، ضیائے قمر، فروغِ شفق
یہ جتنے رنگ ہیں دھوکے ہیں سب نظر کے لئے

مطالباتِ وفا میں شریک ہوں دونوں
کروں میں نالہ، دعا تم کرو اثر کے لئے

ترے خیال میں بت، ذہن میں بتخانے
یہ سجدے بار نہ ہو جائیں سنگِ در کے لئے

شباب کا تو نہیں ہوش، ہاں خیال یہ ہے
کہ ایک نیند سی آئی تھی رات بھر کے لئے

پھر آئے عالمِ ہستی میں انقلاب اعجاز
کہ منتظر ہے نظر عالمِ دگر کے لئے

اعجاز صدیقی
مدیر شاعر آگرہ

غزل

کرم مجھ پہ کیا کیا وہ فرما رہے ہیں
ستم کر رہے ہیں، ستم ڈھا رہے ہیں

تبسم تھا اس رنگ سے انکے لب پر
میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں

تمہیں وجہ بیتابیٔ درد دل ہو
تمہاری ہی جانب کھنچے جا رہے ہیں

خوشی کا سماں ہے، ہنسی گلفشاں ہے
خبر آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں

بہار ایک دم کی ہے کھلنا نہیں کچھ
یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں

ہے آباد میرے تصور کی دنیا
حسیں آ رہے ہیں، حسیں جا رہے ہیں

جلیل اُن کے صدقے جو صہبائے رنگیں
پلا کر مجھے ہوش میں لا رہے ہیں

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

رضوانیات

حیا رخصت ہوئی شوخی اٹھاتی ہے نقاب اُن کا
الٰہی خیر رخصت ہو رہا ہے اب حجاب ان کا

کشش ہے یہ محبت کی کہ ہے یہ بھی حجاب اُن کا
جو مجھ سے روز بڑھتا جا رہا ہے اجتناب اُن کا

دل مرحوم کی کیا اب وفائیں یاد آئی ہیں
ہوا جاتا ہے کیوں محبوب حُسن کامیاب اُن کا

جفائیں ہو رہی ہیں پردۂ صبر آزمائی میں
کرم بھی ہوتا ہے مجھ پہ باندازِ عتاب اُن کا

سوالِ وصل پر پہلو سے اُٹھ کر روٹھے جاتے ہیں
شکیب و صبر کا دشمن ہے یہ رنگ عتاب اُن کا

ہمیں سے ہو رہی ہیں چھیڑ کی باتیں بھی محفل میں
ہمیں دشمن بھی ہیں اور پھر ہمیں سے ہے حجاب ان کا

نگاہِ واپسیں بس رحم کر دیکھا نہیں جاتا
یہ منھ کو پھیر کر رونا یہ حالِ اضطراب ان کا

لکھی ہیں خط میں وہ باتیں نہیں جو میری قسمت میں
مری تقدیر کا لکھا ہوا آیا جواب ان کا

اٹھائی جا رہی ہے اس طرح تمہید محشر کی
قیامت کا نمونہ بن کے آتا ہے شباب ان کا

نگاہِ قہر میں شوخی ذرا آواز میں تیزی
لئے ہے سا تھ میں لا کھوں اداہیں اک عتاب ان کا

علامہ سر شیخ محمد اقبال مرحوم

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

مزے کے آئے دن امید ابن عشق کی راتیں
کہ ہم آغوش ہوتا ہے لڑکپن سے شباب ان کا

امید رضوی بریلوی

غزل

اور دل توڑ کے جانے والے۔ دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھاتا جا
میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی سنتا جا شرماتا جا
تجھکو ابر آلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا۔ بہلاتا جا
یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکر نعمت بھی کرتا جا۔ دامن بھی پھیلاتا جا
دونوں سنگ راہ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی
ذوق طلب۔ ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا!
نغمے سے جب پھول کھلینگے چننے والے چن لینگے
سننے والے سن لینگے۔ تو اپنی دھن میں گاتا جا

حفیظ جالندھری

غزل

نہیں بہار ہی کچھ زمزمہ سرائے بہار
کلی کلی کا چٹخنا بھی ہے صدائے بہار
ریاض دہر میں ہوں میں مثال نکہت گل
مجھے اڑائے لئے پھرتی ہے ہوائے بہار
دبی نہ آگ جدائی کی سیر باغ سے بھی
غضب ہے اور بھی بھڑکا گئی ہوائے بہار
لگا دے لکھ کے یہ کوئی مزار بلبل پر
شہید غمزۂ گل کشتۂ ادائے بہار
ہزار دل حسن برستے ہیں غنچۂ گل پر
نہ جانے کون ہے صورت گرا دائے بہار
بڑے مزے میں ہیں وہ لوگ باغ عالم میں
جو آشنائے خزاں ہیں نہ آشنائے بہار
چمن میں جوشش نمو سے نکھر کے رنگ گلاب
ہوا ہے روکش رنگینی حنائے بہار
زوال ایک کا ہے دوسرے کو وجہ عروج
جو انتدائے خزاں ہے وہ انتہائے بہار
چمن میں آکے ذرا جامہ زیبیاں دیکھو
گلوں کے جسم پہ پھبتی ہے کیا قبائے بہار
ہنسا دے باد صبا گدگدا کے غنچوں کو
اٹھا دے آج ذرا پردۂ حیائے بہار
ابھی تو ان کا شباب ورگل کھلا بیرگا
ابھی کو نام جدا ہے یہ ابتدائے بہار

قفس میں گزرے نہ معلوم کیا عنادل پر — جب آشیانے ہی میں رات دن رلائے بہار
بہار تھی تو نہ کی ہم نے کچھ بہار کی قدر — گئی بہار تو اب چیختے ہیں ہائے بہار
نہیں ہے کام کسی سے قفس نصیبوں کو — چمن سے جائے خزاں یا چمن میں آئے بہار
ہنسی ہے پھولوں کے لب پر خموش ہیں غنچے — بقدرِ فہم جو سمجھے ہیں مدعائے بہار

جو تجھ سے کوئی سنے تو سناؤں اے خنجر
عجیب قصۂ دلکش ہے ماجرائے بہار

میر یاور علی خنجر

بہاراں

بادِ صبا یہ جھومتی آئی ہے کس دیار سے — جیسے شمیم پھوٹ پڑے سینۂ لالہ زار سے
گاہ چمن میں جھومنا، گاہ چمن کو روندنا — کیف اڑا کے لائی ہے موج خرامِ یار سے
پھر ہو نمودِ زندگی موج خرامِ یار سے — حشر یہیں بپا کریں کون اٹھے مزار سے
برق سی کوندنے لگی اٹھنے لگے شرار سے — میری نگاہ لڑ گئی جب بھی نگاہِ یار سے
ضبطِ نظر نہ ہو سکا عشقِ کرشمہ کار سے — بڑھ کے نقاب الٹ دیا روئے حسینِ یار سے
منزلِ رنگ و نور سے مرحلۂ بہار سے — منزلِ نظر گذر بھی جا عالمِ اعتبار سے
فقر کو بیر ہے بیر ہے دولتِ لالہ زار سے — جنسِ جنوں بھی ہو تو میں بھیک نہ لوں بہار سے
موڑ گئے منہ بہار سے پھیر کے رخ ہزار سے — کھیل رہی ہیں تتلیاں، اُن کے گلے کے ہار سے
زلف میں یاسمن کے پھول، موسمِ گل کے وہ رسول — توڑے ہوئے بہار کے، چھینے ہوئے بہار سے
روح نہ تھی تبسم میں، جان نہ تھی بہار میں — کچھ بھی نہ تھا کنار میں، وہ جو اٹھے کنار سے
جوشِ نمو کو گل بہ گل لالہ بہ لالہ دیکھ کر — روحِ جنوں ابل پڑی خم کدۂ بہار سے
فطرتِ حسن و عشق کی ہائے رے بیقراریاں — میں جو ہوں، ناشکیب سا، وہ بھی ہیں بیقرار سے
آج یہ ڈوبتے ہوئے نجمِ سحر نے کیا کہا — خون سا کچھ ٹپک پڑا دیدۂ انتظار سے
حسن ہی کو نہیں گلہ عشق بھی تنگ آگیا — ان کو رُلا رُلا دیا شکوۂ بار بار سے
دل سے کسی کی یاد بھی کرتی ہے یوں ہی شوخیاں — جیسے صبا الجھ پڑے گل کدۂ بہار سے
خود وہ الجھ کے رہ گئی [illegible] — [illegible] زنگار سے

ساغرِ خامہ کار پی، بادۂ مشکبار پی
بادہ نہیں بہار پی میکدۂ بہار سے

ساغر نظامی

غزل

مآلِ زندگانی ہے محبت کیش ہو جانا — دلیلِ کامرانی آفتیں در پیش ہو جانا
ہمارا حاصلِ ہستی یہی ہے حضرتِ ناصح — جگر مجروح۔ سر آشفتہ اور دل ریش ہو جانا
ہمیں مطلب نہیں ہے نیک و بد سے کیشِ الفت میں — رقیبوں کو مبارک ہو مآل اندیش ہو جانا
کسی کو دیکھ کے دل ہمنے اگر سیکھا تو یہ سیکھا — جفا سہنا۔ وفا کرنا۔ محبت کیش ہو جانا
جنہیں ہو عشقِ صادق روک سکتا ہی نہیں انکو — مصیبت ہائے گوناگوں کا گردو پیش ہو جانا
محبت اوّل و آخر ہے دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو — مبارک عاشقوں کو عاقبت اندیش ہو جانا

رہو دنیا میں دنیا سے الگ اے حضرتِ عابد
وگرنہ کونسا دشوار ہے درویش ہو جانا

قاضی محمد زین العابدین عابد

غزل

ہنس رہا ہوں لبِ مجبور پہ فریاد نہیں — کوئی کیا جانے کہ خوں گشتہ ہے دل شاد نہیں
کیا کہوں کس لئے رہ رہ کے تڑپ اٹھتا ہوں — دل میں اک تیر ہے پیوست تری یاد نہیں
کیا کروں آہ بھلایا نہیں جاتا مجھ سے — وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں
کیا مرے خواب میں آنے کا بھی قدغن ہے تمہیں — قید ہے جسم میں تو کیا روح بھی آزاد نہیں
چاندنی، کاہکشاں، پھول، گھٹائیں، نغمے — کیا یہ سب میری تمنا کی ہیں روداد نہیں
یاد ہے وہ شبِ مہتاب میں آہنگِ رباب — اور وہ نکہتِ صحرا جو چمن زاد نہیں
یاد ہے عکسِ شفق سے وہ دلِ دریا میں — منظرِ حسن کہ "منت کشِ" بہزاد نہیں

یاد ہے چھاؤں میں تاروں کی وہ سیرِ کہسار
اور وہ شکوۂ قدرت کہ ہم آزاد نہیں

وجاہت حسین عندلیب شادانی
(ڈھاکہ)

نغمہ و فریاد

میں باغ میں گر نغمۂ دلگیر سنا دوں / بلبل کو بھی فریاد کے آداب سکھا دوں
کیا تجھ سے کہوں کیا ہیں مری آہ کے جھونکے / چاہوں تو ستاروں کے چراغوں کو بجھا دوں
اچھا ہے کہ سجدے مرے بیکار نہ جائیں / تقدیر کی پیچیدہ لکیروں کو مٹا دوں
ڈرتا ہوں کہیں پھول کی پتی نہ لچک جائے / شبنم کو جو کرنوں کی کشاکش سے چھڑا دوں
ہیں حسن کے ہر ظلم کو، ہر جور کو سہہ کر / اوروں کے لئے عشق کو آسان بنا دوں
ہنس ہنس کے وہ کہتے ہیں کہ ہم بھول گئے تھے / مطلب یہ ہے گزری ہوئی باتوں کو بھلا دوں
ساغر کی کھنک، قلقلِ مینا ہیں سمو کر / دنیا کیلئے ایک نیا ساز بنا دوں
گلشن جسے کہتے ہیں وہ آتشکدہ بن جائے / ہیں آتشِ گل کو جو نگاہوں سے ہوا دوں

جس نظم پہ ماہر کو بہت داد ملی تھی
کہئے تو وہی نظم، ترنم سے سنا دوں

ماہر القادری

غزل

ہمارے اشکِ خونیں کی روانی دیکھتے جاؤ / لہو کا ہے لہو پانی کا پانی دیکھتے جاؤ
ہوئی ہے شادیٔ مرگ آج تم سے ملکے دشمن کو / تماشا ہے وفورِ شادمانی دیکھتے جاؤ
تمھاری رہ گزر میں قتل ہو کر سیکڑوں اب چپ ہیں / ادھر آؤ تم ان کی بے زبانی دیکھتے جاؤ
تمھارے دیکھنے والوں کا دم اب تو لبوں پر ہے / اثر لایا ہے کیا سوزِ نہانی دیکھتے جاؤ
نہ دیکھو آئینہ جاتے ہوئے دشمن کی محفل میں / تم اپنا حسن اپنی نوجوانی دیکھتے جاؤ
نہیں ہے بے سبب طوفان اتنا دیدۂ تر کا / مری حالت کی ہے یہ ترجمانی دیکھتے جاؤ

معین کے شعر سن کر بندہ پرور تم بھی خوش ہو گے
ذرا اس کی طبیعت کی روانی دیکھتے جاؤ

معین

جناب ماہر القادری صاحب

جناب راگھویندر راؤ صاحب جذب

غزل

اے پیکرِ خیال نگاہوں پہ چھا کے دیکھ
میرا عیارِ ذوقِ نظر آزما کے دیکھ

جنت نظر ہے، منظرِ رنگینیٔ جہاں
آنکھوں سے امتیاز کا پردہ ہٹا کے دیکھ

کتنی جنوں نواز ہے دنیائے رنگ و بو
اک بار دل میں شمعِ محبت جلا کے دیکھ

تارِ نظر ہو تارِ رگِ جاں بنا ہوا !
لایا ہوں نذرِ غم، ادھر مسکرا کے دیکھ

ہمدم نگاہِ ناز عجب کام کر گئی
تیور بدل گئے، دلِ بے مدعا کے دیکھ

طغیانِ عشق سیلِ حوادث پہ چھا گیا
اے حسن تو بھی زحمتِ طوفاں اٹھا کے دیکھ

سکندر علی وجد

"کچھ نہیں" کے دو پہلو

جنہیں عشق سے واسطا کچھ نہیں
انہیں حسن سے کیا ملا؟ کچھ نہیں

جہاں زہدِ خشک آگیا، اس جگہ
محبت، مروت، وفا کچھ نہیں

خدا جانے کس دل سے کہتے ہیں لوگ
حسیں اور ان کی ادا کچھ نہیں

نہیں دل کی طلعت، جو یہ ماہوش
شبِ ماہ میں بھی مزا کچھ نہیں

شرر ہیں یہ ہنس مکھ ستارے اگر
تو ہر خندۂ خوش نما کچھ نہیں

نظر کے ہیں دھوکے مناظر اگر
تو پھر یہ چمن یہ فضا کچھ نہیں

حکیموں پہ حیرت نہ ہو کیوں مجھے
بڑھا علم تو کہہ دیا کچھ نہیں

نہ ساقی نہ ساغر نہ شاہد نہ باغ
مآل ان کی تحقیق کا کچھ نہیں

۲

وجود ان کا میری نظر میں بھی کیا
عدم ہے، عدم کے سوا کچھ نہیں

کہوں کیسے ہستی کے گلزار میں
فنا ہی فنا ہے بقا کچھ نہیں

میں خوش حسن سے ہوں سوا حسن کے
مری زیست کا مدعا کچھ نہیں

اگر میری نظروں سے دیکھے کوئی — بقا ہی بقا ہے فنا کچھ نہیں
یہ معمورۂ حُسن ہے تو یہاں — خوشی ہے خوشی کے سوا کچھ نہیں
نگاہِ حقیقت رسِ حُسن سے — تعلق غم و رنج کا کچھ نہیں
مزے اہلِ دل کے لئے ہیں بہت — کہاں ہیں نے کب؟ یہاں مزا کچھ نہیں
یہ ساقی یہ ساغر یہ شاہد یہ باغ — حلاوت ہے دل میں کیا کچھ نہیں

علی منظور

میری ہمسائی

جبیں نغموں سے پُر نگاہیں — دریچہ میں مسکرا رہی تھیں
در نوجوانی کی داستانیں — پیام عشرت سنا رہی تھیں
شباب انگڑائی لے رہا تھا — جبینِ نور میں چمک رہی تھی
گلاب کی بھینی بھینی خوشبو — فضا میں ساری مہک رہی تھی

ندیم! ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی!
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

عجیب منظر عجب سماں تھا — مری نگاہوں کے عین آگے
بہار کی چاندنی میں جیسے — دکھائی پڑتے ہیں چاند تارے
لطیف ہونٹوں پہ تھا تبسم — جمال افروز خواب آسا
نظر سے مستی ٹپک رہی تھی — شراب آسا، شباب آسا

ندیم، ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

نگاہِ بد سے خدا بچائے — بہار تصویر سامنے تھی
جمیل خوابوں کی گویا میرے — حسین تعبیر سامنے تھی
ملاحتوں میں صباحتوں میں — رخِ حسیں جگمگا رہا تھا
ادائے دوشیزگی کے صدقے — شباب بھی گنگنا رہا تھا

ندیم، ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

محبوب حسن جگر (عثمانیہ)

مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط

ادارۂ ادبیات اُردو نے مشاہیر اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط اور تحریروں کے جمع کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔ اس وقت تک متعدد کرم فرماؤں نے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دیگر مشاہیر کے بھی بیسیوں خطوط اور تحریریں عنایت کی ہیں جن میں سے صرف چند خطوط اس اُردو نمبر میں شایع کیے جا رہے ہیں۔ ان خطوط میں نمبر (۱) معصومہ بیگم مرزا حسین علی خاں صاحب نمبر ۲، ۴، ۵، ۸ اور ۹- سکینہ بیگم سید رحمت اللہ صاحب کے ۳، ۱۰ تا ۱۶ صغریٰ بیگم سید ہمایون مرزا کے اور ۶، ۷ .... ڈاکٹر زور کے عطیہ ہیں۔

شبلی نعمانی کے خطوط

بنام طیبہ بیگم صاحبہ بلگرامی بنت عماد الملک

مکرمہ من۔ تسلیم

کل میں نواب عماد الملک بہادر سے ملا اور اتفاق سے کل ہی میرے نام ایک خط خواجہ صاحب کا ووکنگ سے آیا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ ریاست سے تو امداد ممکن نہیں لیکن خواجہ صاحب کو لکھ دو کہ بہت جلد (یعنی دس پندرہ دن کے بعد) ہم لوگ ان کے مشن کے لیے ایک معقول ماہوار رقم مہیا کر دیں گے۔ جناب نواب صاحب موصوف اور مولوی انوار اللہ صاحب مل کر اس کام کو کریں گے۔

لکچر کے لیے میں حاضر ہوں۔

خواجہ صاحب کا خط مع اپنی تائید کے کسی اخبار میں شایع کر دونگا۔

شبلی

شہر یور ۱۳۲۳ف
(کاچی گوڑہ)

بنام طیبہ بیگم (بنت عماد الملک)

بھوپال

مکرمہ من

تسلیم۔ خواجہ کمال الدین کے لیے جو کچھ یہاں کر سکا اس کی اطلاع دے چکا ہوں۔

اس وقت یہ تحریر ہے کہ "ظل السلطان" خاص خواتین کا پرچہ ہے اور حضور سرکار عالیہ کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ اس لیے آپ کبھی کبھی اس میں کچھ لکھا کریں تو بہت منت ہوگی۔

شبلی

۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء

بنام سید ہمایون مرزا بیرسٹر ایٹ لا

مکرمی

ہم لوگ نیلام جا رہے ہیں۔ اگر آپ کے سونے یا کسی اور کام کا وقت نہ ہو تو چلیے۔

شبلی

۱۹ اکتوبر ۱۹۰۸ء

طیبہ بیگم کے خطوط

بنام لیڈی سر آسمان جاہ

جناب بیگم صاحبہ معظمہ و محتشمہ دام عنایتہا

بعد تسلیم عرض خدمت گرامی یہ ہے کہ اگر ۱۵ ماہ محرم

کے لیے صرف وہ دربار ہال جو آپ نے مس ایونس کو
انعام کے جلسہ کے لیے عنایت فرمایا تھا مجھے بھی
عنایت ہو تو میں نہایت ممنون ہوں گی صرف
ہال اور اس کے اندر کا اسٹیج باقی سب کمرے
بند رکھے جائیں۔ اگر چودہ تاریخ سے اجازت
ہو جائے تو پردہ کا انتظام کروا دیا جائے۔
مولوی شبلی صاحب جو ایک مشہور و معروف
لکچر دینے والے ہیں، اشاعت اسلام پر لکچر دینگے۔
سامنے کے اسٹیج پر وہ رہینگے اور اس کے مقابل
کے دروں پر پردہ باندھ دیا جائے گا۔
اگر ہال کی اجازت دلوادی جائے تو میں
نہایت ممنون ہونگی۔ ۱۵ محرم کو اتوار کا روز بھی
رہے گا۔ دفتر بھی بند رہیگا۔

طیبہ بیگم

بنام عزیز فاطمہ بیگم شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا

جناب ہمشیرہ صاحبہ
آپ کا مضمون ماشاء اللہ نہایت عمدہ ہے۔
اُردو تو آپ ہمیشہ سے پُرزور لکھتی ہیں مگر جہاں
خدا کا ذکر ہو پھر وہاں کا کیا کہنا ہے۔ اُبلا ہوا
دل چھلک پڑتا ہے۔ آپ تو عشق اللہ میں صوفیوں
کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کے مضمون میں صرف جو
بات کانوں کو ناگوار گذرتی ہے وہ میرا ذکر ہے۔
میں اس کے خلاف ہوں۔ بہت سی وجوہ ہیں۔
صرف اس کو انکسار نہ سمجھئے۔ عند الملاقات
کہونگی۔ خدا ہم کو آپ کی دعوت میں شریک

ہونا نصیب کرے فقط
طیبہ بیگم

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے خطوط

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ ڈل

مہربان من
آپ کی غزل بہت اچھی ہے۔ آپ کے اُستاد
شاگرد فیض صاحب نے بہت خوب بنائی ہے۔
غزل کی تعریف، آپ کی طبیعت کے ... رسا
کی اور ان کی اصلاح کی داد دیتا ہوں اس میں
کہیں گنجائش اصلاح نہیں ہے نسخہ جو ممکن ہے
اس کو آپ خوب دیکھ سکتے ہیں۔

ہیچمدان فصیح الملک داغ دہلوی

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ ڈل

الحمد للہ کہ خیریت سے ہوں۔ روزہ رکھ رہا ہوں۔
کمشنر صاحب صفائی چادر گھاٹ سے جھگڑا ہے۔
مثانہ کے درد کے واسطے دوا بھجوا دو پہلی دوا
مفید ہوئی۔ فقط

گرامی کے خطوط

بنام نواب قادر نواز جنگ بہادر

ہوشیار پور۔ پنجاب
عالی جناب نواب قادر نواز جنگ بہادر
تسلیم۔ آپ کی صورت دل نواز، آپ کی سیرت
دلفریب، آپ کا کلام دلفریب، آپ کا دہ

خلق گرامی نواز، گرامی کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

حضرت قاضی صاحب کو کہہ دیجئے کہ گرامی کو صوبہ صاحب بہادر کا جذبۂ اخلاص حیدرآباد میں کھینچ رہا ہے۔ بفضلِ خدا فروری کے مہینے میں گرامی نواب قادر نواز جنگ بہادر کی مجلس سماع میں حاضر ہو جاوے گا۔

گرامی حضرت قاضی صاحب کی محبت کا دلدادہ ہے۔ اور صوبہ صاحب بہادر کا رہین منت سپاسگزار۔ گرامی چند رباعیاں بھیجتا ہے۔ مجھے امید ہے نواب قادر نواز جنگ بہادر پسند فرماویں گے۔

راقم۔ گرامی

بنام مولوی سیّد احمد

حضرت سید صاحب

رطب و یابس لکھدیا گیا ہے۔ طول بے معنی ہوتا ہے۔ ہر چہ گیرید مختصر گیرید۔ دو شعر نکال دئے گئے۔ خط کھینچدیا گیا ہے۔ خوشخط لکھوا لیجئے۔

راقم۔ گرامی

راشد الخیری کا خط

بنام صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

عزیزہ محترمہ۔ سلام مسنون

میں خود آپ سے اسوقت ٹیلیفون پر گفتگو کرتا کہ آپ کا پرچہ پہنچا۔ کھانا یہاں بھی آپ کا ہے اور وہاں بھی۔ اصلی چیز آپ کی محبت، خلوص اور قدردانی ہے جس کا میں ممنون ہوں، بیگم راشد الخیری آج دہلی جارہی ہیں اور ان کا جانا نہایت ضروری ہے کیونکہ یکم اکتوبر سے نیا سیشن شروع ہوتا ہے اور روپیہ کی تعداد دیکھ کر فیصلہ ہوتا ہے وہ آپ کے ہاں جا چکی ہیں۔ میں دو دفعہ جا چکا ہوں اگر آپ کی رائے میں کھانا نہایت ضروری چیز ہے تو میں حاضر ہوں اور آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں کسی روز آکر بغیر اطلاع جو موجود ہوگا کھا لوں گا۔ نواب معین الدولہ بہادر سے اس وقت ملنے جارہا ہوں امید ہے روپیہ مل جائیگا۔

بیگم مرزا یار جنگ صاحبہ گھر پر موجود نہ تھیں شاید آج کل میں آجائیں۔

میں ابھی ایک ہفتہ اور ٹھہرونگا روانگی سے قبل یہاں کا حساب پریس میں بھیجکر آپ سے انشاء اللہ ملتا ہوا جاؤنگا۔

سید ہمایوں مرزا صاحب کی خدمت میں سلام علیک فرما دیجئے۔

دعاگو

راشد الخیری

نواب امداد امام اثر کے خطوط

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

کیمپ بڑکاڈانڈی	مورخہ ۲۴ مارچ سنہ ۱۹۱۳ء

مجمع فضائل و جود و خیال خلاصۂ خاندان مصطفوی و مرتضوی دام مجدکم

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ محبت نامہ وارد ہوا۔ دریافت خیریت سے مسرت قلبی حاصل ہوئی۔ خدائے تعالیٰ آپ کو ترقی اقبال کے ساتھ حی و قائم رکھے

میری سرگزشت یہ ہے کہ آپ کی لقائے صوری کے بعد جب سے میں وطن کو کلکتہ سے واپس آیا انواع اقسام کی تکلیفات روحی وجسمانی میں مبتلا رہا اور اس وقت تک بلاؤں سے نجات نہیں ملی ہے۔ دو مہینے سے ہز ہائنس نواب صاحب فرمانروائے رامپور کا مہمان ہوں۔ یہاں تقریب شکار سے ہمرکاب آیا ہوں۔ نہیں معلوم کہ کب تک وطن کو معاودت کر سکوں گا۔ وطن کی یہ حالت ہے کہ دس مہینے سے نیورہ نہیں گیا ہوں۔ میں اپنی پریشانیوں کو کیا عرض کروں۔ آپ کی تصنیف شریف گیا میں ہے ساتھ نہیں ہے۔ اُس پر ریویو لکھنے کا مجھے کوئی موقع حاصل نہیں ہے۔ البتہ گیا جاکر تعمیل حکم کر سکوں گا۔ اس وقت امیدوار معافی ہوں۔ فقط زیادہ حد ادب دعاگو

امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبنگلہ۔ گیا۔ صوبہ بہار مورخہ ۳ ہر فروری ۱۹۲۸ء

قبلہ وکعبہ جناب عمو جی صاحب مدظلہ العالی۔

بعد بجا آوری مراتب تسلیم و کورنش عرض ہے کہ بخیریت ہوں اور خیریت بندگان حضرت کا درگاہ الٰہی سے طالب۔ ورود سرفراز نامہ نے افتخار دارین بخشا۔ امور ضروری ذیل میں گزارش ہوتے ہیں۔

میری شومیٔ بخت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ بندگان حضرت پٹنہ تشریف لادیں اور میں شرف قدمبوسی سے محروم رہ جاؤں۔ اگر تشریف آوری کے قصد سے اطلاع ہوتی تو میں ضرور پٹنہ میں حاضر رہتا۔ حق یہ ہے کہ کوتاہی بخت کا کیا جواب ہے۔ اب پایان عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ ایسی حالت میں کیا امید ہو سکتی ہے کہ پھر شرف اندوز ملازمت ہو سکوں گا۔

میری چند تصنیفات تو ضرور شایع ہو چکی ہیں مگر میں نہیں جانتا کہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں میرے پاس میری تصنیفات کے نہ کوئی قلمی نسخے موجود ہیں اور نہ کوئی چھپے ہوئے۔ تعمیل ارشاد میں مطلق دیر نہ ہوتی مگر کیا کروں مجبور ہوں۔

بحضور جناب چچی صاحبہ مدظلہا۔ آداب و تسلیم عرض ہے اور میری اہلیہ بھی آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔ بچوں کی طرف سے آداب و تسلیم قبول ہو۔

مجھے حصول ملازمت کی بیحد تمنا ہے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ پیرانہ سالی مانع نقل وحرکت ہے، تعجب یہی ہے کہ اب تک کیونکر زندہ ہوں، خاص کر حسینؑ امام مرحوم کی رحلت کے بعد فقط

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبنگلہ۔ گیا۔ مورخہ ۲۹ر اپریل ۱۹۳۲ء

جناب عمو جی صاحب قبلہ وکعبہ دام ظلہ العالی۔

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ ورود سرفراز نامہ نے سرفراز و ممتاز فرمایا۔ دریافت خیریت مزاج عالی سے اطمینان قلب نصیب ہوا۔ ذرّہ نوازی کا شکریہ

قبول ہو۔ شرف قدم بوسی کی تمنا احاطۂ بیان سے
باہر ہے۔ کیا کروں کوئی امر اپنے اختیار کا نہیں
ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی۔
اس لئے کہ پایان عمر کو پہونچ چکا ہوں۔ صرف فرمان
خداوندی کی دیر ہے۔ علاوہ اس کے زمانہ نے
ایسی کروٹ لی ہے کہ اکثر افراد کو اپنی جگہ سے
جنبش کرنی دشوار ہو رہی ہے۔ یہ زمانہ امراگردی
کا آیا ہے۔ مگر ہم غرباء بھی اُن کے شریکِ حال
ہو رہے ہیں۔ اب اس دیار کی حالت قابلِ
عرض نہیں رہی ہے اور روز بروز بدتر ہوتی جاتی
ہے۔ اہل غیرت خودکشی سے اپنی آبرو کو بچا سکیں تو
بچا سکیں، ورنہ اور کوئی ذریعہ حفظان آبرو کا
نظر نہیں آتا ہے۔ خیر۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔
بالیقین میں نے اپنی عمر طویل میں کسی زمانے کا ایسا
رنگ نہیں دیکھا تھا جیسا کہ اس وقت دیکھ رہا ہوں۔
اہلیہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں اور بحضور
جناب حضرت چچی اماں صاحبہ مدظلہا آداب و تسلیم
کے پہونچا دینے کی مستدعی ہوتی ہیں۔ خفیف کی
استدعا بھی یہ ہے۔ دنیا میں جس قدر خیریت ممکن
ہے میرے جمیع متعلقان کو بفضلہ تعالیٰ نصیب ہے
پریشانی عام کی اور بات ہے فقط زیادہ حدِ ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبگلہ۔ گیا۔

مورخہ ۲۱ر ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

حضرت عم قبلہ و کعبہ مدظلہ العالی۔ بعد گزارش آداب و
تسلیم عرض ہے کہ شرف بخشی کا شکریہ تہ دل سے
ادا کرتا ہوں، قرین پذیرائی ہو۔ یہاں یا صوبۂ
بہار میں علیؑ امام سلمہٗ کی خدمت حیدرآباد کا مذکور
ابھی تک سننے میں نہیں آیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ خبر تمام تر بے بنیاد ہے۔ ایک مہینے کا عرصہ
ہوتا ہے کہ موصوف یہاں آئے تھے مگر حیدرآباد کا
کوئی ذکر درمیان میں نہیں آیا۔ مجھے حاضری کی
بڑی تمنا ہے خاص کر ایسی حالت میں کہ پایان عمر
کو پہونچ گیا ہوں۔ مگر بہت موانع درمیان میں
حائل دکھائی دیتے ہیں۔ کاش ایسا ہوتا کہ سفر
آخرت کے پہلے شرف قدم بوسی حاصل کر لیتا۔
بیگم صاحبہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔
ہم لوگوں کی طرف سے بحضور جناب چچی اماں صاحبہ
مدظلہا آداب و تسلیم فرما دیجیگا، سایۂ عاطفت
ممدو زیاد فقط زیادہ حدِ ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب نسواں کا خط

بنام صغریٰ بیگم سید ہمایوں مرزا

لاہور۔ جمعرات۔ ۲۹ر دسمبر سنہ ۲۸ء

پیاری بیٹی صغریٰ۔ بعد دعاہائے فراوان
واضح ہو کہ تمہارا محبت نامہ ملکر بے انتہا خوشی
ہوئی۔ چونکہ تم نے مجھے یہ لکھا ہے کہ آپ مجھے اپنی
بیٹی سمجھیں۔ اس لیے میں یہ خط بیٹی ہی کی طرح
لکھ رہا ہوں۔ میں پہلے بھی تم کے لفظ سے خط وکتابت

کیا کرتا تھا۔ لیکن اُس وقت تم میرے ذہن میں کم عمر متصور ہوئی تھیں۔ پھر جب موقع ملاقات کا ہوا تو عمر زیادہ پاکر میں آپ کے لفظ سے مخاطب ہوا۔ اب اپنی بیٹی جان کر پھر اُسی طرح خطاب کر رہا ہوں جس طرح اپنی پیاری وحیدہ کو خط لکھا کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ تمھیں مع اپنے شوہر محترم کے خوش اور خیریت سے رکھے اور حکیم نابینا صاحب کا علاج راس لائے کہ آپ پورے تندرست ہوکر وطن کو جائیں۔

میں ضرور آتا مگر ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے اطلاع آئی کہ سید نذر الباقر صاحب والد مسز سجاد حیدر کا یک بیک حرکت قلب کے بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا۔ میں وہاں جانے والا ہوں۔ مگر تمھاری موجودگی ہی میں مجھے سخت قبض ہوگیا تھا جو بعد جاری رہا۔ اس سے میں بہت ڈرتا ہوں اور یہ سفر میں زیادہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جلاّب لینے کے بعد جاؤ۔ مگر جلاّب سے میرے امعا میں بہت گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔ میں غذا سے درستی کی کوشش کر رہا ہوں۔ ساگ پر زیادہ زور دے رکھا ہے اور موٹے آٹے کا حریرہ گڑ کا کھاتا ہوں۔ اس میں گھی ڈال کر قبض دُور ہو جائے تو میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں جاؤں۔

تمھارے جانے کے بعد ہمارا گھر بہت سُونا سُونا معلوم ہونے لگا۔ بالکل سُنسان، خاموش اور بے رونق۔ مگر رفتہ رفتہ اپنی قدیمی بے رونقی کا عادی ہو جاؤنگا۔

تمہارا بار بار ہنسنا اور ہنستے وقت شرم سے ہاتھ مُنہ پر رکھ لینا، بہت یاد آتا ہے۔ مُنیا بار بار یاد کرتی اور کہتی ہے کہ اُنھیں پھر بُلالو۔

اللہ پھر خوشی سے ملائے اور دونوں جانب خیریت رکھے۔

مسز شاہ نواز نے اب تک کوئی فارم نہیں بھیجا حالانکہ میاں حمید نے انھیں خط بھی لکھا۔ مہربانی کرکے تم انھیں تاکیدی خط لکھ دو اور یہ لکھو کہ ”میں سید ممتاز علی صاحب اور مسز حمید سے وعدہ کر چکی ہوں کہ مسز شاہ نواز بچی کو ضرور داخل کروا دینگی۔ پس آپ مجھے ان کے آگے شرمندہ نہ کرائیں اور جلد انتظام داخلہ کے کرکے بچی کو خود ساتھ لے جائیں۔ میں بے انتہا شکر گزار ہوں گی۔“

اس طرح کا خط اپنے دوسرے حالات کے ساتھ جلد لکھ دیجئے۔

سید صاحب محترم کے اشعار اور لکچر نما تقریریں بہت یاد آتی ہیں۔ کاش میرا حافظہ ہوتا اور ان جواہر ریزوں کو محفوظ رکھ سکتا۔ ان سے مل کر دل بہت ہی خوش ہوا۔ اس نمونے کا بیرسٹر پنجاب میں تو ایک بھی نہیں۔ یہاں کے بیرسٹروں میں تو بوٹ سوٹ کے سوا اور کچھ بھی نہیں نہایت بدمذاق، ناسخن شناس، بے علم ہیں۔ ان میں صاحب لوگیت کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ آپ کے شوہر محترم کو تا دیر سلامت باکرامت رکھے۔

کاش حیدرآباد نزدیک ہوتا اور میں آسانی سے

مل سکتا - یا تم دس بارہ برس پہلے میری بیٹی بنی ہوئی تیں
دو پیاری بیٹی اب ختم کرتا ہوں - قلم سے بوجہ رعشہ
لکھ نہیں سکتا - پنسل سے بہت آہستہ آہستہ بمشکل سے
لکھا جاتا ہے - اتنا لکھنے میں ایک گھنٹے سے کم نہیں
لگا - نُبیا تم دونوں کو آداب کہتی ہے اور سب عزیز
سلام کہتے ہیں - حمید بیرسٹر صاحب کو بہت یاد کرتے
ہیں - عزیزی حیدر صاحب کو بھی میرا اسلام شوق
پہنچا دیجئے - اب بالکل رخصت محبت کے ساتھ

ممتاز علی

مکرر آنکہ - اس وقت بارش ہو رہی ہے - چائے
کا وقت ہو گیا تھا - میرا کوئی آدمی چائے بنانے والا
نہ تھا - دلہن نے اوپر سے چائے بھیجی ہے اور
ساتھ کچھ پکوان - میں خط بند کرنے نہ پایا تھا کہ
چائے آگئی - میں نے یہ بھی خط میں درج کر دیا -
لو اب تو سچ مچ ختم، والدعا -

ممتاز علی

شاد عظیم آبادی کا خط

بنام سید ہمایوں مرزا

دوم جولائی سنہ ۹۶ء عظیم آباد

حبیب محتشم عزیز مکرم دام لطفکم بعد سلام
شوق و اشتیاق دیدار کے واضح خدمت ہو یہ خط
میرا عزیز از جان مسٹر محمد سلیمان صاحب اور برادر
شفیق سید ہمایون میرزا صاحب دونوں حضرات کے
نام نامی سے ہے - کیفیت یہ ہے کہ بعد تشریف بری
آپ کے مولوی سید نور الدین [illegible]

ملاقات کو تشریف لائے اور از راہ عنایت مجھ سے
فرمایا کہ آپ حیدر آباد کا ضرور قصد کیجئے اور وہاں
آ کر میرے گھر ہی چندے قیام کیجئے میں اپنے گھر
میں ایک مجلس سید الشہدا برپا کر کے فخر الملک
وغیرہ اُمرا سے آپ سے ملوا دُونگا (چونکہ اِدھر
میں نے بہت سے مرثیے نظم کئے اور مجالس میں
خود پڑھے اور ان کی رونق اور تعریف بے حد و
حساب ہوئی چنانچہ ایک مجلس عظیم الشان میں
اکثر حضرات بیرسٹر بھی شریک تھے اور یک زبان
ہو کر بے حساب داد دی اسلئے ہمارے نور میاں
کو بہت جوش پیدا ہوا اور یہ صلاح دی)
اسکے جواب میں اپنے عزیز مسٹر سلیمان صاحب
کی رائے ظاہر کی کہ بغیر خط سفارشی مسٹر پلوڈن صاحب
کے آنا اچھا نہیں معلوم ہوتا با ایں ہمہ آج میں صاحب
کمشنر بہادر سے ملنے گیا تھا چونکہ چند روز بعد لفٹنٹ
گورنر آنے والے ہیں ایک قطعہ اُن کے ورود کے لئے
حسب معمول نظم کر کے کمشنر صاحب کو دکھانے گیا
تھا مجھ سے بے اختیار خود کہنے لگے کہ آپ کے لئے
ہم حیدر آباد جانا بہت پسند کرتے ہیں، اگر آپ
کہئے تو ہم مسٹر پلوڈن صاحب کو چھٹی لکھ دیں
بشرطیکہ آپ جانے پر مستعد ہو جائے میں نے کہا
کہ میرے دو عزیز بیرسٹر بالفعل حیدر آباد میں پریکٹس
کرتے ہیں، میں اُن سے صلاح کر کے آپ کی خدمت
میں عرض کرونگا -

اس وقت یہ خط [illegible] لئے آپ کی خدمت میں

بھیج رہا ہوں ذیل کی باتوں کا جواب دیجئے اور خوب سوچ کر میرے حق میں جو مناسب ہو وہ لکھئے

(۱) خط صاحب کمشنر پٹنہ بنام رزیڈنٹ کافی ہوگا یا اور کچھ بندوبست کریں یعنی کلکتہ جاکر اور اور انگریزوں سے بھی کہیں۔

(۲) اگر کمشنر صاحب سے خط لکھوائیں تو اُس کا کیا مضمون ہو۔

(۳) اپنے لڑکے کو ساتھ لائیں یا نہیں مشکل یہ ہے کہ بغیر لڑکے کے زیادہ قیام میرا ناممکن ہوگا۔

(۴) ایسی حالت میں میرے خرچ آمد و رفت کو پانچ سو روپے کافی ہونگے یا نہیں۔

(۵) لباس کس قسم کا وہاں درکار ہے، مطلب یہ ہے کہ جو لباس کی قطع ہے وہ بدلنا ناممکن مگر قسم پارچہ کیا ہو۔

(۶) مولوی خدابخش خاں صاحب سے امید نہیں، شاید حافظ صاحب بھی کچھ معین ہوں تو اپنے وہاں آنے کی خبر اُن کو خواہ مولوی سید حسن صاحب کو دینا چاہئے یا نہیں۔

(۷) رزیڈنٹ کے ذریعے سے مکان قیام مجھے مل سکتا ہے یا نہیں۔

امید ہے کہ آپ لوگ خوب سوچ بچار کر اس کا جواب تحریر فرما کر مجھ کو مشکور احسان فرمائیے تاکہ اگر میرے ہزار پانچ سو خرچ ہوں تو بیکار نہ جائیں۔

یہاں گرمی کی شدت ہے ایک دو پانی برسا ہے مگر کافی نہیں ہے

باقی سب خیریت ہے فقط

آپ کا دعاگو

سید علی محمد شاد غفرلہٗ

رباعیات

گر گل کی ہوس ہے تو کچھ خاروں سے
لے درس حقیقت کا تو افسانوں سے
احساس غم و درد مٹا دے یاں تک
کے نغمہ کی پیدا ہو ترے نالوں سے

(۲)

یوں ہمدمو! مشکل کو تم آساں کر لو
بجلی کو نشیمن کا نگہباں کر لو
چھوڑو کوئی اچھی سی نشانی اپنی
مرنا ہے یہاں جینے کا ساماں کر لو

(۳)

اے دوست بتا دے مجھے کچھ رازِ حیات
قبل اس سے کہ اڑ جائے یہ شہبازِ حیات
کس نے چھیڑا ہے اور کیونکر چھیڑا؟
دلچسپ ہے بسکہ نغمہ سازِ حیات

(۴)

سننے کو نصیحت تجھے خود گوش نہیں
غفلت میں تو مدہوش ہے کچھ ہوش نہیں
دیتے ہیں خبر خزاں کی گل گلشن میں
گویا ہے زبان غنچہ خاموش نہیں

منشی محمد عطاء اللہ عطا کلیانوی

سب رس معلومات

(ضمیمہ سب رس)

کمال اتاترک

غازی مصطفےٰ کمال پاشا جو ۱۸۸۱ء میں سیلونیکا میں پیدا ہوئے، بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔ انھوں نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا، اور ان کے والد علی رضا کروڑ گیری کے ایک معمولی عہدہ دار تھے جو ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے، مگر اس ہونہار بچے کے سر پر اس کی والدہ زبیدہ کا سایہ تھا جو مصطفےٰ کے لئے بڑی نعمت تھی۔ زبیدہ نے سب سے پہلے ایک قدیم مکتب میں مصطفےٰ کی تعلیم کا انتظام کیا تاکہ اس کو مذہبی باتوں سے پوری واقفیت ہو جائے۔ اس کے ایک سال بعد مصطفےٰ ایک ثانوی مدرسے میں منتقل کئے گئے۔ جہاں ان کی ذاتی قابلیت اور پوشیدہ جوہر نے ان کو تعلیمی وظیفے اور "کمال" کے لقب سے سرفراز کیا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصطفےٰ کمال کو تعلیم کی نسبت درج سے زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ وہ مدرسہ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور سیلونیکا کے ایک فوجی مدرسے میں شریک ہو گئے۔ یہاں انھوں نے زیادہ دلچسپی اور انہماک سے کام کیا، اور بہت سے امتیاز حاصل کئے۔

جس زمانے میں مصطفےٰ سنِ شعور کو پہنچے وہ ایک پُر آشوب زمانہ تھا۔ ترکی کی فضا پر ظلم وجور، ذلت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں عثمانی ترکوں کی حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ سلطان سلیم اور سلیمان کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہ کر سکتی تھی۔ سات سرزمینیں اور سات سمندر ان کے قبضے میں تھے۔ مگر زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ علم وتدبر کے مالک تعیشات کے غلام بن گئے۔ سلاطین عیاشی میں پڑ گئے، فوج بے سری رہ گئی اور حکومت نااہلوں کے ہاتھوں میں آ گئی جن کا شعار ظلم وجبر اور رکمز ور عوام کو کچلنا تھا۔ رعایا تباہ تھی۔ کوئی غیرت مند نوجوان جاسوسوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔ ملک کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر یورپی حکومتوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کئے۔ برطانیہ نے مصر دبا لیا، اور فرانس نے ٹیونس۔ بلقان کی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہو گئیں۔ روس کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی موقع ملتا قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا۔ خود سلطنت میں عیسائی اقلیتیں یورپی حکومتوں کے بل بوتے پر آئے دن آمادۂ فساد رہتیں۔ نیز سلطنت دیوالیہ ہو چکی تھی اور قرضوں پر حکومت کا کام چلتا تھا۔ ہر نئے قرض دینے والے کو ملک کا کوئی نہ کوئی انتظامی شعبہ سپرد کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ بڑی مصیبت یہ تھی کہ سلطنت میں جو غیر ملکی آباد تھے وہ ترکی قوانین سے بالاتر تھے اور یہ ذلت واستبداد کی انتہا تھی۔ پھر ۱۸۸۶ء کی جنگ میں جو روس اور ترکی کے درمیان ہوئی تھی، ترکی کے ماتھے پر "بیمارِ یورپ" کا دل خراش دھبہ لگ چکا تھا۔ اس ابتری کی تمام تر ذمہ داری سلطان عبدالحمید پر تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ ظلِ اللہ کے نام سے پوجے جاتے تھے، اور مذہبی طبقے اس کے مظالم کی تائید میں تھے۔ لیکن ملک کے نوجوان جن پر ملک کو تباہی سے بچانے کی بڑی ذمہ داری تھی

اپنے کو منظم اور مستحکم کرنے لگے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی بہت سی انجمنیں قائم ہوگئیں اور ان کی یہ کوشش ہونے لگی کہ موجودہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ نوجوان مصطفےٰ کمال پر نئے خیالات اور نئی تحریکوں کا جنھیں بڑی حد تک بیرونی انتداب اور انقلاب فرانس کا ردّ عمل سمجھنا چاہیے، بہت زیادہ اثر پڑا اور کمال نے "ترقی پذیر جماعت" میں شرکت کر لی جو ایک بہت بڑی خفیہ جماعت تھی اسی خفیہ جماعت سے کمال کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت تک کمال نے فوجی مدرسوں سے فراغت حاصل کر لی تھی اور اب بائیس سال کی عمر میں قسطنطنیہ کی جنگی اکاڈیمی میں لفٹنٹ ہوگئے تھے اس زمانے میں کمال کے خیالات پر سب سے زیادہ اثر جس چیز کا پڑا وہ ایک ممنوعہ کتاب "وطن" تھی۔ کمال نے اس کتاب کا پرچار کیا، اور اس پر تقریریں کیں اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ادارت میں ایک اخبار بھی جاری کیا جو بہ بانگِ دہل حکومت کی مخالفت کرتا تھا۔ مگر نوجوانوں کی سرگرمیاں زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکیں چنانچہ ۱۹۰۵ء میں مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھی پکڑ لئے گئے۔ کمال کو فوج میں لفٹنٹ بنا کر وطن سے دُور دمشق بھیج دیا گیا، مگر یہاں ان کو اپنی جدوجہد کے لئے زیادہ آزادی ملی۔ چنانچہ "وطن" کے نام سے ایک انجمن بنی اور فوج کے نوجوان افسر اس میں شریک ہوئے اسی سلسلے میں کمال سیلونیکا پہنچے، مگر چونکہ حکومت کے جاسوسوں کو اس کی خبر ہوگئی تھی اس لئے وہ بھاگ نکلے چند دنوں بعد فوجی وزارت میں تبدیلیاں ہوئیں اور کمال سیلونیکا کی فوج میں آگئے جو انقلابی جماعتوں کا مرکز تھا۔ اب انھوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا، اور موجودہ دو بڑی خفیہ انجمنوں یعنے "آزاد جماعت" اور "ترقی پذیر جماعت" کو متحد کر دیا۔ کمال اس نئی "انجمن اتحاد و ترقی" کے سرگرم رکن بن گئے اور انور و جمال کے ساتھ کام کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ "انجمن اتحاد و ترقی" اتنی طاقتور ہوگئی کہ ۱۹۰۸ء میں سلطان دستوری حکومت قائم کرنے پر مجبور ہوا، اور ایک پارلیمنٹ بنا دی گئی۔ بعد میں سلطان نے اپنے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو انھیں معزول کر دیا گیا، اور وہ نظربند ہوگئے اب ملک کے نوجوانوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور نااہل لوگ برطرف ہوگئے۔

مگر اس نئے دَور کو شروع ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ملک پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس نازک وقت میں جبکہ ترکی فوج منظم نہ ہوسکی تھی اور ترکوں کے پاس سمندری بیڑا بھی نہ تھا، اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ جوں توں کر کے انور اور مصطفےٰ کمال طرابلس پہنچے اور عربوں کی مدد سے دشمنوں کو روکنا چاہا، وہ اس طرف متوجہ ہی تھے کہ بلقان کی مملکتوں نے قسطنطنیہ پر چڑھائی کر دی۔ ترکوں نے تو دونوں جگہ مقابلہ کیا مگر ان کو ہر محاذ پر شکست ہوئی، اور ترکوں نے جن لوگوں پر برسوں حکومت کی تھی ان کے ہاتھوں ذلتیں اٹھانی پڑیں۔ انور اور کمال طرابلس سے وطن واپس آئے تو کمال کو اور زیادہ مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا کیونکہ اب سلطنت کے سیاہ و سپید کے مالک انور، طلعت اور جمال ہوگئے تھے اور پارلیمنٹ صرف نام کو باقی تھی۔ ان تینوں نے کمال کو نظرانداز کر دیا

اور اپنے معاملات سے بے دخل کرنے کے لئے انھیں صوفیا کی ترکی سفارت میں بھجوا دیا۔ پھر جب ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو انور بے جواب وزیر جنگ تھے کمال کو صوفیا ہی میں رہنے دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ۱۹۱۵ء میں کمال سخت بیمار ہو گئے اس بنا پر وہ قسطنطنیہ پہنچے اور چند دنوں بعد صحت ہوئی تو ان کو درہ دانیال کی حفاظت پر متعین کیا گیا۔ برطانوی فوجیں پوری طاقت سے درہ دانیال پر حملہ کر رہی تھیں، مگر مصطفےٰ کمال کی حیرت انگیز شجاعت اور جنگی مہارت نے معجزہ دکھایا اور بے بس ترکوں نے دنیا کی زبردست سلطنت کو شکست دی۔ چنانچہ انگریز درہ دانیال سے بری طرح پسپا ہوئے اس کا اثر یہ ہوا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال کا نام خوب چمکا مگر مشکل یہ تھی کہ کمال کے حریف انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ مگر دوسری طرف جنگ طول کھینچی تو جرمنوں کے ساتھ ترک بھی ہر محاذ پر شکست کھانے لگے۔ عربوں نے بغاوت کر دی اور عراق و فلسطین کی طرف سے انگریزوں نے پیش قدمی شروع کی۔ اس نازک وقت میں سلطان کی طرف سے کمال کو ہدایت ہوئی کہ فلسطین کے محاذ جنگ پر روانہ ہو جائیں مگر فلسطین میں دشمن کا روکنا آسان نہ تھا۔ کمال پیچھے ہٹتے گئے اور فلسطین، دمشق اور حلب سب ہاتھ سے نکل گئے مگر مسلسل شکستوں کے بعد جب وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے موجودہ ترکی سرحد پر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اب ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا اور وطن کی سرزمین پر دشمنوں کے ناپاک قدم نہیں آسکیں گے مگر اس وقت تک عارضی صلح کا اعلان ہو چکا تھا، چنانچہ جنگ رک گئی اور کمال قسطنطنیہ آگئے۔

مصطفےٰ کمال کی غیر معمولی قابلیت اور ان کے پوشیدہ جوہر کے ساتھ ساتھ انھیں کچھ غیبی امداد بھی تھی چنانچہ ایک موقع پر جب ان کے دشمن کی گولی لگی تو انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا اور انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی جیب سے ایک گھڑی نکال ڈالی جو گولی کی زد سے ٹوٹ گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے موقعوں پر یہ خطرے سے بال بال بچ گئے۔ اس کے معنے صاف طور پر یہ تھے کہ قدرت کو کمال کے ہاتھوں ترکی کی خدمت کروانی منظور تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مصطفےٰ کمال کے لئے بہت سی گتھیاں تھیں۔ سلطان وحیدالدین نے برطانیہ کے ساتھ سازش کر لی تھی۔ دشمنوں کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں اور ان کے جہاز آبنائے باسفورس پر جمے ہوئے تھے۔ یہ ایسا نازک موقع تھا کہ ملک میں ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ انور پاشا وغیرہ ترکی سے بھاگ گئے تھے اور اب پرانے عافیت پسندوں کا راج دوبارہ قائم ہو گیا تھا جو ترکی کے اقتدار کو کھو کر انگریزوں کی غلامی اختیار کرنا پسند کرتے تھے۔ اس کٹھن گھڑی میں مصطفےٰ کمال اٹھے اور ملک کے نوجوانوں کو جن کی رگوں میں زندگی اور حمیت کا خون دوڑ رہا تھا، ایک جگہ جمع کیا۔ یہ نوجوان جن پر ایک بھاری ذمہ داری تھی اپنی قوم کو موت سے بچانے کی فکر کرنے لگے۔ اسی اثناء میں مصطفےٰ کمال مشرقی مقبوضات کے قائد اعلیٰ بنے اور انگورہ کی طرف بھجوائے گئے تاکہ وہ عارضی صلح کی شرائط کے بموجب فوج کو برخاست کر کے ہتھیار جمع کر لیں۔ اس موقع کو مصطفےٰ کمال نے

بہت غنیمت جانا اور انھوں نے فوج کی تنظیم شروع کر دی اور اپنے ہم وطنوں کو آنے والے غلامی کے عذاب سے ڈرایا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ "مرد بیمار" نے پھر سے کروٹ لی اور اپنا علاج آپ کرنے پر تیار ہو گیا چنانچہ سلطنت کے ہر طبقے اور سمت کے لوگ مصطفےٰ کی طرف کھنچے چلے آئے۔ زندگی کی اس نئی روح سے سلطان وحید الدین اور اتحادی گھبرائے مگر کمال ان کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ مجبور سلطان نے اتحادیوں کی شہ پر کمال اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا اور شیخ الاسلام نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خلیفہ کے ہمدرد ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے، مگر اسے اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ عین اس وقت عہدنامہ سیورے کا اعلان ہوا۔ اس کی رو سے ترکی کے سب مقبوضات اس سے چھین لئے گئے، قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ مانا گیا، سمرنا یونانیوں کو بخشا گیا اور انگورہ کی مختصر سرزمین ترکی کے حصے میں رہی۔ ان زیادتیوں کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ ترک قوم اب اپنے زندگی اور موت کے سوال کو حل کرنے کھڑی ہو گئی اور تمام ترکوں نے کمال کا ساتھ دیا۔ سواک کے مقام پر اسمبلی کی بنیاد رکھی گئی اور خلیفہ عبدالمجید خاں کے احکام کو ماننے سے انھوں نے انکار کر دیا۔

ادھر یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھنا شروع کیا، اور ترکوں کو پیچھے ہٹاتے نئے پایۂ تخت انگورہ کے قریب تک پہنچ گئے۔ اس پر ترکوں کے خون نے جوش کھایا اور سقاریہ کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اکیس دن کی معرکہ آرائی کے بعد ترکوں نے فتح حاصل کی اور انھوں نے سمرنا تک کا علاقہ یونانیوں سے دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد ترک قسطنطنیہ کی طرف بڑھے اور انگریزوں کو مقابلہ کی دعوت دی۔ مگر انگریز جو ابھی جنگ عظیم کے بعد سستانے نہ پائے تھے، ترکوں سے نہ لڑ سکے اور انھوں نے صلح کی بنیاد ڈالی چنانچہ معاہدۂ لوزان میں ترکوں کے تمام مطالبات مان لئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطنیہ پر پھر سے پرچم ہلال لہرانے لگا اور باسفورس سے انگریزوں کے جہاز نکال دئے گئے۔ یورپی علاقے کو بھی انھوں نے حاصل کر لیا اور تمام اجنبی مراعات ختم کر دیں۔ ترکی کے حدود معین کئے اور ایک جمہوری دستور سے ملک کو سرفراز کر کے پارلیمنٹی حکومت قائم کر دی جس کا صدر مقام انقرہ (انگورہ) قرار پایا۔ مصطفےٰ کمال ترکی کے پہلے صدر ہوئے اور انھوں نے صحیح معنوں میں ملک کی قیادت کی۔

اسے مصطفےٰ کمال کی اولوالعزمی ہی کہنا چاہیے کہ دو سال کے اندر ترک قوم پھر سے زندہ ہو گئی اور اپنے پیر پر آپ کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی۔ کمال سب سے پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اتحادیوں کے بنائے ہوئے معاہدے کو ٹھکرایا اور دوسری مظلوم قوموں کو زندگی کا سبق دیا۔ دو سال کی قلیل مدت میں یورپ کے "مرد بیمار" کو جس کے ہاتھ پیر بالکل شل ہو چکے تھے، طاقتور قوموں کی صف میں اس طرح لا کر کھڑا کر دینا کہ اچھے سے اچھے مرد تندرست اور ہر بڑی طاقت کا مقابلہ کر سکے، کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ کمال کا معجزہ تھا۔ ترکی کی زندگی اور موت کا سوال

دنیائے اسلام کی زندگی اور موت کا سوال تھا کیونکہ دنیائے اسلام ترکی کو اپنا نمائندہ سمجھتی ہے۔ چنانچہ جب ترکی پر مصیبت آئی اور ایک طرف سے انگریزوں اور باغی عربوں، اور دوسری طرف سے یونانیوں نے ترکی کو کچلنا چاہا تو ساری اسلامی دنیا میں سخت پریشانی سی پھیل گئی اور پوری دنیا کے مسلمان ہر طرح ترکی کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، مگر جب کمال نے فوق العادت ہمت سے کام لیا اور ترکوں کو زندہ کر دیا تو وہ دنیائے اسلام کی آنکھوں کا تارا بن گئے اور سب مسلمان کمال کو اپنا رہنما سمجھنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کمال اتاترک نے دنیا کی دوسری قوموں کو بھی زندہ رہنے کا طریقہ بتایا اور یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ مسولینی نے انہی سے بصیرت حاصل کی اور ہٹلر نے انہی کے نقش قدم پر چل کر معاہدۂ ورسائی کے پرخچے اڑا دیئے اور اپنی قوم کو اس قابل بنا دیا کہ ورسائی میں زیادتیاں کرنے والوں سے پورا بدلہ لے سکے۔

کمال کی کامیابی کا بڑا راز ان کی سیاسی حکمت عملی اور خارجی مسلک میں ہے۔ ملک کی اندرونی اصلاح کے لئے باہر سے اطمینان حاصل کرنا ضروری تھا اور اسے کمال اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے دشمنوں اور دوستوں سبھی کو اپنا ہموار بنانے کی کوشش کی۔ روس سے، جس کے ساتھ ترکوں کی بہت پرانی اور قومی دشمنی تھی، دوستی کی۔ مگر قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس دوستی کے باوجود اشتمالیت کی مسموم ہوائیں ترکی کا رخ نہ کر سکیں۔ یونان جس نے ترکوں کو پریشان کیا تھا اور جو بعد میں ترکوں سے پٹ چکا تھا، اس سے بھی صلح، صفائی کی اور راہ و رسم پیدا کیا۔ برطانیہ اور فرانس سے جو ترکی کے سخت دشمن تھے اور جنھوں نے ترکی کو پریشان کر کے اس کے بہت سے علاقے دبا لئے تھے، اب کمال نے دوستی کر لی بلکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر فرانس سے اپنے بہت سے مطالبات بھی منظور کرا لئے۔ پھر جرمنی سے بھی دوستی قائم رکھی، اور روس و برطانیہ کی دوستی کے باوجود جرمنی کے ساتھ اچھے تعلقات برابر قائم رکھنا ترکوں کی بڑی حکمتِ عملی سمجھی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس انوکھے مسلک کی وجہ سے کمال کو ترکی کی اندرونی اصلاح کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ کمال نے ترکی کے کندھے سے استبداد کا جوا اتار پھینکا تھا اور ترکوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی مگر اب نئی زندگی کے ساتھ ترکی کو ایک نئے جسم کی بھی ضرورت تھی۔ ترکوں کا جسم قومی انحطاط سے کمزور پڑ گیا تھا۔ سالہا سال کی مسلسل جنگوں سے ملک کا برا حال ہو گیا تھا۔ غیر ملکی تجارت اور صنعت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ زراعت پیشہ اب سپاہی بن گئے تھے اور ملک کی زراعت ختم ہو رہی تھی۔ سرمایہ دار طبقے عیش پسند زندگی کے سبب زمین کی پیٹھ کا غیر ضروری بوجھ ہو گئے تھے۔ ملک میں تعلیم نہ تھی۔ علما ہر نئی چیز کے دشمن اور اپنے مفاد کی خاطر ہر طرح کی قربانی کرنے کے آمادہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ترکی کے ایسے جسم کو بدلنا کمال کے لئے ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے ترکی قوم کو نئی زندگی اور نئی روح کے ساتھ ایک نیا قالب بھی دیا جو نئی زندگی

برسوں کی انتھک کوششوں، خونریزیوں، سازشوں، بغاوتوں اور جنگوں کے بعد نوجوان کمال کو ملی تھی اس زندگی کی بقا کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتا تھا جس جذبے نے طرابلس اور بلقان کی جنگیں سر کیں، اور جس روح نے درۂ دانیال سے برطانیہ کو ہٹایا اور سقاریہ میں یونانیوں کو شکست دی، وہی جذبہ اور وہی روح اب ترکی کے نئے جسم کی تعمیر میں کارفرما ہوگئی۔ کمال نے دشمنوں کے خون میں نہا کر اپنی قوم کی رہنمائی کی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وطن کی خاطر انھوں نے اپنے دشمنوں اور دوستوں دونوں کو کچلا، اور اگر یہ سنگدلی اور سختی تھی تو نئے جسم کی تعمیر کے لئے یہ ضروری تھی۔ کمال نے خلیفہ اور سلطان کے ڈھونگ کو ختم کیا، علماء کا زور توڑا جو قوم کی زندگی کے لئے وبال بن چکے تھے۔ جو لوگ مذہب کی آڑ میں ہر نئی چیز کی مخالفت کرتے تھے، وہ گولی کا نشانہ بنے، پیر، مجاور، صوفی اور بھک منگے فقیر جو قوم کا خون چوس رہے تھے، سب ختم ہوئے۔ بے حس عوام میں وطنیت کا جذبہ مفقود ہو چکا تھا، کمال نے ان میں حب وطن پیدا کیا جو ایمان کا جزو ہے۔ عوام جاہل تھے، ان کو علم سے سرفراز کیا۔ عیسائی مشنریوں کا سدباب کیا جو قوم کو سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔ ترکوں میں زراعت کا شوق پیدا کیا اور زرعی تعلیم کا بڑا انتظام کیا۔ لوگوں کو قانون کے ذریعہ صنعت و حرفت کے قابل بنایا۔ بچوں اور بڑوں میں قومی کاموں کا احساس پیدا کیا۔ عورتوں کو جو پردے میں بیٹھ کر عمریں ضائع کرتی تھیں کاروبار میں لگایا۔ پرانی چیزوں کو بہت مقدس سمجھا جاتا تھا، کمال نے ان کے خلاف بغاوت کی اور سب پرانی چیزیں ختم ہوئیں۔ ترکی ٹوپی اور پردہ سب رخصت ہوئے۔ حتیٰ کہ ترکوں کو پیام سلام کے نئے طریقے بتائے گئے اور پرانے عاجزی کے سلام بدل گئے، اور موسیقی جو صرف رونے دھونے کے جذبات پیدا کر سکتی تھی، اب ختم ہوئی اور اس میں نئی زندگی آگئی۔

کمال اتاترک کے تمام کارنامے ترکی کی شاندار تاریخ کے زرین ورق ہیں۔ ان کی عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت ہر قدم پر اپنا لوہا منوا تی تھی۔ ان کے کام بڑے تھے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اس جمود کو جو صدیوں سے اسلام کی روح کو مسخ کر رہا تھا، توڑ دیا اور نئی نسل پر بہت بڑا احسان کیا۔ ان کی بڑائی کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ جو ان کے دشمن تھے وہ دوست بن گئے اور جو انھیں کافر کہتے تھے وہ "مرد مومن" کہنے لگے۔ وہ صحیح معنوں میں مرد مومن تھے اور مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں کے بہت بڑے محسن۔ ۲۱ نومبر ۱۹۳۸ء کو وہ دنیا سے رخصت ہوگئے، مگر ان کی روح ترکوں کے زندہ قالب میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور ان کی ذات جس نے خود جل کر افق اسلام کو روشن کیا، نوجوانوں کے دلوں میں نئی نئی امنگیں اور آرزوئیں پیدا کرتی رہے گی جو ان کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(عبدالحفیظ صدیقی)

ہماری غذا

یہ سوال کہ ہمارے کھانے پینے کی چیزیں کن اشیا سے مرکب ہیں، اپنے اندر بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے کیونکہ ہماری غذا جن عناصر اور مرکبات پر مشتمل ہے وہ بظاہر بہت حقیر معلوم ہوتے ہیں اور ایک عام انسان کا خیال اس طرف جا بھی نہیں سکتا کہ یہ چیزیں ہماری غذا کے اجزا ہوں گی لیکن ایک سائنس داں کی نظر جو ہر وقت کسی نہ کسی شے کے تجزیہ اور ترکیب کی تلاش میں رہتی ہے، ہر چیز کو اپنے خاص انداز سے دیکھتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر بال کی کھال بھی نکال لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری غذا کا سوال ہماری اولین توجہ کا محتاج ہے۔ اگر ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ ہماری غذا کی ترکیب کیا ہے اور غذا کا ہر جزو ہماری زندگی پر کیا اثر رکھتا ہے تو یہ بہت بڑی ستم ظریفی ہو گی اور اپنے آپ پر ایک بڑا ظلم۔ بات یہ ہے کہ جو اجزا ہماری غذا کو بناتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص فعل ہوتا ہے اور ہر جزو ہمارے جسم کے کسی نہ کسی عضو کی خدمت کرتا ہے۔ اگر ہماری غذا میں کسی جزو کی کمی ہو جائے تو اس کے نتائج کسی نہ کسی بیماری یا کسی عضو کی کمزوری کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اس لئے ایک محتاط اور حکمی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ غذا کی ترکیب معلوم کی جائے اور اس کے مفید اجزا سے فائدہ اٹھایا جائے۔
ہماری غذا حسب ذیل اشیا پر مشتمل ہوتی ہے :۔

(۱) پروٹین :۔ یہ ان مرکبات کا نام ہے جن کے اجزا کاربن، ہیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور گندک جیسے عناصر ہیں اور ان کو نائٹروجنی مرکبات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پروٹین کا فعل یہ ہوتا ہے کہ جسم کی بافتوں کو قوی بنائے اور اگر ان میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہو جائے تو اسے دُور کرے۔ پروٹینی غذا میں انڈا (البیومن) گوشت، گیہوں، دودھ، مٹر، بنس اور دالیں ہیں۔

(۲) کاربوہیڈریٹ :۔ یہ ایسے مرکبات کا نام ہے جو صرف کاربن، ہیڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کے ماخذ سبزی اور ترکاریاں ہیں، اور اس کا فعل یہ ہے کہ یہ توانائی پیدا کرتا ہے اور حرارت غریزی اور چربیاں بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔
مثالیں :۔ نشاستہ خواہ کسی اناج سے ہو شکر۔ دودھ کی شکر اور جگر سے حاصل کیا ہوا نشاستہ۔

(۳) چربیاں :۔ ایسے مرکبات جو کاربن، ہیڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ حرارت اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔
مثالیں: مسکہ، گھی، اور دوسرے نباتی تیل۔

پروفسر ہارون خان صاحب شروانی
صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ

(۴) معدنی نمک :- ان میں معمولی نمک یا سوڈیم کلورائیڈ سب سے اہم ہے۔ اس کی بدولت ہیڈروکلورک ترشہ پیدا ہوتا ہے جو ہضمی رس کے لئے ضروری ہے۔ چونے کے فاسفیٹ بھی جو غذا کے اہم ٹکڑوں سے ہے، ہڈیوں کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے اور لوہے کے نمک بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہی سے خون کا سرخ مادہ یعنے ہیموگلوبن پیدا ہوتا ہے۔

(۵) پانی :- غذا ہضم ہو جانے کے بعد پانی اس ہضم شدہ غذا کو حل کرتا ہے اور غذا کی تحلیل میں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ پانی کا بڑا فعل یہ ہے کہ خون کو سیال حالت میں رکھتا ہے اور اخراج میں مدد کرتا ہے۔

(۶) ویٹامن :- یہ ان اشیا کا گروہ ہے جو ہماری غذا کے سب سے اہم اجزا ہیں اور جو ہماری صحت اور نشو و نما کے لئے بیحد ضروری ہیں۔ ویٹامن کی ترکیب ابھی تک اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکی۔ مگر ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کو کیمیائی اور فعلیاتی لحاظ سے اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ اب تک کوئی چھ ویٹامن دریافت ہوئے ہیں :- اے، بی (یا بی ۱)، بی ۲ (یا جی)، سی، ڈی اور ای۔ ان میں کے چار یعنے ویٹامن اے، بی، سی اور ڈی اب کیمیاوی طور پر الگ کرلئے گئے ہیں۔ تمام ویٹامن فعلیاتی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں اور ہر ایک کے جداگانہ افعال ہیں۔ یہ سب تازہ غذا میں موجود ہوتے ہیں۔ (ع - ح - ص) (نوٹ :- ویٹامن پر ایک تفصیلی مضمون آئندہ اشاعت میں آئے گا)

آئندہ امتحانات

امتحان مقابلہ برائے انڈین ملٹری اکاڈیمی اور رائل انڈین نیوی :-

انڈین ملٹری اکاڈیمی ڈیرہ دون اور رائل انڈین نیوی میں شرکت کے لئے فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی طرف سے ایک امتحان لیا جائے گا جو ۲۷ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء سے دہلی میں ہوگا۔ ملٹری اکاڈیمی کے لئے امیدواروں کی عمر ۱۸ سال سے کم اور ۲۰ سال سے زائد نہ ہونی چاہیے، اور انڈین نیوی کے لے ۱۷ سال سے کم اور ۱۹ سال سے زائد نہ ہونی چاہیے۔ شرکت کے لئے درخواستیں ۶ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تک فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں وصول ہو جانی چاہئیں۔ درخواستوں کے ساتھ ساڑھے سات روپیے فیس بھی بھجوانی ضروری ہے۔ انتخابات کے بعد پچاس روپیے داخل کرنے ہوں گے۔ اس امتحان کی شرائط یہ ہیں کہ امیدوار شادی شدہ نہ ہوں۔ منتخب امیدواروں کے ضامنوں کو ہر طرح کی ذمہ داری لینی چاہیے کہ امیدوار کے والدین یا سرپرست ٹریننگ سے متعلق امیدوار کی تمام مالی ضروریات پوری کریں گے، اور اگر کسی وجہ سے امیدوار ملازمت کو قبول نہ کرے تو وہ اس پوری رقم کی بجا آوری کریں گے جو امیدوار پر خرچ کی گئی ہے۔

شرکت کی درخواستیں اور قواعد امتحان مقامی حکومتوں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور حیدرآباد کی حد تک حسب ذیل پتوں سے :۔

سکرٹری صاحب، رزیڈنٹ بہادر، رزیڈنسی حیدرآباد

معتمد صاحب، محکمۂ سیاسیات سرکار عالی و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سکندرآباد

جوڈیشل افسر اورنگ آباد

کھیل

کھیلوں کے امتیازات :۔

ڈیویس کپ کے نتائج :۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں .... فرانس نے امریکہ کو شکست دی ـــــــ ۳-۲

سنہ ۱۹۳۳ء میں .... انگلستان نے فرانس کو شکست دی ـــــــ ۳-۲

سنہ ۱۹۳۴ء میں .... انگلستان نے ممالک متحدہ امریکہ کو شکست دی ـــــــ ۴-۱

سنہ ۱۹۳۵ء میں .... " " " ـــــــ ۵-۰

سنہ ۱۹۳۶ء میں .... انگلستان نے امریکہ کو شکست دی ـــــــ ۳-۲

سنہ ۱۹۳۷ء میں .... ممالک متحدہ امریکہ نے انگلستان کو شکست دی ـــــــ ۴-۱

حسب ذیل ومبل ڈن ٹینس میں ممتاز رہے :۔

سال	سنگلز (مرد)	سنگلز (عورتوں کا)
سنہ ۱۹۳۳ء	جے کرافورڈ (آسٹریلیا)	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ امریکہ)
سنہ ۱۹۳۴ء	ایف۔ پیری (انگلستان)	مسز ڈروتھی راؤنڈ (انگلستان)
سنہ ۱۹۳۵ء	" " "	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ)
سنہ ۱۹۳۶ء	" " "	مس ایچ۔ جیکبس (ممالک متحدہ)
سنہ ۱۹۳۷ء	ڈونال بج (ممالک متحدہ)	مس ڈی۔ راونڈ (برطانیہ)
سنہ ۱۹۳۸ء	(" ")	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ)

حسب ذیل باکسنگ میں ممتاز ہیں :۔

فلائی ویٹ (۱۱۲ پونڈ) ـــــــ پیٹر کین (انگلستان)

بنٹم ویٹ (۱۱۸ پونڈ) سکسٹو اسکو بارل ۔ فدرویٹ (۱۲۶ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ لائٹ ویٹ (۱۳۵ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ ولٹر ویٹ (۱۴۷ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ مڈل ویٹ (۱۶۰ پونڈ) فریڈ اپاسٹلی (ممالک متحدہ)۔ لائٹ ہیوی ویٹ (۱۷۵ پونڈ) ایف۔ ایچ۔ لوئیس (ممالک متحدہ)۔ ہیوی ویٹ (زائد از ۱۷۵ پونڈ) جو لوئی (ممالک متحدہ)

ڈربی:۔ ۱۹۳۲ء۔ اپریل دی ففتھ (مالک مسٹر ٹی۔ وال)۔ ۱۹۳۳ء۔ ہائی پیرین (مالک لارڈ ڈربی)۔ ۱۹۳۴ء ونڈسر لیڈ (مالک مہاراجہ راج پیپلا)۔ ۱۹۳۵ء۔ بہرام (مالک ہز ہائنس آغا خان)۔ ۱۹۳۶ء محمود (ہز ہائنس آغا خان)۔ ۱۹۳۷ء مڈ ڈے سن (مسز جی۔ ملر) ۱۹۳۸ء۔ بوئی روسل۔ ۱۹۳۹ء۔ بلیو پیٹر (مالک لارڈ روز بیری)۔

مہدی جنگ ٹینس:۔ حیدر آباد میں ۱۳ ر دسمبر سے مہدی جنگ ٹینس چمپین شپ ٹورنمنٹ کے کھیل شروع ہوئے ہندوستان کے مشہور کھلاڑی نمبر (۱) غوث محمد اور نمبر (۲) افتخار، اور ان کے علاوہ نارائن راؤ اور راما راؤ وغیرہ بھی اس میں شریک تھے۔ ۱۶ ر دسمبر کو غوث محمد (ہندوستان نمبر ۱) اور افتخار احمد (ہندوستان نمبر ۲) کے درمیان سنگلز کا فائنل ہوا۔ غوث نے افتخار کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۷ ر دسمبر کو سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کا کھیل ہوا جس میں سجاد نے مقصود علی خان کو شکست دی اس کے بعد ڈبلز کا مقابلہ ہوا جس میں غوث، افتخار اور نارائن راؤ و راما راؤ نے حصہ لیا۔ غوث اور افتخار نے پہلا سٹ ۶۔۴ پر دوسرا ۶۔۲ پر لیا۔ تیسرا سٹ نارائن راؤ اور راما راؤ نے ۷۔۵ پر لیا، اور چوتھے سٹ میں غوث اور افتخار نے ۶۔۴ سے کامیابی حاصل کی اور اس طرح فائنل جیت گئے۔

(بقیہ مضمون "حالات حاضرہ") روس کے حصے میں یہ علاقے آئے:۔ یوکرین، وہ علاقے جہاں سفید روسی آباد ہیں اور رومانیہ و ہنگری کی سرحدوں کے قریب کا وہ ضلع جہاں پولستانی تیل کا مخزن ہے! اور اس کے علاوہ پولستان کے باقی حصے جرمنی کو ملے اس تقسیم کا اثر یورپی سیاست پر۔ (۱) اتحادی روس کے مخالف ہوگئے (۲) جرمنی کے حصے میں پولستان کا زیادہ علاقہ آیا مگر پٹرول کے قیمتی ذخائر روس کی ملکیت میں آگئے (۳) روس کی سرحدیں ہنگری اور رومانیہ سے مل گئیں اور یہ صورت حال بلقان کے لئے بہت خطرناک تھی لیکن ترکی کے اتحادیوں کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے بلقان میں روس کی سرگرمیاں ابھی شروع نہ ہوسکیں اور اس نے بالٹک کی مملکتوں کی طرف توجہ کی۔

بالٹک کی مملکتیں:۔ موجودہ جنگ سے روس نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ بحر بالٹک روس کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے روس کی نظریں بالٹک کی مملکتوں پر ایک عرصے سے لگی ہوئی تھیں۔ اب بین قومی صورت حال کی نزاکت سے روس کو اچھا موقع ہاتھ آگیا اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے بالٹک کی تمام مملکتوں کو ہضم کیا جائے۔ سب سے پہلے روس نے اسٹونیا، لٹویا اور لتھونیا کے ساتھ باہمی تعاون کے معاہدے طے کئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ روس کو اپنی قلعہ بندیوں اور ہوائی و بحری مرکزوں کی تعمیر کے لئے ان مملکتوں میں جگہ مل گئی۔ جرمنی کی قلت کو جو لٹویا میں ..... ۵ کی تعداد پر مشتمل تھی ہٹلر کے حکم کی بنا پر ۴۸ گھنٹوں کے اندر ان مملکتوں سے چلے جانا پڑا۔ ان لوگوں کو ہٹلر نے پولستان میں بسانا چاہا، اور جرمنی کی اقلیتیں جو بلقان میں آباد تھیں ان کو بھی پولستان میں آکر بس جانے کا حکم ملا۔

حالاتِ حاضرہ

ڈانزگ اور پولستان :-

۱۹۳۹ء کا سب سے بڑا واقعہ جنگ یورپ کی ابتدا ہے۔ اب اس جنگ کو شروع ہوئے صرف چار مہینے ہوئے ہیں اور ڈانزگ کے سوال سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ جرمنوں نے ڈانزگ میں اپنی قلعہ بندی کرنی شروع کی جو اگست کے مہینے میں مکمل ہوگئی اور ۲۳ اگست کو ڈانزگ کے نازی لیڈر ہرفورسٹر "آزاد شہر ڈانزگ" کے صدر بھی بنا دئے گئے۔ چونکہ یہ پولستان کی بندرگاہ تھی اس لئے یہ ایک دست درازی کے مترادف تھا۔ نازیوں کی اس نقل وحرکت کے صاف معنے یہ تھے کہ ہٹلر جمہوری مملکتوں کو دعوتِ مقابلہ دے رہا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پولستان، برطانیہ اور فرانس جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ جمہوری مملکتیں پولستان کو بچانا اس وجہ سے اپنا فرض سمجھتی تھیں کہ از روئے معاہدہ وہ اس کے ساتھ تھیں، اور پولستان کی شکست ایک طرح سے جمہوری مملکتوں کی شکست تھی۔

پہلی ستمبر کو تو ایک نیا شگوفہ کھلا۔ ہرفورسٹر نے مجلس اقوام کے عطا کردہ دستور کو منسوخ کر دیا اور اس اعلان کے بعد کہ اب ڈانزگ جرمنی سے ملحق ہو چکا ہے، ڈانزگ میں نازی دستور کا نفاذ کر دیا۔ اس کے جواب میں ہٹلر نے اس الحاق کی توثیق کر دی اور فورسٹر کو ڈانزگ کا صدرِ اعلیٰ بنا کر اس کے تمام نظم ونسق کا اسے ذمہ دار قرار دیا۔ ڈانزگ کے الحاق کے بعد اسی روز نازی فوجیں پولستانی "گذرگاہ" میں داخل ہوگئیں اور اس کے بعد طیاروں نے وارسا پر بم باری شروع کر دی۔ ۴۸ گھنٹوں کے اندر پولستان پر کوئی ۴۹ ہوائی حملے ہوئے اور پولستانی شہر اور دیہات پر خوب بم برسائے گئے۔ پولستانیوں کے دل ناتواں نے بھی مقابلہ کیا اور بجائے اس کے کہ ہٹلر کی شرطوں کو مان لیں اور غلامی کی زندگی اختیار کریں، بہادروں کی طرح لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ مگر یہ ناتواں اور زبردست کا مقابلہ تھا۔ انگریز اور فرانسیسی راست پولستان کی مدد نہیں کر سکے چنانچہ اس دلیری کے باوجود پولستانی بہادر جرمنوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولستان ختم ہو گیا اور جرمنی و روس نے، جو بعد میں جرمنی کے ساتھ اتحاد کر کے مشرق کی طرف سے پولستان میں گھس آیا تھا اس ملک کے حصے بخرے کر لئے۔

اتحادی :-

پولستان پر حملہ ہوتے ہی انگریز اور فرانسیسی بھی جرمنی کے ساتھ لڑائی کے لئے کمر باندھی برلن کے

جنوری ۱۹۴۰ء

سب رس

انگریز سفیر مسٹر ہنڈرسن نے ستمبر کی پہلی تاریخ سے چوتھی تک جرمنی اور برطانیہ کے مابین سمجھوتہ کرانے کی پوری کوشش کی مگر ان کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں۔ اس بنا پر ۴ ستمبر کو دن کے سوا گیارہ بجے برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان جدید حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کی وزارت میں بعض ضروری تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ایک جدید کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی جس کے حسب ذیل عہدہ دار مقرر ہوئے :-

مسٹر چمبرلین، صدر اعظم۔ سر جان سائمن، چانسلر آف دی اکسچکر، وزیر مالیات۔ لارڈ ہیلی فاکس، وزیر خارجہ۔ لارڈ چیٹ فیلڈ، وزیر مدافعت۔ مسٹر چرچل، امیر البحر۔ مسٹر ہور بلیشا، وزیر جنگ۔ سر چارلس کنگس لی وڈ، وزیر ہوائیہ۔ سر سیموئل ہور، لارڈ پریوی سیل۔ سر جان اینڈرسن، نائب لارڈ پریوی سیل

ان کے علاوہ مسٹر ایڈن وزیر مقبوضات بنائے گئے جن کو کابینہ میں بیٹھنے کا خاص دیا گیا، اور لارڈ ہینکی وزیر بلا قلمدان مقرر ہوئے۔

برطانیہ کے ساتھ فرانس نے بھی ۴ ستمبر کو اعلان جنگ کر دیا اور جرمنی کے خلاف بحری، برّی اور ہوائی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ فرانسیسی فوجیں زیگفریڈ لائن کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں اور آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھانے لگیں۔ عربی علاقے جو فرانس کے زیر انتداب تھے، ہٹلر کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور جمہوری مملکتوں کے ساتھ اپنی ہمدردی ظاہر کر دی۔ جو عربی ملک برطانیہ کے زیر اقتدار تھے انھوں نے بھی اتحادیوں کا ساتھ دینے پر رضامندی ظاہر کی چنانچہ شام، ٹیونس، ماورائے زوردان، عراق، مصر اور فلسطین سب اتحادیوں کے ساتھ ہو گئے۔ سلطنت برطانیہ کے قلمرؤں نے بھی اس اڑے وقت میں ساتھ دیا۔ چنانچہ آسٹریلیا، کناڈا اور نیوزی لینڈ نے سب سے پہلے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ جنوبی افریقہ میں جنرل ہرٹزگ جو اس لڑائی میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے، کامیابی ہوئی۔ چنانچہ اس قلمرو نے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، اور برطانوی ہند کی طرف سے وائسرائے بہادر نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ ہندوستان برطانیہ کی تائید کے لئے تیار ہے۔ چند دنوں بعد ترک بھی انگریزوں سے متحد ہو گئے لیکن ان کے علاوہ بعض مملکتیں غیر جانبدار بھی ہیں اور وہ یہ ہیں :-

سیام، جاپان، اطالیہ، اسپین، ممالک متحدہ امریکہ، مکسیکو، آئرستان اور بلقان، اسکان ڈی نیویا اور بالٹک کی مملکتیں۔

جرمنی کی آب دوزیں :-

جنگ کے پہلے دو ہفتوں میں جرمنی کی آب دوز کشتیاں بہت سرگرم عمل تھیں چنانچہ ۴ ستمبر کو برطانیہ کا ایک جہاز "اتھی نیا" ڈبو دیا گیا۔ جہاز کے (۱۴۰۰) آدمیوں میں نصف سے زائد ڈوب گئے اور باقی لوگوں کی جان

بہ مشکل بچائی گئی۔ ایک اور جہاز جس کا نام "کرے جین" ہے، دو آب دوزوں کے حملے کا شکار رہا۔ مسٹر چرچل کے بیان کے مطابق یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ مگر انگریزوں نے جن کو اپنی بحری قوت پر پورا بھروسہ ہے، ایک طویل جنگ کے لئے تیاری کرلی اور جرمنی کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ مسٹر چمبرلین نے اعلان کیا کہ ہم کو کم از کم تین سال کی جنگ کے لئے تیار ہونا چاہیے۔ دوسری طرف سے ہٹلر نے جواب دیا کہ جرمنی آٹھ سال کے بعد بھی شکست نہیں کھا سکتا اور جرمن قوم پھر کبھی ایسے معاہدہ کے لئے تیار نہیں ہوگی جیسے پچھلی جنگ کے بعد معاہدۂ ورسائے ہوا تھا۔"

جرمنی:۔

جرمنی کی کابینۂ جنگ جس کی تشکیل ۳۱ راگست کو ہوئی حسب ذیل افراد پر مشتمل تھی:۔

فیلڈ مارشل گوئرنگ، صدر۔　　ہرہس، ہٹلر کے نائب۔　　ہر فرک، مختار کل (نازی نظم و نسق کے)

ڈاکٹر فنک، مختار امور معاشی　　ڈاکٹر لیامنس، وزیر مملکت و رصدر رائش چانسلری　جنرل کیٹال سپہ سالار

جرمنی میں گرفتاریاں:۔

۸ رنومبر کی رات میں جب ہٹلر میونچ کے ہال سے جرمنوں کے ایک بڑے مجمع کو مخاطب کرکے واپس ہوا تو اس کے ۱۰ منٹ بعد ایک بم کا حادثہ ہوا جس میں ہٹلر تو بچ گیا لیکن چھ آدمی مرے اور ۶۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ ہٹلر نے خود تحقیقات کی اور بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جرمنی میں بہت سے آدمیوں نے جنگ کے خلاف پروپگنڈا کرنا شروع کیا تھا اس لئے ہٹلر اس قسم کا پروپگنڈا کرنے والوں کو گرفتار کرنے لگا چنانچہ تقریباً (۱۸۰) آدمی قید کرلئے گئے۔ سابق قیصر جرمنی کے چوتھے لڑکے شہزادہ اگسٹ ولہلم کو بھی شبہہ کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔ جرمنی کے سابق سپہ سالار فیلڈ مارشل فان بلومبرگ اور دوسرے پرانے فوجی عہدہ دار بھی گرفتار ہوئے بلکہ ایک غیر مصدقہ خبر کی رو سے بلومبرگ کو گولی سے ماردیا گیا اور اس کی وجہ اب تک معلوم نہیں ہوسکی۔

پراگ کے ہنگامے:۔

پراگ بھی سیاسی آشوب سے خالی نہیں ہے چنانچہ یہاں سیاسی شورش کی بنا پر چند طالب علم گرفتار ہوئے تھے جب اس کے خلاف دوسرے طلبا نے احتجاج کیا تو تقریباً ۱۲۰۰ طالب علم گرفتار کرلئے گئے اور فوجی قانون نافذ کردیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ پراگ میں ایک دن کے اندر ۱۲۴ چک قید کئے گئے۔ ۸۰۰۰ طلبا کو گرفتار کیا گیا اور ۲۰۰۰۰ مسلح آدمی زیر حراست ہیں۔

اطالوی کابینہ:۔

اطالوی کابینہ میں بھی بعض اہم تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں، کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ کابینہ کے وزیروں نے استعفے دے دیا۔ سینیر اسٹیریس جو فاشسطی جماعت کے معتمد ہیں مستعفی ہوگئے اور ان کے فاشسطی فوج کا چیف آف دی اسٹاف

بنادیا گیا ہے۔ مارشل گریزیا نی، چیف آف دی آرمی اسٹاف۔ سینیر الفیری، سفیر جنرل ٹروزی وزیر اطالوی افریقہ مقرر ہوئے اور سینیر ارس سانڈرو، پاپولرکلچر کے وزیر بنائے گئے۔

روس کا مسلک:۔

جس وقت ڈانزگ کا سوال پیدا ہوا تھا اور جرمنوں نے ڈانزگ کو بغیر لڑائی کے ہضم کرنا چاہا تو برطانیہ اور فرانس کو روس کے آئندہ مسلک کے متعلق تشویش ہوگئی۔ انھوں نے روس کو اپنی "امن پسند برادری" میں شامل کرنا چاہا تھا اور اس سلسلے میں ان جمہوری مملکتوں کے نمائندے، ایک عرصے سے روس کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف تھے لیکن بدقسمتی سے حالات نے ایک نازک صورت اختیار کرلی اور اتحادیوں کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، کیونکہ اچانک یہ معلوم ہوا کہ روس نے جرمنی کے ساتھ ایک معاہدہ عدم اقدام پر دستخط کردئے ہیں اور برطانیہ، فرانس کو جرمنی سے لڑنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ اگرچہ جمہوری مملکتوں نے اس عدم اتحاد کی ذمہ داری روس پر عائد کی مگر روسی وزیر خارجہ مولوٹوف نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ برطانیہ اور فرانس اس ناکامی کے ذمہ دار ہیں کیونکہ انھوں نے بات چیت میں بہت سا وقت لے لیا۔ روس اس شرط پر جرمنی کے خلاف معاہدہ میں شریک ہونا چاہتا تھا کہ اس میں بالٹک کی مملکتیں یعنے لیتھونیا، لٹویا، اسٹونیا اور فن لینڈ بھی شریک ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان مملکتوں کو حفاظت کی ضمانت دی جائے مگر چونکہ وہ آزاد مملکتیں تھیں اس لئے وہ اس قسم کی ضمانت کے لئے راضی نہ ہوئیں اور اتحادیوں کی بات چیت کے ناکام رہنے کا سبب بن گئیں۔ روس نے اتحادیوں کے سامنے جو دوسری شرط پیش کی وہ یہ تھی کہ روسی فوجوں کو ڈانزگ تک جانے کے لئے پولستان میں سے حق راہ دیا جائے تاکہ روس جرمنی کے خلاف عملی طور پر پولستان کی مدد کرسکے، مگر پولستان اس شرط پر تیار نہیں ہوا اور اسی بنا پر روس نے پولستان کی مدد کرنے سے انکار کردیا۔ اس نازک صورت حال سے ہٹلر نے فائدہ اٹھایا اور روس سے معاہدۂ عدم اقدام پر دستخط کرالئے۔

روس اور جرمنی کا معاہدۂ عدم اقدام:۔

روس اور جرمنی کے معاہدۂ عدم اقدام سے پہلے برلن میں ان دونوں مملکتوں کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ بھی طے پایا تھا جس پر ۲۰ر اگست کو دستخط ہوگئے۔ اس معاہدے کی روسے جرمنی نے سات سال کے لئے روس کو بیس کروڑ مارک پانچ فی صد شرح سود سے قرض دے دئے تاکہ روس دو سال کے اندر جرمنی سے سامان خریدے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ جرمنی دو سال کے اندر روس سے اٹھارہ کروڑ مارک کی پیداوار خام خریدے، اور معاہدۂ عدم اقدام ماسکو میں ۲۳ر اگست کو طے پایا جس پر مولوٹوف اور فان ربن ٹراپ نے اسٹالن اور جرمن سفیر فان شولن برگ کے سامنے دستخط کئے۔ یہ معاہدہ سات دفعات پر

مشتمل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :۔ اس مدعا کے لئے کہ جرمنی اور روس کے درمیان امن قائم رہے اور اس قدیم رشتے کی بنا پر جو اپریل ۱۹۲۶ء کے معاہدۂ غیر جانبداری کے وقت قائم ہوا تھا، جرمنی اور روس کی حکومتوں کے مابین ذیل کا معاہدہ طے پایا :۔(۱) فریقین معاہدہ ایک دوسرے پر کسی قسم کا دباؤ ڈالیں گے اور نہ ایک دوسرے پر یا کسی ملحقہ یا حلیف ملک پر حملہ کرسکیں گے۔ (۲) اگر فریقین معاہدہ میں سے کوئی فریق کسی تیسری طاقت کے ساتھ حالت جنگ میں ہو تو دوسرا فریق اس تیسری طاقت کی کسی طرح مدد نہیں کرے گا۔ (۳) فریقین کی حکومتیں آئندہ ایک دوسرے سے مشورہ کرتی رہیں گی تاکہ جن معاملات میں دونوں کا مفاد وابستہ ہے ان سے پوری واقفیت رہے۔ (۴) فریقین میں سے کوئی فریق دوسری طاقتوں کے کسی ایسے متحدہ گروہ سے نہیں مل سکے گا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی ایک فریق کا مخالف ہو۔ (۵) اگر دونوں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف یا کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو تو دونوں مل کر ان جھگڑوں کو دوستانہ طریق پر طے کریں گے اور اگر ضرورت ہو تو ایک کمیشن کے ذریعہ ان مسائل کو حل کیا جاسکے گا۔ (۶) اس معاہدے کی مدت دس سال ہوگی، مگر اختتام مدت سے ایک سال پہلے کوئی فریق اس معاہدہ کو ختم کرنا چاہے تو وہ دوسرے فریق کو اس کی اطلاع دے۔ ورنہ مدت معاہدہ میں خود بخود پانچ سال کی توسیع ہوجائے گی۔ (۷) اس معاہدے کی برلن میں بہت جلد توثیق کی جائے گی اور توثیق سے متعلق دستاویزات کا تبادلہ بھی وہیں ہوگا۔

اس معاہدے کے اثرات :۔ روس اور جرمنی کے اس معاہدے کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ یورپی طاقتوں کا توازن بگڑ گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترازو کا پلٹا کچھ جرمنی کی طرف جھک گیا۔ فاشسٹی حلقوں میں بھی اس معاہدے کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس معاہدے کی بنا پر اطالیہ اور جرمنی کی دوستی تقریباً ختم ہوگئی اور جاپان، جرمنی سے برہم ہوگیا۔ ادھر اسپین سے جنرل فرانکو نے اس معاہدے سے ناراضگی ظاہر کی اور ہٹلر کی دوستی چھوڑ دی۔ روس کو پوری سیاست میں عمل دخل کا اچھا موقعہ مل گیا۔ روس کو دوست بنانے کی وجہ سے جرمنی کو پولستان کے حملے میں بڑی مدد ملی۔

پولستان کی تقسیم :۔ جب پولستان جرمنی کے مقابلے میں برسرپیکار تھا تو مشرق سے سرخ فوجیں پولستان میں داخل ہوگئیں۔ روس کے پولستان میں گھس آنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کو یوکرین وغیرہ کی قلتوں کی حفاظت کرنی ضروری تھی۔ جب روسی پولستان میں داخل ہوئے تو ان کی کسی نے مزاحمت نہیں کی، چنانچہ ان لوگوں نے پولستان کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔ سرمایہ دار اور زمیندار گرفتار کرلئے گئے اور پولستانی عہدہ داروں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ جرمنی اور روس دونوں حکومتوں نے مل کر پولستان کو آپس میں بانٹ لیا۔ (بقیہ مضمون صفحہ ۱۸۱ پر)

عہد آفرین مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔ اڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی (عثمانیہ)

مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم

مستقبل

چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے

دھڑکتے دلوں کی صدا آ رہی ہے
اندھیرے میں آوازِ پا آ رہی ہے
بلاتا ہے کوئی ندا آ رہی ہے

چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے

نہ سلطانیٔ تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری

چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے

اڑاتا ہوا پرچمِ زندگانی
سناتا ہوا عہدِ نو کی کہانی
جلو میں ظفرمندیاں شادمانی

چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے

سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے

چلا آ رہا ہے　　　چلا آ رہا ہے

مخدوم محی الدین

نیا سال مبارک!!

سب رس کا اردو نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے بڑی محنت سے اسے شائع کیا ہے اس میں زیادہ تر مضامین اردو ہی سے متعلق ہیں تاکہ آپ انہیں پڑھیں اور اپنی زبان کی ترقی کے لیے کوشش کریں۔ اردو دنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اس نے بہت کم مدت میں کافی ترقی کی ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک مشترکہ زبان ہے جسے ہر شخص بول سکتا اور سمجھ سکتا ہے اردو سے متعلق تفصیلی حالات آپ کو سب رس پڑھنے سے معلوم ہوں گے اردو میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتیں ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے ترقی دیں اسی مقصد کے لیے ۲۵ ڈسمبر ۱۹۳۹ء شام میں ۵ بجے ادارہ کے ایک نئے شعبہ کا قیام عمل میں آیا جس میں طبقۂ فوقانیہ تک کے طلبہ شریک تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد ادارہ نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی ایک ننھے طالب علم نے "بچے کی دعا" سے جلسہ کا آغاز کیا۔ پھر صدر نشین نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اس کے بعد انتخابات عمل میں آئے۔ رحیم الدین صاحب ظہیر آبادی نائب صدر، معین الدین احمد انصاری معتمد، مجید احمد صاحب فاروقی نائب معتمد، اراکین کابینہ، شعیب اللہ خاں صاحب، حبیب احمد صاحب، محمد علی صاحب عادل۔ خدا بخش صاحب سلیم عارف علی صاحب انصاری۔ عبدالرزاق صاحب۔ محی الدین علی صاحب۔ معتمد کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور اس کے بعد مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں آئندہ تقریر کے لیے یہ عنوان مقرر کیا گیا "ہندوستانی طلبہ کو فوجی تعلیم لازمی ہے"۔ جلسہ ۱۶ اسفندار ۱۳۴۹ف م ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء بوقت ۴ ساعت شام منعقد ہوگا۔ فوقانی جماعتوں تک کے طلبہ اس جلسے میں شریک ہو سکتے ہیں۔

نومبر کے پرچے میں جو معمہ دیا گیا تھا اس کے حل بہت سے وصول ہوئے۔ مگر ایک بھی صحیح نہ تھا اسی وجہ سے انعام کسی کو نہیں دیا گیا۔

معمہ کا صحیح حل
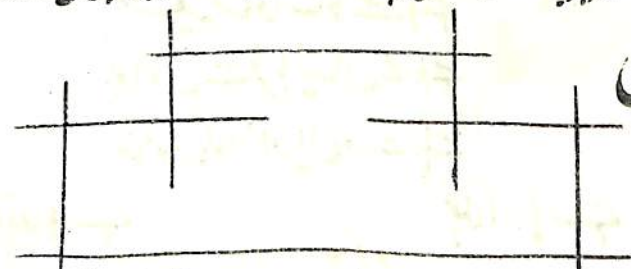
اردو نمبر کو آپ نے کیسے پایا ہمیں معلوم کیجیے

نوٹ:۔ جن خریدار اصحاب کے چندے ختم ہو گئے ہیں۔ براہ کرم وہ جلد از جلد نئے سال کا چندہ روانہ کر دیں۔

معین الدین احمد انصاری

Aziz
پیدائش سنہ ۱۸۴۶ء لسان العصر سید اکبر حسین اکبرآبادی وفات سنہ ۱۹۲۱ء
ان کا کلام طنز یہ ہوتا ہے جس کی کامیاب ابتدا اردو میں انھیں کے
ہاتھوں ہوئی. سماج کو انھوں نے اس طرح ہنسایا کہ دل
رونے لگا.
پیدائش سنہ ۱۸۶۸ء مصورِ غم علامہ راشد الخیری وفات سنہ ۱۹۳۶ء
اردو کے بڑے نثر نگار تھے. طرزِ تحریر دردانگیز
عورتوں کی اصلاح اور ترقی ان کے پیش نظر تھی
پیدائش سنہ ۱۸۳۷ء شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی وفات سنہ ۱۹۱۴ء
سرسید کے گہرے دوست تھے اور انہیں کے کہنے پر مسدس لکھا
جس نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے چونکایا. جدید اردو شاعری کی
بنیاد ڈالی.
پیدائش سنہ ۱۸۱۷ء محسنِ قوم سرسید احمد خاں وفات سنہ ۱۸۹۸ء
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد ڈالی ان کی زندگی قومی کاموں
کے لئے وقف تھی. قوم کو غدر کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچایا.
پیدائش سنہ ۱۸۳۶ء
وفات سنہ ۱۹۱۲ء
شمس العلماء حافظ نذیر احمد
اردو ناول نگاری میں زندگی کو جیتا جاگتا
قرآن شریف اور کئی انگریزی کتابوں کا اردو
یادگار ترجمہ کیا اچھے ادیب. اچھے مقرر تھے
پیدائش سنہ ۱۸۷۳ء. وفات سنہ ۱۹۳۸ء
سر شیخ محمد اقبال
ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے. قومی اصلاح سے شاعری
شروع کی آگے چل کر انسانیت کی اصلاح کے لئے مستقل پیام بنی.
زمانہ صدیوں بعد ہی ایسا شاعر پیدا کر سکے گا
بچوں کے شاعر تھے. ان کی نظمیں اردو ادب میں
اضافہ ہے. مناظرِ فطرت اور قدرت کی کارگری
اردو ادب میں سب سے پہلے پیش کیا.
پیدائش سنہ ۱۸۴۴ء مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی وفات سنہ ۱۹۱۷ء

اردو

کچھ تمھیں سناؤں اردو کی میں کہانی — دلچسپ داستاں ہے سن لو مری زبانی

کہتے تھے اس کو لشکر پھر یہ زباں ہوئی ہے — یہ مادری زبانِ ہندوستاں ہوئی ہے

ہندوستاں نے اس کو اپنی زباں بنایا — شاہوں نے اس کا رتبہ دنیا میں ہے بڑھایا

آغوشِ مغلیہ میں برسوں پلی ہے اردو — شمشیر بن کے ان کے منہ سے چلی ہے اردو

شاہانِ ہند نے بھی جینے کا گر سکھایا — پستی میں یہ پڑی تھی بامِ فلک پہ لایا

"جنت نشانیوں کی" ہے مادری زباں یہ — مشرق کے کارواں کی واحد ہے سارباں یہ

غالب نے اس کی عظمت غالب جہاں پہ کر دی — شعر و ادب میں جس نے اک روحِ تازہ بھر دی

مومن، انیس، سودا اردو کے پاسباں تھے — یہ ان کی ہم زباں تھی وہ اس کے ہم زباں تھے

شبلی[1]، نذیر[2]، سید[3]، آزاد[4]، میر، حالی — اردو کے گلستاں میں ان سب نے جان ڈالی

انشا، تراب، آتش، ناسخ، ظفر سبھوں نے — امکان کے موافق خدمات کیں زباں کی

اقبال نے بھی اپنا خونِ جگر دیا تھا — اردو کا جس نے گلشن سرسبز کر دیا تھا

ندوی[5]، نیاز[6] و حق[7] سے پھولی بہارِ اردو — اور شیخ چاند[8] بھی تھے خدمت گزارِ اردو

احسان[9]، جوش[10]، اختر[11]، مرزا ادیب، شبلی[12] — کرتے ہیں نگہبانی اردو کی سرزمیں کی

ماہر[13] و ساز، امجد[14] ماہر ہیں اپنے فن کے — سرسبز کرنے والے اردو ترے چمن کے

مخدوم، وجد، بیکس اردو کے نغمہ خواں ہیں — زور[15] اور سروری[16] اس گلشن کے باغباں ہیں

ڈر ہے کہ ہوں نہ عریاں تیرے زبان گیسو — ہندی[17] سے ہو رہی ہے مٹ بھیڑ تیری اردو

پر ہے یقین زاہد عالم میں یہ رہے گی
بن کر زبانِ عالم پھولے گی اور پھلے گی

باقر علی زاہد

---

[1] شبلی نعمانی، [2] نذیر احمد، [3] سر سید، [4] ابو الکلام آزاد، [5] سلیمان ندوی، [6] نیاز فتحپوری، [7] عبد الحق، [8] شیخ چاند، [9] احسان دانش، [10] جوش، [11] اختر شیرانی، [12] شبلی (بی کام)، [13] ماہر، [14] امجد، [15] ڈاکٹر زور، [16] عبد القادر سروری، [17] موجودہ ہندی اردو نزع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ اول اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصفجاہ اول کے مجمل حالات مستند واقعاتِ زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ادارہ دوسرے سلاطین آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے۔ اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہیے۔ مصنف مولوی شیخ چاند مرحوم ایم۔ اے۔ ایل ایل بی ارتجا اسکال قیمت ۸؎

ہمیں اردو سے کیوں محبت ہونی چاہیئے؟

پیارے بچو! تمھیں اپنے ماں باپ سے اپنے بھائی بہن سے اپنے دوستوں سے محبت ہے تم ان سے بات چیت کرکے ہنس بول کے خوش ہوتے ہو۔ یہی بات چیت تمھاری ان کی محبت کو بڑھاتی ہے۔ جو تمھارے دل میں ہوتا ہے تم ان سے کہتے ہو اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں تم سے کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ ذرا سی دیر کے لئے سوچو کہ تمھارے ماں باپ، تمھارے بہن بھائی، تمھارے دوست تم سے بولنا چھوڑدیں تو تمھیں کتنی تکلیف ہو؟ زندگی کا لطف آدھا رہ جائے۔ تم یہ محسوس کروگے کہ تمھاری کوئی بہت قیمتی چیز کھوگئی ہے۔ تمھاری محبت اور دوستی کا رشتہ تمھاری بات چیت ہے۔ جب سے تم نے ہوش سنبھالا بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے جب تم بالکل بچے تھے تم نے اپنی پیاری ماں سے اپنے پیارے ابا سے اپنے چھوٹے بڑے بہن بھائیوں سے اردو میں بات چیت کی۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ اردو سے تمھیں محبت کرنی چاہیے یا نہیں؟ اگر تم اردو نہ جانتے ہوتے تو محبت کے جتنے رشتے اب تک تم نے ایک دوسرے سے باندھے ہیں، ان میں سے ایک بھی نہ ہوتا۔

اب ذرا ایک بات اور سوچو تم اپنی اماں سے کھانے پینے کی چیزیں مانگتے ہو اپنے ابا سے بازار سے اچھے اچھے کھلونے اور کپڑے منگاتے ہو۔ بازار جاکر طرح طرح کی چیزیں خریدتے ہو۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہو۔ ان کی باتیں سمجھتے ہو اور انھیں اپنی باتیں سمجھاتے ہو۔ تمھاری زندگی کی ساری ضرورتیں ایک دوسرے سے بول کر ہی پوری ہوتی ہیں۔ اگر تم بول نہ سکتے تو تمھیں کتنی دقت ہوتی تمھیں کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کے کپڑے کھیلنے کے کھلونے اور اسی طرح کی اچھی اچھی چیزیں ملنے میں کتنی دقت ہوتی۔ تم گونگوں کی طرح اشارے کرتے۔ کبھی کوئی تمھارے اشارے سمجھتا اور کبھی نہ سمجھتا۔ تمھیں الجھن اور تکلیف ہوتی کہ جو کہہ رہے ہو اسے دوسرا سمجھ نہیں سکتا یا جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے وہ تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔ محبت اور ضرورت کے یہ سارے رشتے اس زبان کی وجہ سے قایم ہیں جو تم دن رات ایک دوسرے سے بولتے ہو، جسے تم پیدا ہونے کے بعد سے اب تک اپنی ماں کی گود میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل کر سیکھا۔ اس لئے تمھیں چاہیے کہ اس زبان سے محبت کریں۔ اردو ہی کی بدولت تمھیں زندگی کی یہ ساری خوشیاں اور نعمتیں ملی ہیں۔ اس لئے تمھیں چاہیے کہ تم اس کو دل وجان سے زیادہ پیاری سمجھو۔

تم میں سے ہر ایک نے مدرسے میں پڑھا ہے۔ کورس کی کتابیں مثلاً تاریخ جغرافیہ اور حساب کے علاوہ تم نے طرح طرح کی کام کی باتیں پڑھیں۔ اور روز بروز نئی باتیں سیکھیں۔ بتاؤ اگر تم اردو نہ جانتے ہوتے تو تمھیں یہ پیاری پیاری باتیں کیسے معلوم ہوتیں۔ تم "بچوں کی دنیا" اور "سب رس" پڑھتے ہو۔ اچھی اچھی نظمیں اچھے اچھے قصے۔ اچھے اچھے لوگوں کے حالات دنیا کی نئی نئی باتیں تمھیں معلوم ہوتی ہیں اور تمھارا وقت کتنی دلچسپی سے کٹتا ہے۔ تم واقعی کتنے خوش قسمت ہو،

ذرا سوچو کہ وہ بچے جو اردو سبق نہیں پڑھ سکتے۔ کتنے بدنصیب ہیں کہ انھیں یہ اچھی اچھی باتیں نہیں معلوم ہوتیں۔ انھیں نصیحت کی باتیں نہیں معلوم ہوتیں وہ اچھی باتیں سوچنے اور اچھی باتیں کرنے کے فائدے نہیں جان سکتے۔ اور اس لئے ان کی زندگی بری کٹتی ہے۔ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ انھیں اچھا نہیں سمجھتے۔ تمھیں سب پیار کرتے ہیں۔ تم سے سب محبت کرتے ہیں۔ تمھیں اچھا سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ تم اردو جانتے ہو۔ اور اردو کی کتابیں پڑھ کر تم نے اچھی اچھی باتیں سیکھی ہیں۔ اب بتاؤ تمھیں اردو سے محبت کرنی چاہیے یا نہیں؟

اردو میں ہزاروں کتابیں ہیں۔ کچھ آج کل کی لکھی ہوئی ہیں اور کچھ اب سے چند سال پہلے لکھی گئی تھیں اور کچھ اب سے سیکڑوں برس پہلے ہر زمانہ میں اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہوئے انھوں نے اردو میں ایک سے زیادہ عمدہ کتابیں لکھیں۔ یہ سب لکھنے والے اب مر گئے مگر انھوں نے جو اچھی باتیں کہی تھیں وہ ان کتابوں کے ذریعہ سے اب تک تمھارے پاس موجود ہیں۔ تمھارے ان بزرگوں نے پرانے زمانہ میں تمھارے ملک میں کیا کیا ترقیاں کیں۔ اسے کس کس طرح اچھا بنایا۔ انھوں نے کیا کیا کہ دنیا آج تک ان کا نام عزت سے لیتی ہے۔ یہ سب باتیں تمھیں ان پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ تم اگر انھیں پڑھو گے تو تمھیں اپنے پیارے ملک کی ترقی کا حال معلوم ہوگا تم ان باتوں کو پڑھ کر اپنے ملک پر فخر کرو گے۔ تمھیں خوشی ہوگی تم دوسرے لوگوں کے آگے عزت اور فخر کے ساتھ سر اٹھا کر کہہ سکو گے۔ تمھارے دل میں اپنے ملک کی سچی محبت پیدا ہوگی۔ بتاؤ کہ جو کتابیں پڑھ کر تمھارے دل میں اتنی اچھی اچھی باتیں پیدا ہوں ان سے تمھیں محبت ہونی چاہیے یا نہیں؟ تم کہو گے کہ ہاں ضرور ہونی چاہیے۔ اگر تمھارے دل میں یہ خیال اچھی طرح جم جائے گا تو تم خود اردو سے محبت کرنے لگو گے۔

پیارے بچو! اردو سے محبت کئے بغیر نہ تمھاری زندگی اچھی بن سکتی ہے نہ تم ملک کی سچی خدمت کے قابل بن سکتے ہو۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا کے لوگ اقبال، اکبر، مہاتما گاندھی، جواہر لال اور ابوالکلام آزاد کی طرح تمھارے نام پر فخر کریں تو تم پہلے اپنی پیاری اردو سے محبت کرو کہ اس کی مدد سے دنیا کے بہت بڑے آدمی بن جاؤ۔

ماخوذ از "بچوں کی دنیا"

زبان اردو کی ترقی

رمن راج سکسینہ
(سٹی کالج)

اردو زبان میں علوم و فنون کی کمی ہے لیکن پھر بھی دوسری زبانوں کے خیالات سے اردو کے دامن کو لبریز کرنا چاہیے۔ اگر ہم وطن کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس کی ترقی اور بہبودی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی زبان سے بھی محبت کریں اور ہر ممکن طریقے سے اسے ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اردو زبان میں ادب کے بیش بہا ذخیرے ملیں گے۔ اور اس دریا میں بھی بہت سے موتی دستیاب ہوں گے۔ اگر ہماری زبان میں کسی چیز کی کمی ہے تو اس کو پورا کرنا چاہیے اور اسے دوسری زبانوں کی طرح ترقی یافتہ بنانا چاہیے۔ اردو زبان کو اگر ہم ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ خیالی مضامین سے پرہیز کریں اور اس کے دامن کو ایسی تیز گامی سے بڑھائیں کہ گلدستے کے پھولوں کی خوشبوؤں سے لوگوں کے

داغ معطر ہو جائیں۔ ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو انگریزی علوم فنون کے خزانوں سے مالا مال ہیں۔ اور ہماری زبان کو اس سے معمور کر رہے ہیں دراصل ہماری زبان کی ترقی ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو دونوں خزانوں پر قابض ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہماری التجا ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور اپنی زبان کو ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اس پر عمل کرنے سے امید ہے کہ اس میں علوم فنون کے دریا ابل پڑیں گے۔

محمد معین الدین جنیدی
(گلبرگہ)

لکھیں تو کیسے لکھیں

خیال تو ہوتا ہے کہ مضمون لکھیں مگر لکھیں تو کیسے لکھیں۔ پہلے تو عنوان کا سوچنا ہی مشکل ہے۔ اور جب عنوان مل گیا تو اب یہ فکر دامنگیر ہے کہ آغاز کیسے ہو۔ خیر جوں توں کر کے جب مضمون شروع کیا مشکل سے چند سطریں ہی لکھی گئی تھیں کہ اندر سے آواز آئی "جمیل میاں، خالہ جان آئی ہیں۔ پردے لیجاؤ۔" خالہ جان کو اتارنے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں آیا۔ دیکھا کہ قلم کی نب ٹوٹی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ میرا چھوٹا بھائی خلیل کمرہ میں آیا تھا۔ میں نے تاڑ لیا کہ یہ ان ہی کی کارگزاری ہوگی۔ میں امّی کے پاس گیا اور کہا کہ خلیل نے میرے قلم کی نب توڑ دی ہے۔ مجھے دوسری نب منگا دیجئے۔ امّی کہنے لگیں۔ پرسوں ہی تم کو پیسے دیے تھے۔ تجھے کسی چیز کے رکھنے کا سلیقہ کہاں ہیں۔ ہمیشہ یہی رونا ہے آج نب غائب کل قلم غائب اور پرسوں کاپی غائب اِدھر سے آتے ہو پیسے دیجئے اُدھر سے آتے ہو پیسے دیجئے پڑوسن کے لڑکے سردار میاں کو دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے ہمیشہ اپنی ہر چیز سلیقے سے رکھتا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ ہمیشہ یہ غائب وہ غائب۔ اتنے میں خالہ جان بھی آگئیں اور کہنے لگیں۔ جمیل تو بہت اچھا لڑکا ہے ہمارے ہاں کا شیطان نعیم تو ان سے بدتر ہے۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ وہ دفتر جانے کی تیاری میں تھے اور آپ سیکل لے کر اسکول چل دیے۔ آخر ان کو پیدل ہی جانا پڑا۔ بڑی دیر بعد پچ آگئی میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ خدا جانے امّی اور خالہ جان میں کیا کیا باتیں ہوتی رہیں۔ امّی میری شکایتیں کرتیں اور خالہ جان اپنے لڑکے نعیم کی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ تمام خیالات منتشر ہو چکے تھے آخر بڑی مشکل سے آدھا صفحہ بھی نہ ہوا تھا کہ خالہ جان آئیں اور کہنے لگیں۔ کونسے اسکول میں پڑھتے ہو بیٹا اور کس کلاس میں' اتنے میں امّی بھی آگئیں اور کہنے لگیں کہ چار بج چکے ہیں اب تک راموکا پتہ نہیں۔ ابا کی سیکل ہے دوڑ کر سودا تو لادو۔ سچ کہتا ہوں۔ سودے کا نام سنتے ہی میرا جسم سرد پڑ گیا مجبور تھا سیکل لے کر (معظم جاہی) مارکٹ پہنچا۔ سودا لے کر واپس ہو رہا تھا مگر تمام خیالات مکان میں تھے کہ آیا کچھ مضمون لکھنے کا موقع ملتا ہے کہ نہیں۔

یکایک مجھے ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اب جو آنکھ کھولتا ہوں تو معلوم ہوا کہ دواخانہ میں ہوں۔ اور ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ شاید موٹر سے ٹکر ہو گئی ہوگی ـــ جو مضمون لکھنے کا نتیجہ ہے۔ اب آپ ہی کہیے کہ مضمون لکھیں تو کیسے لکھیں۔

سید سجاد محسن (دار العلوم)

ہماری زبان

زبانِ اردو ہے مجموعۂ علومِ جہاں — جو اس زبان میں حظ ہے کسی زبان میں نہیں

ہمارا ملک دکن ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے جس میں بہت سی قومیں رہتی ہیں۔ ان قوموں کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں۔ مثلاً بنگالی، تلنگی، مرہٹی، ٹامل وغیرہ یہ سب زبانیں اچھی ہیں۔ لیکن ان کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں سے کوئی زبان ایسی نہیں جس کو ہندوستان کے ہر حصے کے لوگ سمجھ سکیں۔

ہم جو زبان بولتے ہیں یعنی اردو ہندوستان کی عام زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو انگریزوں نے "ہندوستانی" کا نام دیا، جو آج بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ "ہندوستانی" کا نام اردو کو اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کی عام زبان ہے۔ جس طرح ایران کی زبان کو ایرانی، عرب کی زبان کو عربی، چین کی زبان کو چینی اور جاپان کی زبان کو جاپانی کہتے ہیں۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ یوں تو ہر زبان میں دوسری زبانوں کے کچھ نہ کچھ الفاظ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن مخلوط کا لفظ ایسی زبان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو دو یا دو سے زیادہ زبانوں سے مل کر بنے۔ لیکن جن زبانوں سے مل کر بنی ہو ان میں سے کسی میں ضم نہ ہو جائے۔ بلکہ ایک تیسرے نام سے علیحدہ اور آزاد حیثیت اختیار کرے۔

اردو شمالی ہندوستان کی پرانی زبان پراکرت اور فارسی سے مل کر بنی ہے۔ لیکن اُس کا نام نہ تو پراکرت ہے اور نہ فارسی۔ بلکہ وہ ایک تیسرے ہی نام سے مشہور ہو گئی یعنی اردو کہلانے لگی۔ مخلوط زبانیں دو قوموں کے میل ملاپ سے بنتی ہیں۔ ہندوستان کی حد تک یہ دو قومیں — ہندو اور مسلمان ہیں۔ اور دونوں اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترک قومی زبان، اردو یا ہندوستانی ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہی زبان ہندوستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کی ترقی میں ہندو، اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے سوائے کسی اور زبان میں ہندوستان کی مشترک قومی زبان بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

اردو یا ہندوستانی میں۔ فارسی، عربی، سنسکرت، پراکرت، ہندی، پنجابی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، مارواڑی، ٹامل، ترکی، عبرانی، یونانی، پرتگالی، انگریزی وغیرہ کے بھی الفاظ ہیں اور ان زبانوں کے الفاظ کو۔ اردو نے اپنا لیا ہے۔

سنسکرت۔ درشن، روپ۔ **پراکرت**۔ راؤ، رانا۔ **ہندی**۔ سونا، سنا۔ **گجراتی**۔ ننھا۔ **مارواڑی**۔ تال۔ **ترکی**۔ انا۔
انگریزی۔ گلاس، جنگل، کوٹ، کاروان۔

سر تیج بہادر سپرو نے کیا خوب کہا ہے "اردو زبان ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے"۔ راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ اردو میں ہندوستان کی مشترک قومی زبان بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اردو کی ترقی اور اشاعت میں حتی المقدور کوشش کرے۔ تاکہ اردو زیادہ سے زیادہ مقبولِ عام ہو۔

اشرف عابدی

ردو ادب کی ابتدا و ارتقاء

ادب اور زندگی دو ایسے لازم و ملزوم عناصر ہیں جن میں ایک کا وجود دوسرے کے لئے ناگزیر ہے۔ زندگی گویا ایک آئینہ ہے ور ادب اس کا عکس، ادب زندگی کی لطافتوں، رنگینیوں اور انقلابات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر انقلاب انگیز واقعہ جو کسی قوم ی تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے وہ اس قوم کے ادب پر بھی اپنے نقوش ثبت کرتا ہے۔ چنانچہ ادبیاتِ اردو کی تاریخ بھی ہمیشہ ہندوستان ے انقلابات، کشمکشوں اور عروج و زوال کے واقعات سے ہمیشہ متاثر ہوتی رہی۔ چنانچہ اس نے جس ماحول اور فضا میں پرورش ئی ہے اور ترقی کی ہے اس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔

قدرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ ایک بچہ ہمیشہ بچہ نہیں رہ سکتا۔ اس قانون فطرت کا اطلاق کائنات کے ذرے ذرے پر ہوتا ہے اس لئے کسی ملک کی زبان اور ادب بھی اس قانون کی عملداری سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اردو زبان نے بتدریج ارتقائی منازل طے کرنے شروع کر دیے۔ لیکن یہ کچھ عجیب بات ہے کہ شمالی ہند جہاں سب سے پہلے اردو کی تخلیق عمل میں آئی وہاں اس کی رفتار ترقی کچھوے کی رفتار سے زیادہ سست رہی۔ البتہ جنوبی ہند میں یہ زبان بہت پھلی پھولی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے دکن کو اردو کا مولد کہا جاتا ہے۔

دکن میں شمالی ہند سے بہت پہلے تصنیفی اور تالیفی دور شروع ہو چکا تھا۔ لوگ ادب کتابی کی طرف جوق جوق رجوع ہونے لگے تھے۔ کچھ تو بادشاہوں کی سرپرستی اور کچھ اس زمانے کی علمی فضا ان دونوں نے مل کر سرزمینِ دکن پر اردو ادب کے بہت سے عالم پیدا کر دیے تھے۔ چنانچہ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز خواجہ بندہ نواز سر آمد اقران و امثال ہیں۔ آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف "معراج العاشقین" ادبیات اردو کے اولین کارناموں میں سے ہے۔ یہ کتاب ۱۳۹۸ء میں لکھی گئی اور اس کتاب کا انداز انشا ابتدائی اردو کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ "پیر منع کیے سوں پرہیز کرنا۔ مراقبے کی گولی مشاہدے کے کانسے میں میکائیل کی مدد کے پانی سوں جلی کا کاڑا کر کو پلانا۔ سکن کا کاڑا دینا۔ نرگن ہوا تو شفا پاوے گا۔ طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرنا تو تے بھی طبیب ہو جائے گا۔ ہور ماٹی میں ماٹی، ماٹی میں پانی، ماٹی میں آگ، ماٹی میں بارا، ماٹی میں خالی۔ ان پانچ عناصراں کا واجب الوجود ہو جائے تو معرفت تمام ہوا۔"

بعض محققین نے امیر خسرو کی لغت "خالق باری" کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے لیکن امیر خسرو کی اس تصنیف میں بھاشا اور فارسی اس تناسب سے ملائی گئی ہے کہ یہ تصنیف اردو کہلانے کی مستحق نہیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ امیر خسرو ہی نے پہلے پہل بھاشا اور فارسی کو ملانا شروع کر دیا تھا لیکن ان کے اشعار، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے پتہ چلتا ہے کہ بھاشا فارسی پر اس قدر بھاری تھی کہ اس نئی زبان کو ہندی کہا جاتا تھا جیسا کہ خود حضرت امیر خسرو کو اس کا اعتراف ہے۔

یہ "ہندی زبان" خانہ ہم بسیت گھر ہے
بے حرمت خطر بیم تن [illegible] ہے

بہر حال اس لحاظ سے "معراج العاشقین" ہی ادبیات اردو کی پہلی کتاب ہے۔ "معراج العاشقین" کے بعد حضرت خواجہ بندہ نواز نے علم تصوف پر تینتیس ۳۳ سے زاید کتابیں لکھیں۔ اسی زمانے میں حضرت خواجہ بندہ نواز کے ایک عزیز سید محمد عبداللہ حسینی نے عبدالقادر جیلانی کے رسالے "نشاط العشق" کا دکھنی اردو میں کامیاب ترجمہ کیا۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کے شغل تصنیف و تالیف نے اس زمانے پر گہرا اثر ڈالا چنانچہ ان کی تصانیف نے دوسرے علما اور شعرا کے ذوقِ تصنیف و تالیف کو ابھارا اور اس طرح اکثر علما اور صوفیائے کرام نے اپنی توجہات تصنیف و تالیف کی طرف منعطف کیں۔ چنانچہ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق نے ۱۴۹۵ء میں "مرغوب القلوب" شاہ برہان الدین نے ۱۵۸۲ء میں "کلمۃ الحقایق" اور شاہ امین الدین بیجاپوری نے ۱۶۰۱ء میں گنج مخفی جیسی مشہور و معروف ادبی تصانیف سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ انہی بزرگوں کی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اردو رفتہ رفتہ دکن کے ہر باشندے کے دل میں اپنا گھر کرتی رہی۔ بہادر شاہ کے طوطے کا قصہ بہت مشہور ہے۔ ایک مرتبہ سلطان نصیر الدین ہمایوں نے بہادر شاہ حاکم گجرات و دکن پر چڑھائی کی۔ بہادر شاہ کا ایک نمک حرام سردار رومی خاں ہمایوں سے جا ملا۔ بہادر شاہ کی شکست کے بعد مالِ غنیمت کے ساتھ بہادر شاہ کا چہیتا طوطا بھی لایا گیا جونہی طوطے نے رومی خاں کی صورت دیکھی چیخ اٹھا۔

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام"

اس قصے سے صرف اتنا اظہار مقصود ہے کہ اردو نے دکن میں کتنی ترقی حاصل کی تھی نہ صرف کتابی ادب بلکہ بول چال میں بھی دکن شمالی ہند سے بہت آگے تھا۔ شمالی ہند چونکہ ہر دور میں بیرونی حملہ آوروں کا آماجگاہ بنا رہا اس لئے وہاں کی تہذیب و تمدن ادب اور زبان کو ترقی کا موقع کم ملا۔ البتہ دکن دور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ حملہ آوروں کی دست برد سے محفوظ رہا۔ اس پر ہمیشہ امن کا دیوتا حکمراں رہا۔ اس لئے تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ادب اور زبان نے بھی ترقی حاصل کرنی شروع کی نیز دکن میں اردو کو ہمیشہ شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ چنانچہ عادل شاہی اور قطب شاہی فرمانرواؤں نے زبان اور ادب کی ترقی میں اپنی ساری توجہات صرف کر دیں۔ ان کی سرپرستی نے نہ صرف اردو کو اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنا سکھایا بلکہ بہت سے شاعر مصنفین اور مولفین بھی پیدا کئے۔ بادشاہ اور سلاطین خود شاعر اور عالم ہوتے تھے۔ چنانچہ عادل شاہی خاندان اور قطب شاہی مملکت کا تقریباً ہر فرمانروا عالم فاضل اور شاعر گذرا ہے۔ ان کے دربار علما و فضلا شعرا اور ادیبوں کا مرجع بنے رہتے تھے۔ چنانچہ نصرتی، وجہی، غواصی، شاہ ملک، ابن نشاطی، رستمی، امین، سیوا، مومن اور ہاشمی دربار گولکنڈہ اور بیجاپور کے "نورتن" کہلاتے ہیں۔ ان شعرا اور انشاپردازوں نے اپنے آپ کو صرف درباری شاعری تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ قلمی کاوشوں نے بھی اردو ادب کے خزانے میں اضافہ کرتے رہے چنانچہ نصرتی کا "علی نامہ" وجہی کی "سب رس" اور "قطب مشتری" ابن نشاطی کی "پھول بن" فائز کا منظوم قصہ "رضواں شاہ" امین بیجاپوری کی "جوہر الاسرار" کے نام آج تک ادبیات اردو میں بڑی فخر کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ انہی عادل شاہی فرمانرواؤں کے عہد میں اردو سرکاری اور دفتری زبان بنائی گئی اس کے بعد پھر کیا تھا اس زبان نے

خوب ہاتھ پاؤں نکالے۔

سلاطین بیجاپور کی طرح سلاطین گولکنڈہ نے بھی اردو ادب کی بے لوث خدمت کی خصوصاً محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اردو، مملکت گولکنڈہ کی مقبول عام زبان تھی۔ بادشاہ خود اردو کا ایک قادر الکلام شاعر اور بلند پایہ ادیب تھا۔ اس نے اردو شاعری میں حسن و عشق، تصوف و معرفت کے علاوہ انسانی معاشرت پر بھی نظر دوڑائی شادی بیاہ، ہولی بسنت، صراحی و پیالہ کا مکالمہ، سالی گوری کا مکالمہ وغیرہ۔ قلی قطب شاہ معانی تخلص کرتا تھا۔ اس نے اردو ادب میں اپنی ایک یادگار کلیات کی شکل میں چھوڑی ہے۔ اکبر کے دربار کے نو رتنوں کی طرح اس کے دربار کے بھی "رتن" بہت مشہور و معروف ہیں۔ ملا وجہی ان سب میں ممتاز و نمایاں ہے۔ اس نے دو معرکۃ الآرا تصانیف "سب رس" اور "قطب مشتری" تصنیف کیں "سب رس" اردو نثر کی شاہکار تصنیف ہے اور قطب مشتری ایک نہایت اعلیٰ مثنوی ہے۔ سب رس صرف ایک علمی کاوش ہی نہیں بلکہ اس زمانے کی اردو کی صرف و نحو کا ایک شفاف آئینہ ہے۔ اس دور کے بعد ولی، جعفر، سالک، فضلی، لطفی، احمد، اشرف، ہاتفی وغیرہ پیدا ہوئے۔ شعر و سخن کا سیلاب آیا ان کا بچا کچا مال و متاع دیوان اور کلیات کی شکل میں اردو ادب کو ملا۔ ولی ان تمام شعرا میں ممتاز اور نمایاں شخصیت کا حامل تھا۔

محمد شاہ کے عہد میں شمالی ہند میں اردو نے ترقی کے منازل طے کرنے شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے بہت سے شعرا آج تک اردو ادب کے مربی و محسن سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ ظہور الدین حاتم، نجم الدین آبرو، شرف الدین علی خاں فغاں، محمد شاکر ناجی، مرزا رفیع سودا قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں بہتر شیخ ظہور الدین حاتم تھے۔ مرزا رفیع سودا انہی کے شاگرد تھے۔ ان ارباب اردو نے شاہ جہاں آباد (دہلی) میں اردو کو اتنی ترقی دی کہ شاہ جہاں آباد (دہلی) کو "اردو کا شیراز" کہا جانے لگا۔ چنانچہ سر سید لکھتے ہیں۔

"یہ زبان اب اتنی منجھ گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر ہونی ممکن نہیں اور اس زبان کو شاہ جہاں آباد سے ایسی ہی نسبت ہے جیسے فارسی کو شیراز سے۔"

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جس نے شاہ جہاں آباد کو بسایا۔ اس کے عہد تک اردو صرف بول چال کی زبان تھی۔ کتابی ادب سے لوگ بے بہرہ تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۱۴۰ء سے قبل کسی کتاب کا نام نہیں سنا گیا۔ البتہ سنہ ۱۷۳۱ء میں شاہ فضل اللہ فضلی نے "دہ مجلس" "یا کربل کتھا" کے نام سے اردو نثر کی پہلی کتاب لکھی جس میں واقعات شہادت کربلا مندرج ہیں۔ شمالی ہند میں فضلی کی اس کتاب کو اردو نثر کی اولین تصنیف اور فضلی کو اردو نثر کا باوا آدم تسلیم کیا گیا ہے۔ فضلی کی اس تصنیف میں ہمیں پاکیزہ اردو نظر آتی ہے جو حال حال کے زمانے تک بھی ہندوستان میں رائج تھی۔

اس تصنیف کے بعد سے شمالی ہند میں تصنیفی و تالیفی شغل دھڑلے سے شروع ہو گیا۔ سنہ ۱۷۶۶ء میں مرزا رفیع سودا نے "دیباچہ دیوان مرثیہ" لکھا۔ مرزا رفیع سودا کا طرز فضلی کی طرز انشا سے بالکل مختلف ہے۔ رفیع اس قسم کی عبارت آرائی کرتے تھے۔

"مضمون سینے میں مثل از مرغ نہیں کہ ہو بیچ قفس کے جس وقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش و ادر کے" رسیع سودا نے مثنوی "شعلۂ عشق" بھی اسی عبارت میں لکھی ہے۔ نیز شعوی تاریخ گوئی کے موجد بھی رسیع سودا ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت موت کی ہچکیاں لے رہی تھی جب وہ آخری ہچکی لے کر ختم ہو گئی تو اردو کا کوئی سرپرست نہ رہا اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو کی انگلی پکڑی۔ اور اس کی اپنے بچے کی طرح پرورش کی۔ ۴ مئی سنہ ۱۸۰۱ء میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور کالج اس غرض کے تحت دہلی میں قایم کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج سیاسی ضروریات کے مدنظر قایم کیا گیا۔ یعنی اس کے قیام کا مدعا یہ تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان ہندوستانی زبان اور ہندوستانی معاشرت سے روشناس کرایا جائے۔ مقصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو نے اس کے دامنِ عاطفت میں پرورش پائی اور خوب ترقی کی بلکہ فورٹ ولیم کالج ہی دراصل حقیقی معنوں میں اردو کا سرپرست رہ چکا ہے۔ اس کالج کی بنا ایک ایسی قوم نے ڈالی جس کے لٹریچر کی وسعت اظہر من الشمس ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے لٹریچر کو اردو میں منتقل کرے لیکن چونکہ ہندوستانی انگریزی ادب سے بے بہرہ اور ناواقف محض تھے اس لئے یہ ارادہ خواب بن کر رہ گیا۔ البتہ اس قوم کی کوششوں سے اس دور کے مصنفین نے فارسی اور عربی تراجم شروع کئے۔ میر شیر علی افسوس نے "گلستان" کا ترجمہ "باغِ اردو" کے نام سے شایع کروایا۔ مولوی شاہ عبد القادر نے قرآن شریف کا ترجمہ "آرایشِ محفل" کے نام سے پیش کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر گلکرائسٹ پرنسپل فورٹ ولیم کالج نے جو اردو کا محسنِ اعظم سمجھا جاتا ہے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی جو ادبیاتِ اردو میں "رسالہ گلکرائسٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ غرض کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کی مسیحا نفسی سے اردو کے قالب میں نئی روح پھونکی گئی۔

پہلے پہل تو فورٹ ولیم کی اردو کا رجحان زیادہ تر قصوں اور افسانوں کی طرف تھا چنانچہ ابتداً جتنی تصانیف پیش کی گئیں وہ سب حسن و عشق اور گل و بلبل کے رومانوی قصے تھے۔ لیکن بعد میں گلکرائسٹ کی کوششوں سے فورٹ ولیم تاریخ اور تذکرہ نویسی میں بھی کبھی پیچھے نہ رہا۔ شیر علی افسوس کی "آرایش محفل" حیدری کی "تاریخ نادری" مظہر علی خاں ولا کی "تاریخ شیر شاہی" اور حسینی کی "تاریخ آسام" اس دور کی نہایت معتبر اور مستند تاریخیں ہیں۔ اس کالج کے عہد میں سب سے پہلی مرتبہ پتھر کے چھاپے خانے قایم کئے گئے جن کی وجہ سے تصنیف و تالیف میں غیر معمولی سرعت پیدا ہو گئی۔ اگر چہ کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد نے اردو کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن انھوں نے اردو ادب کے لازمی عنصر نظم کو فراموش کر دیا۔ اسے اردو نظم کی خوش قسمتی سمجھئے کہ قدرت نے اس کی بقا کے لئے ولی، میر، مصحفی، انشا، آتش، ذوق، غالب اور نظیر کو پیدا کیا۔ انھوں نے اردو نظم کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا اور اس کو کبھی نثر سے پیچھے نہ رہنے دیا۔ پہلے پہل اردو میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں فارسیت کا بہت زیادہ غلبہ تھا۔ شاعر اور ادیب [illegible] عربی فارسی کے الفاظ زبردستی اردو میں ٹھونستے تھے۔

سر سیّد اور محمد حسین آزاد ہی وہ اشخاص ہیں جنھوں نے اردو کو سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ سر سیّد اور محمد حسین آزاد کا نذیر احمد حالی اور شبلی نے بھی ساتھ دیا چنانچہ تاریخ ادبیات اردو میں انھیں "اردو کے عناصر خمسہ" کہا گیا ہے۔ ان تمام کی تحریریں اتنی آسان اور دلکش عبارت میں لکھی ہوئی ہیں کہ ایک معمولی اردو داں بھی بخوبی پڑھ سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔ شروع شروع میں یہ طرز انشاء مقبول نہ ہو سکی چنانچہ رجب علی سرور جیسے ادیب نے اس سلاست اور سادگی کا مذاق اڑایا۔ لیکن ان عناصر خمسہ کی سعی پیہم سے یہ بیل جلد جلد منڈھے چڑھنے لگی۔ سر سیّد، نذیر احمد اور شبلی نے اگر نثر میں انقلاب پیدا کیا تو آزاد اور حالی نے پرانی اور تکلف شاعری کا خاتمہ کیا اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ آزاد اور حالی نے حسن و عشق اور گل و بلبل کے قصوں سے اپنے قلم کو نا آشنا رکھا۔ ان کی شاعری کی ہر تان فطرت پرستی حقایق اور حیات انسانی کے واقعات پر ٹوٹتی تھی۔ چنانچہ محمد حسین آزاد نے جدید طرز کی پہلی نظم "شب قدر" ۱۷ مئی ۱۸۷۴ء انجمن پنجاب کے جلسہ میں پڑھی جو کرنل ہالرائیڈ کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اردو میں اسی قسم کی شاعری کا آغاز ہوا۔ حالی اور دوسرے ہم عصر شعراء نے آزاد کا تتبع شروع کیا۔ نیز اس جدید رنگ کی شاعری کی آبیاری کرنے والوں میں اکبر، اقبال، سرور جہاں آبادی، چکبست، ملوک چند محروم اور جوش ملیح آبادی بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا تو وہ اس کی قوم سے اس کے احوال (..................) سے متعلق ہوتا۔ نظم کی طرح نثر میں بھی سر سیّد، نذیر احمد، شبلی اور غالب کی وجہ سے انقلاب ہوا۔ خصوصاً غالب نے اردو زبان کو آسان بنانے میں بڑی مدد دی۔ ان کی عبارت میں سادگی بے تکلفی، بے ساختگی اور لطف پایا جاتا ہے۔ ان کے مکاتب اردو ادب میں "اردوئے معلّیٰ" کے نام سے معروف ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ "خطوط نویسی" دراصل مرزا غالب کی ایجاد ہے۔

یہ سب کچھ انہی ارباب نثر کی کوششوں و مساعی کا نتیجہ ہے کہ ادبیات اردو آج اس قدر مالا مال نظر آتی ہے۔ موجودہ دور کو اگر چہ کہ اردو کے انتہائی عروج کا دور نہیں کہا جا سکتا مگر پھر بھی یہ دور اردو کے شاندار مستقبل کا ضامن ہے ادبیات اردو کے بازار میں آج ہمیں سیکڑوں یوسف الواں بیچتے نظر آتے ہیں چنانچہ اردو شاعری میں جگر، جوش، حفیظ اور امجد کا نام رہتی دنیا تک قایم رہے گا۔

اعلیٰ پایہ کے علمی، ادبی مضامین اور تحقیقی مقالے لکھنا گویا مولوی عبد الحق، نیاز فتح پوری، قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زور اور مولوی عبد القادر صاحب سروری کا حصہ ہے۔

جدید افسانہ نگاری کے متعلق ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ جدید افسانے سارے انگریزی ادب کی پیداوار ہیں اور اردو کے انشاء پرداز مغربی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنا کر پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ نیاز فتح پوری نے ٹیگور کے اثر کو اردو میں رائج کیا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی افسانوں کے متعدد ترجمے شایع کئے۔ عنایت اللہ دہلوی مستقل طور پر انگریزی تصانیف کو اردو میں منتقل کرتے ہیں۔ ... اکبر علی ... گورکھپوری، امتیاز علی تاج،

صادق الخیری، حجاب امتیاز علی، اختر حسین رائے پوری اور علیگڈھ وجامعہ عثمانیہ کے اکثر اصحاب قلم انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانوں کو رائج کر رہے ہیں۔

طبعزاد افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند مرحوم، اعظم کریوی، ام اسلم، آغا حیدر حسن اور خواجہ حسن نظامی قابل ذکر ہیں۔

اردو کا مزاحیہ لٹریچر اکبر الہ آبادی، پطرس، فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کا ممنون احسان ہے۔

اس تمام بحث کے بعد اگر ہم اردو ادب کا دوسری زبانوں کے ادب سے تقابل کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو ادب ابھی عالم طفولیت سے گزر رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، دار المصنفین اعظم گڑھ، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نیز ہندوستان کے اکثر رسائل و اخبارات اردو ادب کے تمول و ارتقا کی ممکنہ کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کی یہ قابل قدر مساعی یقین دلاتی ہیں کہ اردو ادب کا مستقبل نہایت شاندار اور درخشاں ہے۔

کاغذی دوات

ابراہیم حسین جلیس
(گلبرگہ)

اک بچے نے بنائی جو اک کاغذی دوات
ماں سامنے ہی بیٹھی تھی، بولا کہ اماں جان
کیا خوب یہ دوات ہے کیا بات ہے مری
اس میں سیاہی بھر کے میں لکھوں گا اب سبق
ماں نے کہا یہ سن کے کہ اچھی ہے یہ دوات
یہ کاغذی دوات فقط دیکھنے کی ہے
لکھو پڑھو تمھارے یہی کام آئے گا
لکھ پڑھ کے تم جو سونے کی بنواؤ گے دوات
اب کاغذی بنا کے دوات اس قدر ہو شاد
صنعت بھی اچھی چیز ہے تم یہ بھی سیکھ لو
علم و ہنر کو سیکھ کے جو طاق ہو گئے
محنت اٹھا کے سیکھا ہے جن لوگوں نے کمال
میں خوش ہوں تم کو علم کا صنعت کا شوق ہے

خوش ہو گیا کہ سب سے ہے اچھی مری دوات
یہ دیکھئے دوات کی میری انوکھی شان
ہوتی ہے دیکھ دیکھ کر اس کو بڑی خوشی
معنی لکھوں گا اُن کے جو الفاظ ہیں اوق
لیکن میں تم سے کہتی ہوں بیٹا اک ایک بات
جو کام دینے والی ہو وہ تو نہیں یہ شئے
لکھ پڑھ چکو تو اس کا ہے پھر پوچھنا ہی کیا
اس وقت پھر کچھ اور ہی ہوگی تمھاری بات
جب علم سیکھ لو گے تو بر آئے گی مراد
چھوڑو نہ کاہلی سے ہنر اور علم کو
بیٹا! وہ لوگ شہرۂ آفاق ہو گئے
ہے وہ کمال ان کے لئے دولت اور مال
اس کا اٹھاؤ لطف کہ اچھا یہ ذوق ہے

علم و ہنر سے عزت انساں جہاں میں ہے
فیاضؔ اس سے بڑھ کے نہیں اور کوئی شے

ابو الفیض فیاض
(دیورکنڈہ)

بوڑھا سادھو

شام ہو رہی تھی۔

بوڑھا سادھو چلا جا رہا تھا۔

بائیں ہاتھ کی جھولی میں دو چار سڑے گلے آم تھے۔
کندھے پر پوٹلی، دائیں ہاتھ سے کندھے پر سنبھالا
ہوا ایک لکڑی کا — موٹا کالا سا — ڈنڈا!
داڑھی الجھی ہوئی۔ ذرا سفید مگر مٹیالے
بال۔ بالوں میں دھول۔ گڑھے میں دھنسی ہوئی آنکھیں
اور...... اور ہاں، تکان سے لڑکھڑاتے ہوئے پیر!
تھکے ہوئے کندھوں پر گویا وہ مصیبت کا بوجھ لادے
چلا جا رہا تھا۔

جھکی ہوئی آنکھیں اٹھا کر اس نے دیکھا، سامنے
ہی دو نوجوان چلے آ رہے تھے۔ سفید ڈھیلے پاجامے،
لمبے انگریزی وضع کے بال اور منہ میں سگار!

"بابوجی کا بھلا ہو......" بھکاری نے نہایت
عاجزانہ انداز میں کہا۔

نوجوانوں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ غصہ سے
ایک نے کہا "سر پر چڑھا آتا ہے اندھے؟ منہ سے مانگتے
مانگتے نیت نہیں بھری؟"

"ارے یار، یہ تو بدمعاش معلوم ہوتا ہے!"
دوسرے نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

بوڑھا سادھو اپنی جگہ دنگ کھڑا رہ گیا۔ دونوں کو جاتے
دیکھتے ہوئے!

لمبی سانس لے کر پھر چل دیا۔ حالانکہ اس کے پیروں میں
وہ طاقت باقی نہ تھی۔ کندھے کا بوجھ بھاری محسوس ہو رہا
تھا۔ بے عزتی کے بارے کلیجہ منہ کو آ رہا تھا!

سامنے دیکھا، ایک ادھیڑ عورت ایک بوڑھے کے ساتھ
چلی آ رہی ہے۔

بھکاری نے سوچا، عورت کا دل مرد کی طرح لوہے کا
نہیں ہوا کرتا۔ وہ رحم دل ہوتی ہے۔ شاید...... وہ ٹھہر گیا۔
عورت نے دیکھا اور دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"مائی......!" سادھو نے کہا۔

بھوں چڑھا کر عورت نے کہا "اتنی بڑی پوٹلی تو بھری
ہے، اس سے بھی تیرے پیٹ کی آگ نہیں بجھتی؟"

بوڑھے نے ہاتھ بتا کر کہا "ارے باپ رے، ڈنڈا تو
دیکھو اس کا!"

سادھو نے دیکھا، بوڑھی کے ہاتھ میں سونے کی چمکدار
چوڑیاں، کڑے نہ معلوم اور کیا کیا ہیں!

سادھو کی آنکھیں دھندلی ہو گئیں۔ شاید اس میں
کندھے کے بوجھ کو سنبھالنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ مجبوراً وہ
چلتا ہی رہا۔ چلنا تو تھا ہی۔ شام قریب تھی۔ اور رات سے
قبل اس کو ندی کے کنارے پہنچنا تھا۔ ورنہ......؟

اور ندی؟ کتنی دور پر تھی وہ! دو...... تین......
یا...... اور زیادہ میل؟ سادھو نے ہمت کر کے اپنی رفتار
تیز کی۔

تھکے ماندے لڑکھڑاتے پیروں میں ٹھوکریں لگتی تھیں
مگر وہ چلتا ہی جاتا تھا!

کسی بچی کی سریلی آواز اس کے کان میں پڑی۔
دیکھا کہ حسین معصوم لڑکی اپنی ہمجولیوں سے کھیل رہی ہے۔

سادھو رک گیا۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ندی کا کنارا کتنا دور تھا!

پھر بھی بوڑھا سادھو سب کچھ بھول کر اس حسین لڑکی کو
دیکھ رہا تھا، ہنستے ہوئے!
اتفاقاً بچی کی نظر اپنی جانب گھورنے والے
بوڑھے سادھو پر پڑی۔ وہ گھبرا کر خاموش ہو گئی۔
سادھو نے مسکرا دیا، اس کا ڈر مٹانے کے لئے!
بچی پیچھے ہٹ گئی۔ اور مارے خوف کے اس کے
منہ سے چیخ نکل گئی "ارے ڈنڈے والا!" اور وہ بھاگ گئی۔
رات ہو گئی تھی۔ سادھو آہستہ آہستہ قدم بڑھائے
چلا جا رہا تھا، سایہ کی طرح، بے ہوش سا!
زندگی کے لمبے لمبے پچاس سال..... تب ہاں،
وہ بھی بچہ — ایسا ہی بچہ — تھا!..... ہو گا۔ مگر اب؟
تین دن کا بھوکا بدن کام کرنے سے انکار کر رہا تھا!
اتنی تھکان اور اس درجہ کمزوری کا اس کو احساس
ہو رہا تھا کہ شاید وہ پچاس سال سے چل ہی رہا ہے!

آج...... وہ، ڈنڈے والا..... بچوں کا چور... اُف!
اس کا سر چکرانے لگا۔
کانوں میں سنسناہٹ...... آنکھوں میں اندھیر
..... رات شاید آگے بڑھ کر اس کا گلا دبا رہی تھی!
ہائے! ندی کا کنارا کتنا دور تھا! ڈنڈے والا.... اُف... بدمعاش!
سادھو اک بار لڑکھڑایا۔ آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر سنبھلنے کی
کوشش کی۔ اور ایک قدم بڑھایا!
مگر ٹھوکر لگی، اور..... گر پڑا۔

صبح لوگوں نے معلوم کیا کہ سادھو — ایک بوڑھا
سادھو — مرا پڑا ہے! اس کی پھٹی پوٹلی سے کچھ
چیزیں ادھر اُدھر جھانک رہی ہیں۔ اور وہ ڈنڈا پکڑے
ہوئے ہے مضبوطی سے!

ین این کٹی
(ڈگنگ گری)

اردو

ہر اک زباں سے اچھی اردو زباں ہماری　　کہتے ہیں اس زباں کو پیر و جواں ہماری
بے خود بنا ہی دے گی نغمے سنا سنا کر　　جذبات کے وہ اے دل پیاری زباں ہماری
مٹنا ترا ہے مشکل جب تک کہ دم میں دم ہے　　پیاری زباں ہی اردو جانِ جہاں ہماری
اغیار گو ہوں دشمن مطلق نہ خوف کھا تو　　کیا جانے تیری عظمت کیا جانے شاں ہماری
اقبال اور حالی گویا تھے یوں ولی بھی　　پیاری ہی جاں سے ہم کو اردو زباں ہماری

اردو کی شان و شوکت دیکھی ہی جب سے اے درد
کہتا ہے ہو کے قرباں ہندوستاں ہماری

حسین شریف درد
(سٹی کالج)

میر حسن ایم اے کی کتابیں

ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری۔ میر حسن صاحب ام، اے ملک کے ان لائق فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلی کتاب "ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" لکھی اور اسی کتاب سے "ادارۂ ادبیات اردو" کے اشاعت کتب کا سرگرم دور شروع ہوتا ہے۔ ورڈز ورتھ کے متعلق ملک کے جرائد و مشاہیر کی رائیں اس کے مصنف کی پہلی کوشش کی غیر معمولی کامیابی کا ثبوت ہیں۔

"ورڈس ورتھ انگریزی ادب کا معیاری شاعر ہے جناب میر حسن نے اس کو اردو داں طبقے سے روشناس کیا۔"

"مولف نے یہ ایک اچھا طریق سوانح نگاری اختیار کیا ہے۔ اگر اسی رنگ پر وہ دوسرے باکمال شعرائے یورپ کو"

"روشناس کرنے میں کامیاب ہو جائیں جیسا کہ ان کا مقصد ہے تو اردو کی ایک مفید خدمت انجام دیں گے۔ (مولینا سلیمان ندوی)

"مولوی میر حسن صاحب ۔۔۔۔ نے اس کتاب میں نہایت خوبی و جامعیت کے ساتھ انگلستان کے اس مشہور شاعر"

"کی حیات اور کلام اور اس کے معاصرین اور عہد حاضر کے انگریزی اور اردو شاعروں پر اس کے اثرات تنقیدی"

"نقطۂ نظر سے بیان کئے ہیں۔ اسلوب بیان اس قدر دلکش اور دلاویز ہے کہ بے اختیار مصنف کے حق میں"

"۔۔۔۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔ (مشیر دکن)

"سوانح نگاری کا یہ طرز عام روش سے علحدہ ہے، اور چونکہ فطری اصول کے مطابق ہے اس لئے بغایت پسندیدہ ہے۔"

"بہ حیثیت مجموعی ہمارے جدید مطبوعات میں یہ ایک مفید و دلچسپ اضافہ ہے۔ (ہندوستانی الہ آباد)

"جامعۂ عثمانیہ کی بدولت حیدرآباد اور اس کے متعلقات میں خوش فکر اور نوجوان انشاپردازوں کی ایک ایسی"

"اولعزم جماعت پیدا ہو گئی ہے جو ہر وقت اردو ادب کی توسیع و ترقی کی فکر میں منہمک ہے۔ اسی جماعت میں"

"۔۔۔۔ میر حسن صاحب بھی ہیں۔ قابل مصنف نے نہایت محنت اور دماغ سوزی سے کام لے کر یہ کتاب مرتب"

"کی ہے۔ اردو داں پبلک خصوصاً شعرا کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔ (دیا نرائن نگم بی اے)

"موضوع نام سے ظاہر ہے اور افادیت اس کے موضوع سے مترشح۔ وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور"

"مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر متقابلاً نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب خصوصیت"

"کے ساتھ قابل قدر ہے۔ (نیاز فتح پوری)

"میر حسن صاحب نے یہ بہت قابل قدر کام کیا ہے۔ میر حسن صاحب کی محنت قابل شکر اور لایق قدر ہے۔ نظم کا"

"ترجمہ بہت دشوار کام ہے لیکن مولف نے عموماً اس دشوار کام کو بھی خوبی سے انجام دیا ہے۔ اردو شعرا کو یہ"

"کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ (پروفیسر اسمیٹ)

"کتاب اچھی اور بہت اچھی ہے اور بہت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ ورڈسورتھ کی شاعری کے اثرات اردو شاعری کے"

"نئے دور پر آپ نے کامیابی کے ساتھ دکھائے ہیں۔ ہوشمند طبیعتیں ضرور ورڈسورتھ کے کلام کا مطالعہ اب اس نقطۂ نظر سے"
"کریں گی جس کی طرف آپ کی کتاب اشارہ کر رہی ہے۔ (ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)

"ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری پر انھوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے اور اس موضوع پر اردو میں ایک دلچسپ"
"کتاب لکھی ہے۔ (عبدالرحمن خاں سابق صدر جامعۂ عثمانیہ)

"یہ بیش قیمت رائیں" ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" کے اس قابل مصنف کے متعلق ہیں جو پروفیسر قاضی محمد حسین"
"صاحب نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ کی نظر میں "کردار اور عمل کے ایک بلند معیار کا مالک" ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جامعۂ عثمانیہ
کے سانچے میں جو آزادیٔ فکر و عمل ڈھلتی ہے اس کی تعمیر ایسے ہی طلبا کی تعمیری جد و جہد سے ممکن ہے"۔

"ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری کی دوسری اشاعت' سات سال بعد نظرِ ثانی اور اضافوں کے بعد عمل "
"میں لائی جا رہی ہے۔ اس میں ورڈز ورتھ کی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی شریک رہے گا جو صاحبزادہ میکش نے"
"کیا ہے

مغربی تصانیف کے اردو تراجم۔ میر حسن صاحب کی دوسری کتاب جو حال میں شایع ہوئی ہے مغربی تصانیف کے اردو تراجم سے متعلق ہے۔ پروفیسر سروری نے سچ فرمایا ہے کہ "نقدِ ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مغربی زبانوں کی تصانیف اور تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا مبسوط تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۱۷ء تک کے اردو ادب کا یہ پہلو ہر اس شخص کے لئے باعثِ دلچسپی ہوگا جو ترقیٔ اردو کے متمنی ہیں۔

سائنس کے کرشمے۔ "سائنس کے کرشمے" ان نشری تقاریر کا مجموعہ ہے جو نشرگاہ حیدرآباد سے علمی موضوعوں پر نشر ہو چکی ہیں۔ میر حسن صاحب نے ان کو ترتیب دے کر عوام کو علمی موضوعوں سے واقف ہونے کا ایک موقع پیدا کر دیا ہے۔

حسب ذیل کتابیں مرتب ہو چکی ہیں اور زیر طبع ہیں

بچوں کی کہانیاں۔ اردو زبان میں بچوں کے لئے تعمیری ادب کی کمی کا احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اور ان تمام خدمت گزارانِ ملک کے نزدیک یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی تلافی کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ مساعی کا آغاز ہونا چاہیے۔ میر حسن صاحب نے شستہ اور سلیس کہانیوں کا مجموعہ بچوں کے لئے مرتب کیا ہے جو عنقریب شایع ہوگا۔

تہذیب و تمدن کے اجزائے لطیف۔ صنفِ لطیف کے مسائل پر صنفِ لطیف کے افکار کا مجموعہ۔ میر حسن صاحب نے ملک کی صاحبِ فکر خواتین کے مضامین ایک مقدمہ کے ساتھ مرتب کئے ہیں۔ ان مضامین میں خواتین کے مسائل پر خواتین ہی نے عام فہم اور سلیس زبان میں روشنی ڈالی ہے۔

تاریخ ادب انگریزی۔ اردو ادب کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اردو داں مختلف ترقی یافتہ زبانوں کی تاریخ سے واقف ہوں۔ انگریزی ادب نے جو ترقی کی ہے وہ اردو ادب کی ترقی کے لئے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔ اسی تعمیری احساس کے تحت میر حسن صاحب کئی سال سے انگریزی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ قابلِ قدر کتاب جلد شائع ہو جائے گی۔

پروین۔ "پروین" ایک دلچسپ ڈراما ہے جس میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے زندگی اور محبت کے ایک نازک مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محبت کی بے اختیاری جذبۂ ایثار کو پامال نہیں کر سکتی۔ محبت اور ایثار دراصل ایک ہی جذبہ ہے۔ محبت کی انتہائی شکل ایثار کی تعبیر کرتی ہے۔ اس ڈرامے میں اسی کو بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

"حق محبوب" اور دوسرے ڈرامے۔ زندگی کی سنجیدگی بعض وقت قہقہوں کا ماحول ڈھونڈتی ہے۔ میر حسن صاحب ایک ڈراما نویس کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ اس کتاب میں ان کے مزاحیہ مختصر ڈرامے جمع کئے گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں تبسم اور قہقہہ زندگی کے نازک پہلوؤں سے ہم آہنگ نظر آئے گا۔

اللہ نے بچا لیا۔ جدید ادب میں مختصر قصوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ میر حسن صاحب مختصر قصے لکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ "اللہ نے بچا لیا" کتاب کا جس قدر دلکش نام ہے، اسی قدر دلچسپ افسانے اس میں ملیں گے۔

مہتمم "سب رس"

کون کیا ہیں

وقت کی اس ضرورت کو محسوس کر کے کہ ملک کی مشہور اور قابل شخصیتوں کے حالات کا یکجا جمع ہو جانا ازبس ضروری ہے "دکن نیوز" کی مجلس انتظامی نے طے کیا ہے کہ "کون کیا ہیں" کے نام سے ایک نہایت ہی عظیم الشان کتاب ترتیب دیجائے جو زمانہ حاضرہ کی معیاری تاریخ سمجھی جا سکے۔

اس کتاب میں ملک کے قابل اہل قلم قومی کارکن، علماء و مشائخین امراء جاگیردار و وکلاء، حکماء، شعراء اور عہدہ داران سرکاری غرض ہر طبقہ کی ایسی شخصیتوں کے حالات ان کی تصاویر کے ساتھ ہوں گے جن کی زندگیاں قابلِ تقلید نمونہ بن سکتی اور جو اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔

جملہ مراسلت مجلس انتظامی "دکن نیوز" بازار سدی عنبر سے کیجائے

روغن گیسو سنگھار

رجسٹرڈ دولت آصفیہ (۱۱۱)

متعلق محقق و مستند اطبا و تجربہ کار نامور ڈاکٹروں کا اظہار خیال ملاحظہ فرمائیے

عالیجناب آنریبل ڈاکٹر نواب ارسطو یار جنگ بہادر

یہ فرماتے ہیں کہ ۔ روغن گیسو سنگھار رجسٹرڈ نمبر (۱۱۱) کے نسخہ کو میں بطور خود دیکھا اور تیل کی آزمائش بھی کیا یہ روغن دماغ کے لئے مفید اور بالوں کی درازی و سیاہی اور پائیداری کے لئے فائدہ مند ہے جسکی میں تصدیق کرتا ہوں ۔

عالیجناب الحاج حکیم محمود خان صاحب (ساکن پامیلی)

یہ فرماتے ہیں کہ :۔ روغن گیسو سنگھار میری تجویز سے ہے جو مقوی دماغ اور سر کے بالوں کی درازی و دائمی سیاہی کا ضامن ہونے کے علاوہ خوشگوار عطریت بھی رکھتا ہے جو میرا تجربہ ہے اور ہر موسم میں استعمال عورت و مرد کے لئے مفید ہے ۔

عالیجناب امین منصور حکیم محبوب علی خان صاحب آنریری مددگار

نظامیہ شفا خانہ سرکار عالی ۔ یہ فرماتے ہیں کہ یہ تیل نہایت چمکدار نگین و خوشبودار اور فرحت بخش ہے امید ہے کہ استعمال کرنے کے بعد تجربہ بتلادیگا کہ موجد کا اتنا ضرور قابل ستائش ہے خدا کرے جلد غیر ممالک میں بھی روغن گیسو سنگھار ہر دلعزیز ثابت ہو ۔

علامہ وقت مولانا حکیم ابو الفدا محمود احمد صاحب مرحوم

سابق معتمد انجمن اطبا دکن و طبی بورڈ و ممتحن طبیہ کالج سرکار عالی کی یہ رائے یادگار رہیگی ۔ روغن گیسو سنگھار جسکو غلام قادر صاحب صدیقی و قاضی غلام محی الدین صاحب نے خاص اہتمام سے تیار کیا ہے اسکے نسخہ کو میں نے دیکھا تمام عمدہ اجزا ہیں اور ترکیب بھی خاص ہے دماغ کی قوت اور بالوں کے لئے سب اچھی چیزیں ہیں امید کہ اہل ملک قدر کریں گے اور اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے ۔

قیمت شیشہ کلاں ۱۲ ــــــــ شیشہ خورد ۸

تیار کردہ محمد غلام قادر صدیقی و قاضی غلام محی الدین کارخانہ معطر گھر جوہری گلی حیدرآباد دکن سے خرید فرمائیے

(مندرجہ ذیل مقامات سے بھی دستیاب ہوسکتے ہیں)

دواخانہ الحاج حکیم محمود خان صاحب پامیلی ۔ نیچے صدر محاسبی سرکار عالی حیدرآباد ۔ ہیر چند کی دوکان ۔ روغن گیسو سنگھار معطر گھر جوہری گلی حیدرآباد دکن

نُورُاللغات

ہماری اُردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مفصل اور مستند لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ شکر ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اِس طرف توجہ کی۔ امیر الشعرا حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ کے نام سے کئی جلدوں میں ایک مفصل لغت لکھا اس کے ایک عرصہ کے بعد حضرت نیّر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے اس میں اردو زبان کے ایک ایک حرف کے متعلق بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام ایسے اچھے پیمانے پر ایک فرد واحد سے کیسے انجام پا گیا بعض بعض جگہ ایک ایک لفظ کی تشریح و تحقیق میں کئی کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں انداز بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ اور حکیمانہ بغرض لغت کے سلسلے میں اب تک یہ آخری اور مستند کوشش ہے اور حامیانِ اردو کی قدر دانی کی مستحق۔

ڈُورائیں

مرتبہ مولوی نورالحسن صاحب نیّر بی اے ال ال بی
بڑی تقطیع (۲۹۷۸) صفحات قیمت مجلد (للعہ)

اُردو زبان کی لغات میں نوراللغات اپنے طرز کی تنہا لغت ہے جو بالکل جدید اصول پر مرتب کی گئی ہے اور الفاظ کے ذخیرے کے لحاظ سے بھی غالباً تمام دوسرے لغت سے افضل ہے مرتب نے اسے بیحد محنت جانفشانی کے بعد مکمل کیا ہے اس لغت کی اشاعت سے اردو زبان کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے امید ہے کہ اہلِ علم و زبان دان حضرات اس کی قدر کما حقہ کریں گے اور مرتب کی محنت کی داد دیں گے۔

"زمانہ"

نوراللغات ...... جلد اوّل الف ۔ ب صفحات (۷۴۲) قیمت عـہ
" ...... جلد دوم پ سے خ " (۵۱۴) " لـــہ

مولوی نورالحسن صاحب نیّر بی اے ال ال بی
بڑی تقطیع (۲۹۷۸) صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو کے تمام مروجہ الفاظ محاورات ضرب الامثال دخیل کلمات کا پورا استقصاء کیا گیا ہے اور شعرا و اساتذہ کے کلام نظم و نثر پر ہر جگہ استناد کیا گیا ہے دیباچہ میں متروک الاستعمال سے بھی دلچسپ بحث کی گئی ہے اور قواعد کے لحاظ سے الفاظ کی فصاحت پر جس قدر اثر پڑتا ہے متعدد مثالوں سے سمجھایا ہے۔

"نگار"

نوراللغات ..... جلد سوم د سے ق صفحات (۶۹۲) قیمت عـہ
" " ...... جلد چہارم ک سے ی " (۱۰۳۲) " للعہ

صدر دفتر :- مکتبہ جامعہ قرول باغ، نئی دہلی

شاخیں :- جامع مسجد دہلی (۱)، لوہاری دروازہ لاہور (۲)، پرنسس بلڈنگ جے جے اسپتال بمبئی (۳)

تمام یونانی مرکبات کا مخزن
(یونانی طبی بورڈ قائم شدہ ۱۳۳۸ف)
خصوصیات
یہاں کی ادویہ ملک کے نامور اطباء کی زیر نگرانی تیار ہوتی ہیں۔ اس دواخانہ میں عالیجناب حکیم محمد ہبتہ اللہ صاحب مولوی فاضل و حکیم کامل الطبیہ کالج دہلی (پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج معتمد انجمن اطباء یونانی صبح ۸ تا ۱۰ شام ۶ تا ۸ مطب فرماتے ہیں
جمعہ اور یکشنبہ کو ۴ سے ۶ تک ملک کے مشہور اطباء مریضوں کا معائنہ و علاج کرتے ہیں۔
تفصیلی فہرست ٹکٹ روانہ فرما کر مفت حاصل کیجئے
یونانی طبی بورڈ - افضل گنج حیدرآباد دکن
قلموں کا خزانہ
ہر قسم کے فونٹن پن کم سے کم زیادہ سے زیادہ قیمتوں میں دکن پن اسٹور شاہراہ عثمانی
عابد روڈ سے طلب فرمائیے نیز ہمہ اقسام کے فونٹن پن کی درستگی
گیارنٹی کیساتھ کیجاتی ہے
حیدرآباد کا ممتاز مقام
چوراہا افضل گنج روڈ
مجسٹک ریڈیو ہوس
جہاں تجربہ کار ماہرین ریڈیو موجود ہیں۔ ریڈیو سٹ اور لابرقی ریڈیو کی خریداری اور ہمہ اقسام کے ریڈیو کی مرمت کیلئے ہماری خدمات حاصل کیجئے۔
ہر گھر میں آج کل یہی چرچا ہے
کیونکہ خوش رنگ خوشبودار ذائقہ میں بیمثال ہونیکے علاوہ فرحت بخش ہے
آپ بھی ایکبار آزمائش فرمائیے
(رجسٹر آصفیہ ۲۳ھ)
گولکنڈہ ٹپسری ملکی چائے
حمید ایجنٹ اینڈ کمپنی شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن

آپکی قوتِ ارادی کا بہترین حل

روغن آملہ (براق مارک)

تقویتِ دماغ درازی گیسو۔ بالوں کو سیاہ، نرم و چمکدار بنانا۔
گرتے ہوئے بالوں کو ازسرنو پیدا کرنا۔ یہ اسکی بہترین خصوصیات ہیں۔ ہمیشہ استعمال فرمائیے

قیمت شیشہ کلاں عہ — ہر گھر میں اس کی ضرورت ہے — شیشہ خورد ۱۲/

تیار کردہ روح تازہ کمپنی چمن گولیگوڑہ شاخ چھپلی کمان حیدرآباد دکن

آجکل

امراء۔ روساء حکام۔ پروفیسر۔ بیرسٹر۔ وکلا۔ طلبا۔ اور دیگر دماغی کام کرنے والے حضرات و سیٹھ۔ ساہوکار اور معزز بیگمات سکندر آبادی ہیرا تیل کو فرحت و سکون اور اصلاح عوارض دماغی کیلئے نہایت مرغوبیت سے استعمال فرما رہے ہیں یہ نہ صرف تیل کی جملہ خصوصیات کا حامل ہے بلکہ ایک مستند خوشبودار دوائی بھی ہے۔ اپنی پسندیدہ تیل کا استعمال ترک نہ کیجئے بلکہ اسکے صرف دس قطرے اسمیں شامل کر لیجئے کر حکمت کی ایک نئی دریافت کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے یہ ایک خاص چیز ہے رجسٹرڈ سرکار آصفیہ (۳۷۸) قیمت فی بکس ۶

ملنے کے مقامات: شاپ سید عبدالرزاق گلزار حوض۔ شاپ میر حسن عابد روڈ۔ جے۔ اے کریم سکندرآباد۔

شفاخانہ ڈاکٹر نجار عقب دیوڑھی اقبال الدولہ چھتہ بازار حیدرآباد دکن